وانک لتھدی الی صراط مستقیم ۝ صراط اللہ الذی لہ ما فی السموت وما فی الارض الا الی اللہ تصیر الامور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

راہِ حقیقت

تصنیف

جناب محمد نور الدین رحمۃ اللہ علیہ اویسی امینی کشمیری

از خلفائے

الحاج مولوی محمد امین رحمۃ اللہ علیہ اویسی کشمیری (قطب الاقطاب)

شعبۂ نشر و اشاعت

سلسلہ عالیہ اویسیہ ایبٹ آباد (ہزارہ) پاکستان بھمبر آزاد کشمیر

وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ صِرَاطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ أَلَا إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

راہِ حقیقت

تصنیف

جناب محمد نور الدین رحمۃ اللہ علیہ اویسی امینی کشمیری

از خلفائے

الحاج مولوی محمد امین رحمۃ اللہ علیہ اویسی کشمیری (قطب الاقطاب)

شعبۂ نشر و اشاعت

سلسلہ عالیہ اویسیہ ایبٹ آباد (ہزارہ) پاکستان۔ بھمبر آزاد کشمیر

سلسلہ اویسیہ پبلیکیشنز

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ھیں

نام کتاب: راہِ حقیقت

مصنف: حضرت محمد نور الدین اویسیؒ

ایڈیشن: دوم

تاریخ طباعت: جنوری ۲۰۱۵ء

﴿برائے رابطہ وحصول کتب﴾

(۱) محمد بشیر اویسی بلیک برن انگلینڈ فون: 00441254671126

(۲) ریاض احمد خیال اویسی بھمبر آزاد کشمیر فون 03007424574,03451566483

(۳) محمود احمد طائر پلاہل کلاں ضلع کوٹلی آزاد کشمیر فون: 03465259352

دیباچہ طبع ثانی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلٰنَا یَا مُحَمَّدُنِ النَّبِیُّ الْاُمِّیُّ وَاٰلِہٖ وَسَلِّمْ

امام العاشقین حضرت خواجہ اویس قرنیؒ کے بارے میں آقائے دو جہاں صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اِنِّیۡ لَاَجِدُ نَفَسَ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ قِبَلِ الۡیَمَنِ (مجھے یمن کی طرف سے بوئے خدا آ رہی ہے) کا فیض باطنی تو جاری وساری تھا۔لیکن ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے اسے عنقا کہا جاتا رہا۔البتہ طرزِ اویسی کی وجہ سے بعض اولیاء اکرام زمانہ میں 'اویسی'' مشہور ہوئے۔یہ وہ تھے جنہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ارشاد حاصل ہوا۔یا کسی مماتی بزرگ سے باطناً فیض حاصل ہوا۔ایسے بزرگ ہر چہار مشہور سلاسل قادریہ۔چشتیہ۔نقشبندیہ۔اورسہروردیہ میں پائے جاتے ہیں۔لیکن حقیقی فیض اویسی کے بارے میں تاریخ خاموش رہی یہاں تک کہ جب حضرت شاہ لونگ سندھیؒ سے خلافت حضرت شاہ محمد عارف اروڑ ویؒ اور ان سے حضرت سید نور الزمان شاہؒ کو منتقل ہوئی تو دنیا اس سلسلہ سے روشناس ہوئی۔اور ان سے خلافت جب الحاج مولوی محمد امینؒ کو منتقل ہوئی تو سلسلہ اویسیہ روز روشن کی طرح آشکارا ہوا۔

حضرت محمد نور الدین رحمتہ اللہ علیہ سلسلہ اویسیہ کے مہرِ تاباں تھے۔آپ نے تقریباً نصف صدی تک یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡھِمۡ وَ یُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ کا فریضہ انجام دیا۔آپ نے دینِ محمدیؐ کی تبلیغ وترویج کیلئے اپنی زندگی کو وقف کر رکھا تھا۔آپکی درج ذیل کتب زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔(۱) نور العرفان (۲) شرح منازل فقر (۳) حقیقتِ تصوف (۴) راہِ حقیقت (۵) علم العرفان (۶) فتنۂ مرزائیت ایک تجزیہ (۷) تاریخ خلافت اسلامی (۸) سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۹) روح البیان۔علاوہ ازیں آپ کے خطوط کا مجموعہ۔چند تقاریر اور مضامین ۔سوانح حیات بالترتیب نورِ بصیرت۔صراط مستقیم۔عرفانِ حقیقت کے نام سے چھپ چکی ہیں۔

''راہ حقیقت'' میں بڑےSystematic اور عام فہم انداز اور روزمرہ امثال سے مقصدِ تخلیق انسان کی وضاحت کی ہے۔جس میں تخلیق کائنات ۔تفکر کی ضرورت و اہمیت ۔پیغمبر ۔دین کی ضرورت ۔مذہب ـــ معروف مذاہب و ادیان کا تقابل وتنقیدی جائزہ۔مذہب کی حقانیت پرکھنے کے اصول۔اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقانیت ـــ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبی وخاندانی شرافت اور آپکے اعلیٰ وارفع۔بے مثل کردار کا اجمالی خاکہ ـــ محمدؐ ہست برہان محمدؐ۔قرآن حکیم کی صداقت وحقانیت۔اسلام کی صداقت۔ہمہ گیری اور عالمگیریت۔اسلامی عقائد۔اسلامی عبادات۔امرونہی میں مضمر حکمتوں۔روحانی پہلوؤں اور اثرات کا جائزہ۔بڑے موثر مدلل اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

''راہ حقیقت'' قبلہ وکعبہ حضرت محمد نورالدین اویسیؒ کی وہ تصنیف ہے جس کا تعلق آپکے دورِ جوانی (پچاس کی دہائی) سے ہے۔اس میں زبردست آمد۔جوش اور روانی ہے۔بلاشبہ یہ اپنے موضوع میں ایک جامع اور لاجواب کتاب ہے۔اسکا پہلا ایڈیشن جون ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ موجودہ ایڈیشن میں گزشتہ ایڈیشن میں رہ جانے والی کمپوزنگ اور کتابت وغیرہ کی اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے۔موجودہ دور کے تقاضوں کوملحوظ خاطر رکھتے ہوئے قبلہ وکعبہ کی کتب کی اب کمپیوٹر کمپوزنگ کی جارہی ہے۔اس سلسلہ میں حقیقت تصوف۔صراط مستقیم۔علم العرفان طبع ہو چکی ہیں۔راہِ حقیقت کا یہ ایڈیشن بھی اس سلسلہ کی کڑی ہے۔اگراس موقع پر میں محمود احمد طائر صاحب جنکی حسب سابق مجھے بھرپور معاونت حاصل رہی کا شکریہ ادا نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔اللہ انہیں جزا دے اور اپنی معرفت میں اکمل کرے۔امین۔

امید ہے عام قاری کیلئے بالعموم اور حقیقت کے متلاشیان کیلئے یہ کتاب انتہائی سودمند ہوگی۔آپکی قیمتی تجاویز اور آرا کا انتظار رہے گا تاکہ اگلا ایڈیشن بہتر سے بہتر ہو سکے۔

ریاض احمد خیال اویسی

یکے از غلامان حضرت محمد نورالدین اویسیؒ

(سابق ناظم اعلیٰ تعلیم سکولز آزاد حکومت جموں وکشمیر)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ○
نَحۡمَدُهٗ وَ نُصَلِّيۡ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ

دیباچہ

تخلیقِ کائنات کے تصور میں۔ترتیبِ تخلیق کائنات میں یہ ایک موہوم تصور پایا جاتا ہے کہ غالباً اللہ تعالیٰ نے ''شف'' سے یہ کائنات بنائی ہوگی۔لیکن کائنات کے نظامِ تخلیق میں۔جو اشیائے کائنات کی تخلیق میں آثار مشاہدے میں آتے ہیں۔ان اشیاٗ کی تحقیق سے واضح ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک منظم نظام کے تحت یہ کائنات۔ازل سے ابد تک بنائی ہے۔جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیئتوں اور کیفیتوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔چنانچہ قرآن نے بھی۔اس تخلیق کے وجود میں ۔ایک علت وسبب پر غور کرنے کی تحریک دی ہے۔ سِيۡـرُوۡا فِـى الۡاَرۡضِ فَـانۡظُـرُوۡا كَيۡفَ بَدَاَالۡخَلۡقَ (پارہ ۲۰ سورۃ ۲۹ آیت ۲۰)۔پھر و تجسس کرو۔اور دیکھو اللہ نے اس کائنات کے وجود کی ابتدا کیسے کی۔اس تحقیق میں یہ واضح ہوگا۔یہ کائنات محض ''شف'' سے نہیں بنائی گئی۔بلکہ ایک منظم ترتیب کے ساتھ ایک علتِ واحد سے اسکا وجود بنایا گیا۔جسے علت و معلول کی ترکیب میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

یہ تسلیم ہے۔کہ اس کائنات کی تخلیق میں۔اللہ تعالیٰ کی خالقیت کو دخل ہے۔اس لئے۔اس اللہ کی ذات کو ہی۔کائنات کا خالق۔سمجھا جاتا ہے۔اور خالق ہونے کے اعتبار سے۔لَا اِلٰـهَ کے تصور میں اللہ کی ذات کو اَحَد "۔احد۔''ایک'' پکارا جاتا ہے۔جسکے سوا ـــ اللہ کے سوا۔کسی وجود کا تصور ثابت نہیں ہوسکتا۔اس حال میں۔کہ کائنات کی ہر شے۔ہر وجود کسی ـــ وجود۔کسی مرکب ـــ کسی مادہ (Material) سے بننا (پیدا ہونا) لازم ہے۔یہ کائنات کی تخلیق کا ایک فطری

اصول بنتا ہے۔قرآن نے اس تخلیقی ترتیب کا اپنے بیان میں اشارہ دیا ہے۔تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَ مَنْ فِيهِنَّ ط وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط (پارہ ۱۵ سورۃ ۱۷ آیت ۴۴) ترجمہ۔ہر شئے وجود۔۔۔اپنی مخلوقیت میں اپنی اطاعت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔اپنے خالق (پیدا کرنے والے) کی۔جو تمہارے حدِ ادراک وعلم میں آنے والی کیفیتیں آسمان وزمین میں واقع ہیں۔اور یہ کہ کوئی شے (بیکار) نہیں مگر مظاہرہ کرتی ہے (كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ) اپنی ہیئتِ وجودی کی اطاعت سے۔(پہچان سے) مگر صورت یہ ہے۔ کہ یہ پہچان فقہِ قلبی ۔۔۔ مشاہدۂ قلبی سے ممکن ہوسکتی ہے ۔۔۔ ہاں اس پہچان۔تحقیق وتفکر کا آغاز (جو قرآن ہی راہنمائی کرتا ہے) وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (پارہ ۲۶ سورۃ ۵۱ آیت ۲۰۔۲۱) ہاں! اس تحقیق کی ابتدا زمین سے ہوتی ہے۔ جہاں تمہارا مستقر (قرار) ہوتا ہے ۔۔۔ ہاں تمہارے وجود کی تحقیق سے (کہ یہ وجود بھی کائنات کی ایک جز ہے) اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔۔۔ جس تحقیق میں۔آنکھ ۔۔۔ مادی ذرائع علمی۔کو اولاً استعمال کیا جاسکتا ہے۔

عقل وخرد کا تقاضا ہے۔کہ دانشمندانہ فکر سے اپنی ذات اپنی ہستی کے وجود کو بلا کسی ذریعہ کے قبل از وقت (بلا دلیل وثبوت) اللہ کی ذات کو تسلیم کیا جائے۔اور اپنی ذات کو بھی تسلیم کیا جائے کہ ''میں ہوں''۔اور اسی ''میں'' کے وجود سے تحقیق کی ابتدا کی جائے۔جس کی تحقیق وفکر میں۔انسانی مادی ذرائع آنکھ ۔۔۔ عقل سے کام لیا جاتا ہے۔اس حال میں کہ آنکھ ۔۔۔ اور عقل سے کسی شے کی ماہیت کی دلیل میسر آسکتی ہے اور اسی طریق تحقیق وفکر سے انسان بَدَاَ الْخَلْقَ کے ابتدائی وجود کی پہچان (معرفت) تک پہنچتا ہے اور اسی قرآنی بیان سے انسان کو حقیقی راہِ معرفت حاصل ہوتی ہے۔

یہ حقیقت ہے۔کہ کائنات میں شمار زمین (اَلْاَرْضَ) اربوں سال (ان گنت زمانہ) سے تخلیق ہوئی۔جس کی پیدائشی تاریخ ملنا ممکن نہیں۔اسی اعتبار سے۔انسان بھی اسی زمین کی تخلیق

ثابت ہے۔اور انسان کی عقل وخرد کا تقاضا بھی۔عقل وخرد۔کے اعتبار سے۔کائنات کی تخلیق ــــ کَیۡفَ بَدَ اَ الۡخَلۡقَ ــــ کی طرف متحرک ہونا ہے اور حال کا علم وتحقیق بھی ماضی کے علم وتحقیق کا نتیجہ ثابت ہے۔ماضی کی مخلوق میں منتخب محققین۔حکمآ ــــ کا علم ہی حال کے علم کی اساس ثابت ہے۔لہذا مستقبل کے علم پر ہی۔کائنات کی ابتدآ ــــ علت۔بنیاد ہوسکتا ہے۔جس میں تخلیق کائنات کی تحقیق میں صحیح سمت پر اپنی تحقیق کو بنیاد بنانا۔حقیقت ــــ راہ حقیقت حاصل ہونا لازم ہے ــــ

زیرِ مطالعہ کتاب۔موسوم بہ ''راہِ حقیقت '' میں۔ان حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔جو انسانی زندگی میں مقصدِ تخلیق ــــ واضح ہے ــــ جس ''مقصد'' پر کائنات تخلیق ہوئی ہے ــــ یہی ''راہ'' ہے ایک خالق ــــ اور مخلوق میں۔تحقیقی۔فکری۔رابطہ قائم کر کے۔عرفانِ نفس سے معرفتِ حقیقی عطا کرتی ہے ــــ وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡ اِلَّا بِااللّٰہِ۔

العارض

محمد نورالدین اویسی۔امینی۔کشمیری

مکان نمبر ۳۴۰۴ لنک روڈ۔ایبٹ آباد

ہزارہ۔پاکستان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

انسان جب کسی شے کے وجود پر نظر ڈالتا ہے۔تو یہ ایک فطری اصول ہے۔کہ وہ اس کے علم کیلئے اسکی ماہیت پر مطالعہ شروع کرتا ہے۔کہ یہ کیا چیز ہے؟ کیسے بنی؟۔کس چیز سے بنی؟ ۔اسکی اصلیت کو ذہن میں لانے کیلئے اسکی اصل کی طرف رجوع کرتا ہے۔وہ اسکے اجزائے ترکیبی پر نظر ڈالکر اسکی بنیاد کی تلاش کرتا ہے۔کسی شے مخلوق پر اسوقت تک قطعی فیصلہ نہیں دیا جاسکتا جب تک اِسکی اصل سے پوری واقفیت حاصل نہ کی جائے۔ورنہ درمیانی اور سطحی اسباب (جسکی علت معلوم نہ ہو) پر محدود دائرے میں سوچنے سے انسان کبھی کسی معاملہ میں اسکی اصلیت معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا ہے۔اور جو فیصلہ سطحی صورت پر دیا جائے وہ ناقص اور ادھورا ثابت ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ہمارے سامنے ایک درخت ہے۔ہم اِسے مستقل ہیئت میں پاتے ہیں۔ اگر ہم سطحی طور پر اسکی ماہیت کو مستقل قرار دینگے تو یہ مبالغہ ہوگا۔جب ہم عمیق نظروں سے اسکا مطالعہ کرینگے۔تو معلوم ہوگا کہ یہ مستقل نہیں بلکہ ہیئت تبدیل کرنے والی شے ہے۔آج چھوٹا سا پودا ہے کچھ عرصہ بعد بڑا ہوتا ہے۔اس میں تنا۔شاخیں۔پتے۔پھول۔میوہ پیدا ہوتا ہے۔بالآخر ۔اسکی ہر شے ایک وقت معین تک رہ کر فنا ہو جاتی ہے۔ہم اندازہ کر لیتے ہیں کہ یہ درخت ایک ادنیٰ درجہ سے پے در پے چلکر بہت سی تبدیلیاں اختیار کرنے کے بعد ہی ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ان تبدیلیوں کے باعث یہ لازمی ہو جاتا ہے۔کہ اسکی ایک علت[1] ہو تو ہم اسکی

---

[1] علت: بنیاد۔وہ مواد جس سے کسی چیز کا وجود بنا ہو۔

علت پر نظر ڈالکر یہ معلوم کر لیتے ہیں۔ کہ اس درخت کی بنیاد ایک دانہ سے ہے۔ جو زمینی مواد کی قوت سے بڑھکر پودا بنا اور یہی پودا کچھ عرصہ کے بعد درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح جملہ مخلوق کی اشیأ کو اسکی اصل تک پہنچکر ہی پہچانا جا سکتا ہے۔ اگر ہم کسی شے کی علت پر نظر نہیں ڈالینگے تو ہمارا فیصلہ اسکی پہچان کیلئے ناقص ہوگا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اردگرد بہت سی مختلف قسم کی مخلوق ہے۔ درخت ہیں۔ پہاڑ ہیں۔ پھول ہیں۔ دریا ہیں۔ سورج ہے۔ چاند ہے۔ ستارے ہیں۔ چرند و پرند ہیں۔ اور ان میں ایک خصوصی مخلوق انسان بھی ہے۔ جب ہم اِنکی تخلیق پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر شے ایک ہیئت اختیار کئے ہوئے ہے۔ تو ضروری ہمارے دل میں سوال پیدا ہوگا کہ تمام مخلوق کیسے بنی؟ کس چیز سے بنی؟۔ جسوقت بھی ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو اسی وقت ہمارے لئے یہ لازمی ہوگا کہ ہم اسکے مستقل اور غیر مستقل ہونے کا اندازہ کریں۔ کہ آیا یہ خود بنی ہے یا اسکی اصل کچھ اور ہے۔ جہاں تک اس مخلوق کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں اسی زمین کے اندر ہیں کوئی شے بیرونی فضا سے زمین پر کود کر نہیں آئی۔ تو ہمیں یہ اندازہ کرنے میں کوئی شبہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تمام مخلوقِ ارضی اسی زمین سے پیدا ہوئی ہیں۔ انکی ہیئتوں[1] میں اگرچہ کئی طرح کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ لیکن ان تمام چیزوں کی اصل یہی زمینِ خاکی ہے۔ اور ان تمام اشیأ کی علت اسی زمین سے ہے۔ چونکہ یہ اشیأ ہمارے بالکل قریب ہیں۔ اور ہم اپنے حواس کی مدد سے انہیں پہچاننے میں غلط تصور قائم نہیں کر سکتے۔ لیکن زمین سے باہر کی اشیأ جنکا تعلق ہماری زمین سے بظاہر نظر نہیں آرہا اور جو ہم سے دور ہیں صرف ہمارے دیکھنے میں آتی ہیں مثلاً سورج۔ چاند۔ ستارے۔ اِنکی پہچان ہمیں اسی قدر ہو سکتی ہے۔ جتنی ہمارے حس ہم تک انکی اصلیت پہنچا سکتی ہیں۔ چونکہ یہ چیزیں زمین سے علیحدہ ہیں اسلئے ضروری ہے کہ زمین سے ماسوائے[2] ہی انکی کوئی

---

[1] اپناوٹوں [2] علاوہ

علت ہو۔لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ ہر شے کی ایک علت ضرور ہے۔اسلئے زمین جو خود بھی محدود ہے۔باقی فضائی مخلوق کے ساتھ اسکی بھی کوئی علت ہونی چاہیے جو اس مخلوق کی علت ہے وہ ہمارے احساسات سے اوجھل ہے۔اسلئے ہمارے حس ظاہری اس علت کو پہچاننے سے قاصر رہینگے۔اگرچہ وہ علت ہمارے احساسات سے دور ہے تاہم ہمیں اسکے وجود سے انکار نہیں ہوسکتا اسکے لئے جس قدر انسان کا ذہن وسیع اور قوی ہو اسی قدر ان اشیاءَ کی اور اسکے اصل سے واقفیت ہوسکتی ہے۔

ہمارا ذہن ہمارے حواس کے تابع ہے۔ہمارے حواس جسقدر قوی ہوں اسی قدر ہمارے ذہن کو علم ہوسکتا ہے جہاں تک ہماری آنکھیں۔ہمارے کان۔ہمارا مس (چھونا) کرنا۔وغیرہ کام کر سکتے ہیں اسی حد تک ہمارا دماغ (جو فیصلہ کرنے کی قوت رکھتا ہے اور ذہن کہلاتا ہے) ان حواس کے ذریعہ واقف ہوسکتا ہے۔جہاں ہمارے حواس دیکھنے۔سننے۔سونگھنے۔چھونے سے عاری ہوں وہاں دماغ (ذہن) بھی ان چیزوں کو محسوس کرنے سے عاری ہوگا۔جب ہم کسی شے کو دیکھینگے تب ہی ذہن اسکی ماہیت سے واقف ہوسکتا ہے۔ایک اندھے کا ذہن کسی شے کی اصل شکل و صورت کا اندازہ نہیں لگا سکتا کیونکہ اس کی آنکھیں اس چیز کی ماہیت کو اسکے ذہن تک پہنچانے سے قاصر ہیں۔اور اگر اندھا بغیر کسی ذریعہ کے خود خیالی اندازہ لگائے تو وہ اندازہ غلط ہوگا اور اسکا ذہن اس چیز کا غلط تصور کریگا۔مثلاً اگر اندھے کو کسی ہاتھی کے سامنے لا کر کھڑا کیا جائے۔تو وہ جب تک اسے نہ چھوئے وہ ہاتھی کی ہیئت کا اندازہ نہیں کر سکیگا۔اور اگر اسے ہاتھی کا سونڈھ یا لات ہاتھ میں دی جائے تب ہی وہ ہاتھی کے ہونے کا قائل ہوگا لیکن اصل ماہیت سے لاعلم ہی رہیگا۔اسلئے جب تک انسان کسی شے کو دیکھکر اسکی ماہیت سے آگاہ نہ ہو وہ اسکا صحیح تصور ذہن میں نہیں لاسکتا۔

ہمارے محسوسات اس کرۂ ارضی کی ہر شے کا ادراک[1] کر سکتے ہیں۔مگر ان اشیاءَ کا جو ہمارے دید و شنید سے دور ہیں اس کا صحیح تصور نہیں لاسکتے۔اسلئے مادی حیثیت سے انکا ادراک

---

[1] سمجھ میں آنا۔یا پہچاننا۔

ہمارے لئے غیر ممکن ہے۔ زمین چونکہ خود محدود ہے۔ اور مستقل نہیں اسلئے ضروری ہے کہ اسکی بھی کوئی علت ہو۔ جو شے خود مستقل نہ ہو بلکہ محدود ہو اسکی علت کا ہونا ضروری ہے۔ کسی شے کی اصل وعلت اس وقت تک مستقل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں لامحدودیت ظاہر نہ ہو۔ اور جس شے کی علت نہ پائی جائے وہی لامحدود ہوتی ہے۔ لیکن کسی ماوراءا ادراک علت کو ذہن میں نہ آنے کی وجہ سے ہم اسکے وجود کو عدم قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہماری قریبی اشیأ خود مستقل حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ اور یہ اپنی علت سے ہی قائم ہیں اسی طرح زمین اور دیگر محسوسات سے بعید اشیأ بھی ایک علت پر قائم ہیں۔ یہ خود مستقل نہیں ہوسکتیں۔ یہ سب تغیر پزیر ہیں۔ اسلئے انکا وجود بھی کسی بعید علت سے وابستہ ہے۔ چونکہ یہ علت بھی ہمارے احساسات سے بعید ہے۔ اسلئے ہمارا ذہن اسکو نہیں پاسکیگا۔ لیکن اسکا وجود یقینی ہے۔ کسی اندھے کو اگر سورج نظر نہیں آتا تو اسکا مطلب یہ نہیں کہ سورج کے وجود کو عدم قرار دیا جائے۔ اسی طرح اس لامحدود علت کی مستقل ہیئت کو تصور میں لانے کیلئے ہمارا ذہن کسی خاص مقام پر رک نہیں سکتا۔ کیونکہ علت ومعلول کا یہ نظام کسی ہیئت کو مستقل قرار نہیں دے سکتا۔ اور اسکے ساتھ ہی ہم ماوراأ ادراک کی وسعتوں پر مادی حیثیت سے عبور نہیں کر سکے۔ ان دو صورتوں میں دو ہی نتائج پیدا ہونگے۔ کہ ہمارے احساسات سے باہر بھی ایسا ماحول ہوسکتا ہے۔ جو اپنی وسعت میں طویل ہو۔ گو اسکا وجود ہم پا نہیں سکتے لیکن اسکا وجود یقینی ہوسکتا ہے۔ ہماری مادی آنکھ ہمارے قریب کی اشیأ کا ادراک کر سکتی ہے اور ہماری حد نظر تک ہم ہر شے کے وجود کے قائل لازمی طور ہونگے۔ لیکن ہمارے ادراک سے باہر کی اشیأ اگرچہ ہمارے حس کے احاطہ میں نہیں تو اسکا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ انکا وجود نہیں۔ کیونکہ ہمارے علمی مشاہدے میں یہ چیز آچکی ہے۔ کہ اسکے علاوہ زمین کی اتنی وسعت بھی ہے جہاں ہمارے احساسات اُن مقامات کو اپنے احاطہ میں نہیں لاسکتے۔ مثال کے طور پر ہم مشرق میں زمین کے کسی

ا ماوراأ ادراک کے معنی۔ جو ظاہری حس کے تصور میں نہ آسکے۔

حصہ پر مقیم ہیں ہماری حس میں سب سے زیادہ اہم ادراک کرنے والی قوت آنکھ ہے اسکی قوت بھی زیادہ سے زیادہ تین چار میل تک احاطہ کرسکتی ہے۔ہم مغرب کے کسی مقام کا تصور کرنا چاہتے ہیں تو اسکے لئے ہمیں اُس مقام کے وجود کا اگر چہ احساس نہیں لیکن زمین کی وسعت ہمیں اس مقام کے وجود کا یقین کرادیتی ہے کہ یہ مقام اگر چہ احساسات سے بعید ہے لیکن زمین کی وسعت اتنی بھی ہے جہاں مغرب میں ایسا مقام ضرور ہے۔اسی طرح ہم ماورأادراک ماحول کیلئے بھی اسکی علت ومعلول کی ہیئتوں میں اسکی وسعت کو محدود نہیں کر سکتے جب تک ہم اس نظام کے ایک ایسے منبع پر اپنے تصورات کو نہ پہنچا ئیں جس میں ہر معلول کی خاصیت کا تمام اور لامحدودیت کا تصور ہو۔لہذا اس نظام کی وسعت خود بخود ہمارے لئے ماورأادراک ماحول کے وجود کی دلیل ہوسکتی ہے اوراس دلیل کے قائم کرنے سے ہی ہمارے سامنے ایک علت لامحدودقوت کا تصور قائم ہو جاتا ہے گویا وہ لامحدود تصور ہی ہمارے احساسات کی روانی کو یکسر روک دیتا ہے۔جیسے ہم مادی اشیأ (حس میں آنے والی اشیأ) کے بعد اپنے احساسات مادی کو روک لیتے ہیں۔یہی تصور علت لا محدود کیلئے قائم کیا جاسکتا ہے۔جسکی قوت و ماحول کی ذہن میں کوئی شکل تصور میں نہ آسکے۔

کائنات خلقت کی ہر شے اپنے میں ضرور ایک علت رکھتی ہے۔اور حواس اس علت کو دنیا (قریب کی جگہ) میں ہی محسوس کرتے ہیں۔مگر اس دنیا کی ماہیت اسکے وجود پر ہی ختم نہیں ہوتی۔بلکہ ہمارے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوگا۔کہ جب ہر شے اس زمین سے پیدا ہوئی تو زمین کہاں سے پیدا ہوئی؟ اس سوال کیلئے ہمیں ایک اصولی قدم اٹھانا ہوگا۔جسے تجسّس یا تفکر کہیں گے۔کہ ہم اپنے ماحول کی اشیأ کا بغور مطالعہ کر کے اِنکی اصل تلاش کرینگے۔یا تو ہم ہر شے کی علت کو تلاش کرینگے۔یا اُس علت کو تلاش کرینگے جس علتِ مستقلہ سے اِن تمام اشیأ کا وجود قائم ہے۔ یعنی اگر ہم درخت کی اصل پر غور کریں۔تو ہمارے سامنے درخت کی علت دانہ ہوگی۔یا وہ علت ہو گی جس سے اسکا قدیمی وجود ظاہر ہوا۔یعنی وہ علتِ مستقلہ جس سے ہر شے کا وجود قائم ہے۔ اسکے لئے ہم اپنے وجود پر ہی مطالعہ شروع کریں تو ہم ماورأادراک کی ماہیت کا تصور ذہن میں نہ لا

سکیں گے۔ جس سے ہمارا قدم تجسّس و تفکر سے رہ جائیگا۔ یہ قاعدہ ہے!۔ کہ ایک منزل طے کرنے کے بعد جبکہ ہمارے ذہن میں کسی خاص مقام مقصود کا تصور نہ ہو۔ دوسری طویل منزل نظر آنے سے آدمی کی قوت راہ روی مدھم پڑ جاتی ہے۔ اور وہ تھک کر رہ جاتا ہے۔ برعکس اسکے ایک خاص منزل مقصود کا تصور ہماری ہر طویل منزل کی مسافت کو آسان کر دیتا ہے۔ کسی نئی سے نئی طویل منزل کا احساس ہمارے عزم کو کم کرنے کی بجائے ہمارے ولولے میں برانگیختگی پیدا کر دیتا ہے اور ہمارے قدم میں ہر نئی منزل کے آنے پر تیزی پیدا کر دیتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے۔ کہ درمیانی علتوں کا بغیر محسوس کئے جو بھی تصور ہوگا وہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم کسی غلط تصور کو لیکر اسی پر اپنے تصورات کی راہ قائم کریں۔ تو یہ راستہ غلط رخ کی طرف جا لگے گا جس سے ہم اصل کو تلاش کرنے کی بجائے گمراہ ہونگے۔ برعکس اسکے اگر ہم کسی لامحدود علتِ مستقلہ کا ابتداءً ہی تصور قائم کریں۔ تو جب تک ہم اُس تک نہ پہنچیں ہماری مسافت اسی تصور کے مقصود کی وجہ سے غلط نہیں ہو سکیگی کیونکہ اس علتِ مستقلہ کا تصور اسکی لامحدودیت پر ہی ہوگا۔ لامحدودیت چونکہ واحد ہے اسلئے کسی دوسری شکل کی طرف ہمارا رُخ ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ ہم اسکے قریب نہ پہنچیں۔ اور جب لامحدودیت کو پہچانا تو یہ خود اپنی دلیل آپ ہوگا۔

تیسرے۔ یہ کہ لامحدودیت ایک ایسی ہیئت ہے۔ جسکا دوسرا بدل ہو ہی نہیں سکتا اسلئے کسی بھی مرحلہ پر انسان دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ علاوہ ازیں۔ ہر علتِ غیر مستقل میں ایک ایک علیٰحدہ رنگ ہوگا۔ ہمارا ذہن بھی ایک ہیئت پہچانکر دوسری ہیئت کی شکل کا متلاشی رہیگا۔ اور علت مستقلہ[1] کی واحد ہیئت کو ہر معلول میں تلاش کرنے میں ذہن کو متبدّل ہیئتوں کی تلاش کی کوفت سے نجات ہو کر ایک تصور میں یکسوئی پیدا ہوگی۔ جس سے اسکی تلاش و تفکر میں بہت آسانی ہوگی۔ اور ہر علت غیر مستقلہ بھی اسی کے بہروپ میں نمایاں ہوگی۔

---

[1] علت حقیقی یا تمامی

کسی شے مخلوق کیلئے جب تک ہم ایک مستقل ولا محدود منبع کا تعین نہ کریں ہمارے مشاہدات میں روانی نہ ہوگی اس لئے ضروری ہے۔ کہ تفکر سے پہلے ہم ہر معلول کی علت پہچاننے کیلئے ایک واحد لامحدود علت کا تصور تسلیم کریں یہ ایک ایسا تصور ہوگا جو ہماری تحقیق میں خود بخود حقیقت کا انکشاف کرتا جائیگا۔ اور ہماری تحقیق صحیح تحقیق ہوگی۔ ہم ہر شے کی علت کولیکر اسکی اصل کی طرف رجوع کرینگے یہاں تک کہ ہماری تمام علتیں ایک ایسی علت پر مرکوز ہونگی جو علت ان تمام وجودوں سے بالاتر اور اسقدر وسیع الوجود ہوگی جس میں تمام کائنات کا سمانا یقینی ہوگا۔ اسکے لئے ہمارا تصور اسی قدر ہوگا کہ وہ مستقل ولا محدود علت ان تمام مخلوقی قوتوں سے بالاتر ہے۔ چونکہ ہر مخلوق ایک واحد علت کی معلول ہے۔ اسلئے وہی ان تمام قوتوں کی خالق ہوسکتی ہے۔

ہر معلول اپنی علت سے کمتر قوت کا حامل ہے۔ دانہ اپنی علت ہونے کے لحاظ سے درخت سے قوی ہے۔ کیونکہ دانہ نے تمام درخت کو اپنے میں سمایا ہے۔ برعکس اسکے درخت دانہ کو جزوی حیثیت سے اپنے میں سمانہیں سکتا۔ دانہ میں تنا۔ شاخیں۔ پتے۔ پھول اور میوہ کا وجود پایا جاتا ہے۔ مگر کسی شاخ میں تنا نہیں سما سکتا کسی پھول میں شاخ نہیں سما سکتی۔ درخت کل ہونے سے مجبور ہے۔ مگر دانہ خود بخود کُل ہے۔ اسلئے دانہ اپنی حیثیت میں کُل ہونے کی وجہ سے درخت سے قوی ہوگا۔ زمین تمام مخلوق سے قوی ہے۔ کیونکہ پہاڑ۔ درخت۔ سمندر۔ وحوش وطیور۔ ہر ذی روح اسی سے معلول ہیں۔ مگر جزوی حیثیت سے ہر مخلوق میں زمین نہیں سما سکتی۔ علاوہ ازیں ہر شے اپنے میں ایک خاصیت رکھتی ہے۔ پانی میں بجھانا۔ آگ میں جلانا۔ خاک میں پیدائش۔ چاند میں نور (روشنی) سورج میں زندگی وتپش اسی طرح مختلف اشیاً میں مختلف خاصیتیں موجود ہیں۔ ان میں کئی ایک ایسی چیزیں بھی ہیں۔ جن میں تمام اشیاً پر غالب آنیکی قوت موجود ہے۔ جیسے۔ پانی۔ ہوا۔ ایٹم وغیرہ۔ یہ سب اشیاً ایک علت کی معلول ہیں۔ معلول ہونے کی حیثیت سے اِن پر بھی غالب آنے والی قوت اِنکی علتیں ان اشیاً پر غالب ہونگی۔ سورج میں تپش ہے۔ مگر اسکی علت سورج سے قوی اور اس پر غالب آنیکی قوت اپنے اندر رکھتی ہے۔ وہ علت سورج کی خاصیتوں سے

بھی زیادہ قوی خاصیت رکھنے والی ہوگی۔اس میں۔زندگی تپش اور تابانی اس سورج سے زیادہ ہو گی۔ایٹم ایک آن میں فنا کرنے والی۔اجسام کو لمحوں میں متبدل کرنے والی طاقت ہے۔مگر اسکی علت اس سے بھی زیادہ موثر ہوگی۔اسی طرح جس علت سے یہ تمام علتیں وابستہ ہیں۔وہ ضروری ہے۔کہ ان تمام قوتوں سے بالاتر قوت کی حامل ہو۔بس یہی ایک تصور اُس علت حقیقی کیلئے کافی ہو گا جو ہمیں کسی شے کے اصل کو تلاش کرنے سے پہلے لازمی طور تسلیم کرنا ہے۔اُس خالق۔یا علتِ لامحدود کو ہمارے مادی احساسات تصور میں لانے سے قاصر ہیں۔مگر ہر معلول میں ہم اسی علت کو پاتے ہیں۔اسلئے ہر معلول کی ہر صفت اس علت لامحدود میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ہر مادی شے کی علت اپنے معلول کی نسبت اپنے میں ایک خصوصی لطافت اور قوت رکھتی ہے۔اسلئے وہ علتِ مستقلہ اپنے وجود کے اعتبار سے معلول کی ہر صفت کا خاصہ بدرجہ کمال اپنے میں رکھتی ہے۔جسکی لطافت وتابانی اسقدر قوی ہے کہ ہم اپنے مادی حواس سے اسکا عرفان (پہچان) نہیں کرسکتے۔اسکی لطافت وتابانی کا تقاضا یہ ہے۔کہ مادہ اسکے قریب ہونے پر فنا ہو جائیگا۔سورج کی تابانی وتپش کا کوئی وجود متحمل نہیں ہوسکتا۔جب تک کہ مادہ میں سورج جیسی قوت نہ پیدا ہو۔اسلئے سورج کو سورج کی سی کیفیت حاصل کرکے ہی پایا جاسکتا ہے۔اسی طرح اس خالق لامحدود کو اسکی لطافت و تابانی میں دیکھا جاسکتا ہے نہ پایا جاسکتا ہے۔جب تک مادی وجود میں وہ قوت نہ پائی جائے جو اسکے دیکھنے اور پانے کی متحمل ہو سکے۔مثال کے طور پر ہم اس چیز سے آسانی سے اندازہ کرسکتے ہیں۔کہ سورج[1] کی ذاتی تابانی وتپش اسقدر قوی ہے۔کہ دنیا کی مادی مخلوق جب اس کے قریب ہو جائے تو جل کر فنا ہو جائے اور انسان بھی اس کے قریب ہو جائے تو اسکی تابانی کو دیکھ نہ سکے گا۔بلکہ

---

[1] سائنس نے یہ چیز ثابت کی ہے کہ اس سورج سے بھی زیادہ قوی سورج فضا میں ہیں جو اس سورج سے لاکھوں درجہ طاقت وتابانی میں زیادہ ہیں اور زمین سے اسقدر دور ہیں کہ ابھی تک انکی شعاعیں زمین تک نہیں پہنچیں اگر انکی شعاع زمین پر پڑے تو زمین جلکر فنا ہو جائیگی۔(دو قرآن از غلام جیلانی برق)

دیکھنے کی قوت ضائع ہو جائیگی۔اور اسکی تپش سے جل کر خاک ہو جائیگا۔سورج کو بھی مثل زمین کے ایک مجسم چیز سمجھا جاتا ہے۔مگر اس کرّہ میں حد سے زیادہ تپش ہونے کی وجہ سے کوئی مادی شے پیدا ہو سکتی ہے۔نہ قرار پکڑ سکتی ہے۔باوجود روئیدگی اور زندگی نہ ہونے کے بھی اس میں اسکی ہیئت کے مطابق ایک لطیف اور تاباں زندگی ہے۔یعنی جو شعاعیں اس سے ہم تک پہنچتی ہیں۔وہ ایک زندہ اجسام کا مرکب ہیں۔اسکے قریب جانے سے ان ذرات کی کثرت ہم پر حملہ آور ہو کر ہمارے تمام مادی ذرات کو ہلاک کر ڈالینگے۔جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم جل کر خاک ہو جائینگے۔مگر بہت دور ہمارے ماحول تک پہنچنے میں ان اجرام (شعاعوں) کو کئی کثیف طبقوں سے گزر کر آنا پڑتا ہے اسلئے اِنکی تیزی ہم تک نہیں پہنچتی بلکہ اسی قدر شعاعیں ہم تک پہنچتی ہیں جو ہمارے لئے زندگی اور منفعت پیدا کرتی ہیں۔یعنی ہمارے سامنے ایک مترتب نظام ہے۔جس میں ہر مخلوق ایک نظام کے تحت عمل جاری رکھے ہوئے ہے۔سورج۔چاند۔ستارے۔پہاڑ۔سمندر غرض کہ کائنات کی ہر شے منظم طریقہ سے اپنی قوتوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ان میں کچھ مخلوق کمتر قوت رکھتی ہیں اور کچھ بالاتر قوت کی حامل ہے۔جب ہم انہیں ایک مرکز کی طرف منتقل کریں۔اور ان تمام اشیاءٔ کو ایک ہی علت میں سما ڈالیں۔تو لازمی طور یہ ایک آسان تصور ہوگا کہ وہ علت ان تمام قوتوں سے زیادہ تر قوت کی حامل ہوگی جس میں تابانی۔تپش۔منفعت۔مضرت۔زندگی۔موت اور اس سارے نظام (جو ہمارے ماحول میں ہماری منفعت میں مصروف عمل ہے) کا وجود سمایا ہوا ہے۔اور اس علت کا وجود ان تمام اشیاءٔ سے زیادہ روشن اور زیادہ تپش رکھنے والی ہیئت ایک عظیم کرّہ نار کی سی ہوگی۔چونکہ یہ کرّہ نار خود بھی مستقل نہیں اسلئے اسکی اصل اس سے بھی قوی تر ہوگی۔اور ایک لامحدود علت کے مقام پر یہ اپنی تابانی اور تپش میں بھی لاانتہا قوت کی حامل ہوگی۔

ہم اپنے ماحول کی اشیاءٔ کے ادراک کیلئے اپنے مادی احساسات سے اسی قدر اندازہ لگا سکتے ہیں جسقدر یہ اشیاءٔ ہمارے سامنے مادی حیثیت میں ہونگی۔اور جہاں ان میں تپش اور تابانی زیادہ ہو وہاں ہم مادی حسّیات سے انکا پورا ادراک کرنے سے عاری ہونگے۔سورج۔چاند۔

ستارے اور فضا کی دیگر مخلوق کو ہماری آنکھیں ہی دیکھ سکتی ہیں اور ہم انہیں نورانی چیزیں سمجھتے ہیں اسکے سوا انکی اصلی ماہیت سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ اور انکے ادراک کیلئے جسقدر ذرائع ہمیں مہیا ہوں اسی قدر ہم انکی ہیئتوں سے واقفیت حاصل کرسکینگے۔ مگر جو اشیاء ہمارے حدِ ادراک اور محسوسات سے بعید ہوں انکا علم ہمیں نہیں ہوسکتا۔ البتہ ہمارے ذہن اِنکی قوی ہیئتوں اور وسعت کے مطابق ضرور ایک تصور قائم کرینگے۔ جسکے لئے قطع نظر ان مختلف قوی علتوں کے ایک ہی علت مستقلہ کے وجود کا تصور کرنا ضروری ہوگا۔ اور اس علتِ لامحدود کا تصور ہمارے قریبی مخلوق کے اوصاف کے مطابق ہوگا۔ کہ وہ علتِ لامحدود تمام مخلوق کی خالق ہے۔ کیونکہ تمام مخلوق اسی علت سے ہے۔ ایک مرغی کا بچہ جب انڈے سے نکلتا ہے۔ اسے ابھی تک علم نہیں کہ میری غذا کیا ہے۔ مگر وہ دانہ دیکھکر خود بخود دانہ چگنے لگ جاتا ہے۔ یہ تحریک اور یہ علم اسے فطری طور پر حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اسکی ماں (مرغی یا مرغ) اس چیز سے فطری طور واقف ہوتے ہیں گویا بغیر علم اور بغیر سکھائے ایک فعل کا کرنا علت کی خاصیت سے تعلق رکھتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ معلول میں وہی خاصیتیں پائی جاسکتی ہیں جو علت میں موجود ہوں۔ ایک بلی جو اپنی زندگی میں پہلی دفعہ بچے دیتی ہے۔ ایک نر بلے کو دیکھکر گھبرا جاتی ہے۔ اِسے فطری طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ نر بلا میرے بچوں کو مار ڈالیگا۔ اس سے قبل اسے نر بلے کی اس ہلاکت کا تجربہ نہیں ہوتا ہے۔ نہ ہی اسے سکھایا جاتا ہے تو بلی کا یہ فعل فطری ہوتا ہے۔ کیونکہ اسکی ماں کو اس چیز سے سابقہ پڑا ہوتا ہے۔ یہی تاثیر بلی میں بھی ہوتی ہے۔ یعنی یہ بھی ایک ایسا فعل ہے جسکا تعلق علت سے متعلق ہے۔ کسی جانور کو دیکھیں جب ہرن شیر کو دیکھتا ہے تو وہ فطری طور پر شیر سے خائف ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ شیر مجھے ہلاک کر ڈالیگا حالانکہ اس سے قبل وہ شیر سے بالکل ناواقف ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک فطری تحریک ہے۔ جو اسے اپنی علت سے ورثہ میں ملتی ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر مخلوق میں جو بھی خاصیتیں پائی جاتی ہیں وہ من کل الوجود اِنکی علتوں میں ہوتی ہیں اور جب ہم علتِ لامحدود کا تصور کریں تو لازمی طور تمام مخلوق کی خاصیتیں اسی علت لامحدود سے وابستہ ہیں اور وہ علت لامحدود ان تمام اوصاف کی

بدرجہ اتم حامل ہوگی۔ جہاں ایٹم کی قوت لطیف و غالب ہے وہاں وہ علت لامحدود بھی بدرجہ اتم ایسی صفت کی حامل ہوگی۔ جہاں سورج اور بجلی کی کڑک تابانی و تمازت میں قوی اور غالب ہے وہاں علت لامحدود بھی بدرجہ اتم قوی و غالب ہوگی۔ جہاں انسان میں رحم۔ارادہ۔فعل قدرت بحدِ مقدور۔غلبہ۔پایا جاتا ہے وہاں علت لامحدود میں بھی یہ اوصاف بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ جہاں ہوا اور ایتھر میں وسعت اور احاطہ کی قوت ہے وہاں علت لامحدود میں بھی یہ اوصاف بدرجہ اتم ہونے یقینی ہیں۔ چونکہ ہر مخلوق خود معلول ہے اور ہر علت خود معلول ہے اسلئے علت لامحدود اپنی لا محدودیت کے لحاظ سے قائم اور باقی۔ کمزوریوں سے مبرا ہوگی۔لہذا۔علت لامحدود ہی ہر شے کی خالق ہونے کا درجہ رکھتی ہے۔اور ہر شے کی جملہ صفات کے مقابلہ میں علت لامحدود میں تمام اوصاف مستقل اور غیر فانی ہونگے۔ایسی صورت میں ان تمام صفات کی خالق بھی علت لامحدود ہی ہوسکتی ہے۔ ہر علت چونکہ خود معلول کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔معلول ہونے کی صورت میں یہ خود اپنے آپکو پیدا نہیں کرسکتی بلکہ اسکی پیدائش بھی فطری طور ایک مستقل علت سے وابستہ ہے۔ اسلئے ہر علت غیر مستقل کے مقابلہ میں ایک علت مستقل ہی ہر علت کی جملہ صفات اور خود خالقیت کی حامل ہوسکتی ہے۔ جبکہ اس علت کا کوئی بنانے والا نہیں بلکہ تخلیق کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ اسلئے انسانی ارادۂ وقدرت کی صفات اور ہر مخلوق کی صفات کی اصل ہونے کی حیثیت سے وہ علت لامحدود خود خالق ہے۔اس لئے علتِ لامحدود میں۔زندگی۔موت۔منفعت۔مضرت۔لطافت۔ دوام۔اور تمام نظام کا ضبط اور ارادہ موجود ہے۔اور وہ پیدا کرنے والا ہے۔وہ موت دے سکتا ہے۔ وہ نفع پہنچاتا ہے۔وہ نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔وہ آرام دے سکتا۔وہ تکلیف دے سکتا۔وہ بیمار کر سکتا ہے۔وہ اچھا کرسکتا ہے۔وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ چونکہ ہر شے مخلوق میں ایک ارادہ بھی کام کرتا ہے اور خصوصاً انسان میں بھی۔اسلئے ہر صفت اسکے ارادہ سے تعلق رکھتی ہے۔کہ جو کچھ بھی نظام کائنات میں عمل ہورہا ہے۔اسی علت لامحدود۔خالق کے ارادہ سے ہوتا ہے۔وہ خالق ہر شے پر قادر ہے۔ ہر شے اسی کے ارادہ میں مقید ہے۔وہ ازل سے ابد تک

ہے۔وہ محیط ہے۔اسکی لامحدودیت ہی اس بات کی دلیل ہے۔کہ وہ اول ہے۔آخر ہے۔قائم ہے۔محیط ہے۔حی وقیوم ہے۔اُسکا ارادہ جس چیز کیلئے کُن (ہوجا!) کہتا ہے وہ شے ہوجاتی ہے۔

ہمارے لئے نظامِ کائنات میں تفکر کیلئے ایک خوبصورت کڑی (تسلسل) موجود ہے ۔جب ہم تفکر کرنا چاہیں۔تو ہم اپنے ماحول اور اپنی ذات پر نظر ڈالیں۔کہ ہماری زندگی کا تسلسل کس چیز پر ختم ہوتا ہے۔اور اس تسلسل کا مترتب نظام اس خوبصورتی سے واقع ہوا ہے۔کہ ہمیں اسکی اصل کا تصور کرنے میں کسی دقت ودشواری کا سامنا کرنا ہی نہیں پڑتا۔ذرا غور سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق ایک معلول کی حیثیت میں ہے۔اور ان میں مختلف قسم کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔یہ اوصاف اور خود معلول ایک ہی علت سے پیدا ہوئے ہیں۔تو اس علت لامحدود (جو اس تمام مخلوق کی اصل ہے) کا تصور ہمارے سامنے آسانی سے آسکتا ہے۔اور ہمارے ذہن خود بخود اُسی اصل کی طرف ہی رجوع ہوجاتے ہیں۔جس کا تسلیم کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ایسی صورت میں اس عقیدہ میں شبہ کرنے کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔کہ وہ سمیع (سنتا ہے)۔بصیر (دیکھتا ہے) رحیم۔رحمٰن۔جبار۔قہار وغیرہ ہے۔جبکہ یہ اوصاف مخلوق میں بھی پائے جاتے ہیں۔تو اس علت لامحدود میں بھی بدرجہ اتم ولا انتہا پائے جاتے ہیں۔

جب تک ہمارے ذہن میں کسی مخلوق کی اصل کا تصور قائم نہ ہو۔ہم اسکی پہچان کیلئے کوئی قدم اٹھا نہیں سکتے۔اور ہم نے ہر معلول میں ایک علتِ لامحدود کو تلاش کرنا ہے ـــــ وہ محسوسات سے دور ہے۔ہم مادی حسّیات سے اُسے پہچان نہیں سکتے۔اور نہ ہی ہم اس علتِ لا محدود تک پہنچ سکتے ہیں۔ہم اسکی ذات کا تصور نہیں کرسکتے جب تک کہ ہم کسی خاص ذریعہ کسی خاص راہنمائی کسی خاص علم کو حاصل نہ کریں۔چونکہ وہ مجسمہ لطافت وتابانی ہے۔اسلئے اس تک پہنچنا مادی کیفیت سے نہ ہوگا بلکہ لطیف قوت کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔اور صفاتی (جمع صفت) حیثیت سے ہمارا تصور اسی عقیدہ سے ہوگا کہ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (پارہ ۷ سورۃ ۶ آیت ۷۹)۔یعنی تحقیق سے پہلے ہم ایک مستقل لامحدود خالق کا تصور

کرتے ہیں جسکی علت سے جسکے ارادہ سے تمام زمین و آسمان کی تمام مخلوق معلول ہے۔ گو ہم اسے حقیقی طور پر تصور میں نہیں لا سکتے۔ تاہم ایک لامحدود ہستی ہے۔ جو اس تمام مخلوق کی علت و خالق ضرور ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے۔ جسکے لئے ہم ایک مستقل ٹھوس شکل ذہن میں پیدا کرنے سے عاری ہیں۔ لیکن اسکے قوت و غلبہ کی عظمت و جلال ہمارے دلوں پر ضرور طاری رہیگا۔ جب کہ ہم اپنے ماحول کی اشیأ میں ایک عظیم الشان تابانی و جلال ایک خوبصورت نظام دیکھ رہے ہیں۔ تو اس خالق کی عظمت و جلال اصل ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ ہوگا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان جب تک ایک علت لامحدود کے وجود کو تسلیم نہ کرے۔ اسوقت تک انسان اپنے مقصد کی تلاش میں صحیح قدم نہیں اٹھا سکتا۔ جہاں تک مادی ادراک کا تعلق ہے۔ ہم بغیر کسی خاص ذریعہ[۱] کے اپنے ماحول کی اشیأ کی علت و معلول کا بھی ادراک نہیں کر سکتے۔ اور جہاں ماورأ ادراک لطیف قوتوں کا تعلق ہے۔ وہاں ہم لطیف احساسات سے ہی انکا ادراک حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے۔ کہ جس شے کے وجود کو ہم پا نہیں سکتے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہم ہر شے میں ایک علت کو ضرور پاتے ہیں۔ اور ہر معلول کا وجود کسی خاص علت سے قائم ہے۔ اس تسلسل کو جب تک ہم انجام تک نہ پہنچائیں۔ ہم کسی شے کے وجود کو عدم قرار نہیں دے سکتے۔

ہمارے پس پردہ بہت سی لطیف قوتیں ہیں جنہیں ہم دیکھ نہیں سکتے۔ جنکے وجود ایک دوسرے سے قوی تر ہیں۔ اور ہر وجود کی کیفیت کو ایک تمثیلی نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلئے ماورأ ادراک مخلوق میں کئی ایک ایسے وجود بھی ہو سکتے ہیں جو ایک مقام اور ایک ہیئت ضرور رکھتے ہیں۔ چونکہ یہ مادہ سے ماورأ ہیں اسلئے انکے وجود بھی نورانی ہیں۔ اور ان تمام ہیئتوں سے بالاتر قوت جب اپنی لامحدودیت تک پہنچتی ہے۔ تو اس کیفیت کو اللہ کے تمثیلی نام سے پکارا جاتا ہے۔ جسکے

---

[۱] آلات سائنس

لئے ہر قوم ہر ملک میں اپنی زبان کے نام سے پکارا گیا ہے جیسے ۔الہٰ ۔ الٰہیات ۔ ولہ ۔ گاڈ ۔ بھگوان ۔ خدا وغیرہ ۔ مگر یہاں لفظ اللّٰہ کا خصوصی طور پر استعمال اسلئے کیا گیا ہے ۔ کہ یہ زبانِ عربی کا نام ہے ۔ اور گزشتہ قوموں کی زبانوں کا نچوڑ (مشتق) ہے ۔ نیز باقی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں اس عربی زبان کے نام میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اللہ کی لامحدودیت کے تصور کیلئے ہونی چاہیں ۔ یعنی اللّٰــہ اُس ہستی (علتِ لامحدود کیفیت) کا نام ہے ۔ جس کی لامحدودیت کے بارے میں اگر سوچا جائے ۔ اُسکی ذات کا تصور کرنے کیلئے ۔ کہ وہ کیا ہے؟ کتنا وسیع ہے؟ کب سے تھا؟ کب تک رہیگا؟ کہاں سے آیا؟ اور جب اسکی لامحدودیت میں اپنے تخیل کی پرواز کی جائے تو انسانی ذہن بے بس ہو کر حیرت و درماندگی میں پڑ جائیگا ۔ کیونکہ اسی شے میں انسان عقل کو ٹھکانے لگا سکتا ہے جسکے لئے ایک حد اور ایک مقام معین واقع ہو ۔ لیکن جسکی حد نہ ہو ۔ جسکا مقام نہ ختم ہونے والا ہو اسکی حد ڈھونڈنے میں عقل بے بس ہی رہیگی ۔ اسلئے لفظ اللّٰہ کے نام میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جو اللہ کی لامحدودیت میں اسکی ذات کے لحاظ سے بغیر ابتدا و انتہا کے ہیں ۔ اور صفات کے لحاظ سے ہر مخلوق میں پائی جاتی ہیں ۔ جبکہ اللہ کی ابتدا نہ انتہا نہ ہو اسکی ذات سے کوئی جگہ خالی نہ ہو تو ہر شے جو مخلوق ہے ۔ صفاتی رنگ میں اسی کی ذات سے وابستہ ہے ۔ اور وہ علتِ مستقل لامحدود ہونے کی حیثیت سے ہر اس صفت کی بدرجہ اتم حامل ہے ۔ جو تمام کائنات میں پائی جاتی ہیں ۔ ایسی صورت میں جبکہ سوائے اللہ کے کوئی دوسری شے نہ تھی ۔ اللہ ایک مستقل عظیم الشان قوت تھی ۔ تو وہ علت خود بخود جاری ہونے پر مجبور نہیں ہو سکتی جب تک کہ کوئی دوسری طاقت اسے نہ چلاتی ۔ اسلئے یہ خیال ہی عبث و فضول ہے کہ ہر مخلوق خود بخود پیدا ہوئی البتہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے اس نظام کائنات کو اس ترتیب سے خود چلایا کہ ایک بار ارادۂ ازلی میں ایک جہاں کا تصور آیا ۔ اور کہا ''کــــن''[1] اور کن سے ہر شے کا اجراً شروع ہوا چونکہ ہر نظام میں ایک خوبصورت

---

[1] ہو جا

ترتیب و تنظیم ہے اسلئے ضروری ہے کہ اس بناوٹ میں ایک ابتدائی ارادہ ہو یعنی یہ تمام مخلوق ایک مکمل نقشہ کے مطابق بنتی جا رہی ہے جو نقشہ علتِ لامحدود نے اپنے ارادہ میں اولاً قائم کیا ہے۔ اب جو صفات ذات باری تعالیٰ میں سمائی ہیں انکا ہی وجود ظاہر ہوتا جا رہا ہے۔ گویا یہ تمام مخلوق اسی علت لامحدود کی بنیاد پر قائم ہے۔ جو اپنی ابتدا میں لا ابتدا ہے۔

مثال کے طور پر ''کن'' کہا کہ دانہ ہوا۔ اب دانہ زمین میں ہے۔ بغیر کسی الٹ پھیر کے پھٹتا ہے۔ ہیئت بدلتا ہے۔ نازک پودا خود بخود بن رہا ہے۔ مضبوطی خود بخود آ رہی ہے۔ تنا بن رہا ہے۔ شاخیں خود بخود بن رہی ہیں۔ پتے خود بخود نکل رہے ہیں۔ پھول اور میوہ خود بخود بن رہے ہیں۔ خزاں میں اسکی تمام رونق فنا ہوئی۔ بہار پھر اس پر نکھار لاتی ہے۔ یہ سب خود بخود ہو رہا ہے۔ کسی کے الٹ پھیر کی ضرورت نہیں۔ مگر دو باتیں اہم ہیں جن کو تسلیم کرنا ہے۔ کہ یہ تمام تبدیلیاں ایک علت میں موجود تھیں اگر نہ ہوتیں تو ہیئتوں کی تبدیلی واقع نہ ہوتی۔ یعنی اگر علت میں معلول کا وجود نہ ہو۔ تو معلول کا خود بخود وجود میں ظاہر ہونا ناممکن ہے۔ اسلئے جس علت سے یہ مخلوق معلول ہے وہی اسکی خالق ہے۔ چونکہ وہ مستقل ہے۔ اور اس علت پر کوئی دوسری قوت مسلط نہیں بلکہ وہ خود مسلط ہے۔ اسلئے وہ خود بخود نہیں جاری ہو سکتی۔ وہ خود مجبور نہیں ہو سکتی بلکہ مکمل ارادہ رکھتی ہے۔ جس ارادہ سے اسنے مخلوق کو پیدا کیا۔ دوسرے ہر شے میں ایک باقاعدہ تنظیم و ضبط ہے۔ تنظیم و ضبط ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ایک مستقل قوت کے ارادہ ہی سے یہ نظام خود بخود چلنے لگا۔ اگر اس مستقل خالق کا ارادہ نہ ہو تو نظام کائنات کی تنظیم اور اسکا وجود نہیں ہو سکتا ہے۔ اسلئے یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ جو کچھ اللہ کی ذات میں سمایا ہے وہی خوبیاں مخلوق میں پائی جاتی ہیں۔ اگر اللہ میں مخلوق کی کسی قوت کو کم یا عدم سمجھا جائے تو اس سے مخلوق کا وجود پیدا نہ ہو سکیگا۔ اور نہ ہی اللہ کا وجود مستقل قرار دیا جائیگا۔ جس سے تمام مخلوق کا وجود قائم ہے۔ جیسے دانہ میں کسی خاصیت کی کمی درخت کے وجود کو کالعدم کر دیتی ہے۔ اور خود دانہ بھی اپنی خاصیت نہ ہونے کے باعث عدم ہو جائیگا۔ دانہ میں اگر شاخ یا پتوں کا مواد موجود نہ ہو یا کسی اور جز کا مواد موجود نہ ہو دانہ

درخت بننے سے قاصر ہوتا ہے۔دانہ میں اگر پتوں کا مواد نہ ہوتو درخت میں پتے نہ لگیں۔چونکہ یہ صفت درخت میں موجود ہے اسلئے پتے کا ہونا لازمی ہے کیونکہ درخت کیلئے ایک نظام کے تحت پتوں کا ہونا ضروری ہے ورنہ پھل پیدا نہ ہوگا۔اگر اللہ میں رحم نہ ہوتو کوئی شے کسی شے کیلئے فائدہ مند نہیں ہوسکتی سورج کی گرمی نقصان ہی پہنچائیگی نفع نہیں پہنچا سکیگی۔بجلی کی کڑک بجائے فصلوں کی ترقی کے ہلاکت ہی پیدا کریگی۔اگر اللہ میں ضبط ونظم نہ ہوتو ہر شے میں افراط وتفریط ہو۔ انسان۔حیوان ہر شے میں خلط ملط بے ضابطگی اور فنا بغیر تعین کے واقع ہو۔چونکہ کائنات قائم ہو چکی ہے۔اور ہر شے میں ایک خوبصورت نظام پایا جاتا ہے۔کسی شے میں کوئی خامی کوئی نقص واقع نہیں۔اسلئے اللہ کا وجود بہ ہمہ اوصاف اس کائنات کی صفات کے مطابق تسلیم کرنا پڑیگا۔

ہر انسان دین و مذہب سے علیحدہ رہ کر بھی اپنی ذات اور کائنات پر تفکر کرنے کا مادّہ رکھتا ہے۔مگر اسکا تجسس اسی حد تک کامیاب رہ سکتا ہے۔جہاں تک وہ اصل کو پہچاننے میں مادی حیثیت سے استعداد رکھتا ہو۔انسان کیلئے دنیا میں رہ کر چلنے کیلئے ایک سمت مقرر کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ کائنات یا اپنی زندگی پر تفکر نہ کرے۔تو اسکی زندگی بغیر کسی نکتہ کے بے مقصد ہو کر رہ جائیگی۔ اسکا چلنا۔پھرنا۔اٹھنا۔بیٹھنا۔کھانا۔پینا۔مثل دیگر حیوانات کے ہوگا۔جن کا کام صرف صبح سے شام تک سوائے آوارہ پھرنے اور خوراک کی تلاش اور بوجھ اٹھانے کے اور کچھ نہیں۔مگر عام مخلوق میں انسان ایک خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں عقل وشعور ہے۔خود ارادے کا مالک ہے۔جو چاہے کرسکتا ہے۔اپنے فائدہ اور نقصان کو اچھی طرح عقل سے سمجھ سکتا ہے۔اور نفع کو لے لیتا ہے۔اور نقصان سے محفوظ ہو جاتا ہے۔عام مخلوق کے مقابلہ میں اسکے ذرائع وسیع ہیں۔عام مخلوق ایک خاص نظام میں مجبور ہیں۔اس کے برعکس انسان ہر چیز پر خود قادر ہے۔کوئی پابندی نہیں۔ باقی مخلوق کے مقابلہ میں انسان میں کئی ایک خوبیاں ایسی ہیں جو عام مخلوق میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ تحقیقاتی اصول سے یہ ثابت ہو چکا ہے۔کہ انسان تمام مخلوقات کے جواہر کا مرکب ہے۔انسان شعور اور خود ارادیت کے لحاظ سے تمام مخلوق میں اشرف ہے۔کائنات کی تمام اشیاً سے انسان ہی

مفاد حاصل کرتا ہے۔ اسلئے انسان باقی مخلوق سے افضل اور اشرف المخلوقات ہے۔ ہر مخلوق انسان کے ہی سامان ربوبیت[1] کیلئے شب و روز مصروف ہے۔ تو ضروری ہے کہ انسان کی پیدائش کسی خاص مقصد کیلئے ہی ہو۔ اور ان تمام مخلوق میں انسان کا کام خوراک حاصل کرنا نہیں۔ بلکہ اس سے علاوہ کچھ بالاتر مقصد کا حصول ہوگا۔ اگر کائنات خود بخود ہوتی تو اس میں ہر شے ایک ہی رو میں بہے جاتی۔ کسی کی خصوصیت اور کسی کی کمتری کا سوال ہی نہ ہوتا۔ مگر یہاں اللہ کا ارادہ کام کرتا ہے۔ اس نے ارادہ سے کائنات کو بنایا۔ پھر کائنات میں انسان کو افضل درجہ پر پیدا کیا تو انسان کی پیدائش ہی مقصود ہوئی اور انسان کی پیدائش اور اسکے لئے یہ انتظام ثابت کرتا ہے کہ اللہ نے انسان کو کسی خاص مقصد کیلئے پیدا کیا۔

اسلئے انسان کے لئے زندگی کا ایک نصب العین ہونا ضروری ہے۔ وہ نصب العین یہی ہے۔ کہ ہم اپنی ذات کی پیدائش اور کائنات کی پیدائش پر تفکر کر کے اپنے اصل اور اپنے خالق کو پہچانیں۔ وہ پہچان اس لئے کہ وہ کیسا خالق ہے جس نے تمام کائنات کو صرف انسان کی خاطر ہی پیدا کیا۔ اسلئے تفکر ـــــ اور تفکر کے بعد پہچان۔ اور پہچان کے بعد اسکے احسان کا ذکر کر کے مشکور ہونا ـــــ یہ انسان کا نصب العین ضروری ہے ـــــ

انسان کیلئے لازمی ہے۔ کہ وہ ہر شے کو اسکی باریکی میں پہچانے۔ اسکے اصل و خالق کی تلاش کرے۔ اس تلاش میں ایک نتیجہ مرتب ہوگا۔ جس سے ہم اپنی فوقیت اپنی برتری کو جانینگے۔ اپنی برتری کو محسوس کرنے کے بعد ہمیں اپنی انسانیت کی ذمہ داریاں ہم پر واضح ہونگی۔ عام مخلوق کے مقابلہ میں ہمارے لئے تمام سامان زندگی بہتر صورت میں مہیا ہے۔ تو اسکے سوا وہ کون سا کام ہے۔ جسکے لئے ہمارا وجود موجود ہوا۔ ہمارا رخ کس طرف کو ہونا چاہیے۔ ہمارا انجام کہاں اور کیسے ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگی کے سامان سب اس مخلوق سے مہیا کئے جاتے ہیں۔ سورج

---

[1] ربوبیت کے معنے پالنے کے سامان۔ زندگی کے نظام کو قائم رکھنے کیلئے اسکے تمام سامان کا فراہم کرنا۔

سے زندگی۔ پانی سے روئیدگی۔ ہوا سے ہمارا قرار۔ ہر شے ہماری ضرورت کے مطابق ایک ایک اندازہ کے ساتھ مل رہی ہے۔ کسی شے کی زیادتی ہمارے لئے مضر ہے۔ مگر ہمارے لئے اسکی مضرت کو منفعت میں پہنچانے کیلئے بھی کئی مخلوق کام کررہے ہیں۔ غرضیکہ اسی مخلوق سے ہماری زندگی کا سامان وابستہ ہے۔ اسلئے کہ انہیں کے جواہر کا مرکب سے انسان بنا ہوا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی زمانہ سے کائنات میں ہمیشہ تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں گزشتہ زمانے کی مخلوق ہمارے سامنے نہیں۔ بلکہ اپنی ہیئت کو فنا کر چکی ہیں۔ اور ہر شے ایک انجام کی طرف جارہی ہے۔ کائنات کی ہر شے ایک ابتدأ سے پیدا ہوکر ایک انجام پر فنا ہوجاتی ہے۔ باقی مخلوق غیر اختیاری طور پر بنتی بگڑتی ہیں اور کسی نظام میں مجبوراً مقید ہوکر پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں۔ انسان ان چیزوں میں انہیں کی طرح پابند ہے۔ ایک نظام میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک وقت مقررہ تک رہ کر فنا ہوجاتا ہے۔ اس طرح ہر شے کا اپنا کام خودبخود پورا ہوجاتا ہے۔ مگر انسان چونکہ خود مختار ہے۔ اس میں ہر نفع ونقصان کی تمیز کیلئے ایک اختیاری شعور دیا گیا ہے۔ اسلئے اسنے اپنی ترقی کی راہیں خود طے کرنی ہیں۔ اسکا کام عروج کی طرف جانا ہے۔ اور یہ کام ہمیں تفکر کی ابتدأ سے ہی مل سکتا ہے۔ جب ہم اپنے وجود کی ہیئت ترکیبی پر نظر ڈالینگے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم ایک مادۂ خاکی سے مثل دیگر مخلوق کے پیدا ہوئے مگر ترقی نے ہمیں۔ اس مقام پر پہنچایا۔ کہ ہم اس تمام مخلوق سے بالاتر ہو گئے۔ یہ ترقی کس سبب سے ہوئی کہ ہم انسان کی صورت میں پیدا ہوئے۔ ہمیں وہ خاصیتیں حاصل تھیں جو ہمارے وجود کو ان تمام مخلوقات پر سبقت دے گئیں۔ کیونکہ ہماری زندگی کا مقصود **واصل الی الاصل** تھا۔ اسلئے آئندہ آنے والا زمانہ میں جو اس دنیا کے ختم ہونے پر آنے والا ہے۔ ہمیں اپنے نصب العین کی تکمیل کے ساتھ پورے طور تیار رہنا چاہیے۔ ہمارا تجسس ہمارا تفکر اسی لئے ہو کہ ہم ایک معین وقت تک اپنے مقصد کو پورا کریں۔ اور ہماری فنا کے بعد جب ہم ایک نئے ماحول میں (جو لطیف اور نورانی ماحول ہوگا) داخل ہونگے تو ہم اس ماحول میں کامیابی کے ساتھ پورے اتر سکیں۔ ہماری زندگی کے نصب العین میں جو نتیجہ اخذ ہونے والا ہے وہ یہی

ہے۔ کہ ہم تفکر کریں تجسس کریں مقصد کی تلاش میں انجام واصل کو حاصل کریں۔ اور عدم تعمیل میں ہم اپنے فرائض سے کوتاہی کرینگے ہم اپنے مقصد کو بھول جائینگے اور ہم اپنے اصل کو نہ پاسکینگے۔ جسکا نتیجہ ہمیں راحت وعذاب کی صورت میں دیکھنا ہوگا۔

انسان اپنی زندگی میں جو کچھ بھی حرکت (عمل) کرتا ہے۔ اسکا ایک نتیجہ ضرور ہوتا ہے۔ ان حرکات میں دو قسم کے عمل ۱ ہوتے ہیں۔ ایک اچھے (اعمال نیک) دوسرے برے (اعمال بد) اعمال نیک سے مراد وہ عمل ہیں جو نظام کائنات کے عروجی نظام کے ماتحت ترقی وعروج میں ممد ومعاون ہوں۔ یعنی نظام کائنات اور انسان کی ترقی (اصل کی تلاش) میں بہتر نتیجہ پیدا کریں۔ اور اعمال بد سے مراد وہ عمل ہیں جو مشیت الٰہی کے خلاف ہوں۔ جو نظام کائنات کی خوبصورتی میں برہمی پیدا کریں جو بجائے ترقی کے زوال کی طرف لے جائیں۔ ان ہر دو اعمال کا تعلق انسان کے ساتھ ہے۔ اسلیئے ان ہر دو اعمال کے نتیجہ کا اثر انسان پر زیادہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دانہ بویا جاتا ہے نتیجتاً پودا ہو جاتا ہے۔ لکڑی جلانے کا نتیجہ آگ ہوتا ہے۔ پانی سے آگ بجھانا۔ کھانا کھانے سے توانائی۔ لباس سے زینت ہوتی ہے۔ سواری پر چڑھنا۔ مسافت میں آسانی وغیرہ ہر فعل میں ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر چند ایک ایسے بھی افعال ہیں جنکا بظاہر کوئی نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔ مثلاً سچ بولنا۔ کسی بھوکے کو روٹی کھلانا۔ کسی ڈوبتے کو بچانا۔ یا چوری کرنا۔ قتل کرنا۔ جھوٹ بولنا۔ کسی کو دھوکہ دیکر مال حاصل کرنا۔ زنا کرنا۔ شراب پینا وغیرہ ایسے افعال ہیں جنکا کوئی نتیجہ سامنے نظر نہیں آتا ہے۔ مگر ان افعال کا بھی ایک نتیجہ ہے۔ جسکا تعلق ہماری ایک خاص قوت ۲ سے ہے۔ جیسے ان افعال کا نتیجہ ظاہر نہیں اسی طرح وہ قوت بظاہر محسوس نہیں ہوتی۔ اور وہ ہمارے وجود میں ایک لطیف جوہر ۳ کی حیثیت رکھتی ہے جسے ''روح'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ روح کے معنی جوہر کے ہیں۔ یہ بھی ایک وجود کی سی ہیئت رکھتا ہے۔ جسکے ہونے سے ہی انسان پر اسکے ہر فعل

۱، ۲، ۳ اسکی تشریح آگے آئیگی۔

ہے۔کہ ہم تفکر کریں تجسّس کریں مقصد کی تلاش میں انجام واصل کو حاصل کریں۔اور عدم تعمیل میں ہم اپنے فرائض سے کوتاہی کرینگے ہم اپنے مقصد کو بھول جائینگے اور ہم اپنے اصل کو نہ پاسکینگے۔ جسکا نتیجہ ہمیں راحت وعذاب کی صورت میں دیکھنا ہوگا۔

انسان اپنی زندگی میں جو کچھ بھی حرکت (عمل) کرتا ہے۔اسکا ایک نتیجہ ضرور ہوتا ہے۔ان حرکات میں دو قسم کے عمل ۱ ہوتے ہیں۔ایک اچھے (اعمال نیک) دوسرے برے (اعمال بد) اعمال نیک سے مراد وہ عمل ہیں جو نظام کائنات کے عروجی نظام کے ماتحت ترقی وعروج میں ممدومعاون ہوں۔یعنی نظام کائنات اور انسان کی ترقی (اصل کی تلاش) میں بہتر نتیجہ پیدا کریں۔ اور اعمال بد سے مراد وہ عمل ہیں جو مشیت الٰہی کے خلاف ہوں۔جو نظام کائنات کی خوبصورتی میں برہمی پیدا کریں جو بجائے ترقی کے زوال کی طرف لے جائیں۔ان ہر دو اعمال کا تعلق انسان کے ساتھ ہے۔اسلئے ان ہر دو اعمال کے نتیجہ کا اثر انسان پر زیادہ ہوتا ہے۔مثال کے طور پر دانہ بویا جاتا ہے نتیجتاً پودا ہو جاتا ہے۔لکڑی جلانے کا نتیجہ آگ ہوتا ہے۔پانی سے آگ بجھانا۔کھانا کھانے سے توانائی۔لباس سے زینت ہوتی ہے۔سواری پر چڑھنا۔مسافت میں آسانی وغیرہ ہر فعل میں ایک نتیجہ ہوتا ہے۔مگر چند ایک ایسے بھی افعال ہیں جنکا بظاہر کوئی نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔ مثلاً سچ بولنا۔کسی بھوکے کو روٹی کھلانا۔کسی ڈوبتے کو بچانا۔یا چوری کرنا۔قتل کرنا۔جھوٹ بولنا۔کسی کو دھوکہ دیکر مال حاصل کرنا۔زنا کرنا۔شراب پینا وغیرہ ایسے افعال ہیں جنکا کوئی نتیجہ سامنے نظر نہیں آتا ہے۔مگر ان افعال کا بھی ایک نتیجہ ہے۔جسکا تعلق ہماری ایک خاص قوت ۲ سے ہے۔ جیسے ان افعال کا نتیجہ ظاہر نہیں اسی طرح وہ قوت بظاہر محسوس نہیں ہوتی۔اور وہ ہمارے وجود میں ایک لطیف جوہر ۳ کی حیثیت رکھتی ہے جسے ''روح'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔روح کے معنی جوہر کے ہیں۔یہ بھی ایک وجود کی سی ہیئت رکھتا ہے۔جسکے ہونے سے ہی انسان پر اسکے ہر فعل

۱،۲،۳ اسکی تشریح آگے آئیگی۔

کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔یہی وہ قوت ہے۔جسکی بدولت انسان کو عام مخلوق کے مقابلہ میں برتری حاصل ہے۔اوراسی جوہر(روح)کے ذریعہ انسان پر اصل(خالق لامحدود)کی تلاش لازم آتی ہے۔یہ ایک ایسی لطیف ونورانی قوت ہے کہ اگر اسے اعمال حسنہ سے جلادی جائے تو انسان اسی قوت کے ذریعہ ماورأادراک کا تصور کرسکتا ہےاور ماورأادراک لطیف اور حددرجہ قوی قوتوں کا عرفان کرنے کا متحمل ہوسکتا ہے۔ورنہ اگر انسان میں یہ جوہر(روح)موجود نہ ہوتو انسان پر اسکی اصل اور خالق لامحدود کے عرفان کی ذمہ داری عائد ہوہی نہیں سکتی۔کیونکہ جب تک انسان کے پاس ایک ایسی قوت نہ ہو جو ایسے عظیم الشان اصل علتِ لامحدود کو دیکھے۔پہچانے۔پائے۔تو انسان کے پاس کیا ذریعہ ہوسکتا ہے؟اسلئے بغیر اسکے انسان کسی خاص کام کا ذمہ دارنہیں ہوسکتا ـــــ چونکہ انسان پر ہرحال میں ایک خصوصی ذمہ داری ہے! ـــــ اسلئے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کیلئے وہ ذریعہ اوروہ سامان بھی دیا گیا جسے روح کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔انسان کے ہرفعل نیک وبد سے یہی روح متاثر ہوتی ہے۔جس قدر انسان افعال حسنہ کرتا ہے روح متجلأ ہوتی ہےاور ماورأادراک کا عکس اس پر صاف آنے لگتا ہے۔اور جس قدر انسان سے افعال بد کا ارتکاب ہوتا ہے۔روح پر زنگ آجاتا ہے جس سے وہ ماورأ کا ادراک کرنے سے قاصر رہ جاتا ہےاور نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اپنے اعمال کے مطابق ہی اپنی منزل سے دوروںزدیک ہونگے۔اگر ہم نے اپنی روح کو اعمال حسنہ سے جلادی تو ہم میں اپنے اصل کو پہچاننے کی صلاحیت پائی جائیگی اور ہم اپنے اصل سے ہمکنار ہونگے۔اس دنیوی زندگی میں اگر ہم نے اپنے فرائض کی تکمیل میں کوتاہی کی تو آئندہ آنے والے ماحول میں جو اس ماحول سے لطافت وتابانی میں کہیں زیادہ قوی ہوگا ہمیں اپنے وجود کے مطابق اس ماحول میں راحت وعذاب ہوگا۔ہمارے اعمال کیا ہوں۔انکا طریق کیا ہوگا۔یہ سب ہمیں طریق تفکر میں مل سکتا ہے۔

ابتدائی دور میں جبکہ علم سے ہمارا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ہم کائنات کی ہر شے کو دیکھ سکینگے۔ مگر اسکے ماضی حال ومستقبل سے قطعی بےخبر ہونگے۔اگر خیالی تصور بھی ہم انکے لئے قائم کریں۔

تو وہ بھی ہمارے سامنے اصل کو پیش نہ کرسکیگا۔ جب تک کہ گزشتہ واقعات کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ اس کا علم ہمیں گزشتہ مخلوق (انسان) کے واقعات سے ہوگا۔ کہ ہر شخص نے اپنے اور کائنات کے تفکر میں کیا قدم اٹھایا۔ اس طرح ہمارے سامنے گزشتہ زمانے کے واقعات کا ایک علم ہوگا جسے تواریخ عالم کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور تواریخ کے مطالعہ سے ہم اُنکے نظریات اور عقائد کا مطالعہ کرینگے۔ کہ کس شخص نے تفکر میں کونسا قدم اٹھایا۔ اور کیا نتیجہ اخذ کیا ـــــ کونسا نتیجہ صحیح ہوسکتا ہے ـــــ ان چیزوں کی تحقیق وتصدیق کے کیا طریقے ہیں۔ اور ان طریقوں کیلئے اتفاق رائے کس نتیجہ پر متفق ہے۔ گزشتہ قوموں کے تفکر اور تلاش اصل کیلئے کیا نظریات قائم کئے ہیں۔ اور یہ عقائد کہاں تک درست ہیں۔ جو عقائد آخری مرحلہ پر قوانین فطرت کے عین مطابق۔ ٹھوس اور صحیح ہونگے انہیں سے ہمارے تفکر کا پہلا قدم شروع ہوگا۔

تواریخ عالم کا مطالعہ کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اِس کائنات اور ذات پر تفکر اکثر قوموں میں جاری تھا ہر شخص تلاشِ اصل (علتِ لامحدود) میں گامزن رہا۔ دنیا میں کئی ایک ہستیاں پیدا ہوئیں جنکی ذاتی قابلیت اس حد تک پہنچ چکی تھی۔ کہ وہ اپنے ذہن کو اس حد تک پہنچا چکے تھے۔ کہ وہ خود بخود کائنات اور ماوراُ ادراک کے اصل کو تلاش کرنے کیلئے ایک راہ پر چلتے تھے۔ انہیں ہستیوں نے ایک ایک نظریہ قائم کیا۔ انہیں نظریات پر باقی عوام نے اپنے عقائد قائم کئے۔ جو بالآخر قوموں کے نظریات وعقائد بنے۔ یہ عقائد کائنات خلقت کی پیدائش اور انسان کی پیدائش اور اسکی اصل (علت لامحدود) سے متعلق تھے۔ کہ تمام مخلوق ایک علت سے معلول ہے اور وہ علت اس تمام مخلوق پر کیسے حاوی ہے ـــــ ان عقائد میں تفکر کرنے کے جو طریقے شامل ہیں۔ کہ علت معلول کے ساتھ کیا نسبت رکھتی ہے۔ انہیں ہستیوں کے پیدا کردہ ہیں۔ ان نظریات میں زمانہ کے عروج وزوال تغیر وتبدل کے ساتھ ساتھ بہت سے اختلافات پائے گئے۔ اور مخلوق نے قوموں کی صورت اختیار کی اور ہر قوم نے الگ الگ ایک ایک نظریہ قائم کیا۔ کیونکہ زمانہ ہر دور میں اپنی ہیئت عروج وزوال میں تبدیل کرتا رہا۔ جو شکل کل تھی وہ آج سامنے نہ آسکی۔ جو آج ہے

وہ پہلے نہ تھی۔ ہر مفکر نے حال کی شکل پر اپنے تصورات کی بنیاد اٹھائی اور اسی پر اپنا نظریہ قائم کیا۔ یہ طریقہ ہر زمانہ میں جاری رہا۔ اور کسی زمانہ میں بھی قومیں ایک نظریہ ـــ ایک عقیدہ پر متفق نہ ہو سکیں۔ مختلف زمانوں میں مختلف زاویہ نظر رہے۔ جہاں پر جس مفکر کی نظر رکی وہاں ایک نظریہ قائم ہو گیا۔ کسی نے اپنے خیالی تصور کو اس قدر جولانی دی کہ وہ ایک راہ دراز طے کر کے ایک مقام پر پہنچا۔ اسی مقام کو علتِ لامحدود قرار دیا۔ مگر خود مفکر بھی اپنی تحقیق کی صداقت کا ثبوت نہ دے سکا۔ اسکی وجہ یہ تھی۔ کہ جب تک ماوراۓ ادراک کی اصل کیفیت کا نقشہ انسان کے ذہن میں اسطرح نہ آئے جیسے انسان آنکھ سے دیکھکر اپنے ذہن میں کسی شے کی کیفیت کو محسوس کرتا ہے۔ اسوقت تک خیالی تصور کی صداقت یقینی نہیں ہوتی۔ کیونکہ بغیر محسوس کیۓ خیال غلط تصور بھی قائم کر سکتا ہے۔ اور خاص کر اس کیفیت کا غلط ہونا یقینی ہے۔ جو ماوراۓ ادراک کیفیت ایسی قوت و تابانی رکھتی ہو جسکے لئے انسان کا ذہن بغیر دیکھے کوئی تصور لا ہی نہیں سکتا۔ چونکہ ان مفکرین کا تصور کسی بالاتر قوت کی امداد و ذریعہ سے خالی تھا اسلیئے مادی نظریہ کے مطابق انکے نظریات مستقل صورت اختیار نہ کر سکے۔ اسکی صورت سوائے اسکے کچھ نہیں کہ سب سے پہلے ایک اصل (لامحدود علت) کا تسلیم اور اسی کا تصور ضروری ہو ـــ مفکرین نے کائنات خلقت کو دیکھکر اسکی قریبی علت کو محسوس کیا۔ مگر کسی خاص علت لامحدود کی جستجو نہیں کی۔ اسلیئے ہر قریبی علت کو دیکھکر ہر مفکر اپنے ذہن کو انجام تک نہ پہنچا سکا اسلیئے انکے تصورات و نظریات ادھورے رہے۔ جہاں جس مفکر کا قدم رکا۔ سمجھا کہ یہی ابتداۓ ہے۔ طرزِ تفکر مادی ہونے کیوجہ سے اصل منظر اور اصل منبع تک رسائی نہ ہو سکی۔

جہاں ہوتی ہے منزل ختم وہ آغازِ منزل ہے غلط سمجھا جو تو محدود سمجھا راہ ہستی کو

یہ حقیقت ہے۔ کہ جہاں تک ہم اصل (علتِ لامحدود) کو مادی قوت سے تلاش کریں گے۔ ہم اسے مادہ کے اختتام تک ہی ذہن میں لا سکینگے۔ چونکہ وہ علتِ لامحدود اس مادی ہیئت سے دور انتہائی لطافتوں۔ روحانی تابانیوں کی حامل ہے۔ اسکے پہچاننے میں جہاں مادی تفکر انتہا کو پہنچکر تھک جاتا ہے۔ وہیں سے اس لطیف علت کا پہلا قدم شروع ہوتا ہے۔ مادی قوت ہمارے

ساتھ مادہ کے اختتام تک ہی چل سکتی ہے۔اسکے بعد چونکہ عالم روحانی ہے۔اسلیئے ہم سوائے روحانی قوت کے اسکا استدراک نہیں کر سکتے۔

؎ گر پڑتا ہوں تھک کر رہِ عشق میں جس جا اک مرحلہ ہوتا ہے منزل نہیں ہوتی

وہ مفکر جنہوں نے مادی حس سے اصل کو پہچاننے کی کوشش کی۔لازمی طور ماوراٗادراک کیفیت کو پہچاننے کیلیئے انمیں استعداد نہ تھی اور خیالی تصور سے جو نقشہ قائم کیا جائے اس میں حال[1] نہ ہو گا وہ بغیر پہچان کے ہو گا۔اسلیئے اُس نظریہ کا غلط ہونا امکانات سے ہو سکتا ہے کیونکہ اِنکی نظر۔اِنکے ذہن ابتداٗ تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ہر شخص نے مادی رنگ میں بجائے علت کے معلول کو پرکھنا شروع کیا۔کہ یہ چیز اصل سے کس طرح بنی ہے۔جب اصل علت کا بنیادی طور پر تصور نہ ہو تو معلول کی ماہیت بھی سمجھنا دشوار ہو گا۔اور جب معلول میں کسی تابانی قوت کا تصور قائم ہوا اسی کو مستقل اور اصل قرار دیکر نظریہ قائم کر دیا۔

مختلف مراحل میں مادی مخلوق کی مختلف انواع و اشکال ہوتی ہیں۔اور ہر نوع اپنے معلول سے تابانی وقوت میں زیادہ تر ہوتی ہے۔اسلیئے کسی غالب علت کو جو ابھی خود معلول کا درجہ رکھتی تھی اصل سمجھکر اسی کو علتِ مستقل سمجھا گیا۔کسی مفکر نے اس سے کم یا زیادہ تحقیق میں مختلف انواع و اشکال کا تصور کیا تو ضروری ہے۔کہ ان نظریات میں اختلاف پیدا ہو گا۔مثال کے طور پر کسی نے سونے کو ایک آبدار چیز سمجھکر اسکی علت کی تلاش کی اُسے اسکی دوسری ہیئت ایک چمکدار پتھر سیاہ رنگ کا نظر آئیگا۔دوسرا اسی سونے کی علت کو مٹی کی صورت میں دیکھیگا۔تیسرا اسی سونے کو چند جماداتی اجزا کے مرکب میں پائیگا۔سونے کی ہر جگہ ایک مختلف علت ہو گی۔ہر علت ایک دوسرے سے ہر نوع میں مقام و مرحلہ کے مطابق مختلف ہیئت میں ہو گی۔اسی طرح سونے کو جب تک اسکی

---

[1] حال سے مراد ماوراٗادراک کا تصور روحانی قوت کے ذریعہ من وعن اپنے ذہن میں لاکر اسکا عینی مشاہدہ کرنا۔ جہاں ظاہر آنکھ ذہن کو کسی شے کا ادراک کرنے سے عاری ہو وہاں روحانی قوت آنکھ کا کام کرتی ہے اور ذہن کو ماوراٗ ادراک کی کیفیات کا مشاہدہ کراتی ہے۔اس مشاہدہ کو تمثیلی الفاظ میں ''حال'' کہتے ہیں۔

ابتدائی علت میں نہ دیکھا جائے۔اسکی علت کے نظریات میں اسکی مختلف الانواع ہیئتوں کی بنأ پر اختلاف پایا جائیگا۔۔۔۔ اسلیئے ہر نظریہ ادھورا ہی ہوگا۔اور اسکی اصل کو مستقل قرار دینے سے نظریہ غلط ہوجائیگا۔اور سب سے بڑی وجہ نظریہ غلط ہونے کی یہ ہوئی کہ کسی مفکر نے اپنے تفکر میں اولاً ایک عظیم الشان علت لامحدود تسلیم کرنے سے گریز کیا۔انکا خیال یہ تھا کہ جب تک کسی شے کی علت ہمارے مشاہدہ میں نہ آئے ہم اسے موجود ہونا تسلیم نہیں کرتے۔بجائے اسکے کہ وہ ایک لامحدود خالق (علت مستقل) کا تصور ابتداءً ہی کرکے اسی کو ہر معلول میں تلاش کرتے۔تو لازمی طور اِنکے ذہن لطافت و روحانیت کی طرف مائل ہوکر روحانی قوتوں سے اسکا ادراک کرنا شروع کرتے۔ اور جب تک وہ ایک مستقل علت تک نہ پہنچتے۔انکا ذہن تلاش سے نہ تھکتا اور نہ رکتا۔۔۔۔ برعکس اسکے انہوں نے ایک نامعلوم شے کو جسکا تصور و تسلیم انہیں نہ تھا ڈھونڈنا شروع کیا۔جس وجہ سے اِنکی تحقیق ابتدأ سے خالی رہی اور نظریات بھی ادھورے رہے۔

اِن میں بعض ہستیاں ایسی بھی پیدا ہوئیں جنہوں نے مادی قوت سے علاوہ ایک ایسی قوت ۱؎ کا اجرا کیا جس قوت کی ماورأ ادراک تصور کیلئے ضرورت تھی۔اور جو کسی حد تک ماورأ ادراک کا تصور قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔اور اپنے نظریات کو اللہ کے علم سے متعلق کرکے اپنے آپکو منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔اسکی دلیل انہوں نے اپنے کریکٹر اور مافوق الفطرت ۲؎ واقعات کا مشاہدہ کرانے سے پیش کی۔انہیں پیغمبر ۳؎ کے نام سے خطاب کیا گیا۔انہوں نے یہ چیز ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسانی وجود میں ایک ایسی قوت ہے جسے روح ۴؎ کہتے ہیں۔یہی روح انسان کو باقی حیوانی مخلوق سے فوقیت دلاتی ہے۔اور اس روح کو اسلیئے ودیعت کیا گیا۔کہ انسان ماورأ ادراک کا صحیح تصور کرسکے۔اور اس روح کے ہونے کی وجہ یہ ہے۔کہ انسان اس دنیا میں بے مقصد نہیں بلکہ ایک نصب العین رکھتا ہے۔کہ وہ اپنی اور کائنات کی اصل (لامحدود علت) کو پہچان

۱؎،۲؎،۳؎،۴؎ اسکی تشریح آگے آئیگی

کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔اور اسکے لئے ضروری ہے کہ انسان تفکر سے پہلے ایک علتِ لامحدود خالق کو تسلیم کرے۔اور نظام کائنات کی تمام کارکردگی کو اسی اللہ سے وابستہ کردے۔ کہ اسی کے ارادہ سے یہ تمام کائنات بنی کیونکہ وہی ذاتِ لامحدود اس کی علت نمائی ہے۔اسی چیز کے تسلیم کرنے سے انسان پر اسکی فوقیت و برتری کی تمام ذمہ داریاں عیاں ہوتی ہیں۔کہ انسان کا ایک خاص نصب العین ہونا چاہیے۔اُسی نے اِسے بنایا۔کسی خاص مقصد کیلئے بنایا۔اور اسی قدرتِ لامحدود کے اشارہ و ارادے سے اسے دنیا میں ایک پروگرام کے ماتحت عمل کرنا ہے۔اور ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوگا۔جس کی پاداش میں اسے اِس کائنات کے ختم ہونے کے بعد ایک نئے نورانی ماحول میں آرام و عذاب ضروری حاصل کرنا ہوگا۔اس نظریہ کو تسلیم کرنے کیلئے لوگوں میں استعداد نہ تھی۔کیونکہ زمانہ ہر دور میں۔شر و فساد پیدا کرتا رہا۔لوگوں میں۔خود غرضی۔نفس پرستی۔آرام طلبی سے خونریزیاں اور فساد رونما ہوتے رہے۔یہ لوگ دنیا کی طلب میں اسقدر غرق ہو گئے۔کہ اپنی ذاتی برتری کو بھول گئے۔جستجو سے انمیں وہ تابانی و روحانی جواہر مسخ ہو گئے۔جن سے یہ اس لطیف ماوراء ادراک ہستی کا تصور یا تلاش کرنے سے انحراف کرنے لگے چونکہ یہ ہستیاں اپنے آپکو منجانب اللہ قرار دیتی تھیں۔اسلئے لوگوں کو اس دنیا پرستی سے باز رکھنے کے لئے انہوں نے اپنی تمام کوششیں مخصوص کر دی تھیں اور ہر شخص کو اسکے نصب العین سے آگاہ کرنے لگے۔جن لوگوں نے ہوشمندی سے کام لیا انہوں نے۔انہیں منجانب اللہ ہونا تسلیم کیا اور اسکے ساتھ ہی ایک لامحدود علت (اللہ) کو تمام کائنات کا خالق تسلیم کر کے اپنے نصب العین کے مطابق تفکر شروع کیا۔اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ۔وَ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ وہ لوگ جو رسول کے کہنے پر بغیر تحقیق و مشاہدہ (اللہ کے ہونے پر) یقین رکھتے ہیں انہیں مسلم کے نام سے خطاب کیا گیا یعنی تسلیم کرنے والے۔جو لوگ زیادہ اندھیرے میں پھنسے تھے۔اور اپنے روحانی جواہر کو مادی وجود میں جلا دینے کی تکلیف سے کتراتے تھے۔انہوں نے اپنی نفس پرستی کی وجہ سے تسلیم و تائید کرنے سے انحراف کیا۔انہیں کافر کے نام سے خطاب کیا گیا۔یعنی پیغمبر کی اصلاحی تعلیم کو ٹھکرانا۔اور اولاً ایک خالق کے ہونے

سے انکار کرنے والے۔ جماعت منکرین نے پیغمبروں کی مخالفت کی اور مسلم نے پیغمبروں کی تائید کی۔ قوم مسلم کو اپنے راہنما (پیغمبر) نے طریق تفکر سکھا کر ایک مستقل راہ پر چلایا۔ اسطرح ایک قوم مسلم کا اجرا ہوا۔ اور پیغمبر کے نظریات جو خود منجانب اللہ تعلیم دیئے گئے تھے اس قوم کے عقائد بنے۔ جب تک پیغمبر ایک قوم میں راہنما کی حیثیت سے رہا قوم نے پورے اطمینان سے اپنی راہ پر گامزنی کی۔ پیغمبر کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد زمانہ گزرتا گیا۔ اور قوم میں بھی افراط و تفریط شروع ہونے لگی بعد کے لوگ پھر نفس پرستی کی طرف راغب ہونے لگے اور عقیدت سے پیغمبر کے بت بنانے شروع کیئے اور ناجائز حصول دولت کی خاطر اسی دین[1] (طریق تفکر) میں من گھڑت افسانے ملا کر لوگوں کو اپنے تصرف میں لانے لگے چونکہ دنیا ابھی اپنے ابتدائی اور درمیانی دور سے گزر رہی تھی اصل کی تحقیق بھی مکمل نہ ہوسکی دوسرے لوگوں میں بھی انتہا پانے کی پوری استعداد نہ پائی گئی آہستہ آہستہ عقائد کی شکل بدل گئی۔ اور ایک زمانہ کے بعد اصل عقائد بالکل معدوم ہو گئے۔ چونکہ اس دور میں بھی حقیقت کو اصلی روپ میں نہ پایا گیا۔ اسلئے آئندہ آنے والی قوموں میں تحقیقاتی اختلاف ضرور پیدا ہوا۔ کچھ تو خودغرضی نفس پرستی کی بنأ پر عقائد میں اختلاف ہوا۔ کچھ لوگوں میں تحقیق کی استعداد نہ پائی گئی۔ اور نظریات میں اختلاف پیدا کیئے گئے۔ البتہ جو علم ان مخصوص ہستیوں نے پیش کیا اس میں حقیقت کو پانے اور تسلیم کرنے کا پورا مواد موجود تھا۔

دنیا میں کئی قومیں ان غلط نظریات میں پھنسی رہیں اور غلط عقائد کو اپنی نفس پرستی کی خاطر اپنایا۔ اور یہ عقائد دین و مذہب کی شکل میں پیش کیئے گئے۔ اکثر زمانوں میں بار بار مصلح۔ مخصوص ہستیاں دین اسلام[2] کو لیکر آئیں۔ عقائد میں اصلاح کی مگر زمانہ گزرنے کے بعد انکے دنیا سے جانے کے بعد ہر دور میں لادینی اور فساد نے لوگوں کو پھر غلط راہ پر لگایا۔ اور کسی زمانہ میں ایک

---

[1] طریق تفکر کے اصولوں پر چلنے کیلیئے جو راہ اختیار کی جائے اُسے دین کے تمثیلی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

[2] اسلام۔ اس سے مراد وہ طریق تفکر و تصور جس میں تفکر کیلیئے اولاً ایک لامحدود علت کو خالقِ کل تسلیم کیا جائے۔ یعنی تسلیم کرنے والا دین۔

نظریہ ایک عقیدہ پر اتفاق نہ ہوسکا۔

گزشتہ مذاہب میں سوائے چند مخصوص اصولوں کے جسقدر بھی تصور کے نظریات ملتے ہیں ان سب نظریات وعقائد کا سطحی عکس نظر آتا ہے۔اور انکے اصل۔زمانہ کے عروج وزوال کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتے گئے۔یہاں تک کہ صحیح حقیقی نظریہ میں فرق آگیا۔اگر مذاہب کے صحیح عقائد (جن کی حقیقت زمانہ میں ملنی محال ہے اور کالعدم ہوچکے ہیں) کا اِنکے حال کے عقائد کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ان میں حد سے زیادہ تضاد پایا جائیگا۔تحریف اور من گھڑت افسانوں کی وجہ سے ایک ہی مذہب میں ایک ہی نظریہ کیلئے مختلف قسم کے اصول پائے جائینگے۔اسلئے ہر مذہب میں اصل کی تحقیق کیلئے کوئی خالص نظریہ کوئی خالص طریق تفکر کا اصول نہیں مل سکیگا۔اور ہر مذہب کی موجودہ تعلیم بالکل ناقص اور ادھوری ہوگی۔جس سے انسان کوئی صحیح راستہ حاصل کرنے سے عاری ہوگا۔ان مذاہب کے نظریات ناقص ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے۔کہ اگر کسی مذہب میں تفکر کی انتہا کو پایا جاتا۔تو وہ ایک مستقل حیثیت اختیار کرلیتا۔اور زمانہ کی فسادی گردش اس پر اثر انداز نہ ہوتی۔اور اکثریت میں قومیں اسے قبول کرنے پر مجبور ہوجاتیں۔

تواریخ کی روشنی میں ہم یہ معلوم کرسکتے ہیں۔کہ زمانہ میں کس قسم کے مذاہب پیدا ہوئے۔اِنکی ابتدأ کہاں سے ہوئی؟ انکے موجدوں (پیغمبروں) مفکروں (حکما وفلاسفر) نے کس قسم کے نظریات پیش کئے؟ اور وہ کس حد تک اصل کو پانے میں کامیاب رہے؟ انکے تفکر کے نظریات وعقائد کس حد تک صحیح وغلط تھے۔قوموں نے ان نظریات کو کس طرح اپنایا۔۔۔۔

تواریخ سے ہم اس مخلوق کی پیدائش کی ابتدأ کا صحیح تعین نہیں کرسکتے۔کہ کس وقت پیدا ہوئی۔اسکی پیدائش جب بھی ہوئی۔ہمارا تعلق اسکی پیدائش سے صرف اسی قدر ہے۔کہ اسکی علت کیا ہے۔۔۔؟ یہ کیسے ظہور میں آئی۔۔۔؟ اور اس مخلوق میں انسان کی کیا خصوصیت پائی جاتی ہے۔۔۔؟ اسلئے تفکر کا دارومدار انسانی خلقت پر ہی منحصر ہے۔

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے۔کہ انسان کی پیدائش اسی زمین سے ہوئی ہے۔کیونکہ اس کے

وجود میں تمام زمینی قوتوں کے جواہر موجود ہیں۔ تفکر میں ہم نے انسان کو مجموعہ موجودات کی حیثیت سے دیکھنا ہے۔ اور اسی مجموعہ (جواہر مرکب) پر ہی اپنی تحقیق کا آغاز کرنا ہے۔ انسان کے وجود کی تحقیق سے ہی ہم پر تمام کائنات کے رازِ پنہاں عیاں ہوجاتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے۔ کہ یہ انسان کیسے پیدا ہوا۔ جس زمین سے اسکی زندگی کی ابتدا ٔ ہوتی ہے۔ اسکی علت کہاں پر اپنی لامحدودیت پر قائم ہے۔ اس طرح انسان سے لیکر لامحدود علت تک مراحل در مراحل گزر کر ہمیں منتہا کو پانا ہے۔

تواریخ یا علمِ تفکر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمام مخلوقِ انسانی ایک انسان سے پیدا ہوئی۔ جسے آدم[1] کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ یہ آدم دنیا کی بیرونی فضا سے کود کر زمین پر نہیں داخل ہوا۔ بلکہ اسی زمین میں اس نے جنم لیا۔ یہ ایک قیاس ہے۔ جسے ہم محدود دائرہ کی شکل دیکر اسی دائرہ میں اپنی تحقیقات شروع کرینگے۔ تاوقتیکہ ہم اسکے ظاہری باطنی اسباب کا پتہ نہ لگا سکیں۔ ہمارے لئے قیاس ہی تفکر کی اساس ہے کہ انسان مٹی سے بنا۔ جب ہم اسکے جواہر کے اجزائے ترکیبی پر غور کرینگے تو ہم اسکے جواہر میں علت در علت ایک قوی جوہر پائینگے۔ جسے ہم دوسرے الفاظ میں روح کے نام سے موسوم کرینگے۔ اسطرح ہمیں انسان دو قوتوں کا مرکب نظر آئیگا۔ جس پر اسکی ابتدا ٔ ہوئی ہے۔ روح کی ترکیب ہی پیدائش آدم میں کارفرما نظر آئیگی۔ یعنی آدم کی تخلیق کی ابتدا ٔ جوہر کے ایک ایسے لطیف مادہ سے ہوئی۔ جو تمام زمینی قوتوں کا جوہر اور علت ہے۔ اور اسی پر اسکی زندگی اور افزائش کا دارومدار ہے۔

مادی حسیات کی مدد سے ہم اپنی ذات اور جملہ کائنات کا اندازہ سطحی طور پر لگا کر ایک نتیجہ قائم کر لینگے۔ مگر اپنے اس نظریہ کو کسی علم کے ساتھ موازنہ نہ کئے بغیر اپنی تحقیق کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ کہ آیا ہمارا اندازہ صحیح ہے یا غلط۔ کیونکہ ہمارا اندازہ تخیلی ہے۔ نہ کہ مشاہدہ سے۔ اسکے لئے ہمیں گزشتہ مذاہب و بانیان مذاہب کے اقوال وافعال پر نظر ڈالنی ہوگی یا کسی تحقیق شدہ علم کے

---

[1] آدم کی اس سے پہلے کوئی بھی ترکیب ہو۔ مگر جب یہ ہستی آدم کی شکل پر پہنچی اسکے بعد اسی سے سلسلہ انسانی شروع ہوا۔

ذریعہ ہی کسی نتیجہ پر پہنچنا ہوگا۔ اور مادیت سے باہر ماوراُادراک کے تفکر و تحقیق کیلئے کسی خاص اصول کو لیکر ہی ہر مخلوق کی علت کا علم حاصل کرنا ہوگا۔ اسکے لئے انہیں گزشتہ بانیانِ مذاہب یا مفکرین کے اصول ہمارے سامنے ہونگے ان میں جو لازوال اور مصدقہ علم ہوگا اُسے ہی راہنما بنانا ہوگا۔ کہ اس تفکر کیلئے مذاہب نے کیا طریق اختیار کیا۔ انکی تحقیق کیا کچھ پیش کرتی ہے۔ اور وہ علم کس حد تک درست ہے۔ اور اس علم نے کس حد تک منتہا کو پہچانا۔ اور یہ علم کہاں تک صداقت پر مبنی ہے۔ قبل از تقلید ہمیں ان مذاہب میں یہ باتیں دیکھنی ضروری ہیں۔

تواریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آدم کی پیدائش کے بعد اولادِ آدم سے یہ انسانی خلقت پھیلی۔ اور انہیں میں سے کئی ایک ہستیاں ایسی بھی پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے مقصد اصلی کی تلاش کی طرف انسانوں کی راہنمائی کی۔ اِن ہستیوں کا ظہور اسوقت ہوا۔ جب کہ باقی مخلوق میں۔ انتشار۔ فساد اور خونریزی ہورہی تھی۔ ہر انسان پریشاں حال ظلم وستم کا شکار اور زبوں حالی میں گرفتار تھا۔ ہر شخص اپنی اغراض کے لئے دوسرے کو اپنا غلام اور محکوم بنانا چاہتا تھا۔ دنیا پرستی اور ہوس رانی کا دور دورہ تھا۔ کسی قانون۔ کسی اصول کی پابندی نہ تھی۔ انسان کی زندگی کی کوئی قیمت نہ تھی۔ لوٹ مار۔ قتل و غارت گری کا کھلے بندوں دور دورہ تھا۔ دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ ان لوگوں کی حالت اسوقت تباہی کی طرف جاتی رہی جب کہ انسان نے اپنے نصب العین سے منہ پھیر کر اپنے مقصد خصوصی سے کوتاہی برتی۔ جسکی وجہ سے انسان میں اکثریت کے ساتھ۔ خودغرضی ۔ ہوس رانی۔ نفس پرستی۔ ناجائز دنیا طلبی کے ساتھ ساتھ تفکر سے اجتناب ہوا۔ لوگ اپنی اغراض نفسانی کے پورا کرنے میں ہر قبیح سے قبیح افعال کا ارتکاب کرنے میں عار نہ سمجھتے تھے اور انسان اپنی نفسانی ناجائز خواہشات میں الجھ کر بے بس ہو جاتا۔ اس سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ انسان کے لئے ایک خصوصی مقصد مقرر ہے۔ جسکی تکمیل اس نے کرنی ہے۔ اور اِسے پس پشت ڈالنے سے انسان ذلت و تباہی کی طرف جاتا ہے۔ جو اسکے زوال کی علامت ہوتی ہے۔ انسان نے کسی خاص زمانہ۔ کسی خاص مقام تک اپنے آپکو لازمی پہنچانا ہے۔ اور جب انسان اپنا مقصد

بھول کر گمراہی کی طرف جاتا ہے۔تو انسان کی اصلاح اور راہنمائی کیلئے ایک ہستی فطری طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔کیونکہ کائنات ایک خوبصورت ترتیب و نظام میں چل رہی ہے۔اسکی برہمی کے اسباب پیدا ہونے پر کسی مصلح کا موجود ہونا ضروری ہو جاتا ہے اور کائنات میں سب سے زیادہ برہمی پیدا کرنے والا انسان ہی ہے۔اسلئے فطرتاً انسانی اصلاح کیلئے ایک ایسی ہستی کی ضرورت ہوتی ہے جو کائنات اور انسانی نظام میں پھر سے خوبصورتی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔اُسے تمثیلی الفاظ میں پیغمبر[1] کے نام سے تعبیر کیا گیا۔یہی ہستی انسان کو اپنے مقصد کی طرف لانے کی کوشش کرتی ہے۔اور پیغمبر انسان کے بھولے ہوئے سبق ''تفکر'' کو یاد دلاتا ہے۔کہ انسان تفکر کی طرف رجوع کرے۔اور بجائے گمراہی کے اصل علت لامحدود کو پہچاننے کی کوشش کرے۔اسکے لئے سب سے پہلے ایک لامحدود علت کا تصور دلا کر اُسے تسلیم کرایا جاتا ہے۔ان ہستیوں میں ایک فرقہ حکماً و فلاسفہ کا ہے۔جو مادی علم سے حقیقت کو پہچاننا چاہتے ہیں۔لیکن وہ علت لامحدود مادے کی قید سے ماوراً ہے اس تک مادی حس پہنچ نہیں سکتی اسلئے اکثر حکماً و فلاسفہ کا اندازہ منتہا کو اسکی اصلی ہیئت میں نہ پا سکا۔اسلئے انکا علم ہمیشہ ناقص رہا اور زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ اِنکے نظریات وعقائد کی بھی تردید ہوتی رہی۔

دوسرا فرقہ پیغمبروں کا ہے۔جنہوں نے اپنے علم کی ابتدا کسی ماوراً ادراک علتِ لامحدود کے تسلیم پر کی۔انہوں نے باقی مفکرین کی طرح اپنے مادی حسّیات پر کوئی نظریہ پیش نہیں کیا۔بلکہ اپنے آپکو منجانب اللہ قرار دیکر۔اِسی اللہ سے مقصدِ تخلیق کائنات اور تفکر کا علم سیکھنے کا دعویٰ کیا۔اسلئے انہوں نے اپنے پیغمبر ہونے کے ثبوت میں چند باتوں کو دلیل کی صورت میں پیش کیا:-

(۱) منجانب اللہ ہونا۔

---

[1] کائنات میں انسان کو پیغام تفکر سنا کر اسکی اصلاح کرنے والا۔

(۲) روحانی وجود (جوہرا علیٰ) کا ہونا۔

(۳) معجزات یعنی مافوق الفطرت واقعات کا مظاہرہ۔

(۴) حشر۔ قیامت ـــــ جزاوسزا۔ کائنات کا انجام وفنا اور اسکے بعد تسلیم وانکار سے نتیجتاً راحت و عذاب حاصل کرنا۔

پیغمبر کے منجانب اللہ ہونے سے مراد یہ ہے۔ کہ دنیا میں تفکر ہرانسان کیلئے لازمی ہے۔ جہاں تک مادی احساسات کا تعلق ہے۔ انسان اپنے تفکر میں اصل علتِ لامحدود کو پانے سے قاصر ہے۔ اور اگر اپنے مادی تعلق میں جولانی دے بھی تو اِسکا تمام ماحصل ذاتی اختراع پر مبنی ہوگا۔ اسکے علم میں صداقت کی کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہوگی۔ پیغمبر بھی چونکہ انسان کی طرح بشری قویٰ رکھتا ہے۔ اسکے احساسات بھی انسان کی طرح مادی ہیں۔ جہاں تک اسکے مادی احساسات کا تعلق ہے۔ اصل علت لامحدود کے تصور کیلئے اسکا بھی وہی نظریہ ہوگا جو عام انسانوں اور مادی مفکرین کا ہوتا ہے۔ مگر پیغمبر کی خصوصیت منجانب اللہ ہونا اسکی صداقت پر دال (دلیل) ہوتی ہے۔ کہ وہ مادے سے ماسوا ایک ایسی قوت کا اجرأ کرتا ہے۔ جسے عام انسان استعمال نہیں کرتے۔ اسکے نظریات کو تب تک قبول نہیں کیا جاتا جب تک کہ اسکے پاس ایک ایسا علم نہ ہو۔ جو ماورأادراک کو محسوس کرنے کیلئے۔ ماورأادراک قوت سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔ کیونکہ ماورأادراک قوت (لامحدود علت) ہی ماورأ سے واقفیت رکھتی ہے۔ اور اسی کے علم کے ذریعہ سے آگاہی ہوسکتی ہے۔ اسلئے انسان تک پہنچانے کیلئے دو باتوں کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ ایک۔ اپنے ماورأ کا علم انسان تک پہنچانے کے لئے ایک مخصوص ہستی کو منتخب کرنا۔ دوسرے ـــــ اس طاقت کو انسان میں جلا پانا جسکے ذریعہ مادی انسان اسکے علم سے آگاہی حاصل کرسکے۔ وہ ''روح'' ہے جو ایک انسان کو ماورأادراک کا علم کراسکتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں (علم اور روح) پیغمبر کیلئے ضروری ہیں۔ علم کا اللہ کی طرف سے ہونا ضروری ہے۔ چونکہ مخلوق اس علم کو پانے سے قاصر ہے۔ سوائے اسکے انسان کو گمراہی کی طرف جانے کا احتمال ہے۔ اسلئے انسان کے صحیح راہ پانے کیلئے۔ ایک ہستی کا پیغمبر ہونا لازمی ہے۔ جو منجانب اللہ ہو۔ اسکا تعلق ایک طرف مادہ

کے ساتھ ہو دوسری طرف اسکا روحانی تعلق براہ راست اللہ سے ہو۔اور اس تعلق کو برقرار رکھنے والی قوت ایسی ہو جو قربِ اللہ کی متحمل ہو سکتی ہو۔اور مادہ کے قریب ہو کر اسے آگاہ بھی کر سکتی ہو جیسے آگ اور پانی ایک جگہ قریب نہیں ہو سکتے ہیں۔لیکن ایک مٹی کا برتن درمیان رکھکر پانی اور آگ قریب ہو جاتے ہیں۔اس حال میں کہ دونوں کیفیتوں کی ہیئتیں قائم رہتی ہیں۔ایک ہانڈی میں پانی بھر کر آگ پر رکھنے سے پانی آگ سے اثر لیتا ہے۔مگر اپنی اصل کو ضائع نہیں کرتا اسی طرح ایک مخصوص ہستی درمیان ہونے سے لامحدود تابانی و تپش رکھنے والے نور سے۔انسان قریب ہو کر بھی اثر لے سکتا ہے۔کہ اسکا وجود باوجود قوی قوت کے اپنی ہیئت میں قائم رہتا ہے۔

مثال کے طور پر صاحبِ مکان اپنے مکان کی بالائی منزل پر مسند نشین ہے۔اس تک پہنچنے کیلئے جب تک اسی سے راہنمائی طلب نہ کی جائے اُس تک نہ رسائی حاصل ہو سکتی ہے نہ اسکے مکان سے واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔اسکے لئے دو ہی ذرائع ہو سکتے ہیں۔یا تو وہ خود ہم تک پہنچکر ہمیں واقفیت عطا کرے۔یا اپنے کسی خاص معتمد کو ہمارے پاس بھیجے۔تیسرا ذریعہ یہی ہے۔کہ ہم خود اس تک پہنچیں مگر یہ تیسرا ذریعہ مفید نہیں ہو سکتا۔نہ تو ہم اسکے مکان سے واقف ہیں۔نہ ہم میں اسقدر قوت ہے کہ ہم براہ راست اس تک پہنچیں نہ ہم بغیر وسیلہ[2] کے اس تک رسائی[1] حاصل کرنے کے قابل ہیں۔اسلئے بھٹک جانے کا احتمال ہوگا۔اور ہمارا نظریہ صاحب مکان تک پہنچنے کیلئے غلط راہ پیدا کریگا۔

---

[1] رسائی سے یہ مراد نہیں کہ اسکے راستے ہمارے لئے بند ہیں۔بلکہ ہمیں اسکے مکان سے پوری واقفیت حاصل کرنی ہے (ہر علت کو پہچاننا ہے) بغیر وسیلہ کے ہر قدم پر بھٹک جائینگے۔کیونکہ اس تک پہنچنے کیلئے مکان میں ایسے آثار موجود ہیں جنہیں ہمارا تصور فہم میں نہیں لاسکتا مبادا ہم کسی خوبصورت ماحول کو ہی انتہا قرار دیکر الجھ جائیں۔یا کسی اور طرف بھٹک کر نکل جائیں کیونکہ مکان میں کئی چور دروازے بھی ہیں جو بجائے مقام مقصود تک پہنچانے کے ہماری غلطی کے باعث مکان سے باہر پہنچا دینگے۔اسلئے بغیر وسیلہ۔راہنما کی راہنمائی کے اس تک رسائی ہونا ناممکن ہو جاتی ہے۔

[2] وسیلہ۔علت لامحدود تک پہنچنے کیلئے ایک درمیانی وجود (یا آئینہ) جسکے ذریعہ ہم علت (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ذریعہ اول کیلئے وہ خود ہم تک نہیں آ سکتا کیونکہ اسکا جلال اسکی شان اسقدر ارفع ہے کہ نہ تو ہم اسے سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اسکے جلال کو برداشت کر سکتے ہیں۔ البتہ اسکے معتمد کی ایسی پوزیشن ہے۔ جو ایک طرف مالک مکان سے مل سکتا ہے۔ دوسری طرف ہم سے بھی رابطہ کرتا ہے۔ مالک مکان نے اسے خود اسی کام کیلئے منتخب کیا ہے۔ اور اس قابل بنا دیا ہے۔ کہ وہ اس تک پہنچ سکا اور اسے اپنے مکان کے نشیب وفراز سے آگاہ کر دیا۔ اور ہر ادب ہر طریق اسے سکھائے۔ اسلئے

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) لامحدود کے وجود کا پورا احساس کر سکیں۔ یعنی ایک راہنما ۔۔۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان تمام مخلوق سے اشرف ہے۔ اور تمام مخلوق کے جواہر کا مرکب ہے اسی طرح۔ ایٹم اور سورج وغیرہ کا جز بھی اس میں موجود ہے۔ اس شرافت کے لحاظ سے انسان بمقابلہ ایٹم اور سورج کے کل (مرکب) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ چیزیں بھی اسکے مقابلہ میں جز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ باوجود انسے اشرف ہونے کے بھی انسان ایٹم اور سورج کا قرب (نزدیکی) نہیں پا سکتا۔ کیونکہ انسان کی مادی رنگ میں ایسی پوزیشن ہے کہ سورج کے سامنے ہونے سے جل کر راکھ ہو جائیگا۔

سورج کا نور (روشنی) جو شعاعوں کی شکل میں زمین پر پڑتا ہے اسکا اثر انسان پر پڑتا ہے۔ اگر یہ شعاعیں براہ راست انسان پر پڑیں تو بھی یہ ان شعاعوں کی گرمی کی تاب نہ لا سکیگا۔ اور نتیجتاً انسان جل کر راکھ ہو گا اور مر جائیگا۔ لیکن درمیانی فضا کے کثیف ذرات سے گزر کر ہم تک پہنچنے میں یہ شعاعیں ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں اور ہم اس کثیف فضا کے وسیلہ سے ایک مہلک اور ناقابل برداشت قوت کو آسانی سے اپنے لئے نفع رساں پاتے ہیں۔ کثیف فضا ایک طرف ہم سے رابطہ رکھتی ہے دوسری طرف سورج کی شعاعوں کو اپنے میں سمانے کی قوت بھی رکھتی ہے۔ سورج اور انسان کے درمیانی رابطہ کیلئے کثیف فضا کا ہونا لازمی ہے۔ نہیں۔ بلکہ فطرتاً اس کردار کو پورا کرنے کے لئے اسکا وجود لازمی ہو گیا ہے۔

سمندر انسانی آبادیوں سے دور ہے۔ اسکا پانی ہر شخص فرداً فرداً حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ اگر انسان کو اپنی فصلوں اور دیگر ضروریات کیلئے پانی سمندر سے حاصل کرنا پڑتا تو اسکے لئے زندگی وبال ہو جاتی۔ لیکن یہی سمندر کا پانی سورج اور ہوا کے وسیلہ سے انسان کیا بلکہ ہمالیہ کی چوٹی کے ایک کیڑے کو بھی پانی بہم پہنچاتا ہے۔ یہ ایک وسیلہ ہی ہے۔ جسکا نظام کائنات میں فطری طور پر ہونا ضروری ہے غرضیکہ نظام کائنات کے ہر معاملہ میں ایک نہ ایک وسیلہ فطری طور پر ضرور موجود ہے۔ اسی طرح انسان کو ایک ایسی قوت (علت لامحدود) (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

طالب کیلئے معتمد کا بحیثیت وسیلہ ہونا ضروری ہے۔ مالک مکان اپنے معتمد خاص کو ہم تک بھیجد یتا ہے۔ معتمد اعلیٰ ہمیں ہر ادب۔ اور ہر طریق راہ روی سکھاتا ہے۔ اور ہمیں اپنی معیت میں ہمراہ لے جا کر مکان کے ہر نشیب و فراز سے واقف کراتے ہوئے مالک مکان تک پہنچاتا ہے اسطرح ہم آسانی سے مالک مکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی تعریف ایک پیغمبر کی ہے۔ اور یہی ضرورت ایک پیغمبر کی منجانب اللہ ہونے کی ہے اور یہی طریقہ اللہ کی طرف سے علم عطا ہونے کا ہے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) سے ملنے یا پانے کیلئے بھی فطری طور ''وسیلہ'' کی ضرورت ہے۔ جو انسان اور علت لامحدود میں آسانی سے رابطہ قائم کردے۔

انسان میں باعتبار اپنے وجود کے اسقدر قوت ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے اپنی ایک جز سورج پر بھی حاوی ہے۔ اگر انسان سورج اور ایٹم پر حاوی نہ ہوسکتا ہو تو اسکا مجموعہ جو ہر ہونا بے معنی اور بیکار ثابت ہوتا ہے۔

انسان اپنی پیدائش کے وقت ایسا ہی اشرف پیدا ہوتا ہے۔ لیکن باقی مواد جو زمین سے حاصل کرتا ہے اس مواد سے اس میں ایسی قوتیں شامل ہوتی ہیں جو سورج کی تمازت کی تاب نہیں لاسکتیں۔ یہی چیزیں ہیں جن پر سورج کا اثر غالب آجاتا ہے۔ اگر انسان اپنی پیدائش کے وقت اس بات پر قادر ہو کہ وہ ان زمینی اجزا کو نہ استعمال میں لائے۔ تو ضروری ہے۔ کہ وہ ہر شے پر غالب ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ چیز اسکے اختیار سے باہر ہے۔ اسلئے ان اجزا کا اثر اس میں آنا ضروری ہے۔ اور انسان کے شعور کی تکمیل پر اسے انہی اجزا کو تحلیل کرنا ہے۔ تاکہ وہ اپنی اصل قوت کو دوبارہ اپنی اصل حالت میں لائے اور جو قوتیں علتِ لامحدود سے لیکر مادہ تک اس میں موجود ہیں انہیں مادی مواد سے علیٰحدہ کرکے صاف کرے تو لازمی ہے۔ کہ وہ علت لامحدود کو بھی پاسکیگا۔ چونکہ یہ کام براہ راست انسان سے ہو نہیں سکتا اسلئے اس عمل کیلئے ایک تفکر ہی ہے جو اسے کسی عالم (پیغمبر) کی طرف رجوع کرائیگا جو ان اوصاف سے متصف ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی پیغمبر اپنے طریق ادب میں اسی علم الٰہی کے ذریعہ جو اسے حاصل ہے انسان کو طریق تفکر میں وہ علم (وہ طریقہ) دکھائیگا جس سے انسان اپنی دبی ہوئی قوت کو دوبارہ اپنی اصلی ہیئت پر لائیگا۔ اور وہ اشرف المخلوقات کے صحیح مقام کو حاصل کرکے ہر شے پر غالب ہوگا چونکہ وہ اسی علت لامحدود سے معلول ہے۔ خالص اشرف المخلوقات ہونے کی صورت میں وہ خود بخود اپنی اصل کو پہچان لیگا۔ اسلئے یہ مقام بغیر پیغمبر کی راہنمائی اور وسیلہ کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ چونکہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ایک (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پیغمبر میں معتمد خاص ہونے کی حیثیت میں ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ کہ اس میں وہ نورانی قوت وہ اشرف المخلوقاتی عظمت (جوہر یا روح) مجلّا ہوتی ہے جو ماوراً ادراک کا مادی احساسات سے علاوہ ادراک کرسکے۔ اسلئے۔ روحانی وجود (جوہر اعلیٰ۔ یا روح) کا ہونا بھی یقینی ہے۔

مثلاً۔ انسان فطرتاً جواہر سے مرکب ہے۔ اس میں ایک جوہر وہ ہے۔ جس سے اسکی زندگی برقرار ہے۔ جو تمام مخلوق ادنیٰ کا جوہر ہے۔ جب ہم وجود انسانی کی چھان بین کرتے ہیں۔ تو ہمیں تمام موجودات کے جواہر کا مرکب اس میں ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ انسان کو جب کسی بیماری کا عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ اسکے عناصر میں کسی خلط کی کمی واقع ہوتی ہے۔ تو اسکا علاج انہیں اخلاط کی کمی پوری کرنے سے کی جاتی ہے۔ معدے کی بیماری ہو۔ تو اسکی وجہ کسی تیزابی مادے کی کمی یا زیادتی یا فولاد کی کمی کے باعث ہوتی ہے اسکا علاج انہی کے جواہر تیزاب یا فولادی جواہر (ایسڈ یا آئرن مکسچر Iron Mixture) پلانے سے کیا جاتا ہے۔ جس سے انسان کی مشنری دوبارہ اپنی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) مادی ماحول بھی واقع ہے جس سے اسکا متاثر ہونا ضروری ہے اسلئے فطری طور پر اسکی اصلی پوزیشن کو حاصل کرنے کیلئے۔ طریق تفکر ــــ اور پیغمبر کا ہونا لازمی ہے۔ مفکرین مادہ نے بغیر کسی راہنمائی کے اس چیز کو پانے کی کوشش کی یہ طریقہ فطری طور بغیر وسیلہ ہونے کے قطعی غلط ہے۔ اسلئے انکے تفکر کے نتائج بھی غلط ہوسکتے ہیں۔

یہ چیز بھی قابل غور ہے۔ کہ ایک شخص تن تنہا خانہ بدوش ہے۔ بھیک مانگ رہا ہے۔ اسے اپنی پوزیشن پر غور کرنا ہے۔ کہ دنیا میں ہر شخص بھیک نہیں مانگ رہا ہے۔ میری ایسی پوزیشن کا کیا سبب ہے۔ تو اسے اپنی گزشتہ زندگی پر تفکر کرنا ضروری ہوگا۔ کہ میرے اسلاف کیا گداگر ہی تھے یا متمول بھی تھے۔ اپنی زندگی پر غور اسکے لئے لازمی ہوگا اسی طرح ایک انسان پر گزشتہ زندگی پر اپنے ماحول پر غور و تفکر ضروری ہوتا ہے۔ جب وہ تفکر کی طرف رجوع کریگا۔ تو اسے اپنے وجود اور کائنات پر ہی نظر ڈالنی ہوگی۔ انسان براہ راست علم لیکر نہیں آتا بلکہ کسی عالم سے سیکھتا ہے۔ اسلئے تفکر کیلئے ایک ایسے عالم کی طرف رجوع ضروری ہوگا جو اس انسانی اور کائناتی علم سے واقف ہو۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے۔ کہ گزشتہ زمانوں میں ایسی ہستیوں کا وجود ظاہر ہو چکا ہے۔ جو حکماً۔ فلاسفر اور پیغمبروں کے ناموں سے مشہور ہیں۔ اسلئے اپنے تفکر کیلئے ایک پیغمبر کو وسیلہ بنانا لازمی ہے۔

صحیح حالت پر آ کر زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے کام شروع کر دیتی ہے۔اس حالت میں اسے براہ راست تیزاب یا فولاد نہیں کھلایا جاتا۔ بلکہ ا۔نکے جواہر دیئے جاتے ہیں۔اسی طرح اگر دق یا سل کی بیماری کا عارضہ ہو جائے تو اُسے چونے کی کمی بتایا جاتا ہے اسکے لئے چونے کا جوہر (Calcium) دیا جاتا ہے جس سے چونے کی کمی پوری ہو کر انسان روبہ صحت ہو جاتا ہے۔کمر یا جوڑوں کے درد کے لئے بجلی کی شعاعیں داخل کی جاتی ہیں۔اسکے علاوہ آفتابی غسل Sun Bath کے ذریعہ سورج کی شعاعوں سے علاج کیا جاتا ہے۔ایٹم کی ایجاد کے بعد اسے بھی انسانی علاج میں کام میں لایا جاتا ہے۔غرض کہ کائنات کی ہر شے وہ مچھر ہو یا ہوا۔یا سمندر کی کوئی مخلوق ہو ہر شے انسان کیلئے کارآمد ہے۔کیونکہ کائنات کے ہر جوہر کا مجموعہ انسان میں ہے۔ایٹم اور عکس آفتاب اپنی ہیئت کے لحاظ سے لطیف اور قوی ہیں۔اور کائنات کی بہت سی اشیاً اسی ہیئت میں لطافت رکھتی ہیں۔تو ضروری ہے کہ انسان میں بھی ان لطافتوں کا وجود جوہر کی حیثیت میں موجود ہو۔

ہم انسانی وجود کو ایک مادی اور ٹھوس شکل میں محسوس کرتے ہیں۔جو بجائے خود جوہر کا مرکب ہے۔مگر جہاں ایٹم اور لطیف جواہر کا تعلق ہے۔وہ یہ چیز ثابت کرتا ہے۔کہ انسان میں یہ لطیف طاقتیں بھی موجود ہیں جن سے انسانی زندگی برقرار ہے۔اور انکے خواص واثرات بھی جوہر ہونے کی حیثیت میں بدستور ویسے ہی ہو سکتے ہیں جیسے اثرات ان چیزوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اگر انسان ان جواہر کو بجائے خود روبکار لائے۔تو انسان میں بذات خود اتنی طاقت ہو سکتی ہے کہ وہ ایٹم سے زیادہ کسی چیز کو فنا کر سکتا ہے۔سورج سے زیادہ تابانی و تپش پیدا کر سکتا ہے۔آگ۔ ہوا۔پانی کائنات کی ہر مخلوق پر حاوی ہو سکتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے۔کہ انسان ایک ایسی روح (جواہر) سے معلول ہے۔جس میں یہ تمام ایٹمی۔شمسی [1] اور مادی قوتوں کے جواہر کا مرکب بدرجہ اتم و کامل موجود ہے۔اور اسی روح سے اسکی زندگی برقرار ہے۔اس علت کو مجسم روح سے

[1] سورج زمین سے باہر ہے۔اسکا جوہر زمین میں نہیں۔لیکن انسان میں اسکا بھی جوہر ہے۔(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تعبیر کیا جائیگا۔ کیونکہ اسکی ہیئتِ ابتدائی مادہ سے قوی۔ لطیف اور تابانی ہے۔ یہی روح انسان کے وجود کا پہلا بنیادی نقطہ ہے۔ اس روح کے ظاہر ہونے کا کوئی تعدد وتعین نہیں بلکہ ازل سے معلول در معلول[1] لطیف ہیئتوں (شکلوں) میں چلی آتی ہے۔ صرف خاکی جامہ پہننے سے یہ مادی رنگ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) یہ جوہر اسکے ابتدائی وجود میں پایا گیا ہے۔ کیونکہ انسان سورج کے اثرات کو بھی حاصل کر رہا ہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا ابتدائی وجود وہ جوہر ہے۔ جو زمین کے تمام جواہرات سے قوی ہے۔ اسکی ترکیب یہی ہوسکتی ہے۔ کہ جب زمین کرۂ نار سے علیٰحدہ ہوئی اسکی طاقت اُن اجزاٗ کے مانند بلکہ ان سے قوی صورت میں تھی جو کرۂ نار سے علیٰحدہ ہو کر منتشر ہوئے۔ گویا زمین تمام اشیاٗ سورج۔ چاند۔ ستارے وغیرہ سے تمازت وقوت سے قوی تھی۔ آخری مرحلہ پر جبکہ کرۂ نار منتشر ہوا۔ تو زمین میں کرۂ نار کی مانند سب سے زیادہ قوت تھی اور باقی اجزاٗ کے ساتھ زمین میں بھی کشش تھی تمام اجزاٗ نے اپنے مقام معین کے مطابق ایک دوسرے سے کشش کا تعلق پیدا کیا زمین میں سرد ہونے کے بعد اتنی ہی کشش باقی رہی جس سے اسکا تعلق باقی چاند۔ سورج اور ستاروں سے باقی رہا۔ زمین میں وہی قوتیں موجود تھیں جو باقی تمام اجزا میں تھیں۔ چونکہ باقی اجزاٗ میں تمازت و تابانی قائم رہی۔ اور زمین سے کم ہوئی اسلئے بمقابل اور اجزاٗ کے زمین میں روئیدگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اور زمین سے ان تمام اجزاٗ کی قوتوں کے مطابق ہی پیدائش کا سلسلہ جاری ہوا۔

گویا زمین میں وہ پیدائش جو جوہر اعلیٰ کی حیثیت میں موجود تھی انسان کی شکل میں نمایاں ہوا۔ باقی کم درجہ قوتیں عام حیوانات۔ نباتات وغیرہ کی شکل میں نمودار ہوئیں۔ صرف وجود انسانی نے اپنی اصلی حالت میں جوہر اعلیٰ کی صورت میں تمام اجزاٗ کے مرکبات لیکر ظہور کیا۔ اسلئے اس میں سورج اور دیگر اجزاٗ کے مرکبات ہونے لازمی ہیں۔ جن سے وہ بعد میں بھی تاثرات حاصل کر لیتا ہے۔ یعنی انسانی جوہر تمام اجزاٗ کرۂ نار سے افضل وقوی ہے۔

[1] معلول در معلول سے مراد یہ ہے۔ کہ جب بھی ایک نورانی حصۂ نور منتشر ہوا۔ اسکا ایک حصہ مثل زمین کے قوی رہا۔ اور یہ سلسلہ ہر تقسیم میں جاری رہا یہاں تک کہ زمین کا وجود ظاہر ہوا۔ گویا وجودِ انسانی کا جوہر ہر تقسیم کے بعد قوی حصہ میں منتقل ہوتا رہا۔ اور اسکا جوہر ہر قوی حصہ نور سے ہی معلول ہوتا رہا مثلاً ایک (۱) کے دس حصے ہوئے نو (۹) منتشر ہوئے۔ ایک (۱) اپنی حالت میں قوی صورت میں رہا پھر اسی (۱) کے حصے منتشر ہوئے پھر ایک (۱) حصہ اسکا بھی قوی رہا پھر اسی ایک (۱) کے حصے ہوتے رہے۔ اور اصل کا ایک حصہ باقی رہا ہر تقسیم میں ایک (۱) حصہ قوی صورت میں باقی رہ جاتا یہاں تک کہ زمین ایک (۱) حصہ کی صورت میں باقی رہی اسی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں ظاہر ہوئی ہے۔اسکی نسبت ہر انسان کے ساتھ ابدی ہے۔جیسے ایک دانہ سے قرن ہا قرن (سالہا سال) سے درخت کا وجود چلا آتا ہے۔اسی طرح انسان اپنی پیدائش کے وقت اس روح سے زندہ نہیں ہوتا بلکہ اسی روح سے آدم کی بناٗ ہوئی اور اسکا سلسلہ بدستور چلا آتا ہے۔یہی ایک روح مسلسل۔مختلف انسانی شکلوں میں چلی آرہی ہے۔اسکا وجود ایک ہی تھا اور ہر انسان کی زندگی اسی ابتدائی روح سے وابستہ چلی آتی ہے۔جب ہم انسان کی ابتداٗ پر نظر ڈالتے ہیں۔تو ہمیں ایک لطیف زندگی کا ضرور پتہ چلتا ہے۔دنیا کے قائم ہونے سے پہلے ایک کرہٗ نار (ناری ماحول) تھا جو اس تمام کائنات کی علت تھی۔ہر شے کی علت ایک لطیف نور سے واقع ہوتی ہے اور جب یہ نور تنزل کی طرف آیا۔تو اسکی ہیئت نور اور مادہ کی درمیانی ہیئت میں آنی ضروری ہے۔مادہ کو اگر قوت دی جائے تو اسکی ہیئت ناری ہوگی۔''نار'' کو اگر قوت دی جائے تو اسکی تیزی نور میں مبدل ہوگی۔ چونکہ ہم ہر شے میں زندگی کے آثار پاتے ہیں۔اور اصل نور بھی مجسمہ زندگی ہے۔کیونکہ اسی نور کا ایک ذرہ ہمارے وجود خاکی کو زندگی بخشتا ہے۔مادے سے ماوراٗ لطیف نور ایک مکمل زندگی کا ماحول ہے۔جہاں نور کا تعلق ہے۔وہاں نوری زندگی ہے۔جس زندگی کو ملائکہ کے تمثیلی نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ماوراءِ خاک و نار اوپر کے نور میں ایک ماحول ہے اور اس ماحول میں نوری مخلوق ہے۔ جیسے زمین خاکی ایک ماحول ہے یہاں بھی مخلوق ہے اور یہ مخلوق اُسی نوری مخلوق کے ایک حصہٗ نور سے زندگی حاصل کئے ہوئے ہے۔اسی طرح نوری ماحول میں بھی نوری مخلوق ہوسکتی ہے۔اور جب یہ نور Analize ہوکر پھیلا تو اسکی تابانی مختلف حصوں میں منقسم ہوگئی۔تو اسکے نور میں بھی تقسیم ہوئی ہر ذرہ مثل آفتاب کے تابانی نہیں رکھتا اسی طور میں نور کی منقسم تنزلی ہیئت ایک طرف نوری ماحول میں تقسیم ہوئی اور ایک حصہ کرہٗ نار (ناری ماحول) کی صورت میں آگیا۔اسکی مثال آفتاب و ذرہ کی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) حصہ (ا) کا جوہر اعلےٰ انسان بنا یعنی انسان کی ابتداٗ ـــــ روح۔روحِ حیوانی بنی۔اور یہی روح۔انسان کی بنیاد ہے۔جو خود زمین کے منتشر اجزاٗ اپنے میں جذب کرکے انسانی وجود میں متشکل ہوئی۔جسے آدم کے نام سے پکارا گیا۔

ہوگئی۔ چونکہ زندگی ہر ماحول کے ساتھ ہے۔ اسلئے اس ناری ماحول میں بھی زندگی ہے۔ اسی ناری زندگی کو ایک مخلوق سے موسوم کر کے نور اور نار کے درمیانی مخلوق قرار دیا گیا۔ ایک طرف نور سے قریب بھی دوسری طرف خاک سے متعلق ہے۔ یہ مخلوق ایک طرف مرئی [1] ہونے کی قوت بھی رکھتی ہے۔ دوسری طرف غیر مرئی بھی ہو سکتے ہیں۔ انہیں ''جن'' کے تمثیلی نام سے پکارا گیا۔ چونکہ اس کرۂ نار کا سورج چاند ستاروں میں منتشر ہونے کے بعد بعد از تقسیم ایک ہی حصہ رہ گیا جس نے اپنی ہیئت سرد ماحول ہونے کی وجہ سے خاکی صورت اختیار کی اسلئے اس مخلوق کا مقام بھی با اعتبار تخلیق ناری ہے با اعتبار مقام اسکا مقام بھی اسی زمین (دنیا) پر ہے۔ یہ اپنی قوت کے لحاظ سے پوشیدہ بھی رہ سکتا ہے۔ پرواز بھی کر سکتا ہے۔ اس دنیاوی فضا سے نوری فضا کے باہر تک بھی پرواز کر سکتا ہے۔ یہ بھی انسان کی طرح زمین پر مرئی صورت میں رہ کر بھی زندگی بسر کر رہا ہے۔

ایک جسیم درخت کی علت ایک دانہ ہے۔ دانہ بجائے خود ایک زندگی رکھتا ہے۔ اگر دانہ میں زندگی نہ ہو تو زمین میں رہ کر یہ اپنی عروجی ہیئت میں آنے کیلئے زمین سے کوئی مواد حاصل نہیں کر سکتا بلکہ گل سڑ کر خاک ہو جائیگا۔ زندہ ہونے کی صورت میں ہی اسکی نشو و نما ہوتی ہے۔ جب ایک درخت کا وجود قائم ہوتا ہے۔ درخت ہونا ہی دانہ کی زندگی کی دلیل ہے۔ اسی طرح کائنات کے جملہ موجودات میں ایک زندگی ہے۔ انسان اور جملہ مخلوق کی زندگی ہی اسکی علت کی مجسم زندگی ہونے کی دلیل ہے۔ اور وہ علتِ لامحدود اپنی انتہائی لامحدودیت میں زندہ اور دائم

---

[1] مرئی ایک ایسا لطیف پیکر ہے جو مادی حس میں محسوس نہیں کیا جاتا۔ اسکا وجود ہمارے قریب ہونے کے بھی ہمیں محسوس نہیں ہوتا۔ اور لطیف ہونے کی حیثیت سے یہ مادی وجود پر غالب ہوتا ہے۔ چونکہ اسکا وجود لطیف ہے۔ اسلئے لطیف ہونے کی صورت میں اسے ماوراءِ ادراک تک بغیر کسی وسیلہ کے پہنچنے میں آسانی ہے۔ لطیف ہونے کی حیثیت سے اس پر بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اصل تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اسکے مقابل انسان چونکہ اسقدر لطیف نہیں اسے خصوصی طور پر نورِ ازلی کا ایک حصہ۔ نورِ ازلی کے ادراک کرنے کے لئے عطا ہوا۔ اسوجہ سے اس عطا کے بموجب اسے اس ناری مخلوق پر بھی فوقیت حاصل ہے۔

وقائم ہے۔ کیونکہ معلول کی ہر صفت علت میں بدرجہ اکمل واتم موجود ہوتی ہے۔

زمین کی پیدائش اسی علت سے معلول ہے۔اور خصوصاً انسان مجموعہ جہاں (مجموعہ موجودات) اور اسکی روح اسی لطیف مادہ کا قوی جز ہے۔ جب انسان کی تخلیق[1] شروع ہوئی۔ وہ زمین میں ایسی جگہ پر ہوئی جہاں زمین کے تمام جواہراتی اجزأ من کل الوجود موجود تھے۔اور اسی لطیف قوت نے اپنی زندگی کو اسی جگہ نشو ونما کیلئے پایا۔اور زمینی مواد سے گوشت و پوست کی شکل

---

[1] اس تخلیق کی ابتدائی ترکیب یوں ہے:۔
جسوقت علت لامحدود میں اسکے ارادہ کے تحت تحریک ہوئی کہ اس لا انتہا وجود سے ایک مخلوق پیدا ہو تو اسی نور میں ایک رنگت نمودار ہوئی گویا نور ازلی وہی تھا صرف ایک شکل یا رنگت دینے سے اسکی ہیئت میں ظاہر کیا۔ یعنی یہ نور ازلی سفید رنگ میں تھا۔تحریک کے بعد اسمیں ایک لا انتہا وسیع وجود کا سیاہ داغ ظاہر ہوا۔نور کا وجود نہیں ہوتا صرف رنگوں سے اسکی شناخت ہوسکتی ہے۔اسلئے سیاہ نور وہ نور ہے جو انتہائی تمازت وتابانی کا حامل ہے۔ پھر ارادہ ازلی نے اسی نور کو بنیادی طور لیکر اسی نور کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے مختلف قسم کے مقامات و ماحول بنائے۔ان مقامات کا اندازہ لگانا انسان کے ادراک سے باہر ہے۔ جب تک کہ انسان مشاہدہ نہ کرے ان کیفیات کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ کیونکہ اس نور کی وسعت اسکی ابتدائی ہیئت کے لحاظ سے ماوراً ادراک ہے۔اور جس قدر ماوراً ادراک کیفیات تا علت لامحدود واقع ہیں اسی نور سے بنائے گئے۔ یہاں تک کہ اس نور کی کیفیت اسکی آخری تنزلی ہیئت پر پہنچی یعنی اسکے آخری حصہ نور نے منقسم ہو کر ان کیفیات کو بنایا جو ہمارے قریب ہیں۔ جن کیفیات کے خیالی نام ہمارے تفکر کی بحث میں بھی آتے ہیں جیسے آسمان۔ ملائکہ وغیرہ۔اسی آخری نوری حصہ کی منقسم شدہ ہیئت کا ایک حصہ کرۂ نار کی تنزلی شکل میں متشکل ہوا۔ یہ تمام نوری ماحول مجسمہ زندگیاں ہیں انہیں کسی مادہ کی معاونت یا لاگ کی ضرورت نہیں۔زندہ ہونے کی صورت میں یہ قوتیں اپنا فعل کرنے میں کسی قسم کی مجبوری یا پابندی کے محتاج نہیں کیونکہ زندگی محرک ہوتی ہے۔اسی طرح یہ مادی ماحول بھی اپنی ہیئت کے مطابق ایک محرک زندگی کا حامل ہے۔ جب اس ناری ماحول کے منتشر ہونے کا وقت آیا۔تو اس سے بھی کئی ماحول پیدا ہوئے جنہیں ہم انکی ہیئتوں میں اپنے قریب پاتے ہیں جیسے سورج (یہ بھی ایک نہیں بلکہ کئی ہیں صرف ایک سورج جو اپنی آخری تنزلی کیفیت میں ہے ہم سے نزدیک ہے) چاند۔ستارے اور دیگر آسمانی اور بیرونی فضا کی مخلوق و ماحول اور اسی کرۂ نار کی آخری تنزلی کیفیت یہ زمین ہے۔ جو اپنی ابتدأ میں اسقدر گرم تھی جیسے آوے سے نکلا ہوا آگ کی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں اپنے وجود کو قائم کیا۔ بالآخر انسانی شکل میں متشکل ہوا۔ اسکے علاوہ جتنی بھی چیزیں دنیا میں موجود ہیں سب اسی زمین سے اسی صورت میں پیدا ہوئیں۔ چونکہ انسانی زندگی ایک مخصوص نظام کے اندر بن رہی تھی اور زمین میں ایک انسان کا وجود خصوصی ہونا منظور تھا اسلئے اسنے انسانی شکل

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) مانند ایک برتن ہوتا ہے۔ ہر کیفیت کی تقسیم کا طریقہ یہی رہا کہ مختلف کیفیتوں میں منقسم ہو کر ایک حصہ آخر تنزلی ہیئت پر آ تا رہا جیسے نور سے اسکی آخری تنزلی ہیئت کرۂ نار ہے اسی طرح کرۂ نار کی آخری تنزلی کیفیت زمین ہے۔ اور باقی مخلوق سورج چاند ستارے وغیرہ میں تیزی ہے صرف زمین چونکہ آخری کیفیت ہے۔ اسنے تنزل کی طرف رخ کیا۔ اسکی ابتدائی ہیئت بھی اسی طرح تابانی اور تیزی میں شدت رکھتی تھی مگر اسکا قرار ایسے مقام پر ہوا۔ جہاں اسکی حرارتی ہیئت میں آہستہ آہستہ کمی آنے لگی۔ یعنی یہی زمین جب یہ اپنی شدت میں ناری طبقہ کی ہیئت میں تھی اس پر بخارات کا وجود ہوا اور بادلوں کی شکل میں نمودار ہوا۔ بخارات چونکہ ہوا اور پانی کا مجسمہ ہیں اسلئے ان سے پانی نمودار ہوا۔ اور اس پانی نے زمین کی سطح پر پڑ کر اسے ٹھنڈا کر دیا یہاں تک کہ زمین نے پانی کے وجود سے سیراب ہو کر خاک کی ہیئت اختیار کی۔ پانی کی مقدار اسقدر تھی کہ تمام روئے زمین پر پھیل گیا۔ اسمیں لہروں کی وجہ سے کافی عرصہ تلاطم رہا اور زمین کی مٹی کو گھول دیا۔ اسطرح زمینی مواد کے تمام اجزا پانی میں مل گئے۔ آخر بیرونی تمازت وتپش کے اثر سے پانی خشک ہوتا گیا اور پانی ایک نشیبی مقام پر جمع ہو گیا جہاں اسکے پانی میں ملے ہوئے تمام اجزا اکٹھے ہو گئے اور اس نے دلدل کی صورت اختیار کی چونکہ پانی میں تلاطم ہونے کی وجہ سے اسکے ساتھ زمین کی مٹی شامل تھی لہذا یہ مہین مٹی لیسدار ہو کر ایک جگہ جمع ہو گئی جس میں تمام زمینی مواد کے جواہر موجود تھے۔ جیسے ایک برتن میں مٹی ڈالکر اسے ہلایا جائے تو مٹی کے باریک ذرات پانی میں مل جاتے ہیں جب یہ پانی کسی دوسرے برتن میں ڈالکر خشک کیا جائے تو اسکی تہ میں پانی میں ملے ہوئے ذرات اکٹھے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں یہ مہین مٹی کیا شے تھی۔ یعنی اسی زمین کے جواہرات کا نچوڑ تھا۔ جس نے گل سڑ کر ایک مرکب قائم کیا اسی دلدل میں اپنی زندگی کی افزائش شروع کی۔ باقی زمین میں مختلف قسم کے اجزا پیدا ہوئے یہ زمین کی خاصیت سے پیدا ہوئے اور ہر خاصیت نے ایک ایک شکل اختیار کی جو آخر۔ نباتات۔ جمادات۔ حیوانات کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اور انہیں خاصیتوں نے دنیا پر پھیلاؤ کیا ایک طرف ایک انسان کی نشو ونما ہوتی رہی دوسری طرف باقی مخلوق کی نشو ونما ہوتی رہی۔ کہیں کیڑوں کی شکل میں حیوانات کے وجود پیدا ہوئے کہیں پودوں کی شکل میں درخت نمودار ہوئے کہیں زمین نے ابالا کھا کر اپنی گرمی کو ابھارا تو پہاڑ پیدا ہوئے۔ کہیں ہلکے ابھار میں زمین (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

باعتبار اپنی ہیئت ومرکب کے پائی۔ باقی مخلوق منتشر جواہر سے پودے۔ کیڑے۔ وغیرہ کی شکل میں نمایاں ہوئی۔ ہر کیڑے۔ ہر پودے نے اپنے ماحول کے مطابق ہیئتیں بدلیں۔ کہیں چرند کہیں پرند۔ کہیں نباتات۔ کہیں جمادات۔ مختلف اشکال میں بننے لگیں آخر ہر تکمیل کے بعد ہر مخلوق نے ایک شکل مکمل اختیار کی یہی وجہ ہے کہ ہر مخلوق (جوہر) جزوی حیثیت سے انسان (جواہر مرکب) کیلئے کارآمد ہے۔ انسان نے کل کی حیثیت سے زندگی حاصل کی اور باقی مخلوق نے جز کی حیثیت اختیار کی۔ ہر شے میں ایک علیحدہ علیحدہ خاصیت جزوی حیثیت سے ہے اور انسان میں جز کی تمام خاصیتیں موجود ہیں۔ اور یہی علت انسان کی زندگی کی اولین بنیاد ہے۔ اور اسی علت کو روح کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

چونکہ انسان کے ایک وجود[1] کیلئے ایک ہی طریقہ کی ضرورت تھی اسلئے سلسلہ تناسل کا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) پھٹ کر چشمے اگلنے لگی۔ اس کاروائی میں لاکھوں سال گزرتے گئے کہیں مہیب اور جسیم جانور (صورتیں) بننے لگے کہیں لاکھوں سال کے نشوونما سے مہیب۔ درخت پیدا ہوئے اور زمانہ کے بناؤ بگاڑ نے مختلف وقتوں میں فنا کا کام بھی شروع کیا۔ بالآخر ایک دور وہ آیا جب انسان نے ایک مکمل صورت انسانی اختیار کی اور اسکے ماحول میں ان اجزا کا وجود قائم رہا جو اسکی ضرورت کے لئے سودمند تھیں باقی مہیب اور مہلک صورتیں اسی بناؤ اور بگاڑ میں فنا ہو کر زمین میں مل گئیں جنہوں نے مختلف شکلوں میں منقسم ہو کر مہلک صورتیں اختیار کیں مگر یہ صورتیں اس ہیئت پر تھیں جو انسان کی طاقت سے باہر نہ ہوئیں اور انسان ان پر غالب قوت پر رہا۔ جیسے شیر۔ سانپ اور دیگر مہلک قسم کے حیوانات وغیرہ۔ اسی طرح ہر مخلوق نے ایک منقسم صورت اختیار کی جو انسان کی قوت پر غلبہ پانے کی قدرت نہ رکھتے تھے یہی تخلیقِ کائنات کی ابتدائی ترکیب ہے جو لاکھوں کروڑوں سال تک جاری ہونے کے بعد ایک پابند نظام کے ماتحت جاری ہوئی۔ کائنات کے گزشتہ قرنوں (زمانہ) کے واقعات پر چھان بین کرنے سے تحقیقات کے بعد آج بھی اس ترتیب کا پتہ چلتا ہے کہ زمانہ کے بناؤ بگاڑ میں کئی قسم کی پیدائشیں ہوئیں جنکی ہیئتوں کو دیکھنے سے (جیسے کہ آج کی سائنس (محققین آثار قدیمہ)) زمانہ قدیم کے کھنڈرات اور انسے نکلے ہوئے ڈھانچوں سے مشاہدہ کرا رہی ہے) انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

[1] انسان کی وجودی ترکیب میں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کل کائنات کے جواہر کا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک نیا طریقہ نر و مادہ کا ظہور میں آیا۔روح اور مادہ نے نر و مادہ کی صورت میں انسان کو جنم دیا۔ اسلئے آئندہ سلسلہ بھی ایک ارادہٗ ازلی کے ماتحت نر و مادہ کی صورت میں جاری ہوا۔نر و مادہ کی صورت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کا ایک جواہر مادہ کے رحم میں زمینی مواد سے خون کی صورت میں اپنی نشوونما کیلئے اپنے وجود کی افزائش کرتا ہے۔حالانکہ اس زندگی میں شعور نہیں ہوتا۔مگر چونکہ ارادہٗ ازلی [1] اس میں شامل ہے۔اسلئے ہر مخلوق ایک مکمل نظام کے ماتحت ترقی کر رہی ہے۔اور قیام دنیا تک یہی سلسلہ بدستور جاری رہیگا۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) مجموعہ ہے اور اس مجموعہ کو ایک لطیف روح نے حاصل کر کے ایک انسانی شکل اختیار کی جواہر مرکب ہونے کی حیثیت سے جہاں انسان اشرف درجہ رکھتا ہے۔وہاں اسکے لئے ایک ہی لطیف زندگی کا وجود ہونا ثابت ہے۔انسانی تخلیق کی ترکیب ہی اس بات کی دلیل ہے۔کہ اجسام انسانی کی ابتدأ ایک ہی لطیف ذرہ سے ہوئی ہے۔اگر لاتعداد زندگیاں ہوتیں تو پھر انکا ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر مکمل (جواہر مرکب ہونا) جواہر مرکب کا مواد حاصل کرنا مشکل تھا۔لہذا یہ ضروری ہے کہ انسان کی تخلیق کے لئے ایک ہی لطیف وجود پیدا ہوا۔ جس نے زمین سے اپنی قوت حاصل کر کے ایک انسان کی ہیئت اختیار کی۔ذرہٗ لطیف اور مادّہ یکجا ہونےسے ضروری تھا کہ اس ترکیب سے نر و مادہ دونوں کا وجود ظاہر ہو۔کیونکہ اسکا مواد اِس مرکب میں موجود تھا اسی لطیف ذرہ اور مادہ خاکی میں نر و مادہ کی خاصیت تھی اسلئے ایک ذرہ سے دونوں جسموں کی پیدائش ہوئی جس سے نر و مادہ کی صورت میں آئندہ سلسلہ تناسل شروع ہوا۔

[1] ہم دیکھتے ہیں۔کہ عام مخلوق اپنی زندگی کا سامان بغیر ارادہ بغیر طلب کے حاصل کر لیتی ہے۔اور انسان اپنے ارادہ اور اپنی طلب کے مطابق سامان زندگی حاصل کر رہا ہے۔ہر مخلوق کیلئے اسکا سامان زندگی ہر جگہ میسر ہوتا ہے۔ حیواناتی مخلوق کو ایک شعور ہے جس سے وہ اپنی زندگی کا ہر جگہ سامان حاصل کر لیتی ہے۔اسکے لئے اتنا ہی شعور ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ہر مہلک حادثہ سے آگاہ ہو اور اپنا سامان زندگی پا سکے۔

مگر انسان اسکے علاوہ اپنے پسند اپنے ارادہ سے ہر سامان زندگی کو حاصل کر لیتا ہے۔اسکے لئے انسان کا شعور ایک وقت معین پر اپنے شعور سے کام لیتا ہے۔مگر اس سے پہلے جبکہ اسکا شعور مکمل نہیں ہوتا یہ اپنے ارادہ اپنی پسند سے کوئی سامانِ زندگی حاصل نہیں کر سکتا۔فطری طور پر اسے سامان زندگی میسر ہوتا ہے۔مگر کسی ارادہ کے ذریعہ ہی بغیر شعور کے یہ اپنی زندگی کا سامان حاصل کر لیتا ہے۔مثال کے طور پر اسی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہماری زندگی کی نمود کا سبب ایک نورانی ذرہ ہے۔اسلئے ہمارے وجود کیلئے اس نور کا وجود مقدم ہے۔اور جب خالق کا ارادہ شامل ہو۔تو وہ ''کن'' (ہوجا!) کے ارادہ سے اپنے نور کو ہر رنگ میں بھی انسانی جسم عطا کر سکتا ہے۔اسلئے یہ بھی لازم ہے۔کہ انسان بغیر زمین میں سمانے بغیر نر کے مادہ سے ظاہر ہو۔نر کی صورت میں وہ خود موجود ہے۔لطیف ہونے کی صورت میں اسے کسی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ابتدائی زندگی میں جبکہ اسکے تمام اعضا نامکمل تھے نہ ہاتھ تھے نہ پاؤں تھے۔نہ دماغ تھا تاوقتیکہ اسکے تمام اعضے نے اصل مکمل ہیئت اختیار کی یہ اپنے ارادہ اپنے مطلب سے سامان زندگی حاصل کرنے سے مجبور تھا۔اسوقت اسکا ارادہ اسکی پسند کا کام نہیں کر رہی تھی۔مگر فطری طور اسکی نشوونما کسی سامانِ زندگی سے ہوتی رہی۔چونکہ انسانی زندگی کے حصول میں اعضے وشعور کا مکمل ہونا ضروری ہے۔اسلئے بغیر ان ذرائع کے اگر انسان سامانِ زندگی پالیتا ہے۔تو کسی نظام اور کسی ارادۂ خاص کی کارفرمائی ضرور ہے۔جو اسکے سامان زندگی کو فراہم کر رہی تھی۔حتیٰ کہ اس نے انسانی شکل اختیار کی اسکے بعد سلسلۂ تناسل میں مادّہ کے پیٹ (رحم) میں بھی ایک نظام موجود ہے۔کہ انسان منہ سے کھاتا ہے ہاتھ کو کام میں لاتا ہے۔اپنی پسند کی چیز کو حاصل کرتا ہے۔مگر رحم میں اسکے پاس ان ذرائع میں سے کوئی شے بھی اسکے سامانِ زندگی میں معاون نہیں۔جس چیز کو یہ اپنے شعور کے ہوتے پسند نہیں کرتا وہی چیز اسکی غذا ہوتی ہے۔یعنی وہی خون جسکی بندش بعد تولد نسل مادّہ کے لئے مضر ہے۔انسان کی پیدائش میں اسکی غذا ہوتی ہے۔چونکہ اسکے ہاتھ منہ اور دیگر اعضے مکمل نہیں ہوتے۔تو یہ ایک نالی کے ذریعہ جو اسکے معدہ کے ساتھ ہوتی ہے۔اسی ذریعہ سے یہ خون جس میں تمام زمینی مواد کے جواہر ہوتے ہیں خود بخود اسکے معدہ میں جاتا ہے۔جس سے اسکی نشوونما ہوتی ہے۔مادہ کے رحم میں جائے قرار۔حیض سے خوراک کا پانا اور خود بخود اسکے وجود کی افزائش کا سامان۔یہ چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ فطری طور انسان کی زندگی کیلئے ایک مترتب نظام موجود ہے۔اور نظام کا ہونا ایک ارادۂ ازلی کی دلیل ہے ـــــ یہ امر مسلمہ ہے کہ ایک غیر شعوری غیر ارادی پتھر جب تک کہ کسی ارادہ سے زمین سے اوپر نہ اٹھایا جائے اسکا زمین سے اونچا ہونا قطعی ناممکن ہے۔اسی طرح ایک شعور وارادہ رکھنے والے انسان کو اسکی غیر شعوری غیر ارادی حالت میں جب تک کوئی ارادہ اسے سامان زندگی دیکر اسکی زندگی کو افزائش کی طرف نہ لے جانے والا نہ ہو اسکا زندگی حاصل کرنا ناممکن ہے۔انسان میں اسکی تکمیل پر مکمل شعور وارادہ حاصل ہوتا ہے۔اور ان ہر دو کا مواد اسکی علت میں موجود ہونا لازمی ہے۔اسلئے علت لامحدود میں بدرجہ اتم یہ ارادہ و شعور موجود ہے۔اور اسی ارادۂ ازلی سے انسانی زندگی وابستہ ہے۔یہی کیفیت ارادۂ ازلی کہلاتی ہے۔

جگہ بھی قرار پکڑنے میں کوئی وجود کوئی ذریعہ روکاوٹ نہیں پیدا کرسکتا ہے۔ یہ چیز ارادہ ازلی سے کچھ بعید نہیں۔ اور یہ چیز بھی یقینی ہوسکتی ہے۔

الغرض یہ ایک روح ہے جو انسانی نظام میں کارفرما ہے۔ اور اسے جواہراتی حیثیت میں انسان کو باقی مخلوق پر شرف حاصل ہے۔ اور باقی مخلوق میں جزوی حیثیت سے یہ روح کارفرما ہے۔ گویا باقی مخلوق کی تمام روحیں اسی روحِ انسانی کی ایک ایک جز ہے۔ ورنہ اگر عام مخلوق میں بھی یہی کلی روح ہوتی تو اسکا نتیجہ بھی کل کی حیثیت سے ظاہر ہوتا۔ اور یہ چیز اس بات کی شاہد ہے۔ کہ انسان کسی نظام کے تحت مشرف کیا گیا۔ جہاں انسان مشرف و برتر ہے۔ وہاں اسکے لئے موجودات کی ہر شے سے نفع حاصل کرنے کا اختیار[1] ہے۔ مگر یہ بات قابل غور ہے۔ اس سے اسکی تخلیق میں پیدائش کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ جیسے عام مخلوق کی پیدائش ہوئی سوائے اسکے کہ ایک نظام کے ماتحت ایک مقرر ارادہ کے تحت یہ ان سمع بصر۔ اور شعور سے عام مخلوق کی خدمات سے اپنی پسند کے مطابق اپنی زندگی کیلئے سامان حاصل کرلیتا ہے۔ یہ قویٰ مادی ہونے کی حیثیت میں ماورا کا ادراک نہیں کرسکتے البتہ تفکر کیلئے انہی قویٰ میں سے ذہن تفکر کی تحریک دیتا ہے یہی ذہن ہے جو انسان میں شعور کی شکل میں ہے تفکر کی تحریک کا ایک آلہ ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عام مخلوق کے مقابلہ میں اور بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہر شے سے انسان ہی کیوں مستفید ہورہا ہے؟۔ عام مخلوق خود بخود کسی نظام میں پابند ہے۔ انہیں ہر ماحول میں اپنی زندگی کا سامان مل رہا ہے۔ وہ صرف زندگی کے برقرار رکھنے کیلئے ہے۔ اور یہ زندگی انسان کیلئے وقف ہے؟ باقی مخلوق میں کسی نیک و بد کی تمیز نہیں۔ انکے سپرد سوائے اسکے کوئی کام نہیں کہ وہ انسانی زندگی کے قرار میں مدد ہوں۔ اسکے برعکس انسان ہر شے پر قادر ہے۔ تعقل رکھتا ہے۔ ہر نفع نقصان کو جانچنے کی تمیز ہے۔ ایک

---

[1] انسان اصولی طور پر کسی زندگی کو ہلاک کرنے کا مجاز نہیں۔ مگر اپنی سے کم تر مخلوق کی زندگی پر وہ قادر ہے۔ کہ ہر جاندار کو اپنی ذات کے نفع کیلئے ہلاک کرتا ہے۔ اور اصول اسے کسی گرفت میں نہیں لاتا۔ بلکہ اسکا فعل حق بجانب سمجھا جاتا ہے۔

مستقل ارادہ رکھتا ہے۔اور اپنی مرضی سے جو چاہے کرتا ہے۔تمام مخلوق پر حاوی ہے۔ہوا۔پانی سمندر۔بیرونی فضا پر قبضہ کیئے ہوئے ہے۔اسکی وجہ انسان کی خصوصیت۔اور یہ خصوصیت اس بات پر دال ہے۔کہ اسکے ذمہ کوئی خصوصی کام ہے۔جہاں انسان موجودات کی تمام اشیأ پر قادر ہے اور اسے ہر مخلوق پر فوقیت و بادشاہت حاصل ہے۔نور ازلی عطا ہونے کی صورت میں اِسے نورانی مخلوق پر بھی بادشاہت حاصل ہوسکتی ہے۔اور وہ ماورأ ادراک پر بھی سبقت حاصل کیئے ہوئے ہے۔اسلیئے یہ ضروری ہے۔کہ اسے ماورأ ادراک کا احساس کرنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی۔چونکہ یہ ماورأ ادراک محسوس نہیں کرتا۔اسلیئے اسکا کام یہی ہے کہ وہ ماورأ ادراک کا درک کر کے اصل علت لامحدود تک رسائی حاصل کرکے اس تک پہنچ جائے جب انسان کا وجود (Automatically) فطری طور مشرف ہے۔اور دنیا پر اسے اپنی زندگی کے نظام میں کوئی ڈیوٹی (کام) بھی سپرد نہیں تو پھر یہی ہوسکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص کام کیلیئے ایسی پوزیشن دی گئی ہو۔وہ یہی ہے کہ اصل علت لامحدود تک پہنچ جائے۔ایسی صورت میں ایک ایسی روح کا ہونا بھی یقینی ہے۔جو ماورأ ادراک کا جوہر ایک علت لامحدود کے وجود سے ملی ہوئی ایک قوت ہو جو علت لا محدود کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتی ہو۔اور یہی روح ہے جو اسے علت لامحدود سے ہمکنار ہونے کی دعوت دیتی ہے ورنہ بغیر اسکے انسانی قویٰ سمع۔بصر۔ذہن سب بیکار ہوتے ہیں۔اگر ماورأ ادراک کے تعقل کیلیئے روحانی شعور نہ ہو تو مادی شعور جو انسان کو باقی مخلوق کے مقابلہ میں سامان زندگی میں اشرف بنا رہے ہیں۔انکا ہونا بے معنی ہو جاتا ہے۔انسان میں کوئی شے بیکار نہیں۔اپنی ہر قوت کو استعمال کرتا ہے۔اور اس سے ایک نتیجہ پاتا ہے۔اسلیئے اس ماورأ ادراک جوہر سے بھی اس نے علت لامحدود خالق تک پہنچنے کیلیئے تمام ماورأ ادراک ماحول پر حاوی ہونا ہے۔چونکہ زندگی کی روح کی طرح اس روح کی انسان سے کوئی ابتدائی نسبت نہیں۔اور ابتدائی زندگی میں اسکا انسانی وجود میں ہونا قبل از وقت ہے جب تک کہ انسانی وجود اپنی پوری شکل میں مکمل نہ ہو۔لیکن انسانی اجسام کے مطابق انکے روحانی وجود کا قبل از وقت موجود ہونا ضروری ہے۔اس روح کا تعلق علت لامحدود سے قریبی ہے۔اسلیئے تمام نورانی مخلوق بنانے سے قبل یہ روح اپنی قربت کے لحاظ سے

ازل سے ہی بنی (اسکے بعد باقی نورانی مخلوق کے معلول بنے) جب تک دنیا قائم ہے۔انسان کی پیدائش کا سلسلہ جاری رہیگا۔جسقدر بھی انسان پیدا ہونگے ہر انسان کیلئے ایک روح اعلےٰ کا قبل از وقت ہونا ضروری ہے۔باالفاظ دیگر جسقدر بھی روحیں ازل (ابتدأ) میں بنی ہیں اِنکے لئے قبل از وقت ایک مقام نوری میں معین ہونا ضروری ہے انہیں روحوں کی تعداد کے مطابق ایک وجود انسانی پیدا ہوتا ہے۔اور تکمیلِ وجود انسانی پر ہر انسان کی روح اعلےٰ (عقل کل) اسکے وجود میں منسلک ہو جاتی ہے۔اسلئے ہر انسان کیلئے ارادۂ ازلی میں قبل از وقت ایک روح کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جوانسانی وجود کی تکمیل پر صرف ماورأادراک کے تصور حقیقی قائم کرنے کی خاطر انسان میں پیوست کی جاتی ہے۔تاکہ کائنات کی بادشاہت کے ساتھ ساتھ ماورأادراک کی بادشاہت کا بھی ذریعہ حاصل ہو۔یہی وہ روح ہے جسے عقل کل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔جوانسانی وجود سے قبل تمام ماورأادراک مخلوق سے پہلے بنائی گئی تھی اور اس نور کی ایک جز ہے جو تمام ماورأادراک نورانی ماحول ومخلوق کی علت ہے اسی روح سے انسان پر تلاش اصل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔چونکہ یہ انتہائی لطیف ہے۔اسلئے انسانی وجود میں مادی حس سے اسے پہچاننا ناممکن ہے۔بلکہ مادی ادراک اسی روح سے تعقل کرنے کیلئے محتاج ہے۔جب تک یہ روح مادی ادراک کو احساس نہ کرائے مادی حس ماورأ سے بے خبر رہیگی۔اسی روح کے ذریعہ ایک انسان منتخب ہوکر ماورأادراک علت لامحدود تک عرفان (پہچان) حاصل کر لیتا ہے یہی چیز پیغمبر کی صداقت کی دلیل کیلئے پیش کی جاتی ہے۔ اور اس صداقت کیلئے محیر العقول (عقل مادی کو حیرت میں ڈالنے والے) واقعات کا اظہار کیا جاتا ہے۔جو مادی حیثیت سے مافوق الفطرت [1] پوزیشن اختیار کر لیتے ہیں۔

---

[1] مافوق الفطرت۔وہ چیز جو مادی حس کی شناخت سے باہر ہو۔مادی ذریعہ سے اس کام کو نہ سمجھا جائے۔اور مادی اصول کے خلاف اس سے بڑھکر کیفیت ظاہر کرنے والی ہو۔جو چیز مادی ادراک سے باہر ہو جسکا ہونا غیر یقینی ہو۔ اسکا عدم ہونا ضروری نہیں اسلئے مافوق الفطرت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مثلاً۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ زہر ہلاکت خیز ہے۔ جانور۔ خشک لکڑی۔ کنکر۔ غیر شعوری مخلوق ناطق (بولنے والے) نہیں ہو سکتے۔ پانی پر چلا نہیں جاتا۔ ہوا میں پرواز نہیں کی جا سکتی۔ آنکھ کے دیکھے بغیر کسی چیز کی ہیئت کو من وعن بتلایا نہیں جا سکتا۔ بغیر قوت سمع کے سنا نہیں جا سکتا وغیرہ۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جن کا اثر الٹا نہیں ہو سکتا۔ یہ چیزیں اصول اور مادی ادراک کے مطابق اپنا اثر الٹا نہیں دکھا سکتیں۔ اب اگر ان کا اثر الٹا ہو جائے۔ یعنی۔ آگ میں انسان یا کسی چیز کو ڈالا جائے اور آگ نہ جلائے۔ کنکر جانور خشک لکڑی بولنے لگے۔ پانی پر چلا جائے بغیر آنکھ و قوت سمع کے دیکھا اور سنا جائے۔ تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ باوجود اصول کے خلاف ہونے کے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ چیزیں مادی وجود اپنے مادہ کے اعتبار سے نہیں کر سکتا بلکہ کسی خالص اور قوی قوت کے ذریعہ ہی کر سکتا ہے۔ چونکہ یہ قوت ہمارے ادراک سے باہر ہے اسلئے ہم اس قوت کے اور اس فعل سے۔ سوائے عجز اور حیرت کے کچھ نہیں کر سکتے عجز اور حیرت کا تقاضا ہے۔ کہ انسان ایسے معاملہ میں بے بس ہو جاتا ہے۔ اور اپنے ظاہری ادراک سے قائم کیئے ہوئے عقیدے کو کلی طور پر تسلیم کرنے سے مذبذب حالت میں آ جاتا ہے۔ اور مذبذب حالت کا قاعدہ کہ انسان اپنے عقیدے سے پھر کر حقیقت کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب مادی اصول کے خلاف ایک واقعہ کا ظہور ہو جائے تو اُسے یقینی سمجھنے اور حقیقت سمجھنے کیلئے اس واقعہ کا ہونا ہی اسکی حقیقت وجود کی دلیل ہے کہ جب خلاف اصول واقعات کا صدور ہوا تو اس میں بھی کوئی قوت کام کر رہی ہے۔ اسلئے اگر خلافِ فطرت خلاف اصول ایسے واقعات کا ظہور ہو اور مشاہدہ میں آئے۔ تو یہ وہ قوت ہوگی۔ جو ماورأ ادراک سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلئے ماورأ ادراک ایسی شے ہے۔ جو مادی حس سے تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ اور مشاہدہ کی صورت میں اسکا موجود ہونا ضروری ہے۔ مافوق الفطرت واقعات کا صادر ہونا بھی اسی لطیف قوت سے ہے۔ جو خود ایٹم کی قوت سے بدر جہا قوی ہے۔ جب ایٹم ایک چیز کو لمحہ میں ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں تبدیل کرتا ہے تو یہ قوت بھی اسی طرح کر سکتی ہے اور اسکا تعلق اسی قوت سے ہوگا جس قوت میں ابتدائی آثار اور قوی قوتیں موجود

ہیں۔ جو آگ ہوا پانی وغیرہ پر قادر ہو سکتی ہے۔ جو پتھر۔ کنکر لکڑی وغیرہ غیر ناطق مخلوق میں قوتِ گویائی پیدا کر سکتی ہے اسکے لئے زبان۔ کان وغیرہ ہونے کی کوئی قید نہیں کیونکہ وہ لامحدود میں شمار ہے چونکہ یہ چیز مادی حس سے باہر ہے اسلئے اسکی اصلیت تب تک نہیں کھل سکتی جب تک کہ ایک پیغمبر کو تسلیم کر کے اسکے دعوؤں کو تسلیم نہ کیا جائے۔ مافوق الفطرت واقعات کو تسلیم کرنا من گھڑت عقیدہ کی بنا پر نہیں۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ جو انسان کے تعقل اور مادی ادراک سے باہر ہے۔ معجزہ ایک علت لامحدود اور تفکر کیلئے ایک تحریک ہے۔ یعنی انسان پر واضح کرنا ہے۔ کہ جو کچھ مادی حواس سے انسان سمجھ سکتا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں کیجاتی۔ بلکہ انسان کی حیثیت بحیثیت اشرف المخلوقات اسقدر اعلیٰ اور قوی ہے۔ کہ اس سے ایسے واقعات سرزد ہوتے ہیں جو ہر انسان اپنی مادی عقل سے پرکھ نہیں سکتا ہے۔ بلکہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے۔ ایک عظیم الشان قوت وطاقت کا حامل ہے۔ جس سے وہ تمام کائنات پر اپنی ہر مرضی کو پورا کر سکتا ہے۔ جس سے وہ تمام مخلوق ارضی وسماوی (مادی وروحانی) پر حکومت کر سکتا ہے۔ اور ان تمام اسرار سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اپنے سے ماوراٗ کے عالم کو تسلیم کرے اور اسکے لئے اپنی ذات اور کائنات پر تفکر کرے اور اپنی علوی خاصیتوں کو پرکھ کر کام میں لائے۔ اسی لئے پیغمبر تحریک کے طور پر مافوق الفطرت معجزات کا ظہور کرتا ہے کہ انسان صرف کھانے پینے کیلئے ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ کائنات کے ہر ذرہ سے لیکر ایک انتہائی علت پر (جو صرف لامحدود نہ ہو) بھی اپنا تصرف کر سکتا ہے۔

معجزہ کیا ہے؟ معجزہ ایک اشرف المخلوقات ہستی کا اپنی ان خاصیتوں کو روبکار لانے کا ایک ظاہری مظاہر ہے جو انسان میں اسکی خاصیتوں کے لحاظ سے ودیعت کی گئی ہیں۔ اور علت لا محدود کی قدرتِ کاملہ اور ارادہ کے ظہور کا ذریعہ۔ یعنی معجزہ سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ ایک ایسی طاقت بھی ہے جسکی قدرت سے ایسے واقعات کا ہونا یقینی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس میں مادی روحانی شرف پایا جاتا ہے۔ مادی حیثیت سے اس میں ان

تمام قوی اور تابانی قوتوں کا جوہر موجود ہے۔ جو کائنات میں پائی جاتی ہیں ان قوتوں کو اگر انسان استعمال کرے تو ان قوتوں کے ذاتی اثر سے کہیں زیادہ قوت واثر انسان میں موجود ہے۔

مثال کے طور پر انسان کا پیشاب ایک زہریلا مواد ہے۔ اس میں تیزابی مادہ بھی ہوتا ہے۔ بظاہر یہ ایک فضول چیز سمجھی جاتی ہے مگر جوہر کے لحاظ سے اس میں اسقدر تاثیر ہے۔ کہ اگر کسی چیز پر اسکو ایک ترکیب سے ڈالا جائے تو یہ اس چیز کے آر پار گزر کر چھید کر کے نکل جائیگا۔ یہ ایک ادنیٰ فضلہ ہے جسکی یہ خاصیت ہے۔

اسکے علاوہ انسان میں بحیثیت جوہر مرکب ایٹم۔ سورج۔ اور تمام جماداتی جواہر۔ ہائیڈروجن گیس وغیرہ تمامی چیزیں موجود ہیں۔ ان مادی قوتوں کا یہ اثر ہے۔ کہ ایک آن میں۔ حیرت انگیز طریقہ پر اشیأ کو ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں لاتا ہے۔ انسان بحیثیت اشرف المخلوقات اس سے زیادہ حیرت انگیز طریقہ پر ایسا کرنے پر قادر ہوسکتا ہے۔ یہ تو مادی اشیأ کی خاصیتوں کا ظہور ہے۔ جہاں مجسم زندگی (لطیف ونورانی زندگی) کا تعلق ہو وہاں کسی شے کو زندگی بخشنا۔ کسی میں گویائی پیدا کرنا۔ دیگر قسم کے مافوق الفطرت واقعات کا ظہور انسانی خاصیتوں میں ہونا اور انکا ظہور ہونا مبالغہ یا من گھڑت عقیدہ نہیں ہوسکتا۔ پیغمبر اپنی حیثیت مکمل اشرف المخلوقات انسان کی سی رکھتا ہے۔ اور ہر معجزہ اسکی انسانی خاصیت کا ظہور ہے۔ اور یہ ظہور اسلئے مافوق الفطرت سمجھا جاتا ہے۔ کہ انسان کے مادی تعقل سے باہر ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان مادی عقل سے ہی ہر شے کو پرکھنا چاہتا ہے۔ اور اسی کا قائل ہوتا ہے۔ اور جو اشرف المخلوقاتی طاقتیں انسان میں ودیعت کی گئی ہیں۔ بوجہ انحراف اور علت لامحدود کے عدم تسلیم کی بنأ پر ان پر ایمان ویقین قائم نہیں کرتا ـــــ درحقیقت معجزہ کوئی نئی اختراع نہیں بلکہ انسانی خاصیتوں کے ظہور کا ایک واحد طریقہ ہے جس سے پیغمبر کی حقیقت کی صداقت واضح کرنی مقصود ہوتی ہے۔ چونکہ پیغمبر ماوراٗ ادراک کیفیات کا ہی تصور دلاتا ہے۔ اسلئے ماوراٗ سے متعلق واقعات کو مافوق الفطرت معجزات کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ یہ چیزیں مشاہدات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسلئے عمومی حیثیت سے عام عقل

انسانی کے ادراک سے باہر ہوتی ہیں جسکا بغیر مشاہدہ ہی تسلیم کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ واقعات بھی اپنے میں ایک حقیقت کا وجود رکھتے ہیں اور اسلئے ہر وہ شے جو خلاف عقل (مافوق الفطرت) واقع ہوا سمیں وہ قوتیں کام کرتی ہیں جو ماورائے عقل محسوس سے باہر موجود ہیں۔ جب تک ان تمام کیفیات کو مشاہدہ میں نہ لایا جائے تب تک مادی عقل کے زور پر انسے انکار کرنا بھی انحراف کے برابر ہے۔

مادہ سے لیکر علت لامحدود تک جو کچھ بھی واقعات کا صدور ہوتا ہے۔ اسکی آگاہی کیلئے ایک خصوصی ذریعہ ہوتا ہے جس سے صاحب مکان ہی واقف ہوتا ہے۔ یہ ایک علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے پیغمبر کو واقف کرایا جاتا ہے۔ وہ اس لئے کہ ہر انسان اس سے آگاہ ہو۔ اور تلاشِ اصل علتِ مستقلہ کا ادراک کرے۔ جو انسانی زندگی کا واحد نصب العین ہے۔ اور یہ ذریعہ سوائے روح اعلےٰ کی مدد کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی روح اعلےٰ سے جو ازل میں ہر انسان کے وجود کیلئے مقرر کی گئی ہے۔

چونکہ دنیا ایک مکمل نظام کے ماتحت جاری ہے۔ اسلئے روحوں کی تعداد اور وجود انسانی کی پیدائش اور اس کائنات کا انجام بیک وقت ہوگا۔ اور ہر شے کے اختتام پر تمام کائنات بیک وقت فنا ہو کر رہ جائیگی۔ نظام کائنات کے واقعات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ تمام موجودات صرف انسان کیلئے بنی ہے۔ جب انسانی زندگی اپنی انتہا پر پہنچکر انجام پزیر ہوگی تو لازمی ہے۔ کہ پھر دنیا کا نظام بے مقصد ہو کر رہ جائیگا۔ لہذا انسانی زندگی کے ساتھ اس کائنات کی فنا بھی لازمی وضروری ہے۔

انسان کی ظاہری زندگی اصل روح (عقل کل) کی محتاج ہے۔ اس روح کی نسبت انسانی ظاہری زندگی سے بھی وابستہ ہے اور یہ روح تمام کائنات کی تخلیق سے قبل پیدا ہوئی ہے۔ اسلئے اسکے لئے تعدد ضروری ہے (جو صرف خالق لامحدود کے علم میں ہے)۔

کائنات پر نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسکی تخلیق سے قبل تا علت لامحدود۔ اس کائنات سے علاوہ کسی دوسری کائنات کا نشان محسوس نہیں ہوتا ہے۔ اور علت لامحدود سے

انسان اور کائنات کے ایک ادنیٰ ذرہ تک ایک مسلسل مترتب تسلسل چلا آرہا ہے۔ اسلئے سوائے اس کائنات کے کسی اور کائنات کا وجود لازم نہیں۔ جو اس کائنات کے مقابلہ میں ہوسکتی ہے۔ بالفرض محال اگر یہ تصور بھی کیا جائے (جو غیر یقینی ہے) تو وہ بھی اپنے انجام کو پہنچکر فنا ہو چکی ہوگی۔ اور پھر ایک علتِ لامحدود کا وجود باقی رہنا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں کائنات سے قبل ایک ہی خالق تھا۔ اور خالق سے ہی کائنات کا وجود ظاہر ہوا۔ کائنات کی ابتدأ سے پیدائش اور فنا کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ اسلئے ضروری ہے۔ کہ ایک وقت کلی طور اس کائنات کا انجام ہو۔ جو اسکی فنا میں رونما ہوگا۔ کیونکہ ابتدأ سے لیکر حال تک ہمارے سامنے فنا و بقا کا سلسلہ جاری نظر آتا ہے۔ اسلئے یہ سلسلہ بقأ ایک دن اپنی زندگی کی تعداد پوری کرنے پر ضرور فنا ہوگا جسے ''قیامت[1]'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی اس کائنات کا تمام نظام اختتام پزیر ہوگا اور اسکی مادی رنگ میں فنا ہوگی۔ چونکہ وہ علتِ لا محدود اسکے بعد بھی قائم رہیگی اسلئے اسکے قریب کی جزوی قوت (روح) بھی اسکی ہیئت کے اعتبار سے بعد فنا قائم[2] رہیگی۔ اور ہماری فنا کے بعد ہماری ابتدائی روح کا جو کہ نہایت قوی اور نورانی ہے اسکی ہیئت کے مطابق قائم رہنا ضروری ہے۔ یہ بات قابل غور ہے۔ کہ یہی روح ایک ارادہ کے ماتحت ماورأ ادراک علتِ لامحدود کو محسوس کرنے کیلئے انسان کی خاطر بنائی گئی۔ انسان نے اپنی تکمیل پر اس سے کام لیا۔ کسی نے اس سے کام لیکر اپنے اصلی مقام روحانی کو پالیا۔ اور کسی نے اپنے نصب العین اور مقصد کو پس پشت ڈالکر نفس پرستی۔ اور خلاف فطرت اعمال سے اپنے آپ پر اندھیرے (ظلمت) کا پردہ چڑھالیا۔ اور اپنے وجود کو اس قابل نہ بنایا کہ وہ اصل علت

---

[1] قیامت کے معنی قیام ٹھہراؤ یعنی دنیا کے اس نظام کا ٹھہراؤ اسی کو انجام و فنا کہتے ہیں۔

[2] ہر انسان کی موت کے بعد اسکا فعل ختم ہوجاتا ہے۔ اسلئے ہر انسان کے عمل کے مطابق پہلے کی طرح ماورأ ادراک میں اسکا معین مقام پر ایک وقت مقرر قیامت تک قرار ہوتا ہے۔ روح پیشتر بھی ایک مقام معین میں ہوتی ہے۔ انسان میں داخل ہونے پر اسکے ذمہ ایک نصب العین کی تکمیل ہوئی۔

لامحدود کو پالے لہذا ان ہر دو روحوں کی کیفیت انسان کے اپنے افعال کے مطابق ہو جائیگی۔ ایک اپنے مقام پر روشن ماحول پالیگی۔ دوسری ظلمت کے پردے میں ملبوس ہوگی۔ اور ہر روح برتر و کمتر ہیئتوں میں موجود رہیگی۔ گو ہر روح اپنے اصلی وجود میں ہوگی۔ مگر انسانی افعال کے مکمل و ناقص (نیک و بد) لباس میں ملبوس ہوگی۔

کائنات کی فنا سے مراد یہ ہے کہ اس نظامِ کائنات کا تمام کارخانہ لپیٹ لیا جائیگا۔ اور جیسے پہلے عدم تھی یا جس بنیاد سے پہلے بنی تھی اسی ہیئت پر پھر آجائیگی۔ کیونکہ کوئی وجود کالعدم نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی اصل کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اسلئے اسکی ظاہری ہیئت کے فنا ہونے پر اسکی ظاہری شکل کو ہی فنا ہوتی ہے۔ ظاہری شکل فنا ہونے پر اسکی اصل ضرور قائم رہتی ہے۔ جیسے سونا اسکی چمکیلی شکل فنا ہو کر خود فنا نہیں ہوتا بلکہ اسکے اجزا انہیں اجزا سے ملتے ہیں جس سے اسکی علت قائم ہے۔ انسان فنا ہونے کے بعد کالعدم نہیں ہوتا بلکہ اسکی ظاہری شکل معدوم ہو جاتی ہے۔ اسکا وجود سڑگل کر زمین میں مٹی بنکر سما جاتا ہے اور مٹی میں چونکہ اسکے جوہر ہیں ہر جوہر اپنی اپنی جز کو واپس لے لیتا ہے۔ اسطرح انسان جو کہ کل تھا جز میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کلی حیثیت ختم ہوتی ہے مگر جز میں قائم رہتا ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر شے صرف اپنی ہیئت سے فنا ہوتی ہے باقی علت قائم رہتی ہے۔ اور جب ارادہ ازلی چاہے کہ انسان کو پھر جزوی حیثیت سے کھڑا کرے تو اسکے ارادہ میں یہ قوت ہے کہ انسان کے انہیں اجزا کو کل کی صورت میں لاکر پھر انسانی شکل دے اور چونکہ روح بھی قائم ہے اسلئے جسم اور روح اپنی آخری ہیئتوں میں دوبارہ بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ جسم مادی ہیئت میں ہو یا اس سے قوی ہیئت میں۔ تاہم ہر حال میں موجود ہو سکتا ہے۔ کیونکہ انسانی جسم و روح کسی صورت میں کالعدم نہیں ہو سکتے جبکہ ہر معلول ایک علت کے ساتھ نسبت رکھتا ہو کسی نہ کسی صورت میں ہر شے کا وجود قائم ــــ اور باقی رہتا ہے۔ ہر شے کی علت اسی لامحدود علت سے ہے اسکا ہر جز اسکے احاطہ میں پابند ہے۔ اور اسی طرح قائم بھی۔ ہر وجود میں اسی کا نور ہے صرف کمتر درجوں میں ہونے کی وجہ سے اِنکی ہیئتوں اور رنگتوں میں فرق ہے۔ ہر شے اپنے اصل کی طرف اپنی ہیئت کے

مطابق رجوع کریگی۔ چونکہ ہر شے اسی نور لازوال کے احاطہ میں مقید ہے۔ اسلئے کسی کے لئے کوئی دوسرا مقام جائے فرار نہیں ہوسکتا۔ اور بعد فنا جب ایک نئے نورانی ماحول[1] کا دور شروع ہوگا ہر شے اپنی دنیوی کیفیت و تاثرات سے ملبوس موجود ہوگی۔ اور روح بھی اس نورانی ماحول میں موجود ہوگی۔ ابتدأ اسکی نورانی تھی وجود انسانی میں آکر انسانی افعال کا اثر لیکر اس پر ضرور افعال کا روشن یا اندھیرا لباس ہوگا۔ انسان جیسے دنیا میں روح کی معیت میں اپنے آپکو محسوس کرتا تھا اسی طرح نئے ماحول میں بھی خود کو محسوس کریگا۔ چونکہ وہ ماحول بہت نورانی ہوگا اور انسان میں اس ماحول سے مطابقت کی صلاحیت نہ ہوگی اسلئے وہ ایک جلالی اضطرابی کیفیت محسوس کریگا۔ کیونکہ اس نے اپنے مقصد میں اپنی روح کو جلا نہ دی تھی۔ اسکے لئے ضروری تھا کہ تلاش اصل میں تفکر کی زحمت میں کسی قدر محنت و مشقت کرے لہذا اپنے اصل سے ملنے کے لئے جو محنت اس پر واجب تھی اسکا ازالہ اسی صورت میں ہوگا کہ نئے ماحول میں اسے محنت و مشقت کرنی پڑے۔ اسلئے جسقدر ظلمت اس پر طاری ہے اسی قدر افعال کے مطابق اسے محنت ہوگی جو عذاب کی صورت دکھائیگی۔ اور جس شخص نے اپنی زندگی میں اپنے نصب العین کو جس حد تک پہنچایا اسی قدر اسے راحت حاصل ہوگی اسکی کیفیت لطیف ہوگی یہ اسکے افعال کی جزا (بدلہ) ہوگی جو اسنے زندگی میں تلاش اصل کیلئے محنت کی صورت میں کئے لہذا بعد از فنا یہی مشقت اور کوتاہی اسے راحت (جنت) وعذاب کی صورت میں حاصل ہوگی۔ اور جب تک انسان سے وہ کثافت جو اسنے اپنی کوتاہی سے اپنے اوپر مسلط کی تھی دور نہ ہو تب تک عذاب کی صورت دیکھیگا حتیٰ کہ روح اپنی ہیئت پر آکر اپنے مقام اول کے قابل نہ ہو۔ اسلئے تمثیلی الفاظ میں کائنات کے فنا کو ''قیامت'' اور نئے ماحول کے نئے دور کو ''محشر'' یعنی جہاں تمام کائنات کی اول سے لیکر آخر تک کی ہر شے اکٹھی ہوگی اور ہر روح کے ساتھ جو کچھ اسکی ہیئت کے مطابق واقع ہونا ہے اُسے ''جزا'' (بدلہ) ''سزا'' (بدلہ) ان

---

[1] بمعنی لطیف نورانی ماحول جو ایک جنت باغ خوبصورت کی تمثیل میں محسوس ہوگا۔

ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پیغمبر اِن خصوصی دعوؤں کو عام مفکرین مادہ کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی دلیل میں پیش کرتا ہے۔ یعنی منجانب اللہ ہونا۔ اپنی تفکر کی صداقت کیلئے پیش کرتا ہے۔ اور ایک ماورأ ادراک جوہر (روح یا عقل کل) کے وجود کو منجانب اللہ ہونے کیلئے پیش کرتا ہے اور مافوق الفطرت واقعات کے ظہور کو ان ہر دو کی دلیل میں پیش کرتا ہے اور ان تمام امورِ تفکر کیلئے وہ محشر۔ جزا و سزا کا تصور دلا کر انسان کو قوتِ عمل اور فطری قوانین کے ساتھ مطابقت کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ ان صورتوں میں پیغمبر جو بھی علم تفکر کیلئے پیش کرتا ہے اسکی نسبت من جانب اللہ یعنی کلام الٰہی یا وحی ا الٰہی سے تعبیر کرتا ہے۔ جسے ''دین ۲'' یا مذہب کے تمثیلی نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

ا وحی:۔ کسی فعل کی تحریک کے لئے ذہن کا بغیر مادی حس (آنکھ۔ کان۔ مس وغیرہ) کی مدد کے آگاہ ہونا۔ جس کا ادراک ذہن نہیں کرسکتا ہو۔ مثلاً ایک دیہاتی گنوار۔ انگلینڈ کے کسی مقام۔ یا بمبئی کے سمندری ساحل سے بالکل ناآشنا ہے۔ اگر اُسے اس جگہ کا خیال ہو کہ وہ جگہ کیسی ہے۔ تو وہ اسکے لئے اپنی بساط اور ماحول کے مطابق ہی اندازہ کریگا۔ کہ وہ جگہ کیسی ہوگی؟ یعنی اسکے تصور میں وہ جگہ ایسی ہوگی کہ وہ ایک بازار ہوگا جس میں شہری قسم کے لوگ سفید اجلے لباس میں ہونگے بڑے بڑے چونا کئے ہوئے کوٹھے ہونگے پتھر کی سڑکیں ہونگی وغیرہ یا ایک بڑا دریا ہوگا جس میں بڑی بڑی کشتیاں ہونگی پتھر کا گھاٹ ہوگا سیڑھیاں ہونگی وغیرہ یہ ایک خیالی تصور ہوگا جو اسکے ذاتی ماحول سے کسی قدر وسیع ہوگا مگر یہ تصور چونکہ حقیقت سے خالی ہے۔ اسلئے یہ تصور غلط ہوگا۔ اسکے برعکس ''وحی'' کا یہ قاعدہ ہے۔ کہ یہ شخص مادی حواس کو ایک طرف چھوڑ کر ایک قوی قوت کے ذریعہ (جو انسان میں ہے) تصور کریگا اس میں خیال کام نہیں کریگا۔ یہ دیکھیگا کہ ربڑ اور تارکول کی کشادہ سڑکیں ہیں۔ بلند عمارتیں سات سات منزلہ۔ باغات اور ٹرام گاڑیاں۔ ریلیں۔ کاریں وغیرہ ہر شے اصلی روپ میں بغیر آنکھوں سے دیکھے بھی محسوس کریگا یا ایک ناپیدا کنار دریا جس میں جسیم قسم کے جہاز ہیں۔ گودیاں ہیں جس میں جہاز لنگر انداز ہیں وغیرہ۔ یہ صورت اصلی ہو گی یہ چیزیں اسکے ذہن میں نہیں مگر کسی قوت سے اسکا ذہن آگاہ ہوا۔ جو اسکے لئے ماورأ ادراک ہے۔ خیال اور تصور میں یہی فرق ہے۔ کہ انسان اپنی ذہنی قوت کے مطابق کسی چیز کا نقشہ قائم کر کے اسکو محسوس میں لاتا ہے۔ اور تصور وہ قوت ہے۔ جو بغیر کوئی نقشہ قائم ہونے کے بھی اصل کیفیت ذہن میں خود بخود آجاتی ہے۔ خیال میں ایک

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) وہی نقشہ ہوتا ہے۔اور تصور کسی شے کی ماہیت اصل صورت میں سامنے لاکر بغیر آنکھ کے ذہن کو مشاہدہ کراتی ہے۔یہی کیفیت اصلی کی آگاہی وحی کے تمثیلی نام سے موسوم ہے۔اسی طرح ہر ماوراُادراک شے وعلم سے بغیر آنکھ کان وغیرہ کی مدد کے روحانی وجود کے ذریعہ آگاہ ہونے کو''آگاہی''یعنی''وحی'' کہتے ہیں۔ وحی سے مراد وہ بات جو اللہ نے انسانوں تک اپنے خاص بندے کے ذریعہ پہنچائی ہو۔بات پہنچانے کا ذریعہ۔ ایک لاِسلکی۔جس میں درمیان میں کوئی مادی ذریعہ بات پہنچانے کیلئے نہ پایا جائے جیسے ٹیلیفون۔مثال کے طور۔ کائنات کی فضا میں مختلف قسم کے ایٹمی ذرات پائے جاتے ہیں۔جن میں ایک قسم یہ ہے۔کہ جب ہم کسی شے کی ماہیت اور اسکی رنگت کا اپنی آنکھ کے آلہ (Lense) پر عکس پاتے ہیں۔تو اس ماہیت ورنگت کو دیکھنے کیلئے فضا میں ذرات ہی پہنچاتے ہیں۔اگر یہ ذرات فضا میں نہ ہوں۔تو باوجود آنکھ ہونے کے بھی ہم کسی چیز کو نہیں دیکھ سکینگے۔ یہ ذرات فضا میں اسقدر وسیع اور کثیر تعداد میں ہیں کہ کوئی جگہ ان سے خالی نہیں۔اور یہ اسقدر باریک اور لطیف ہیں کہ ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔اسی طرح ہمارے مُنہ سے جو آواز نکلتی ہے اس آواز کو ہمارے کان تک پہنچانے کیلئے فضا میں ایسے ذرات ہیں جو ہمارے مُنہ سے ہمارے کان تک کثیر تعداد میں موجود ہیں۔گویا یہ ایک وسیع ذرات کا دریا ہے جسمیں انسان ڈوبا ہوا ہے۔جہاں ان ذرات سے کوئی منہ کے آواز کے ذرات ٹکرائے اُدھر کان کے اندر ایک ریڈیو کے مانند آلہ ہے (جس کی شکل ڈھول کے مانند ہوتی ہے) اس پر آواز ٹکراتی ہے۔جہاں آواز آلہ سے ٹکرائی اسی وقت تاریں جنکا تعلق (Connection) دماغ کے ساتھ ہے۔دماغ کو یہ آواز سناتی ہیں۔دماغ کو خبر پہنچنے سے انسان اس آواز سے دوسرے کی خبر پالیتا ہے۔اگر یہ ذرات اور کان کا اندرونی آلہ انسان میں موجود نہ ہوتو انسان کوئی آواز نہیں سن سکیگا۔جیسے ایک بہرا باوجود کان رکھنے کے نہیں سن سکتا۔کیونکہ اسکا ریڈیائی آلہ کمزور ہوتا ہے۔اس پر ان ذرات کے ذریعہ آواز کی پوری چوٹ نہیں لگتی اور وہ سننے سے مجبور ہوتا ہے۔اسی طرح سونگھنے۔چکھنے۔اور مس کرنے کے لئے بھی انسان میں اسی ترتیب سے ایک مکمل نظام ہے۔گویا انسانی وجود کیلئے مختلف قسم کے خبر رساں۔خبر پہنچانے والے۔دیکھنے والے۔سننے والے۔چھونے والے۔حفاظت کرنے والے سپاہی ہر سپاہی ایک مکمل زندگی رکھتا ہے اور ہر زندگی ذرہ کی ہیئت میں اسکے تمام کام انجام دیکر دماغ کو خبر پہنچاتے ہیں اور دماغ بحثیت گورنر یا وزیر اعظم ہر حفاظت کیلئے حکم دیتا ہے۔ہر کام کی تکمیل کیلئے حکم دیتا ہے۔اسی طرح بیرونی فضا میں بھی تمام کائنات میں صرف انسانی کام انجام دینے کیلئے بے شمار لطیف قوتیں اسقدر موجود ہیں۔کہ اگر مشرق میں کسی کے منہ سے بات نکلی تو وہ اس وسیع ذراتی سمندر سے ٹکراتی ہے۔انکی کشش ایسی ہے۔کہ یہ آواز ایک آن میں ہر چار جہات میں ایک ہی لہجہ ایک ہی صوت (آواز) ایک ہی آن میں محسوس کی جاتی ہے۔صرف دور ونزدیک ہونے کا فرق ہے۔اور یہ دوری ایک آلہ کے ذریعہ دور کیجاتی ہے۔یعنی کان کی خاصیت والا ایک

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) مصنوعی (ریڈیو) آلہ تیار کیا جاتا ہے۔ جس پر اس آواز کی ٹکر چسپاں ہو جاتی ہے۔ اور تاروں کے ذریعہ اسے ہر کان کا آلہ ایک ہی ہیئت میں سن لیتا ہے۔ اسی طرح ہر حس میں ایک ایک قوت کام کرتی ہے۔ اور یہ تمام چیزیں ہماری مادی دنیا میں کارفرما ہیں۔ ان چیزوں کی علت جو اپنی لطافت اور قوت میں ان سے بھی زیادہ تاثیر رکھتی ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ تیزی اور باریکی میں دور ونزدیک یکساں اپنا عمل جاری رکھ سکتی ہے۔ جہاں دنیوی نظام میں یہ ترکیبیں واقع ہوتی ہیں۔ وہاں ضروری ہے۔ کہ اِن بالاتر علتوں کے وجود اور ماحول میں ان سے زیادہ لطافت کے ساتھ یہ عمل جاری ہو۔ چونکہ دنیوی نظام میں یہ سب چیزیں صرف انسان کی خاطر ہی استعمال ہو رہی ہیں۔ اسلئے ماوراُادراک کے علم کیلئے بھی ان چیزوں کا بااعتبار اپنی لطافت ونورانیت اور قوت کے اسی طرح ان ضرورتوں کا اہتمام ہونا لازمی ہے۔ ورنہ اس دنیوی نظام کی یہ ترکیبیں (جو انسانی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے ہی موجود ہیں) انسان کے ماوراُادراک کے علم میں ان ضروریات کے نہ ہونے کی وجہ سے اسکے مجبور ہونے پر سب نظام بیکار اور بے معنی ہو کر رہ جائیگا۔ اسلئے علتِ لامحدود سے انسان تک جو لطیف اور نورانی زندگیاں اور ماحول موجود ہیں۔ انکے علم کیلئے یہ عمل انہی ماوراُادراک لطیف محسوسات سے کیا جاسکتا ہے۔ گویا وہ روح جو اپنی لطافت اور تابانی ہیئت میں انسان سے وابستہ ہے علتِ لامحدود کے ہر ارادہ (ہر بات) کو آناً فاناً اپنی لطیف اور نورانی قوت کے لحاظ سے سن سکتی ہے۔ جہاں ہم میں۔ گویائی۔ شنوائی۔ وہاں علتِ لامحدود میں بھی بدرجہ اتم۔ ارادہ۔ گویائی۔ شنوائی۔ دیکھنا۔ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ علتِ لامحدود (اللہ) ایک کلام اپنے علم سے انسان کے روحانی وجود تک پہنچا سکتا ہے۔ اور لطیف نورانی وجود میں اسکا ادراک۔ سننے۔ دیکھنے کی استطاعت ہے۔ اسلئے وہ بھی علت لامحدود کی بات کو کسی قوی لطیف قوت (ملائکہ یا نورانی تعلق) کے ذریعہ یا براہ راست روحانی حالت میں سن سکتا ہے۔ اسی کیفیت کو عربی زبان میں وحی کے تمثیلی الفاظ سے موسوم کیا گیا ہے۔ ''وحی'' ایک کیفیت کا تمثیلی نام ہے۔ جس کیفیت کے ذریعہ انسان ماوراُادراک ماحول کے واقعات کو سن سکتا ہے اور مشاہدہ (دیکھکر ذہن کا آگاہ ہونا) کر سکتا ہے۔ چونکہ انسان مادی حیثیت ہی میں ان واقعات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اسلئے وحی کے ذریعہ ہی بغیر آنکھ کان وغیرہ کی مدد کے انسان کا ذہن ماوراُ ادراک ماحول و واقعات سے آگاہ ہوتا ہے۔ جس طرح دنیوی معاملات میں اسکے کان آنکھ وغیرہ اور دیگر لطیف زندگیاں اسکے ذہن تک معاملات کو پہنچانے کا کام انجام دے رہی ہیں۔

اس وحی کی ضرورت انسان تک اللہ کا علم (جس میں ماوراُادراک کا راز پنہاں ہے اور انسان تک اسکی مادی خاصیت میں نہیں پہنچ سکتا) پہنچانے کیلئے ہے۔ چونکہ پیغمبر اس کام پر خصوصی طور پر مامور ہوتا ہے۔ اسلئے اسکے دعوے کے مطابق اللہ کے ماوراُادراک ماحول کا تمام علم۔ خود اللہ ہی اپنے اس مخصوص بندے (پیغمبر) تک بذریعہ

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) وحی پہلے پہنچاتا ہے۔اور پیغمبر اسی علم کو دیگر مخلوق انسانی تک مادی حیثیت میں پہنچاتا پھر اپنی طرح مشاہدہ بھی کراتا ہے۔تاکہ علتِ لامحدود کے علم کی شناخت انسان کو بھی ہو سکے۔یہ ایک وحی کی کیفیت ہی ہو سکتی ہے۔جو اللہ کے ماورأ ادراک علم سے آگاہی پانے کا ذریعہ بنتی ہے۔جو۔انسان کو پیغمبر کی پیروی اور علت لامحدود کے تسلیم کے بغیر نہیں مل سکتی۔

یہ قوتِ محسوس ہر انسان میں بقدر استطاعت موجود ہے۔مگر ہر شخص پیغمبر کی سی خصوصیت نہیں پاتا۔نہ ہی انسان اسقدر پاک رہ سکتا ہے۔کہ اسکے اشرف المخلوقاتی اوصاف بعینہٖ پاک رہ سکیں۔اور نہ ہی انسان دوبارہ اپنے آپکو اپنے ابتدائی منصب پر لا سکتا ہے۔جب تک کہ اسے کسی حکیم۔کسی راہنما کی راہنمائی حاصل نہ ہو۔اسکے مقابل پیغمبر مخصوص ہوتا ہے۔اور اسکا منصب اسکا شرف ابتدأ سے ہی برقرار رہتا ہے اسلیئے ہر شخص دنیا میں آنے کے بعد پیغمبر نہیں بن سکتا۔یہ صرف ایک منتخب ہستی کیلیئے ہی مقرر ہے کہ وہ ایک پیغمبر کی حیثیت سے ابتداءً اس کام کیلیئے وقف کیا جاتا ہے۔اور تمام اسرارالٰہی اسپر منکشف کیئے جاتے ہیں تاکہ اس کی راہنمائی میں کسی قسم کی کمزوری یا ادھوراپن واقع نہ ہو۔اور پیغمبر کے ذریعہ ہر شخص کو اسکی صفائیِ وجود کے مطابق حسب طاقت حسب برداشت علم الٰہی سے واقف کرایا جاتا ہے۔پیغمبر کی طرح ہر شخص اپنی اصلی شرافت کو محفوظ نہیں رکھ سکتا اسلیئے ہر انسان میں کچھ نہ کچھ نقص لازمی طور واقع ہوتا ہے۔اور اس نقص کے باعث یہ انسان تمام اسرار الٰہی کی وحی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔پیغمبر کے مقابلہ ہر شخص پیغمبر جیسا درجہ پا نہیں سکتا۔اور یہ امر مسلمہ ہے۔کہ مکمل وحی پیغمبر کے بغیر اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔گویا مکمل وحی کا پانا ہی ایک ہستی کے پیغمبر ہونے کی دلیل ہے۔

۲۔ دین:۔یہ لفظ عربی ہے۔اور عام زبانوں میں استعمال ہوتا ہے۔اسکی نسبت ہر اُس شخص کے ساتھ ہوتی ہے۔جو طریق تفکر میں کائنات کے نظام میں چھان بین کر۔نے کا ایک طریقہ جاری کرے۔مثلاً ایک مفکر نظام کائنات اور علتِ لامحدود کے بارے میں تحقیقات کے بعد ایک نتیجہ اخذ کرکے۔طریق تفکر (غور و تجسس) اور اصل کی پہچان کیلیئے چند اصول پیش کرتا ہے۔کہ اصل کیا ہے۔اسے کس علم و عمل سے پہچانا جاتا ہے۔یہ علم نظریات کی صورت میں لوگوں میں پیش کرتا ہے۔یہی علم (طریق تفکر اور تفکر کا ماحصل یا نتیجہ) جس پر اسکے معتقدین عمل پیرا ہوتے ہیں۔ایک راستہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔یعنی ایک راستہ اور راستہ پر چلنے کا طریقہ دین کہلاتا ہے۔

اسی طرح ایک پیغمبر تلاش حق (اصل) کے لئے منجانب اللہ ایک طریق تفکر (طریق عمل) اور عمل کا نتیجہ۔یعنی حقیقت کی راہوں کا انکشاف کرتا ہے۔جس پر اسکی قوم (لوگ) عمل پیرا ہو کر کسی ماورأ ادراک مقام کو پا لیتی ہے۔اس مقام۔اس عمل (طریق راہ روی) کو دین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

''دین'' بے شمار معانی کا حامل ہے۔جس میں انسان کی ابتدأ سے لیکر آخری انجام تک کا تمام علم۔اور

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) عمل کی تحریک موجود ہے۔''دین'' کے معنی۔عمل۔عمل کرنے کا طریقہ۔عمل سے جو نتیجہ حاصل ہو ـــــ وہ راستہ جس پر علم کے ذریعہ چلا جائے۔انجام ـــــ ہر انجام کے بعد ایک نتیجہ۔اور کائنات کی فنا کے بعد وہ زمانہ جس میں ہر شخص اپنے عمل کے مطابق اپنا ایک نیا وجود پائیگا۔یعنی۔ابتدائی تحریک۔عمل کرو(اپنے مقصد کے لئے)ایک راستہ پاؤ گے(اصل سے ملنے کیلئے)تمہارا انجام تمہارا عمل ہوگا جب ہر شخص اِسکے اعمال اسکی کمائی کے مطابق اِسکا نتیجہ(عمل کے بدلہ کے دن)پائیگا۔

ابتدا میں جب انسان اپنے حواس کو مکمل پا لیتا ہے ـــــ تو وہ اپنی ذات اور کائنات کو ایک ماحول کی صورت میں پاتا ہے۔اُسے وہ چیز محسوس ہوتی ہے۔جسکا اُسکو اس سے قبل کچھ علم نہیں ہوتا ہے۔تو ضروری ہے کہ وہ یہ سوچے۔کہ میں کہاں ہوں؟ کہاں سے آیا؟ یہاں کیسے آیا؟ کیوں آیا؟ اس سے قبل میں کہاں تھا؟ اس کے بعد میں نے کہاں جانا ہے؟ جیسے ایک دیہاتی گنوار جو اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اپنے گھر کی چاردیواری میں پیدا ہوتا ہے ـــــ کسی بیرونی ماحول کا اِسے علم نہیں اپنے گھر سے باہر نکلتے ہی بے ہوش ہو جاتا ہے ـــــ اچانک چند شہری اسے دیکھ پاتے ہیں۔اور اٹھا کر شہر کے کسی بڑے ہسپتال میں داخل کرتے ہیں۔ہسپتال میں ہوش آنے پر وہ ایک غیر واقف مقام کو دیکھکر چند ساعت کیلئے حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ میں اس نئے ماحول میں کیونکر آیا۔ہوش و حواس قائم ہونے کے بعد فطری طور اسکے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔کہ میں کہاں تھا۔اب کہاں ہوں۔کیسے آیا۔کیوں آیا۔اور ان سوالات کی تحقیق و تجسس کیلئے ایک ارادہ پا کر اپنی ذات سے انکا علم چاہتا ہے۔مگر خود اپنی ذات سے علم حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔چنانچہ وہ اپنے ماحول کے ان غیر واقف لوگوں کو پاتا ہے۔اور انہیں سے ان سوالات کا جواب مانگتا ہے۔علم ہونے کے بعد چونکہ اسکے ذہن میں اپنے ابتدائی مقام کا تصور قائم ہوتا ہے۔یکلخت اسے اپنا گھر یاد آتا ہے۔اور وہ اپنے گھر کی طرف رجوع کرتے ہوئے۔راستہ کی تلاش کرتا ہے۔اور اپنے مقام کی سمت کو ڈھونڈنے کیلئے صحیح سمت پوچھتا ہے۔یہاں اس پر دو کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔راہ چلتے یا تو وہ شہری دلچسپی میں کھو کر رہ جاتا ہے۔اور اگر ارادہ قوی ہو تو وہ اپنی دلچسپ اور سادہ زندگی کا دوبارہ متلاشی ہو جاتا ہے۔اور کسی شخص کی (جو اسکے گھر سے علیت رکھتا ہو) راہنمائی میں اسکی پیروی کرتے ہوئے راہ روی کرتا ہے۔یہی مثال ایک انسان کی اس دنیا میں ہوتی ہے۔کہ اسکی تکمیل انسانی پر اسے ایک نئے غیر واقف ماحول کا احساس ہو جاتا ہے۔اسکے ساتھ ہی اسے ضرور یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔کہ اس سے قبل میں کہاں تھا؟ اب جہاں ہوں یہ کس قسم کا ماحول ہے۔یہاں کیسے آیا۔اگر اسے اپنے گھر کا تصور ہو تو گھر کا رخ کرتا ہے۔اگر گھر کا تصور نہ ہو تو ضروری خیال کرتا ہے کہ میں نے کہاں جانا ہے۔اگر میں نہ ہوتا تو میرا وجود نہ ہوتا۔مگر اس سے پہلے میں کیا تھا۔کیسے بنا۔کیوں بنا۔کس کے لئے بنا۔اس صورت میں انسان کے لئے دو مقام ضروری ہیں۔ایک وہ مقام جہاں

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) سے آیا ایک وہ مقام جہاں موجود ہے۔ جب دو مقامات کا وجود لازم آیا وہاں تیسرے مقام کی طرف نقل مکانی ضروری ہے۔خواہ وہ تیسرا مقام ہو یا پہلا مقام۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے۔ کہ انسان کا یہی پہلا اور آخری مقام ہوسکتا ہے تو اسکا جواب یہ ہوسکتا ہے۔ کہ اگر ایسا ہی ہو۔تو اس سوال کی تصدیق کیلئے اپنے ماحول اور اپنی ذات پر تجسس کی نگاہ ڈالکر اسکی حقیقت کو پرکھا جائے۔ کہ اس سے پہلے جو لوگ آئے وہ کہاں گئے؟ اگر ہمارا پہلا اور آخری مقام دنیا ہی ہے۔تو اس دنیا کے بغیر کوئی مادی یا غیر مادی (روحانی) مقام نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اور کوئی مقام نہیں تو ہماری فنا ضروری نہیں۔اگر فنا ہو بھی تو ہمارا وجود بھی اسی جگہ قائم ہونا چاہیے۔اس میں شک نہیں کہ انسانی وجود (جو کل یعنی جواہر مرکب ہے) فنا کے بعد بھی اسی زمین میں اپنی اپنی مفرد جز میں ملکر دنیا میں ہی قائم رہتا ہے۔ ہمارا وجود جملہ مخلوق کے جواہر کا مرکب ہے۔ ہماری فنا کے بعد ہمارا جسم زمین میں گل سڑ کر (ہمارے تمام اجزا منتشر ہو کر) اپنی اپنی جز میں سما جاتا ہے۔تو ثابت ہے کہ ہمارا وجود باوجود ظاہری (وجودی) فنا کے بھی زمین میں جز کی حیثیت سے قائم رہتا ہے۔اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسی زمین میں ہمارا پہلا مقام ہے اور آخری مقام بھی ہے لیکن یہ مقام مادی وجود کے اعتبار سے ہے۔ ہماری اصل کے اعتبار سے نہیں کیونکہ ہماری ابتدائی علت بجائے خود زمین سے نہیں کیونکہ اس میں بھی فنا ہے۔اور خود زمین لامحدود علت نہیں اسلئے ہمارے ابتدائی وجود کا پہلا مقام کہیں زمین سے اول اور زمین سے باہر ہے۔ جو زمین سے ماوراۓ ہے۔اور اسکی تصدیق کائنات اور انسان کی ذات پر مکمل تحقیق پر ہی ہوسکتی ہے۔ کہ کائنات کیا ہے؟ کہاں سے آئی اسکی وہ علت کیا ہے؟ جس سے انسان اور زمین کی پیدائش ہوئی؟ کیا زمین خود مستقل وجود رکھتی ہے یا معلول ہے؟ تو یہ چیز ثابت ہے کہ اس کائنات کا وجود پہلے نہ تھا۔گویا یہ مستقل نہیں۔ بلکہ کسی اور علت یا علتِ لامحدود سے معلول ہے۔ایسی صورت میں جب ماں ہی یہاں کی نہ ہو بچہ کیسے یہاں کا ہوسکتا ہے؟ یعنی باقی دیگر مخلوق میں جب موت وحیات۔ بناؤ بگاڑ۔قیام وفنا کا سلسلہ جاری ہے۔تو لازمی ہے کہ جب تمام مخلوق کے فنا و بقا کا یہ سلسلہ ختم ہو جائیگا پھر اس زمین کا وجود بیکار ہو جائیگا۔اور جب زمین کا اپنا کام پورا ہو جائیگا تو یہ بھی فنا ہو جائیگی۔ کیونکہ ماضی سے حال تک کا جو زمانہ گزر چکا ہے اس میں بھی اس دنیا کے بناؤ اور بگاڑ کے کئی مظاہر ہو چکے ہیں۔ کہیں زمین دھنس رہی ہے کہیں شہر تباہ ہو چکے ہیں۔ کہیں بستیاں فنا ہو رہی ہیں۔ جو ماضی میں تھا وہ حال میں نظر نہیں آرہا ہے۔تو یہ بناؤ اور بگاڑ اس امر کی شاہد ہے۔ کہ دنیا کلی طور اپنے مستقبل کی انتہا پر جب اس پر مخلوق کا سلسلہ ارتقاو تناسل ختم ہو جائیگا۔ اسکے وجود کی ضرورت نہ رہیگی۔لہذا یہ بھی فنا ہو جائیگی۔ البتہ اگر اسکی ابتدأ مستقل ہو تو اسکی انتہا بھی مستقل ہوگی پھر فنا کا وجود نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں مذکورہ بالا سوال درست ہوسکتا ہے۔مگر جب اسکی ابتدأ نہیں تو اسکی ہیئت انتہا میں بھی قائم نہیں رہ سکتی اسلئے اسکی فنا لازمی ہوگی۔اور فنا کی صورت زمین اور اس میں سمائی ہوئی مخلوق جو خود بھی زمین کی ہیئت میں ہی

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) قائم ہوگی۔ تمام کی تمام آخری فنا میں داخل ہونگی۔ اب سوال یہ ہے کہ زمین فنا ہو کر کالعدم ہوگی یا اسکا وجود موجود رہیگا۔ اسکا جواب یہ ہے۔ کہ جیسے عام مخلوق میں فنا ہو کر صرف اسکی معلولی ظاہری شکل ہی فنا ہو جاتی ہے۔ اور اپنی اصل اپنی علت میں جا کر قائم رہتی ہے۔ اسی طرح زمین کی ظاہری معلولی شکل فنا ہوگی اور یہ بھی واپس اپنی علت کی شکل اختیار کریگی۔ ایسی صورت میں کالعدم نہ ہوگی بلکہ ایک نیا وجود اپنی علت کا جو اس زمین سے لطافت و تابانی میں زمین سے قوی ہے۔ جیسے سونا۔ چمکدار وزنی شے ہے۔ جب اسکی اس ہیئت میں فنا آتی ہے تو یہ اپنی ظاہر ہیئت ہی کھو بیٹھتا ہے۔ یعنی مٹی میں مٹی ہو کر سما جاتا ہے۔ جہاں اسکی علت کے اجزأ (جن مرکبات سے اسکا وجود بنتا ہے) ہر معدنی جز اسکی ہر اجزا کو اپنے میں سمالیتا ہے۔ سونا بجائے خود سونا نہیں۔ بلکہ چند معدنی اجزأ کا مرکب ہے۔ اسی طرح زمین کی کیفیت ہوگی کہ اپنی اصل کھو کر اپنی علت میں سما جائیگی۔ اسوقت اسمیں تمام سمائے ہوئے وجود بھی اس میں موجود ہونگے جیسے دانہ میں تمام درخت کے مواد کا وجود ہوتا ہے۔ اسی طرح زمین تمام مخلوق خصوصاً انسانی وجود کو لیکر اپنی علت میں تمام کی تمام موجود ہوگی۔ اور ہر وجود اپنی پہلی علت میں نقل مکانی کرینگے۔ اسلئے یہ چیز ثابت ہے۔ کہ انسان کا وجود کالعدم نہیں ہوگا اور نہ کائنات اسکا پہلا اور آخری مقام ہوگا۔ اور نہ ہی کائنات فنا ہو کر کالعدم ہوگی۔ بلکہ کسی نئی علت میں موجود رہیگی۔ یہ دلیل اس امر کی شاہد ہے۔ کہ انسان نے باوجود زمین میں ہمیشہ رہنے کے۔ نہیں۔! بلکہ انسان کا وجود اپنی آخری ہیئت کے اعتبار سے زمین میں مقید رہیگا۔ اور ایک مقررہ دن بمعہ زمین کے ایک ایسے ماحول میں جائیگا۔ جو دنیا کے فنا کے بعد دنیا کی مادی ہیئت کے مقابلہ میں تابانی و تپش میں بیحد قوی ہوگا۔ اور اسوقت جو انسان اس زمین میں سمائے ہونگے انکی حالت اسی قسم کی ہوگی جس حالت میں وہ زمین میں سمائے ہونگے۔ یعنی اگر قوانین فطرت کے مطابق انسان بھی اپنے ارتقأ و عروج کو پالیگا تو اسکا جسم اپنی عروجی ہیئت میں زمین میں سمائیگا۔ اگر انحراف کی حالت میں زمین میں سمائیگا تو اسکا وجود برعکس عروجی ہیئت کے ذلیل حالت میں ہوگا۔

یہ چیز ثابت ہے۔ کہ انسان میں اس وجود کے علاوہ ایک جوہر اعلےٰ (روح اعلےٰ) بھی ہے جسکا تعلق انسان کے ساتھ ہے۔ انسان اگر فطرت کے اصول کے مطابق قبل از وقت اپنی ہیئت کو اس روح اعلےٰ کے ہم مشابہ قوی کرے تو اس نئے ماحول میں اُسے کوئی دقت نہ ہوگی کوئی تپش محسوس نہ ہوگی ــــ کیونکہ روح کی نسبت کی وجہ سے انسان تابانی اور قوی وجود پاچکا ہوگا۔ اور اگر قوانین فطرت کی خلاف ورزی کی ہو تو انسان مادی تنزلی حالت میں ہوگا۔ ایسی صورت میں جب زمین (اپنی ہیئت کو) اپنی قوی اور تابانی علت میں سما جائیگی تو انسان کی تنزلی حالت ایسی ہوگی جیسے سورج کے بالکل قریب یا سورج کے بیچ میں انسان کو ڈالا جائے۔ جسکا اثر یہ ہوگا کہ انسان انتہائی

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) تپش کی وجہ سے حد درجہ جلن اور عذاب (درد) محسوس کریگا۔ چونکہ یہ مقام مادہ سے ماسوا لطیف ہوگا اسلئے اس میں فنا اور موت واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ علت سورج اور ایٹم کے وجود سے بھی زیادہ لطیف اور قوی ہوگی۔ ایسی صورت میں انسان کی کیا حالت ہوگی جبکہ اسے ایک طرف انتہائی درد بھی محسوس ہوگا اور دوسری طرف اسے موت بھی واقع نہ ہوگی۔ کسی انتہائی عذاب و تکلیف کا نتیجہ انسان کی موت ہوتی ہے۔ اور جہاں موت نہ ہو۔ وہاں اس عذاب کی شدت بھی نہ ختم ہونے والے عذاب کی سی ہوگی جسکی تکلیف کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سب کیفیتیں ''دین'' کے تمثیلی نام میں شامل ہیں۔ اسکے ساتھ ہی انسان کو ہر غلط اقدام سے روکنے اور صحیح راہ پر لانے کیلئے جو طریق استعمال کئے جائیں انہیں مذہب کہا جاتا ہے۔

''دین'' تفکر کی تحریک دیتا ہے ــــــ! دین عمل کی طرف لاتا ہے ــــــ! دین طریق تفکر سکھاتا ہے۔ دین انسان کو اپنے اصل کی راہ دکھاتا ہے۔ دین جزا و سزا کا تصور دلاتا ہے۔ دین انسان کو اسکی زندگی کے مقصد۔ اور اسکے نصب العین کا احساس دلاتا ہے۔ دین ایک مقام کا تصور دلاتا ہے۔ جس میں ایک دن ہر انسان کو (دنیا میں اپنی ذمہ داری محسوس کرنے کے بعد) ایک عمل ایک نتیجہ اور نتیجہ کا اثر عذاب وراحت کی شکل میں ضرور حاصل کرنا ہے۔

دین کے معنی۔ عمل۔ راستہ اصل علت لامحدود کے پہچاننے کا۔ اعمال کا نتیجہ۔ آخری انجام اور پاداش عمل کا دن۔ مذہب کے معنی وہ قانون جس میں پابند رہ کر انسان تنزل۔ غفلت۔ انحراف سے بچکر عروج کی طرف جائے۔

مذہب۔ کیا ہے۔ مذہب کا وجود کیسے ہوا ــــــ اسلام میں مذہب اور دین ایک ہی چیز ہے۔ مذہب ایک ایسا قانون ہے ایک ایسا نظام زندگی ہے۔ جسکے ذریعہ انسان اپنی ہر قسم کی بہتری کے سامان مہیا کرتا ہے۔ جس سے اسکی زندگی امن وراحت میں بسر ہو سکے۔ اور ہر مضرت سے محفوظ رہ سکے۔

انسان کیلئے یہ فطری تقاضا ہے۔ کہ اسکا دماغ کسی نہ کسی معاملہ میں ہر وقت الجھا رہتا ہے۔ یہ معاملات اسکی روزمرہ زندگی کے واقعات سے ہوتے ہیں انسان کو سب سے بڑی ضرورت اپنی زندگی کو امن و سلامتی سے گزارنے کی ہے۔ تاکہ اسے اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے اسکی ہر ضرورت آسانی سے میسر ہو۔ جہاں اسے کسی چیز کے حصول میں مجبوری اور دشواری پیدا ہو۔ وہ ان دشواریوں اور مجبوریوں پر قابو پانے کی تجویزیں سوچنے لگ جاتا ہے۔ کہ وہ اپنی ضرورت پوری کرنے کیلئے کونسے ذرائع اختیار کرے۔ یہ ضرورت وہ ایسے علم سے حاصل کرتا ہے جو اپنی ہیئت میں مکمل اور نتائج میں مفید ہو۔

اکثر زمانوں میں دیکھا گیا ہے۔ کہ انسان اپنے لئے سامان زندگی فراہم کرنے کی سعی میں اسقدر کوشاں رہا کہ اسکی یہ طلب دیوانگی کی شکل اختیار کرگئی۔ ابتدائی زمانہ میں جبکہ انسان اپنی ضروریات بغیر کسی انتظام

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) اہتمام کے بھی پا تا تھا۔اسکے لئے زندگی کے سامان کی فراہمی کی صرف اسی قدر کوشش تھی جواسے آسانی سے مہیا ہوتی تھی۔انسان گھاس اور پتوں پر بھی اکتفا کر سکتا تھا۔ایک تو اسے دیگر انواع کی غذاؤں کا علم نہ تھا۔وہ ان کے استعمال سے ناواقف تھا۔اسے کدال اور ہل بیلچہ کا نہ علم ہی تھا نہ اِنکے لئے کوئی اختراع کی ضرورت تھی۔کیونکہ وہ ہر قسم کی لذات سے ناآشنا تھا۔اسلئے اسے ان چیزوں کے حصول کی بھی ہوس نہ تھی۔ دوسرے آبادیاں مختصر تھیں۔ضرورتیں مختصر تھیں ہر شخص۔گھاس پتوں کی قلیل مقدار سے اپنی نشو ونما پا کر مطمئن تھا۔ جوں جوں زمانہ ارتقا کی طرف آیا۔لوگوں نے مختلف قسم کے ذرائع معاش اختراع کیں جس سے ضرورتوں میں وسعت پیدا ہوتی گئی ایک وقت ایک گھاس یا پتے کھانے والا انسان پتھر یا لوہے کی تلاش کو ضروری نہیں سمجھتا تھا بلکہ اسے ان چیزوں کے استعمال کا گمان بھی نہ تھا۔مگر زمانہ کی ارتقائی صورت کے ساتھ ساتھ انسانی دماغ میں بھی جولانی پیدا ہوئی۔آخر ایک دن لوگوں نے جانوروں مچھلیوں اور دیگر قسم کے حیوانات کے شکار کیلئے بھی اپنی تلاش کو وسیع کیا۔اور پھر اس زمانہ میں بجائے صبح شام پتے کھا کر اطمینان سے گزارنے کے۔ان اختراعوں کی تلاش میں لوگ جستجو کرنے لگے۔انہیں مختلف قسم کے ذائقوں کی وجہ سے لذات کا تابع ہونا پڑااور اپنی خواہش کو پورا کرنے کیلئے انکا ذہن ہمہ وقت زیادہ سے زیادہ مصروف رہنے لگا۔یہ قاعدہ ہے۔کہ جسقدر ضرورتیں کم ہوں اسی قدر دماغ پر بھی الجھنیں کم ہوتی ہیں۔اور جب ضرورتیں زیادہ ہوں تو لذتوں کے تابع انکی فراہمی کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔گویا انسان لذتوں میں پھنس کر اپنی ضروریات کی وسعت کو محسوس کرنے لگا۔اور ہمہ وقت اختراعات میں ذہن کو الجھائے رکھا۔

ارتقاءَ نے انسانی دماغ میں جولانی پیدا کی اور اس ترقی نے اسے۔اختراعات ولذات کی طرف مائل کیا اور انسان پر بہت سی ضرورتوں کا دروازہ کھلا۔انسان کیلئے حصولِ سامان زندگی کی وسعت نے اس میں ہوس کا مادہ پیدا کیا۔کہ انسان اپنی ضروریات کے حصول کیلئے ہمہ تن مصروف رہنے لگا۔اپنی وسیع ضروریات کے حصول کی تدبیریں سوچنے لگا۔جسکا نتیجہ یہ ہوا۔کہ سامان زندگی کے نئے نئے ذرائع پیدا ہوگئے۔یعنی انسان اب گھاس اور پتے کھانے کا عادی نہ رہا۔باقی لذات نے اسے گھاس اور پتوں کے ذائقہ سے نفرت دلادی۔یہاں تک کہ انسان اس مرحلہ پر پہنچا کہ اس نے زمین سے فصل کی صورت میں اپنی غذا تیار کرلی آگ اور پانی کو استعمال کرکے غذاؤں میں لطافت پیدا کردی۔

یہ چیز ضروری ہے کہ ہر انسان کا ذہن (دماغ) یکساں نہیں ہوتا۔ہر انسان فطری طور پر دماغی قابلیت یکساں لیکر آتا۔لیکن مختلف قسم کی کمی وبیشی یعنی فزوں قابلیت اور عدم قابلیت ماحول اور ضروریات زمانہ کے مطابق پیدا ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں جو عام لوگوں کے مقابلہ میں دماغی قابلیت

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) میں تفوق حاصل کر لیتے ہیں۔ بہت ہی کم انسان ہوتے ہیں جو اپنی دماغی قابلیت کے ذریعہ ایجادات کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ہر شخص فرداً فرداً مستقل اختراعات نہیں کرسکتا۔ایسے حالات میں انسانوں میں بھی مختلف قسم کی دماغی حیثیت سے مختلف جماعتیں ہوتی ہیں۔ان لوگوں میں طبیعتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔کوئی بالکل سادہ اور کم سوچنے والا اپنی طاقت کے مطابق ہی اپنی ضروریات پر گزارا کرتا ہے۔کوئی شخص دماغی قابلیت میں کم مگر عام آدمیوں کی ضرورتوں کو دیکھکر خود بھی ایسی چیزوں کا متمنی رہتا ہے۔یہ شخص چونکہ خود براہ راست حاصل نہیں کرسکتا اسلئے کسی دوسرے کی امداد و اعانت کا خواہاں رہتا ہے۔تیسری جماعت جو خود اختراعات سے اپنے مفاد پورے کرتی ہے۔ان حالات میں مجموعی حیثیت سے انسان ان ایجادات میں حصہ لیتا ہے۔جسقدر اسے منافع میسر ہو اسی قدر وہ اپنی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے۔لیکن اس ارتقاٗ اور ایجادات کے پس پردہ ایک خصوصی چیز ہے جسکا اثر ہر انسان سے متعلق ہوتا ہے۔وہ یہ کہ انسان ان نئی ایجادات سے لذات کے تابع ہوکر زیادہ سے زیادہ حصول کا خوگر ہو جاتا ہے۔اور اپنی ضرورت کی وسعت کے ساتھ ساتھ انکے حصول کے طریقے بھی اختراع کرتا ہے۔

یہ چیز فطری طور پر لازمی ہے۔کہ انسان اپنی پیدائش کے لحاظ سے دنیا کی باقی اشیاٗ سے اپنی ضرورت حاصل کرنے کیلئے مساوی حق رکھتا ہے۔اس دنیا میں اسے کسی چیز کے حصول میں فطری طور رکاوٹ نہیں۔مگر یہ چیز باعثِ نقص و فساد ہے۔کہ اگر ایک شخص اسی لذات کے تابع صرف اپنی ذات کیلئے دنیا کی ہر شے کو وقف کرنا چاہے۔یعنی انسان میں اپنی لذات کے تابع ہونے سے حرص و ہوس کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔کہ ہر شے سے میں فائدہ حاصل کروں اسطرح وہ عام کم حیثیت انسانوں کے حقوق پر بھی تسلط جمانا چاہتا ہے۔ایک شخص بذات خود اپنی ضرورت سے زیادہ اشیاٗ کو فراہم کرنے کی وسعت نہیں رکھتا۔اگر ایک شخص اپنی ضرورت کیلئے سو گز زمین کی فصل سے خوراک مہیا کرتا ہے۔تو اسکی ایجادات اسے ہزار گز زمین پر پھیلنے کی تحریک دیتی ہے۔اسکے لئے اسے دیگر انسانوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔اور یہ معاونت دو صورتوں میں ہوسکتی ہے۔کہ یا تو باقی انسانوں کے حقوق بطور معاوضہ ادا کرے۔یا باقی انسانوں پر بھی تسلط جمانے کی کوشش کریگا تاکہ انکی محنت کے پھل پر اسی کا تسلط قائم رہے۔یا وہ ذرائع اختیار کریگا جس سے اِنکے حقوق پر تسلط جمانے میں اسے کامیابی ہو۔یعنی۔وہ ناجائز طریقہ۔ جھوٹ۔دغا۔فریب۔زبردستی سے انکے حقوق پر قابض رہیگا۔جسکا نتیجہ بالآخر خونریزی اور فساد ہوگا۔

زمانہ میں اکثر قوموں میں خونریزیاں اور فساد پائے گئے۔جس سے بے شمار جانیں تلف ہوئیں۔اور انسان۔اپنی سلامتی اور امن اور خوشحال زندگی بسر کرنے سے قاصر رہا۔چونکہ یہ چیزیں انسانی نظام امن و راحت میں برہمی پیدا کرنے کا سبب بنیں۔اسلئے انسانوں کو فطری طور پر امن و سلامتی کی جستجو ضروری ہوگئی اور قوموں میں

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) امن وسلامتی اور خوشحال زندگی بسر کرنے کیلئے کوئی طریقہ ایجاد کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور قوم کے اکثر دماغی قابلیت رکھنے والی شخصیتوں نے جن کی طبیعتیں اعتدال پر تھیں چند ایسے طریقے رائج کئے جس سے کہ ان ارتقائی اثرات کے مضر نتیجہ سے محفوظ رہنے کیلئے انسانوں کو ایک پابند نظام میں لایا جائے۔ اس نظام میں ایسے اصول قائم کئے گئے۔ کہ ہر شخص اپنا پیدائشی حق بلا کسی روک کے بلا کسی زحمت کے حاصل کرے۔ اس پر کسی کا ناجائز تسلط یا ظلم نہ ہو۔ ہر شخص اعتدال کے اندر اپنی ضروریات کو حاصل کرے۔ اور اگر انسان میں اسقدر قوت ہے کہ وہ جائز طریقہ سے اپنی ضروریات کو وسعت دے سکے تو اسے اختیار ہے کہ جسقدر بھی وہ حاصل کرے اسکی ملکیت سمجھا جائے بشرطیکہ اُس چیز کے لئے باقی مخلوق محروم نہ ہو بلکہ ہر شخص آسانی سے حاصل کرسکتا ہو۔ کسی دوسرے کو اسکی اپنی ملکیت میں لی ہوئی ضرورتوں پر ناجائز ڈاکہ ڈالنے کی جرأت نہ ہو۔ ارتقاً انسانی میں یہ اہم چیز ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے آسان راستے تلاش کرتا ہے۔ اور انسان کی تن آسانی اسے لذات کا تابع کردیتی ہے۔ اور لذت ہی اسے زیادہ حصول کی طرف مائل کردیتی ہے۔ اور زیادہ حصول کی ہوس ہی اسے قوانین فطرت کے خلاف چلنے پر آمادہ کرتی ہے۔ قوانین فطرت کی خلاف ورزی ہی اسے۔ ہر قسم کے ناجائز طریقوں پر کھلا راستہ پیدا کرتی ہے۔

انسان اس افراط وتفریط کی وجہ سے سامان زندگی کے حصول میں مجبوری کا احساس کرتا ہے۔ جس سے کہ امن۔ راحت واطمینان کھو بیٹھتا ہے۔ ہمہ وقت کی پریشانی واضطراب اس پر خوف ودہشت طاری کردیتا ہے۔ جسکے لئے لازمی طور پر اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ طریقے ایجاد کئے جائیں جس سے انسانی زندگی ہر قسم کے اضطراب و پریشانی۔ خوف ودہشت سے محفوظ ہو جائے۔ اور جو طریقے اس ظلم وطغیان کو ختم کرنے کیلئے رائج کئے جائیں اسے مذہب کی شکل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جسکا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ ہر شخص ایک پابند نظام کے دائرہ میں مقید ہو کر چلے تاکہ ارتقائی زمانہ کی ہر ایجاد اسے لذات کا تابع نہ بنادے اور ہر ایجاد سے بجائے ظلم وفساد پیدا ہونے کے یہ چیز انسان کیلئے بہتر ذریعہ بن سکے۔ مذہب بھی باقی اختراعات کی طرح ایک اختراع ہے مگر ہر اختراع کسی انجام ونتیجہ پر پیدا ہوتی ہے۔ اور اسکی ضرورت ہر ایجاد کے مضر مواد کو ختم کرنے کیلئے ہوتی ہے۔ گویا عام اختراعات (جو سامان زندگی کے حصول کیلئے ہوتے ہیں) کے ساتھ اسکی نسبت نہیں یہ اختراع ہے مگر اختراع کو اپنے احاطہ میں لانے والی اختراع ہے۔ ایسی صورت میں مذہب وہم نہیں بلکہ ٹھوس چیز ہے۔ جسکی ضرورت انسان کیلئے ازبس ضروری ہے۔ مذہب ہی ایسی چیز ہے۔ جو انسان کی زندگی کے سامان کی فراہمی اور اسکے امن وراحت کی علمبردار ہوتا ہے۔ گزشتہ زمانوں میں یہ چیز دیکھنے میں آتی ہے۔ کہ اکثر قومیں۔ اپنی ضرورتوں کو کسی اختراعی مجسمۂ وہمی کے ساتھ نسبت دیکر انہیں اپنی تمام ضروریات کا علمبردار سمجھتے تھے۔ جیسے آگ کا خدا۔ پانی کا خدا۔ رزق

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) (خوراک) کا خدا۔صحت کا خدا۔قہر کا خدا۔رحم (محبت) کا خدا وغیرہ۔اور لوگ ان چیزوں کو مذہب کے رنگ میں ڈھال کر اپنے لئے ایک عقیدہ قائم کرتے تھے۔گویا اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے وہ یہی طریقہ رائج کئے ہوئے تھے کہ انہیں خداؤں کے ذریعہ ہماری ہر ضرورت پوری ہوتی ہے۔مگر یہ طریقہ سرے سے غلط ہے۔اول تو ضرورتوں کے حصول کا طریقہ ہی دوسرا ہے۔اور اِنکی تنگی اور وسعت کے اسباب ہی علیحدہ ہیں۔اسلئے عقیدتاً ضرورتوں کا ان خداؤں سے متعلق کرنا سرے سے عبث اور بے معنی بات ہے۔رہا یہ سوال کہ یہ چیزیں کیسے مذہب کے روپ میں لائی گئیں۔اسکے لئے ہمیں ان اسباب کا تجزیہ کرنا ہے۔جن سے یہ خدا پیدا ہوئے۔پھر انکی کیفیت اور اثر کو دیکھنا ہے۔کہ انہیں کیوں ان ضرورتوں کے ساتھ نسبت دی گئی۔

یہ خدا کیسے بنے؟ اسکی وجہ یہ ہے۔کہ زمانہ نے اپنے ارتقائی دور میں بناؤ اور بگاڑ کی کئی انقلابی ہیئتیں بدلیں۔انسان پہاڑوں کے پھٹنے لاوے کے بہنے۔بجلی و رعد کی گڑگڑاہٹ سے ناآشنا تھا جب اس نے اِن صورتوں کے منظر دیکھے تو ضروری تھا کہ اس پر خوف و دہشت طاری ہوتا۔یہی خوف و دہشت انسان کے ذہن میں حافظہ کی صورت میں جگہ کر گئے۔زمانہ لاعلمی کا تھا۔انسان ہر قوی الجثہ صورت اور قوی طاقت سے مرعوب ہوتا رہا۔لاعلمی کی وجہ سے وہ اپنے حافظہ کے گزشتہ نقوش کے تاثر سے انہیں اپنے سے بالاتر قوتیں سمجھ کر اِنکے آگے اپنی عاجزی کا اظہار کرنے لگا۔جسوجہ سے اسنے اپنے مادی و نامکمل ذہن ہونے کی بناء پر آگ کو قوی سمجھ کر اسے خدا مانا کہ انسان اپنے وقت میں اس چیز کا محتاج ہے۔اور یہ کسی بالاتر قوت کی وراثت ہے۔اسی طرح سورج۔پانی۔رزق۔صحت۔قہر۔محبت وغیرہ جن چیزوں سے انسانی ذہن متاثر ہوا۔اسے اپنے سے بالاتر قوت سمجھ کر اسکے آگے جھکا۔گویا اسکا فطری نظریہ یہ تھا کہ جو شے انسان پر غالب ہو اور جس قوت سے انسان اپنی ضرورتوں کیلئے محتاج ہو وہی اسکا مالک وہی اسکا حکمران ہوتا ہے۔گویا یہ انسان کے ضمیر و فطرت کی آواز تھی کہ جو شے ہر مخلوق سے غالب قوت کی حامل ہو وہی اس (مخلوق) کی مالک و رازق ہوتی ہے۔اس چیز میں انسان کو اصل خدا کے تصور کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔اسنے اپنے ماحول کی غالب مخلوق کو ہی انتہائی قوی سمجھ کر اپنی تمام مجبوریوں کو انہیں خداؤں کے رحم و کرم پر سمجھ کر انہیں خدا سمجھا۔حالانکہ نہ یہ خدا تھے نہ ضرورتیں ان سے وابستہ تھیں۔بلکہ انسان کے مادی تخیل نے ہی انہیں خدا بنایا۔یعنی ان خداؤں کی اختراع انسان کی کم عقلی کے سبب ہوئی اور اصل نظریہ کے بالکل برعکس ایک اختراع کی۔جب تک ایک ایسی طاقت جو تمام مخلوق سے غالب ہو اسکا پتہ نہ لگایا جائے تب تک کسی خدا کو خدا نہیں کہا جا سکتا۔اصل نظریہ تو یہی ہے خدا وہی ہو سکتا ہے جو تمام مخلوق پر غالب ہو۔کیونکہ یہ انسان کی اسوقت کی اختراع ہے۔جب انسان ہر علم اور ہر واقعہ سے بیخبر ہوتا ہے۔یہ انسان کی فطری آواز ہے جس کے تحت وہ اپنے تعقل کے نقص کے باعث اصل خدا کی بجائے غلط خدا بنانے لگا ہے۔اگر یہ فطری آواز نہ ہوتی تو انسان اس نظریہ کے بغیر

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) سرے سے کسی خدا کا قائل ہی نہ رہتا۔ اور اسی فطری آواز کی تصدیق دین سے کی جاتی ہے جس میں۔ ماورأ ادراک مخلوق و ماحول۔ جزا و سزا (حشر) قیامت کا عذاب تفکر میں عدم تکمیل انسانیت پر انسان کا منحرف ہونا۔ اور اپنے اعمال کے مطابق نتیجہ پانا۔ اور ایک خدا کا۔ مالک و خالق اولاً تسلیم کرنا۔ یہ چیزیں دین اسی لئے پیدا کرتا ہے۔ کہ انسان انکے بغیر ایک غلط مذہب اختیار کر کے غلط راہ کی طرف جاتا ہے۔ اسلئے دین و مذہب ہی ایک مستقل راہ پیدا کر کے انسان کو امن و راحت کی راہ دکھاتا ہے اور دین کو تسلیم نہ کرنے سے انسان مختلف خداؤں کی طرف رجوع کرنے لگتا ہے۔ اس کے سامنے ایک قوی و قادر ہستی کا تصور نہ ہونے کی وجہ سے ہر معمولی قوی قوت کی دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ جسے وہ خدائے قوی کے دھوکہ میں سجدہ کرنے لگتا ہے۔ اور اسی نظریہ کے تحت ایک عظیم الشان خدا کا بھی تصور قائم ہوا۔ یہ چیز اختراع نہیں بلکہ کسی شے کا تاثر ہے۔ کہ ہر شخص ایسا سمجھنے کیلئے مجبور تھا۔ انکے لئے یہ چیز ایک حقیقت تھی۔ اور بعد کے ارتقائی زمانہ میں جب ہر ضرورت پر قابو پایا گیا تو لازمی تھا کہ ہر ضرورت کا خدا ختم ہوتا۔ بالالفاظ دیگر ہر ضرورت نے ایک خدا بنایا تھا۔ درحقیقت خدا خود کوئی شے نہ تھی۔ انسان پر علم و ارتقأ کیوجہ سے اصل حقیقت کا انکشاف ہوا۔ کہ ضرورت تو انسان کی اپنی استعداد پر منحصر ہے۔ نہ کہ خدا پر۔ جب ضرورت کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے تو اس میں خدا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ چیز خصوصی طور پر ایک مذہب ہی سمجھا سکتا ہے۔ جس نے انسانی ارتقأ میں خوبصورتی اعتدال اور صحیح اثر کو قائم کیا لہٰذا ان عقائد کا مذہب کے ساتھ کچھ تعلق نہیں یہ ایک وہم ہے۔ جسکی مذہب بھی مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ انسانی طریق کار کیلئے ایک خوبصورتی اور اصلاح پیدا کرنے والا مذہب کسی غلط نظریہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ اسلئے ہر وہ طریق کار جو انسانیت کیلئے مضر ہو توہم اور کند ذہنی پہ محمول انسانی زندگی میں غلط تاثرات پیدا کرنے والا مواد جس سے انسانی ارتقأ میں بجائے فائدہ کے خلل واقع ہو اسکی اصلاح اور صحیح راہ کی راہنمائی کے مجموعہ یا مواد کو مذہب کہا جاتا ہے۔ جہاں تک انسانی فطرت اور ارتقأ کا سلسلہ ہے۔ مذہب کا وجود ہونا Automatically لازمی و یقینی ہے۔ ہر غلط راہ ہر غلط طریق ہر غلط نتیجہ مذہب نہیں کہلاتا۔

رہا یہ سوال کہ غلط عقائد کو مذہب کے ساتھ کیوں نسبت دی جاتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ انسان دین حقیقی کو تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ اسکے شعور سے پیدا شدہ تخیل کی ایک مصنوعی (تخیلی) تصویر ہوتا ہے۔ جو اصل حقیقت سے خالی ہوتی ہے۔ اس تخیل کا تعلق مادی تخیل و ادراک سے ہوتا ہے۔ اسلئے یہ تخیل سراسر غلط صورت اختیار کر جاتا ہے۔ یہ حقیقتاً اصل واقعہ نہیں بلکہ یہ انسان کی ذاتی غلط اختراع ہے۔ درحقیقت مذہب یہ چیز نہیں کہتا کہ ہر شے کا خدا ہے۔ البتہ اگر مذہب کہے کہ خدا ہے۔ تو وہ ایسی حالت میں ہونا چاہیے کہ فی الحقیقت اس میں قہر و جلال۔ رزق دینا۔ گرمی دینا۔ پانی دینا۔ زندہ کرنا۔ موت دینا۔ رحم و غضب کے قوی آثار مستقل طور پر موجود ہونے چاہیں اور

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) انسان بنیادی طور پر بغیر اسکے عطا کرنے کے یکسر مجبور ہو جائے۔ یہ چیز تو ہم کے ساتھ تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ تفکر و تجزیہ۔ کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اگر انسان ابتدائی طور پر ہر شے کو خود بنانے پر حاوی ہے تو یہ اسکی ذاتی ملکیت ہوگی نہ کہ خدا کی۔ اگر انسان کسی شے کو ابتداءً بنانے یا پیدا کرنے پر حاوی نہیں تو یہ اسکی ملکیت نہیں بلکہ کسی خدا کی دی ہوئی چیزیں ہیں جسے وہ اپنے ارتقاً کی وجہ سے اپنے تصرف میں لاتا ہے۔ یہ چیزیں انسان کی اپنی خلقت پیدائش کے لحاظ سے عطا کی گئی ہیں۔ اور اگر وہ من کل الوجود ہر شے کو خود نہیں بناتا ہے۔ کسی اور کی بنی ہوئی ہیں تو وہی خدا کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ یہ چیز جب مشاہدہ میں آئے تو پھر باقی خداؤں کی طرح وہم کے ساتھ غائب نہ ہوگا بلکہ اسکی اصلیت ہر شخص پر عیاں ہوگی کہ اول تو وہ خدا عام خداؤں کی شکل میں وہم تھا۔ مگر جب ہم۔ اپنی ذات اور کائنات کی ابتدائی تخلیق پر غور کرتے ہیں کہ ہر شے۔ آگ۔ پانی۔ رزق اور خود انسان الگ الگ نظام کے ماتحت اسوقت بنے ہیں جب انسان خود اپنے آپکو پیدا کرنے کی طاقت نہ رکھتا تھا بلکہ ایک ادنیٰ درجہ کی خاصیت سے پیدا ہوا۔ اور اسکی پیدائش سے پہلے ہی باقی چیزیں بن چکی تھیں ایسی صورت میں یہ اسکی ملکیت نہیں جن پر آج وہ حاوی ہے بلکہ کسی دوسری قوت کی بنائی ہوئی قوتوں کو ان دماغی قوتوں سے اپنے تصرف میں لا رہا ہے جو بجائے خود اسکی خود پیدا کردہ نہیں بلکہ کسی اور قوت سے پیدا شدہ ہیں۔ یعنی اسکی وہ قوت جس سے وہ موت و حیات پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ خود اسکی ملکیت نہیں۔ بلکہ عطا کردہ ہے۔ ایسی صورت میں انسان ابتدائی تخلیق میں ہر حال میں ایک خدا کے آگے مجبور و محتاج ہے۔ اگرچہ وہ موت و حیات پر بھی حاوی ہو جائے۔ انسان جب اپنی ضرورتوں پر قادر ہو جاتا ہے تو اسکی ضرورتوں کے خدا غائب ہونے لازمی ہیں اسطرح وہمی خداؤں کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ مگر ایک خدا کا ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ وہ وہ خدا ہوتا ہے جو انسان کو یہ تمام طاقتیں ودیعت کرنے والا خدا ہے۔ کیونکہ انسان بجائے خود ایک مخلوق ہے یہ کسی علت لامحدود سے مخلوق ہوا ہے۔ اسلیئے اسکی ہر طاقت کسی خدا کی طرف سے ہی ودیعت کردہ ہے ان طاقتوں کیلیئے اسکی محتاجی بدستور قائم رہتی ہے۔ اسلیئے وہ قوی غالب خدا جس کے آگے انسان ہر حال میں محتاج ہے۔ اسکا وجود ہر حال میں قائم رہیگا۔ اور باقی خداؤں کے مقابلہ میں اس خدا کی طاقتیں وسیع و لاانتہا ہیں اسلیئے یہ خدا کسی صورت میں غائب نہیں ہو سکتا۔ یہی عقیدہ مذہب دین سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ دین باطل تو ہمی خداؤں کی زد سے نکالکر ایک ایسے خدا کی طرف لاتا ہے جسکا تسلیم کرنا ہر انسان کیلیئے ازبس ضروری ہے۔ اور مذہب ہی اسکے خدا ہونے کی دلیل پیش کرتا ہے وہ تفکر اور تجزیہ ہے جو مشاہدہ یعنی چشم دید ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ جس میں تو ہم کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ لہذا مذہب و خدا کا تصور دو لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ جو انسان کی اصلاح و امن و سلامتی کے ضامن ہوتے ہیں۔ ہر شخص فرداً فرداً مذہب نہیں بناتا۔ بلکہ مذہب کو کسی خاص شخصیت کے ساتھ نسبت دی جاتی ہے۔ یعنی سوسائٹی یا ایک شخص نظام کائنات کے واقعات کا تجزیہ کرنے کے بعد

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) چند نظریات پیش کرتا ہے۔ جنہیں عام لوگ اپناتے ہیں اور انہیں نظریات پر عقائد قائم کئے جاتے ہیں۔ زمانہ کی تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ کسی مفکر نے مادی حیثیت سے کائنات کا تجزیہ کیا۔ اور نظریات قائم کئے اس پر قوموں کے عقائد بنے۔ یا کسی پیغمبر نے کائنات کے لئے تجزیہ کا طریق پیش کیا جسمیں کائنات کی اصلی حقیقت کیلئے نظریات قائم کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ اور یہی نظریات عقائد کی صورت اختیار کر گئے۔ یہ دونوں جماعتیں صرف کائنات کے تفکر کیلئے پیدا ہوئیں۔ جسمیں خدا یا خداؤں کا ہونا یا نہ ہونا۔ اور ہر شے کی ابتدأ و اصل ہر شے کا مستقل اور غیر مستقل وجود کا ہونا۔ ہر شے کا مجبور یا قادر ہونا ان چیزوں کے متعلق عقائد تھے۔ انہیں نظریات کے تحت ہر مفکر ہر پیغمبر کے نظریات کو دین کی شکل سے تعبیر کیا گیا۔ اور ان شخصیتوں کا وجود اسوقت ظاہر ہوتا رہا جب ارتقأ کائنات اور انسان کے نئے نئے اختراعات کا وجود پیدا کر کے ضرورتوں کو وسعت دی۔ اور ہر ضرورت کی فراہمی کیلئے ذرائع اختیار کئے گئے جو ذرائع بالآخر انسانی زندگی کیلئے باعث اضطراب و پریشانی۔ فساد و خونریزی اور تباہی کا سبب بنے یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان نے دنیوی حصول زیادہ سے زیادہ مقدار میں حاصل کرنے کی غرض سے ہی دوسروں کے حقوق پر قبضہ کرنے خود کو ہر شے کا مالک بنانے اور ناجائز تسلط کے وجہ سے ہی خونریزی کی ورنہ اگر انسانی ضرورتیں محدود ہوں تو کسی کے حقوق پر ناجائز قبضہ کرنے کا موقع ہی نہیں آتا۔ ایسے وقت میں ہی۔ قوانین فطرت کی متابعت کرنے کی پابندی۔ صحیح معنوں میں ارتقأ کرنے کیلئے ایک منضبط قانون کا اجرأ کیا۔ تا کہ انسان ارتقائی ضرورت کے ساتھ ایک حد میں پابند رہ کر۔ ارتقأ کی ہر شے باعث نفع ہو سکے۔ اسکے لئے انہوں نے انسان اور کائنات کے بنیادی نقوش کا تصور (دین) دلا کر انسان کو صرف ایک پابند قانون اور نظام میں لانے کی کوشش کی۔ جسے مذہب سے تعبیر کیا گیا۔ علاوہ ازیں وقتاً فوقتاً انسانی سوسائٹیاں قائم کی گئیں جو صرف انسانی اضطراب و تباہی سے متاثر ہو کر قائم کی گئیں انکا مقصد بھی ایک صحیح نظام ایک پابند قانون کے دائرہ کا اجرأ کرنا تھا جس سے انسان خود کو تباہی سے بچا سکے۔ اب صرف دیکھنا یہ ہے۔ کہ ان نظریات اور عقائد کی حقیقت کے دلائل کیا ہیں جو قابل تسلیم ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

فرقہ مفکرین کے تمام نظریات عمومی حیثیت سے ہیں یہ اپنے نظریہ کیلئے کوئی مشاہداتی دلیل پیش نہیں کر سکتے البتہ زمانہ حال کے مفکرین نے چشم دید دلائل کو پیش کر کے اپنے نظریات کو ٹھوس بنانے کی کوشش کی ہے۔ مگر انکے نظریات میں نہ ابتدأ ہے نہ انتہا۔ نہ اول ہے نہ انجام ان کے نظریات میں ابتدا اور آخر کا کوئی مشاہداتی تصور با دلیل نہیں۔ اسلئے جب تک (سے لیکر) تک تمام علم کی تکمیل نہ کیجائے اُس علم میں غلط نظریہ کا احتمال ضروری ہے۔ فرقہ پیغمبروں نے اپنے نظریات کو ایک ابتدأ سے لیکر انتہا تک کا نظریہ قائم کیا ہے صرف فرق اتنا ہے کہ انکے نظریات کو ماورأ ادراک تصور قائم نہ ہونے کے باعث وہم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر ایک شخص تب تک کسی علم کو

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) ناقص قرار نہیں دے سکتا جب تک کہ اسکے ظاہری باطنی نظریات کے مشاہدہ میں وہ اپنے تجزیہ کو اسکی انتہائی حدوں پر نہ پہنچائے۔ اگر انسان میں ماوراُادراک ماحول ولطائف کیلئے ادراک یا تصور کرنے کی استطاعت نہیں تو وہ اس علم کو قبل از وقت وہم یا ناقص کہنے کا مستحق نہیں۔ البتہ ایک چیز ایک علم کی صداقت کے لئے ضروری ہوسکتی ہے جس بنأ پر کسی دین و مذہب کو ناقص یا صحیح کہنے پر انسان حق بجانب ہوسکتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ بانئے مذہب۔ اور مذہب کے طریق یعنی علم کو ظاہری اصولوں کے ساتھ پرکھا جائے کہ یہ علم+ ۔ یہ مذہب انسانی زندگی کو امن وراحت اور صحیح ارتقأ کیلئے کس قدر مواد فراہم کرسکتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے۔ کہ اس علم کا ہر نظریہ قوانین فطرت کے مطابق ہو۔ بلکہ کائنات کا ہر ذرہ اسکی شہادت میں اپنے وجود کی خاصیت میں پیش کرتا ہو۔ اسلئے مذہب کا تعلق صرف اصلاح کے ساتھ ہے۔ نہ کہ نقص یا عدم تکمیل یا تنزل کے ساتھ۔ اور اسکی نسبت ہر انسان کے نظریہ کے ساتھ نہیں۔ بلکہ مذہب ہی ایک نظریہ قائم کرکے انسان کو اس پر چلنے کیلئے مجبور کرتا ہے۔ ہر انسان مذہب کی اختراع نہیں کرتا بلکہ ایک مخصوص ہستی ہی اسکا اجرأ کرتی ہے جسے مفکر یا پیغمبر کہا جاتا ہے۔

انسانی پیدائش میں غلط نظریہ کس وقت جاری ہوا؟ مثل ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ یعنی انسان جب کسی شے کے حصول میں عاجز ہوا۔ اسوقت ہی ان خداؤں کا وجود ظاہر ہوا۔ اور ان ضرورتوں کے سبب سے ہی مذہب نے ایک علیحدہ شکل پیدا کرلی۔ ورنہ انسان کو ابتدأ میں ایک آزادانہ زندگی حاصل ہوتے ہوئے کسی ضرورت میں مجبوری نہ تھی اور کسی خدا سے عاجزی کرنے یا مانگنے کی ضرورت نہ تھی۔

انسان کے ابتدائی دور پر جب تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے۔ کہ جہاں انسان تمام لذتوں سے بے خبر تھا۔ یہاں تک کہ اسے۔ اپنے اٹھنے بیٹھنے۔ چلنے پھرنے۔ کھانے پینے کی بھی کوئی ہدایت یا جستجو نہ تھی۔ تو کون سی طاقت تھی جو اسے اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے اسے زندگی کے دوام اور حفاظت کی تحریک دیتی تھی؟ اسوقت تو اسے اپنے انسان اور کسی خدا ہونے کے احساس کی بھی خبر نہ تھی! تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ انسان میں اپنی پیدائش کے ساتھ ساتھ ایک فطری تحریک تھی۔ جو اسے غذا۔ پانی۔ نیند۔ اور اپنی حفاظت (جیسے عام مخلوق میں فطری طور پایا جاتا ہے) کے سامان کی جستجو کی طرف رجوع کراتی تھی۔ انسان چونکہ عام مخلوق سے کچھ علاوہ خاصیتیں رکھتا تھا اسلئے اسے اپنی ضرورتوں کیلئے جستجو کرنی ضروری تھی۔۔ انسان چونکہ اسی زمین میں جواہر کی صورت میں پیدا ہوا اسلئے اسکی زندگی کے سامان بھی اسی زمین پر مہیا تھے اس نے ہر اس چیز کو لیا جو اسکے لئے مفید تھی۔ اور اسے آسانی سے مہیا ہوتی تھیں۔ ایسی صورت میں اسے کسی خدا کے تصور کی ضرورت نہ تھی جسکے لئے یہ اپنی عاجزی ظاہر کرتا۔ انسان گویا

حاشیہ در حاشیہ +اسکی تشریح یہاں قبل از وقت ہوگی اسلئے تشریح آگے آئیگی۔

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) زمین پر ایک بادشاہ تھا جہاں چاہے جتنا چاہے پا سکتا تھا۔ اور جب انسانی نسل بڑھنے لگی ہر انسان نے دیکھا دیکھی میں اپنی زندگی کے حصول کا علم ایک دوسرے سے سیکھا۔ بہر حال غذا کی جو کچھ بھی نوعیت ہو وہ آسانی سے پا سکتا تھا۔ جوں جوں آبادی بڑھنے لگی۔ سامان زندگی میں ایک ہاتھ کی جگہ اب کئی ہاتھ پڑنے لگے تو یہ چیز بھی فطری تھی کہ ہر انسان اپنی ضرورت کی طرف جستجو کیلئے ہاتھ بڑھانے لگا۔ دماغ کو جستجو کی تحریک ہونے لگی ہر شخص کے ذہن میں اپنے سامان کے حصول کیلئے ایک عمل قرار پانے لگا۔ مثال کے طور پر اگر ایک روٹی ایک ہی شخص کھانے والا ہو تو اسے سوچنے کی ضرورت نہیں کہ کہاں سے کھاؤں جہاں سے چاہے بغیر رکاوٹ کے کھا سکتا ہے۔ جب ایک روٹی پر دو آدمی ہوں یا دو سے زیادہ ہوں تو انکے لقمہ لینے میں احتیاط اور تدبر بھی کام کرنے لگتا ہے۔ یہی احتیاط و تدبر انسانی ذہن کو اپنے اصلاحی مواد کے ابھارنے کی تحریک دیتا ہے۔ یعنی انسان میں تدبر کی صلاحیت موجود ہے۔ ضرورت پڑنے پر ہی وہ اپنا عمل شروع کرتا ہے۔ اسطرح انسان ایک ضرورت کے تحت ہی اپنے دماغ سے کام لینا شروع کرتا ہے۔ جب دماغ پر ایک تحریک کی ضرب لگی تو وہ خود بخود محرک ہو کر اختراع شروع کرتا ہے۔ جتنی ضرورت ہو اتنی اختراع کرنے لگتا ہے۔ اور جب یہ ضرورت اس حد تک پہنچی کہ انسان اپنے لئے (لذتوں کے تابع ہو کر) زیادہ سے زیادہ حصول کی جستجو کرے۔ تو انسانی دماغ بھی اسی قدر وسیع ہونے لگتا ہے۔ اور اپنے سامان زندگی کے حصول میں آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی ایک طرف انسانی آبادی میں زیادتی ہونے لگی اور دوسری طرف حصول کی جستجو نے ضرورتوں کو پیدا کیا۔ اور ضرورتوں نے اختراعوں کو پیدا کیا۔ سب سے اہم چیز جو انسان کے ساتھ پیش آئی وہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک انسان اپنی ضرورتوں کو محسوس نہ کرتا تھا اُسے خدا کے محسوس کرنے کی ضرورت نہ پڑی اور جب ضرورتیں پیش آئیں تو اس نے اپنی ضرورتوں کی طرف ذہن کو لگا یا۔ اور ضرورتوں نے اسے موقع نہ دیا کہ وہ اپنی ذات اور کائنات پر تفکر کرتا۔ یہاں تک کہ زمانہ میں بناؤ بگاڑ کے کئی واقعات و حادثات رونما ہونے لگے۔ یہ چیز انسان کیلئے نئی تھی۔ اس انقلاب نے انسان پر ایک طرف اپنی خوبصورتی میں محبت کے تاثرات کو جگایا۔ دوسری طرف بناؤ بگاڑ شیروں کی گرج۔ بادلوں کی گرج۔ بجلی کی چمک۔ پہاڑوں کے پھٹنے۔ لاوے کے بہنے۔ سردی گرمی کے تاثرات نے اس پر کچھ عاجزی کچھ گھبراہٹ اور خوف و ہراس طاری کر دیا۔ یہ فطری اثر ہے کہ انسان محبت کی طرف لپکتا ہے۔ اور خوف سے پناہ کی طرف دوڑتا ہے۔ یہ بھی فطری اثر ہے کہ انسان خوف کی صورت میں کسی کی پناہ چاہتا ہے۔ یہ محبت اور یہ خوف اسی جذبہ فطری کے تحت ہے جو اسے ایک مستقل اور قوی خدا کی پناہ میں آنے کیلئے تحریک دیتا ہے۔ اور اِسے ایک ایسے خدا کا احساس دلاتا ہے جو قوی ہے۔ غالب ہے۔ محبت کا مجسمہ اور قہر کا مجسمہ بھی ہے۔

انسان کو ایسے خدا کا احساس جو ہر قوت کا حامل ہو ابتدائی پیدائش سے ہی ہو جاتا ہے۔ اسکا ایک قوی

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) قوت کا تصور اسکے مادی ماحول سے ہی ہو جاتا ہے۔بس انسان کیلئے یہی عقیدہ حقیقتاً کافی ہوتا ہے۔کہ خدا+ وہی کیفیت ہے جو ہر مخلوق پر غالب ہے جسکی پناہ لینے پر انسان محفوظ رہ سکتا ہے۔جسکے قہر سے انسان فنا ہوسکتا ہے۔اور اس تصور کے غلط ہونے کے یہی اسباب ہیں۔کہ اگر انسان لذتوں کا تابع ہو کر ہوا وحرص میں پھنس کر ضرورتوں کا محتاج نہ ہوتا۔تو اسکی اصلی فطرت صحیح رہتی اور اسے صحیح خدا کا تصور حاصل ہوتا۔جہاں انسان کو آگ پانی غذا وغیرہ کی ضرورتوں نے ان خداؤں کی طرف راغب کیا وہاں حقیقی خدا کو بھی انہیں خداؤں سے شمار کیا گیا۔کہ دراصل ایک خدا نہیں بلکہ بہت سی ضرورتوں کے الگ الگ خدا ہیں انسان نے مادہ کی طرف رجوع کیا اور مادی رنگ سے ادراک کرنا شروع کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا۔کہ اسے اصل علت لامحدود کے تفکر کا نہ موقع ملا نہ ہی اصلی فطرت اصل خدا کو سامنے لاسکی۔یہاں تک کہ انسانوں میں وہ وقت بھی آیا کہ ضرورتوں نے انہیں ایک دوسرے سے برسرپیکار کردیا۔خونریزی اور فساد پیدا ہوئے۔سامان زندگی کے حصول جن میں حرص۔خودغرضی۔حسد۔کینہ اور اس قسم کی مہلک خاصیتیں پیدا ہو چکی تھیں انسان کو تباہی و بربادی کے مقام پر پہنچایا۔نتیجہ یہ ہوا۔کہ انکی اپنی ضرورتوں اور غلط طریق کار نے انمیں فساد و خونریزی پیدا کردی۔غلط خداؤں کا وقار عارضی تھا انکا کسی انسان پر اثر نہ تھا اور نہ ہونا تھا ہر انسان باغی ہوا۔اور فطرت کی خلاف ورزی شروع ہوئی۔اور اس فساد و خونریزی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کسی خدا کے مہر وقہر کا کسی انسان پر اثر نہ ہوسکا جس وجہ سے انسان کسی قہر کے خوف سے بھی بے پروا ہو کر خودسر ہوا اور نہ فطری تقاضا تھا کہ انسان کسی کے قہر سے سہم جاتا جب اس میں خوف کے اثرات باقی رہتے تو انسان خودسر اور باغی ہو کر فساد کی طرف مائل نہ ہوتا۔

انسانی زندگی میں یہ بات بالکل واضح ہے۔کہ انسان ایک پرامن ماحول میں پیدا ہوا۔اسکی فطرت پر امن رہ کر زندگی گزارنے کیلئے ہے۔اسلئے انسان میں انہیں خاصیتوں کا روبہ عمل آنا ضروری ہے جو اسکے امن و اطمینان کیلئے کارآمد ہوں جسکے لئے سب سے اول ایک ایسے قانون کی ضرورت ہوتی ہے جس میں ایک مستقل اور پائیدار صورت میں انسانی فلاح وترقی کا منصوبہ منضبط ہو۔اور یہ قانون ایک ایسی ہستی سے ہی جاری ہوسکتا ہے۔جس میں فطری قانون کی کلی طور موافقت کرنے کی صلاحیت ہو اور یہ قانون بھی فطری بنیادوں پر قائم ہو۔اسی ہستی کو پیغمبر سے تعبیر دیا جاتا ہے۔اور امن واطمینان کی زندگی عطا کرنے والا ایک منضبط نظام (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حاشیہ در حاشیہ +خدا کا لفظ استعمال کیا جائے یا نہ کیا جائے۔مگر وہ خدا جسکے ہونے نہ ہونے کے متعلق اصل علت لامحدود کی شکل میں ادراک کرنا ہے۔یہی قوت ہے جو ہر مخلوق سے قوی اور غالب ہے اسی کیفیت کو سمجھنے کیلئے خدا کا تمثیلی لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

پیغمبر کا یہ دعوےٰ ہے۔ کہ وہ علتِ لامحدود اسقدر تابانی وعظمت کی حامل ہے۔ کہ تم اِسکی تابانی و لطافت میں اُسے نہیں دیکھ سکتے اور اسکے قرب (نزدیکی) کیلئے جب تک تم اپنے کثیف (زمینی) مادّہ کو تحلیل کر کے روحانی (اشرف المخلوقاتی) قوت کو جِلا (تیز) دیکر اپنے اصلی مقام تک نہ لاؤ گے۔ تم اسکے قرب کو برداشت نہیں کر سکتے۔ جیسے انسان ایک ادنیٰ درجہ کی قوت (سورج) کے قرب اور روشنی کو نہیں برداشت کرسکتا۔ ویسے ہی اس علتِ لامحدود (اللہ) کے قرب ونور کو برداشت نہیں کرسکیگا۔ چونکہ پیغمبر ان مراحل سے گزر چکا ہوتا ہے۔ وہ بوجہ منتخب ہونیکے۔ کثیف آلائشوں سے پاک رہتا ہے۔ اور اسکی روحانی عظمت ان جواہر کی عظمت جو ہر انسان میں پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے برقرار رہتی ہے۔ پیغمبر کا کام ہی راہنمائی (قوانین فطرت کی مطابقت) کرنی ہوتی ہے۔ اسلئے بحیثیت معتمد خاص کے اسے ہر ماورأ ادراک مقامات کی آگاہی ہوتی ہے۔ جو اس علتِ لامحدود تک علت در علت واقع ہوتے ہیں۔ چونکہ انسان کو صاحب مکان (اللہ) تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ اسلئے صاحبِ مکان خود ہی پہنچنے کے مقام [1] اور پہنچنے کے اصول [2] بتا کر پیغمبر کو

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) قائم کرنے والا اور ایک ایسی قوی قوت کے محبت وقہر کا احساس دلانے والا (جو انسان کو فساد و بغاوت سے باز رکھے) قانون ہی مذہب یا دین کہلاتا ہے۔ اسکے برعکس دینوی لذات کے تابع ہو کر دینوی ضرورتوں کے حصول کیلئے کسی بناوٹی خدا کی طرف رجوع کرنا۔ ایسا طریق کار اور ایسے خداؤں کا عقیدہ مذہب میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ مذہب کی ضد ہے۔

مفکر قبل از وقت ان نظریات کا قائل نہیں کیونکہ اسکا مادی ذہن ان واقعات کا نہ تصور ہی لاسکتا ہے۔ اور نہ ہی اسکے مشاہدہ میں یہ چیزیں آسکتی ہیں۔ اسلئے اسکے نزدیک دین یہی ہے۔ کہ دنیا خود بخود بنی۔ اور یہی انسان کا پہلا اور آخری مقام ہے۔ فنا کے بعد ہر شے کالعدم ہوگی۔ مگر پیغمبر ایک سلسلہ وار ترتیب کو علت لامحدود سے لیکر دائرہ کی شکل میں چکر لگا کر پھر اسی مقام پر لاتا ہے۔ اسلئے دین کی تعریف پیغمبر سے ہی مل سکتی ہے جس کے دین میں تفکر کی اصلی روح۔ علتِ لامحدود کا تسلیم۔ تجسس۔ عمل۔ عمل کا نتیجہ۔ حشر اور حشر میں اپنے اعمال کے نتیجہ کی پاداش۔ یہ تمامی کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔

حاشیہ صفحہ ھذا [1] مقام: وہ ماحول جو انسان کے معلول سے لیکر علتِ لامحدود تک علت در علت در (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انسانی اصلاح کا کام سپرد کر دیتا ہے۔اور پیغمبر انسان تک وہ اصول پہنچا تا ہے۔

پیغمبر اپنے تبلیغی کام میں۔اول اللہ (علت لامحدود) کا تصور دلاتا ہے۔پھر طریق تفکر سکھانے میں انسان کے لئے لازمی ہو جاتا ہے۔کہ پیغمبر کی پیروی کرے۔پیغمبر اللہ کے تصور کے بعد اپنی پیروی کراتا ہے۔یعنی طریق تفکر میں اصل علت لامحدود کو پانے کیلئے وہی طریقہ بہتر ہوسکتا ہے۔جو اسی علت لامحدود سے جاری ہوا ہو۔پیغمبر وہی کچھ بتاتا ہے جو اللہ نے اسے بذریعہ روحِ لطیف پہنچایا ہو جسے تمثیلی الفاظ میں کیفیت وحی کہتے ہیں۔

یہی چیزیں پیغمبر کو منجانب اللہ ہونا قرار دیتی ہیں اور اسکی ضرورت بھی ہوتی ہے کیونکہ جب ہم یہ تسلیم کریں کہ ہم خود نہیں بلکہ کسی علت سے ہیں اور ہماری آخری علت علتِ لامحدود ہے۔لہذا یہ امر مسلمہ ہو چکا کہ وہی اللہ ہمارا خالق (بنانے والا) ہے۔جب ہم عام مخلوق کے مقابلہ میں خصوصی حیثیت رکھتے ہیں تو ضروری ہے۔کہ ہمیں کسی خاص مقصد کیلئے بنایا گیا ہے۔دنیا کا ہر نظام ایک صحیح اصول کے تحت چل رہا ہے۔بلکہ اسی اللہ کے اشارے سے چلا ہوا ہے۔تو ہماری زندگی کا یہی مقصد ہے۔کہ ہم ایک علت سے پیدا ہوئے اور اسی علت کو پہچاننا اسی تک پہنچنا ہے۔اور اپنی اشرف المخلوقاتی پوزیشن کو برقرار رکھنا ہے۔تاکہ ہم۔ایٹم۔سورج۔ہوا۔آگ۔غرضیکہ ہر مخلوق پر غالب ہوں۔ایٹم ہماری تاثیر سے فنا ہو نہ کہ ہم ایٹم سے فنا ہوں۔سورج کی تابانی ہم سے

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) علت واقع ہوں۔

۲ اصول: جمع اصل کی ہے۔طریق عمل۔قوانین۔جن پر عمل پیرا ہو کر انسان اصل علت لامحدود کو پاسکے۔اور ان میں کسی قسم کی خامی نہ پائی جائے۔یعنی اصل کو پانے کیلئے وہ صحیح طریق کار جن سے اصل کو پایا جائے جو باوجود۔عقل کے تسلیم نہ کرنے کے بھی۔اپنے میں حقیقت کو پانے کا پورا اثر رکھتے ہوں۔اور قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت اور موافقت بھی رکھتے ہوں اس اصول کی ہر بات تجرباتاً صحیح ثابت ہو سکے ــــــ جن میں مخلوق سے لیکر علتِ لامحدود (خالق) تک کے تمام مراحل سے گزرنے کے حالات اور طریقے بتائے گئے ہوں۔کہ کس طرح انسان تفکر کرے۔اور کس طرح علت لامحدود تک رسائی حاصل ہو۔

ماند پڑ جائے نہ کہ ہم اس سے متاثر ہوں۔ ہوا ہمارے اختیار میں ہو نہ کہ ہمیں اڑا لے جائے وغیرہ۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنی اس روحانی عظمت کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ جس سے انسان اِس تمام مخلوق سے اشرف واعلیٰ قوت وغلبہ کا درجہ رکھتا ہے۔ انسان چونکہ فطری طور پر اشرف المخلوقات ہے۔ اُسے اپنے اس مقام عالی کا احساس کرنا ہے کہ میں کیا تھا اور اب کیا ہوں۔ انسان نے اپنی شرافت کو اپنے فرائض کی کوتاہی۔ غفلت اور غلط روی کیوجہ سے مادی رنگ میں ملوث کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کائنات کی سب سے افضل مخلوق کے بگڑنے سے نظام کائنات میں برہمی پیدا ہو گئی۔ جس سے نظام کائنات میں فطری قوانین کی مخالفت ہوئی اور بدانتظامی پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ چونکہ سب سے اہم کام انسان کے لئے ہی معین ہو چکا ہے۔ اسلئے انسان کو ہی دوبارہ راہ راست پر لانے کا انتظام ضروری ہے۔ جسکے لئے ایک پیغمبر کو منجانب اللہ مخصوص کر کے دنیا اور انسان کے مقصد اصلی کو دوبارہ تازہ کیا جاتا ہے۔

جہاں تک اس نظریہ کا تعلق ہے۔ یہ چیز انسان کی ذاتی اختراع ہے۔ کہ انسان کو ابتدائی تفکر میں کن نظریات سے سابقہ پڑتا ہے۔ تفکر میں یہ مقام انسان کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ تفکر کے لئے اپنا راستہ استوار کرے اور اس نظریہ کی تصدیق بھی ضروری ہے۔ اسی تصدیق کے لئے ہمیں زمانہ ماضی وحال کے واقعات وعلم پر نظر ڈالکر گزشتہ قوموں اور بانیان مذاہب (مفکر حکما وپیغمبر) کے قول وفعل کا مطالعہ کرنا ہے۔

تواریخ کے مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت سے پیغمبر زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے ایک دین کو پیش کیا اور قوموں کے لئے ایک طریق تفکر کا اجرا کیا۔ اسی طریق پر قوموں کے نظریات وعقائد مستقل ہوتے گئے۔ بانیانِ مذاہب نے جو تعلیم پیش کی۔ وہ زمانہ کے حالات کے مطابق تھی۔ زمانہ جسقدر ترقی پر جاتا رہا اسی قدر انکے اقوال ونظریات میں بھی ردّ وبدل ہوتا رہا۔ مگر یہ ردّ وبدل صرف زمانہ کی روش کے مطابق ہی ہوتے رہے۔ ان نظریات میں تحقیق وتفکر اور اصل علتِ لامحدود کی تلاش کا مقصد ہر بانئے مذہب نے ایک ہی رنگ میں پیش کیا۔ یعنی مقصد

سب کا ایک ہی تھا۔ مگر طریق تفکر کا علم ہر قوم کے حسب حال کیا گیا۔ اس طرح ہر زمانے میں ہر مفکر ہر پیغمبر کی ایک ایک جماعت بنی ہر جماعت نے قوم کی شکل اختیار کی اور اپنے بانی کے نظریات کو اپنا کر اسی پر عقائد قائم کیئے۔

مفکرین مادہ نے مادی رنگ میں جو نظریات پیش کیئے قوم نے انہی نظریات پر اپنا عقیدہ قائم کیا۔ اور پیغمبروں نے جو منجانب اللہ علم سے نظریات پیش کیئے قوم نے انہیں نظریات پر عقیدہ قائم کیا۔ ان سب ہستیوں کا ایک ہی نصب العین تھا۔ کہ انسان پر تفکر لازم ہے۔ اور وہ تفکر میں اصل علت لامحدود کو تلاش کرے۔ لیکن زمانہ کے مختلف وقتوں میں اقوال و افعال (طریق عمل) میں اختلاف ضروری تھا۔ اسلیئے ان اقوال و افعال میں اختلاف سمجھا گیا۔ مفکرین مادہ اور پیغمبران دو فرقوں کے نظریات میں اختلاف تضاد ضرور ہے۔ کیونکہ ایک کی بنیاد مادہ پر ہے۔ اور دوسرے کی بنیاد مادہ سے قوی قوت منجانب اللہ علم۔ روحانیت پر ہے۔ مفکرین نے مادی حسیات کے ذریعہ جو نظریات پیش کیئے وہ چونکہ ماوراُ ادراک کا صحیح اندازہ نہ کر سکے اسلیئے انکے نظریات میں نقص پایا گیا اسکے مقابل پیغمبروں کے نظریات چونکہ روحانیت پر مبنی تھے اسلیئے ان دونوں نظریات میں تضاد ہونا ضروری تھا۔ علاوہ ازیں پیغمبروں کی روحانی جماعتوں میں بھی نظریات وعقائد میں اختلاف رہا۔ یہ اختلاف زمانہ کے حالات کے مطابق اور لوگوں کے اعمال کے لحاظ سے پیدا ہوئے۔ پیغمبروں کی تعلیم میں اختلاف نہ تھا۔ بلکہ انکی قوموں میں اختلاف پیدا ہوئے۔ اس اختلاف کی اور بھی چند خصوصیات تھیں۔

پہلی خصوصیت اختلاف کی یہ تھی۔ کہ پیغمبر ایک وقت معین پر پیدا ہوا۔ جس وقت کہ لوگوں میں فساد۔ خونریزی۔ قوانین فطرت کی خلاف ورزی کی وجہ سے اپنے مقصد اصلی (یعنی تلاش اصل سے کوتاہی) سے غفلت تھی۔ یہ عدم تکمیل اور کوتاہی وانحراف ہی اختلاف کا باعث بنی۔ اور اس غفلت کا باعث انسانی فطرت تھی۔

انسان میں فطری طور پر فساد کا مواد موجود ہے۔ یعنی اسکا مرکب دو خصوصی اجزاُ سے بنا ہے۔ ایک وہ جز جو اشرف ہونے کی حیثیت سے لطیف روحانی جوہر کی شکل میں اس میں پایا جاتا

ہے۔دوسرا دہ موادِ زمینی جس سے اسکے اصل جوہر کی نشوونما ہوئی۔ یہ جز ادنیٰ درجہ کی خاصیت رکھتا ہے۔ان ہر دو اجزاٗ کا اثر یہ ہے۔کہ لطیف جوہر اپنے اصل (عروج) کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جس سے انسان میں عروج کی طرف تحریک ملتی ہے۔اور ادنیٰ درجہ کی مادی خاصیت اپنے مادہ (تنزل) کی طرف رجوع کرتی ہے۔جس سے انسان میں تنزل کی طرف رغبت ہونے لگتی ہے۔انسان کیلئے یہ لازمہ ہے کہ وہ ان دو قوتوں کے تابع ایک نہ ایک جز کی طرف مائل ہوتا ہے۔ خواہ وہ اپنی ذات سے تفکر کرے یا نہ کرے اس نے انہیں دو خاصیتوں کے اثر کے مطابق کام کرنا ہے۔انسان کے ارادہ ہوتے ہوئے اُس پر یہ لازم ہے۔کہ وہ ان اجزاٗ کے اثرات میں سے بہتر اثر قبول کرے۔اسکے لئے اسے اپنی ذات اور کائنات پر تفکر کرنا ضروری ہے۔تفکر میں قدم اٹھانے سے ہی وہ اپنی عروجی قوت کے ذریعہ عروج کی طرف جائیگا یہاں تک کہ اصل علتِ لا محدود سے ہمکنار ہوگا۔انسان کو سوائے اسکے چارہ نہیں کہ وہ اپنے لطیف اجزاٗ کو روبکار لا کر کثیف مادہ کے اثرات سے خالی ہو۔اسکی ذمہ داری ہے کہ وہ کثیف مادہ کو تحلیل[1] کرے۔جب کثیف اجزاٗ

---

[1] انسان کی ابتدائی زندگی کی بنیاد ایک نورانی لطیف ذرہ سے ہوئی ہے۔یعنی انسان اپنے وجود کی اصلی ہیئت سے پہلے ایک لطیف جرثومہ تھا۔اسوقت اسکی قوت لطیف تھی۔اسی ذرۂ لطیف نے زمینی مواد میں سما کر اسی مواد سے اپنا وجود انسانی بنایا۔اس وجود سے پیشتر یہ ذرہ قوی تھا۔زمینی مواد کے اثر سے اس میں تنزلی کیفیت کا اثر آ گیا۔ذرہ بجائے خود زندگی رکھتا تھا۔اب اسنے یہی مادی وجود اپنے پیشتر کے وجود میں اسطرح لانا ہے۔کہ زمین سے حاصل کردہ مواد کو پھر تحلیل کرنا ہے۔اور روح اعلیٰ ہوتے ہوئے اسنے اس سے بھی بالاتر قوت کو حاصل کرنا ہے۔یعنی انسان اپنی جسمانی ہیئت کے لحاظ سے کمتر درجہ رکھتا ہے۔مگر کمتر درجہ رکھتے ہوئے اشرف المخلوقات ہے۔اسکی شرافت وبلندی کا باعث اسکا جواہراتی مادہ ہے۔(۱) وہ جوہر جو جملہ مادی مخلوق کے جوہر سے افضل ہے یعنی وہ جوہر جس سے انسان کی زندگی کی ابتداٗ ہوئی (۲) دوسرا وہ جوہر جو ماوراٗ ادراک جواہراتی قوتوں کی علت ہے جو انسان میں اسلئے ودیعت کیا گیا ہے۔تاکہ انسان علت لامحدود کا بھی ادراک کر سکے۔یہی جوہر ہونے کی وجہ سے انسان باوجود کمتر درجہ کی ہیئت (مادی جسم) رکھنے کے اشرف المخلوقات کا درجہ رکھتا ہے۔اسلئے جب تک انسان میں مادہ کا غلبہ ہوگا انسانی شرافت کثافت میں دب جائیگی اور جب یہ اعلیٰ جوہر۔روحِ لطیف مادہ پر غلبہ حاصل کریگی تو لازمی ہے کہ مادہ کم ہوگا اور روحِ لطیف روشن ہوگی۔یہ چیز سوائے اسکے نہیں ہوسکتی جبتک انسان اپنی مادی کثافت کو دور نہ کرے۔

کا انسانی وجود میں اثر کم ہو جاتا ہے۔تو لطافت بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے اصل کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیتی ہے۔اور جب انسان اپنے ان فرائض کو بھول کر قوانین فطرت کے برعکس چلنے لگتا ہے۔تو وہ تفکر اور مقصد اصلی کا تصور کرنے سے رہ جاتا ہے۔جس وجہ سے اسکا مادی کثیف مواد عود کر آتا ہے۔جسکا لازمہ ہے کہ وہ بجائے عروج کے تنزل کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے۔کہ انسان دینوی لذات کے تابع ہو جاتا ہے۔وہ دنیا کی ہر مادی شے کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔اس غرض کے تحت انسان۔خود غرض۔لالچی۔نفس پرست ہو جاتا ہے۔ناجائز طریقہ سے دینوی امارات کا حصول کرنے لگ جاتا ہے۔ناجائز حصول کا اثر یہی ہے۔کہ انسان ہر برے فعل پر آمادہ ہو جاتا ہے۔قتل۔خونریزی۔کمزوروں کو محکوم بنانا۔صرف اپنی ہوس پوری کرنے کی خاطر ہر انسان کے حقوق پر صرف اپنا تسلط جمانا چاہتا ہے۔اسطرح قوانین فطرت کے خلاف جو چیزیں ہر انسان کیلئے مساوی صورت میں استعمال کرنے اور فائدہ اٹھانے کیلئے دنیا میں پیدا ہوئیں ان سب کو اپنی خاطر جمع کر کے باقی انسانوں کے حقوق تلف کرتا ہے۔اس حصول کے لئے وہ ہر ناجائز حربہ استعمال کرنے لگ جاتا ہے۔خواہ یہ تصرف ظلم سے ہو۔دغا۔دھوکہ۔جھوٹ۔چوری اور سینہ زوری سے ہو انسان ہر حربہ استعمال کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔انسان پر جب یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔تو عمومی حیثیت سے نظام کائنات کے اصول وقوانین کے اجرا میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔جس سے دنیا کے عروجی نظام میں برہمی پیدا ہونے کا احتمال ہو جاتا ہے ایسی صورت میں فطری طور پر اس چیز کی ضرورت ہو کہ کائنات کے اس گندہ زخم کو دھویا جائے تاکہ یہ زخم تمام جسم کو مریض نہ کر ڈالے جس سے تمام کائنات کے تباہ ہونے کا خطرہ ہو۔لہذا ایک ایسے حکیم کی ضرورت فطری طور پر ہونی ضروری ہے جو اس زخم کو اس مہلک مرض سے صاف کر کے ان گندہ جراثیم کو صاف کر ڈالے۔لہذا اس خلل کو دور کرنے کے لئے ایک پیغمبر کی ضرورت ہوتی ہے۔جو اس مرض کی پہلی بنیاد پر ہاتھ ڈالتا ہے۔یعنی پیغمبر انسان کو اسکے اصلی مقصد سے آگاہ کرتا ہے۔کہ انسان تفکر کرے ــــ انسان بوجہ غفلت کے اس حالت میں پہنچا ہے۔لہذا انسان اپنی روحانی

لطیف خاصیت کی طرف مائل ہونے کی کوشش کرے تاکہ مادی کثیف جوہر کی طاقت کم ہو جائے جو ان تمام مرضوں کی جڑ ہے۔ جب تک انسان اپنے اصل کی طرف مائل نہ ہو۔ انسان کی اس تباہی کا سوائے اسکے اور کوئی علاج نہیں ہوسکتا۔ اسکے لئے پیغمبر ایک صحیح طریق تفکر پیش کرتا ہے۔ وہ بطور علاج طریقہ تفکر میں چند دواؤں کا استعمال کراتا ہے جس سے کہ یہ مہلک مادی جراثیم زائل ہونے لگتے ہیں۔ اور انسان روبصحت ہونے لگتا ہے۔ یعنی انسان پیغمبر کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلکر غلط روی سے پرہیز کرتا ہے اور صحیح مقصد کی طرف رجوع کرتا ہے۔ صحیح مقصد کی طرف رجوع کرنے کا نتیجہ یہی ہے۔ کہ دنیا میں فساد ختم ہو جاتا ہے لیکن ___ انسان جب دنیوی لذت اور نفس پرستی میں پھنس جاتا ہے۔ تو اسکی آرام طلبی اسے ان لذات کی نفع اندوزی یکلخت چھوڑنے سے مانع ہوتی ہے۔ انسان اپنی غفلت اور عقل کی نارسائی کیوجہ سے خودغرضی پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور وقتی مفاد (جسکی اصل میں قیمت کم ہے) کو ہی کافی سمجھکر اسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اسلئے اس دنیوی مفاد کے مقابلہ میں پیغمبر کی اصلاحی تعلیم کو ٹھکراتا ہے ___ پیغمبر کی تعلیم کا یہ اثر ہوتا ہے۔ کہ خودغرض انسان کے تمام ناجائز طریقے یکسر ختم ہو جاتے ہیں۔ اسکے ناجائز ذرائع بند ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز لازمی ہے۔ جہاں پیغمبر اپنے اصول کو پیش کرنے لگتا ہے۔ یہ چیز تمام ناجائز طریقوں کے ختم کرنے کا ایک مکمل حربہ ہوتا ہے۔ جس سے ہر خودغرض انسان کے ناجائز اغراض پر چوٹ لگتی ہے۔

جب انسان اپنے ناجائز ذرائع کے راستے مسدود پانے لگتا ہے۔ تو ضروری ہے کہ وہ اپنے نفع کے خاطر اس روکاوٹ کو دور کرے۔ لہذا یہ منحرف انسان کلیتاً پیغمبر کی مخالفت اور اسکے دین کی تردید شروع کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اب پیغمبر کا دین سچائی اور حقیقت پیش کر رہا ہے جس سے اسکے تمام منافع ختم ہونگے۔ اُسے اختلاف نہیں بلکہ تسلیم ہوتا ہے۔ کہ میرے ناجائز اور غیر اصولی طریق کو سچائی اور حقیقت سے ہی موت ہوگی۔ یہ اختلاف نہیں۔ بلکہ اپنے مفاد کے بچانے کا ایک غیر اصولی حربہ ہوتا ہے۔ جو سچائی کے مقابل استعمال کیا جاتا ہے۔ اس حربہ کی شکل تردید کی صورت میں پیش کی جاتی ہے۔ کہ خدا کوئی شے نہیں۔ پیغمبر کے یہ سب طریقے غلط اور بہتان ہیں۔ وہ

ہماری طرح کا آدمی ہے۔ جو کچھ یہ کرتا ہے۔ جادو ہے۔ نظر و دماغ کو دھوکہ دینے والی چیزیں ہیں وغیرہ۔ یہ چیزیں کسی مذہب کی آڑ میں نہیں ہوتیں بلکہ اپنی نفسانی اغراض کے تحت ہوتی ہیں۔ انسان خدا کا قائل ہو یا نہ ہو وہ مذہب کی مخالفت صرف اپنی اغراض کے نقصانات کی بنا پر کرتا ہے۔ اپنے حربہ کو مضبوط شکل دینے کیلئے وہ بھی مذہب کی نقلی شکل اختیار کرتا ہے۔ یعنی حقیقت کے مقابلہ میں ایک باطل (غیر حقیقی) قوت کھڑی کرتا ہے اسکی تقویت کیلئے یہ بھی پیغمبر کی طرح اکثریت کی شکل اختیار کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ مقابلہ میں کمزوری نہ واقع ہو۔ اسطرح پیغمبر کے نظریات کی تردید میں ایک باطل (منحرف) جماعت کا وجود مستقل ہونے لگ جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ہم نے قوانین فطرت کی پیروی کی تو لازمی طور پر ہمیں اپنی نفس پرستی اور خودغرضی سے کنارہ کش ہونا پڑیگا۔ تو ہمارے تمام ذرائع ناجائز حصول کے یکسر ختم ہو جائینگے۔ اسلئے یہ جماعت پیغمبر کی سرے سے مخالف ہو جاتی ہے۔

قوانین فطرت کی موافقت (پیروی) انسان کیلئے ایک لازمی چیز ہے۔ اسلئے اکثر لوگ پیغمبر کی حمایت و تائید میں آجاتے ہیں۔ اور قوانین فطرت کے اصولوں (تفکر۔ تسلیم۔ تلاش اصل) پر عملدر آمد شروع ہوتا ہے یہ چیز فطری ہے۔ کہ ہر گندہ مواد ضائع ہو جاتا ہے۔ اسلئے مخالفت جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ تو اسکا نتیجہ ضروری ہے۔ کہ یہ باطل جماعت یا تو تباہ ہو جاتی ہے۔ یا شکست کھا کر تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ پیغمبر کی کامیابی پر انکے ہر ذرائع بھی ختم ہو جاتے ہیں بلکہ یہ خود بھی اپنے ذرائع بند ہونے کے باعث اپنی زندگی کو خطرے میں محسوس کرتے ہیں۔ اسلئے انہیں مجبوراً پیغمبر کی حمایت میں آنا پڑتا ہے۔ اور جب انکی بھی حالت باقی لوگوں کی طرح ہو جاتی ہے۔ تو ضروری بات ہے۔ کہ جب ناجائز راستہ بند ہو جائے۔ تو انمیں لطافت کے مواد کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔ انمیں اکثر صحیح معنوں میں تسلیم کرتے ہیں۔ اور اکثر صرف زبانی حمایت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسطرح ایک حقیقی جماعت میں جہاں خالص لوگ ہوتے ہیں وہاں ان میں گندہ کثیف جراثیم بھی چھپے ہوتے ہیں۔

پیغمبر اپنے زمانے میں اپنی تعلیم کو پوری طرح جاری کر دیتا ہے۔ جسکا اثر اسکے بعد مدتوں رہتا ہے۔ کہ حقیقت کی حمایت ہوتی رہتی ہے۔ مگر انسانی تسلسل لگاتار شروع رہتا ہے۔ ایک زمانہ کے بعد اصل کو پانے والے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ زمانہ میں حقیقی تعلیم کا اثر کم ہونے لگتا ہے۔ لہذا اگندہ مواد پھر عود کرنے لگ جاتا ہے۔ اور طویل زمانہ کے بعد پھر اُسی ظلم و فساد کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اور اب اسکی ہیئت پہلی ہیئت سے کسی قدر مختلف ہوتی ہے پہلے تو براہ راست مخالفت ہوتی ہے۔ مگر اب موافقت کے رنگ میں مخالفت ہوتی ہے۔ یعنی خود غرض نفس پرست لوگ اسی مذہب کو اپنے ناجائز ذرائع کا ذریعہ بناتے ہیں یعنی مذہب کے اصول و قوانین میں تحریف (ہیر پھیر) شروع کرتے ہیں۔ اپنی عقیدت کو ظاہر کرنے میں اپنی انتہائی محبت کا مظاہر کرنے کیلئے پیغمبر کے بت[1] بنائے جاتے ہیں۔ اپنے تصور میں انہیں بتوں کو لاتے ہیں۔ کہ یہی بت ہمیں اپنے مقصد تک پہنچائینگے۔ دراصل یہ چیز اصل پر مبنی نہیں ہوتی یعنی اسطرح بھی انکا مقصد تلاش حقیقت نہیں ہوتی بلکہ حقیقت کو چھپانے کا ایک حربہ ہوتا ہے۔ اور یہ لوگ اسی ذریعہ سے اپنے ناجائز مطالب کو پورا کرتے ہیں۔ دین میں اپنی من گھڑت باتیں ملا کر اس قسم کا بناتے ہیں کہ جسکا نتیجہ سوائے دنیوی ہوس کے اصل حقیقت سے آگاہی کا نام تک نہیں ہوتا۔ اسطرح ایک زمانہ کے بعد ایک پیغمبر کے ساتھ منسوب کی ہوئی ایک قوم پیغمبر کی تعلیم کے مرزہ ڈھانچے کو لیکر (جس میں تحریف کے باعث اصل تعلیم قطعاً معدوم ہو چکی ہوتی ہے) ایک مذہب اور چند بناوٹی نظریات کو لیکر ایک شکل اختیار کرتی ہے۔ یہ قوم حقیقی دین کی حامی نہیں ہوتی بلکہ باطل اور انحراف کو لیکر اپنے ناجائز اغراض کو پورا کرتی ہے۔ جسکا نتیجہ ایک وقت یہی ہوتا ہے۔ کہ انسان پھر لطافت کی بجائے ظلم و تنزل کی طرف مائل ہو کر دنیا میں فساد پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ پھر دنیا کو دوبارہ ایک

---

[1] اسکی تشریح آگے آئیگی: نوٹ:- بت پرستی کس وجہ سے انسانوں میں پائی گئی اسکے اسباب کیا تھے۔ یہ قرآنی تشریح میں آئیگا۔

مصلح (پیغمبر) کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ قوانین فطرت کے اصولوں کی پھر اپنی اصلی رنگ میں تجدید ہو جائے۔

انسان کی قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت ایک ابتدائی قدم ہے۔ جب انسان اپنی سرشت کے تحت فساد کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ تو ان حالات میں فطری قوانین کے اصول ناپید ہو جاتے ہیں۔ اسلئے ان اصولوں کی تجدید کیلئے ایک پیغمبر کا وجود ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اور جب پیغمبر سابقہ تعلیم الٰہی کی تجدید کرتا ہے۔ تو غلط اور بناوٹی اصول و نظریات کی اس سے ٹکر ضروری ہوتی ہے۔ یہ ٹکر مذاہب کی نہیں بلکہ حقیقت اور انحراف کی ہوتی ہے۔ اسلئے روحانیت سے کوتاہی۔ اور مادی کثافت کار و بکار آنا ہی حقیقی مذہب اور باطل مذہب کی مخالفت کا سبب بن جاتا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے۔ کہ انسان کاہل اور آرام طلب واقع ہوا ہے۔ اپنی کم فہمی کے باعث اپنے بے بنیاد نفع میں ہی اپنی بہتری سمجھنے لگتا ہے۔ مادی نفع خوری میں وہ کم مشقت اور آرام سمجھتا ہے۔ اسکے مقابل حقیقت میں یہ مادی آرام طلبی بہت کم پائی جاتی ہے۔ ایک شخص ایک خشک روٹی کھا کر ننگی زمین پر سو کر بھی وقت گزار سکتا ہے۔ اسکے مقابلہ میں ایک شخص مرغن غذا کھا کر اور نرم گدگدے بستروں پر سو کر اپنے وجود کو مشقت اور تکلیف کا عادی نہیں رہ سکتا وہ ننگی زمین پر اپنے وجود کی تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ننگی زمین پر سونے والا اگرچہ وجود کو آرام نہیں دیتا۔ لیکن اسکا مادی وجود اسی حالت میں تحلیل ہوتا رہتا ہے۔ جس سے اسکی روح قوی ہوتی ہے۔ برعکس اسکے ایک آرام طلب انسان اپنے وجود کو آرام پہنچانے سے مادی غلبہ کو اور بھی قوی کر دیتا ہے۔ یہ آرام طلبی انسان کو حقیقت کی طرف مائل ہونے میں مانع ہوتی ہے اور چند ہی تعداد میں انسان حقیقت (تلاش اصل) کیلئے کسی محنت و مشقت کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں اسلئے حقیقت کو پانے کیلئے اکثریت میں انسانیت اپنی تکمیل کو نہیں پہنچتی اور چند عرصہ کے بعد یہ مواد بھی ختم ہو جاتا ہے اسلئے اکثریت کی عدم تکمیل کی وجہ سے انسان اپنی اصل کو پہنچنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ یہی ایک خصوصیت ہے کہ انسان نے کسی زمانہ میں اصلیت سے آگاہی مکمل طور پر حاصل نہ کی جس سے کہ کوئی تعلیم

عالمگیر حیثیت اختیار نہ کرسکی۔اور ہر زمانہ میں باطل کو اقتدار حاصل کرنے کا موقع ملتا رہا اور زمانہ میں یہ اختلافات بدستور قائم رہے اور ہر زمانہ میں ہر مذہب اپنی عدم تکمیل کے باعث انسانیت کو اصلی منصب پر نہ پہنچا سکا۔اور یہ مذاہب ایک طویل مدت کے بعد نامکمل صورت میں ہی کالعدم ہوتے رہے۔البتہ ضرورت زمانہ کے مطابق پیغمبروں سے اصل قوانین فطرت کی تجدید ہوتی رہی۔جس سے منحرف افراد اصل کی طرف رجوع کرتے رہے۔اور انسانیت میں قوانین فطرت کی تعمیل کا اثر پیدا ہوتا رہا جسکی وقتی طور زمانہ کو ضرورت رہتی رہی۔لیکن پیغمبر کی تعلیم کو دوام حاصل نہ ہوا تا کہ مابعد کے لوگ بھی اس سے فیض یاب ہوتے۔اسلئے پیغمبر کے گزرنے کے بعد زمانہ کو پھر ایک پیغمبر کی ضرورت پڑی۔

تیسری خصوصیت یہ ہے۔کہ پیغمبروں سے علاوہ جن مفکرین نے تلاش اصل کیلئے نظریات پیش کئے۔وہ بھی اسی مادی رنگ میں ملوث تھے۔جن سے حقیقت کا وجود ظاہر نہ ہوسکا۔چونکہ ان نظریات میں روحانی عروج کا کوئی سامان نہ تھا لوگوں نے سہل طریقہ ہونے کی وجہ سے اس تعلیم (نظریات) کو جلد قبول کرلیا۔کیونکہ اس تعلیم میں کسی ماوراًادراک علت لامحدود کا ابتدائی تصور تھا ہی نہیں۔قوانین فطرت کی پابندی کا احساس کسی کو نہ ہوا۔اسلئے لوگوں میں۔عمل کی تحریک۔یا نتیجہ اور جزا کا احساس نہ پایا گیا۔جس احساس سے کسی عذاب یا تکلیف کا خوف پیدا ہوتا اسلئے پیغمبر کی تعلیم کے مقابلہ میں ان نظریات میں انسانی اصلاح کا کوئی مواد موجود نہ تھا۔بلکہ یہ نظریات ایک خیالی صورت میں پیش کئے گئے۔جو صرف سطحی اعتقاد پر مبنی تھے۔اور ان میں اصلاحی تحریک کا کوئی شائبہ نہ تھا۔یہ ضروری ہے کہ انسان کو جب تک کسی محتسب یا بالاتر قوت کے دباؤ اور خوف کا احساس نہ ہو۔اِسے قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرنے میں کوئی روکاوٹ نہیں ہوسکتی۔اسکے مقابل روحانیت کی تعلیم انہیں بنیادوں پر ہے۔کہ انسان جب ایک مقام کی طرف راہ روی کرے۔تو اسکے لئے وہ طریقہ اختیار کیا گیا۔جو ایک مستقل نتیجہ پیدا کرے۔وہ یہی ہے کہ جب اس علت لامحدود کو "اللہ" کے نام سے تسلیم کیا گیا۔تو اُسے قہار۔عذاب دینے والا۔مالک یوم

الحساب۔خالق کے تصور میں لایا جائے۔تو ضروری ہے۔کہ انسان میں قوانین فطرت کی خلاف ورزی (برے اعمال) کی طرف رجوع کم ہوگا۔جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں کسی بالاتر قوت کے خوفِ عذاب یا اسکے قانون کی گرفت کا ڈر ہونے سے۔فساد وخونریزی۔ظلم کم ہوگا۔جیسے کہ ہم اپنی سماجی زندگی میں۔پولیس۔عدالت۔جرم اور اسکی پاداش کا قانون صرف اسلئے پاتے ہیں کہ دنیا میں فساد۔چوری۔ظلم وغیرہ غیر آئینی واقعات جو قوانین فطرت کے خلاف ہیں کم ہوں۔اسی طرح اپنی زندگی کے انجام پر نظر ڈالکر ایک فنا کا تصور قائم ہو جاتا ہے۔جس سے دنیوی لذات کی ہوس۔نفس پرستی۔خودغرضی کی بجائے اپنے مقصد کی تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔جس سے کہ بجائے خلاف ورزی کے قوانین فطرت کی متابعت ہوتی ہے۔افعال قبیحہ کا صدور کم ہوتا ہے۔اسکی جگہ افعال نیک کا وجود پیدا ہوتا ہے۔جس سے کہ ہر شخص کو اپنی اصل پانے کے لئے ایک خوبصورت ماحول حاصل ہو جاتا ہے اسلئے ایک پیغمبر کی تعلیم ہی ان نقائص کو دور کرنے کیلئے کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔لیکن پیغمبر کی تعلیم مفکرین کی تعلیم کے مقابلہ میں ایک پابندی اور عمل کے احاطہ میں ہوتی ہے۔ہر شخص اس پابندی کو اپنے اوپر عائد کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔اسلئے یہ جماعت جو مفکرین کی تعلیم پر چلنے والی ہو مذہب سے ضرور اختلاف رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔یہ چیز بھی خودغرضی کی بناً پر ہوتی ہے۔مذاہب کا تضاد نہیں ہوتا ہے۔

الغرض جسقدر بھی مذاہب کے اختلاف پائے جاتے ہیں۔وہ اصل مقصد کے لئے نہیں بلکہ جماعتوں کے اپنے اختلافات ہوتے ہیں۔دراصل مذہب حقیقت میں ہر پیغمبر کا ایک ہی ہوتا ہے۔جس میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔جماعتوں میں خودغرض عنصر کے پیدا ہونے سے پیغمبر کی تعلیم کو من گھڑت تعلیم میں مبدّل کر کے اصل کو کالعدم کر دیتے ہیں اور ہر نئی تعلیم اس من گھڑت تعلیم کو ختم کرنے کیلئے پیدا ہوتی ہے۔یعنی یہ اختلاف اصل و نقل۔تسلیم و انکار کی جنگ ہوتی ہے۔جسے مذاہب کا تضاد سمجھا گیا۔مذاہب نے ہر زمانہ میں اصل کی پہچان کیلئے ایک روشن تعلیم پیش کی انکی تعلیم میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ انسانیت کو اپنے وقت پر تباہی سے بچایا۔مگر زمانہ اپنی

طویل مسافت کی طرف جاتا رہا اور دنیا میں ہر بار انسانی زندگیاں پیدا ہوتی رہیں۔ ہر زمانہ میں انسان فطری طور پر تنزل کی طرف مائل ہوتا رہا اور ہر زمانہ میں پیغمبر کی تعلیم انسان کو اپنے مقاصد کی طرف رجوع کراتی رہی۔

اگر تضاد کی وجہ دیکھی جائے کہ پیغمبر کی تعلیم بوجہ انسانی عدم تکمیل اور استعداد نہ ہونے کے اور زمانہ کے عروجی نظام کے نہ تکمیل ہونے کے باعث انسان عالمگیر حیثیت میں اصل کو نہ پا سکا۔ اگر کسی زمانہ میں بھی انسان عالمگیر حیثیت میں پا تا۔ تو اسکے لئے لازم تھا کہ زمانہ کی بھی تکمیل ہو۔ اسلئے ہر پیغمبر نے زمانہ کے حالات کے مطابق ہی تعلیم کو پیش کر کے اپنا فرض ادا کیا۔ اور انسانیت کو اسی حال پر چھوڑا کہ جب زمانہ اپنی انتہائی تکمیل پر پہنچے تو ایک تکمیل کرنے والا پیغمبر بھی ساتھ ہی پیدا ہوگا جو انسانیت کو اسکے انتہا تک عالمگیر حیثیت میں پہنچایگا۔ جسکے بعد کسی پیغمبر کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ انتہا کو اس اکثریت کے ساتھ پایا جائیگا کہ ہر انسان ہر مذہب کو مجبوراً اسے تسلیم کرنا پڑیگا۔ اور اس عالمگیر مذہب کی تعلیم بھی عالمگیر حیثیت حاصل کریگی اور ہر زمانہ اس تعلیم اور اسکی انتہا کو ہر وقت پاسکیگا۔ ابتدائی زمانوں میں پیغمبر مختلف وقتوں میں مخصوص قوموں کیلئے آئے۔ چونکہ زمانہ بھی ابتدائی ہیئتوں میں جارہا تھا۔ ہر شے اپنی آخری شکل کو نہ پا چکی تھی اسلئے لوگوں کے ماحول اور ذہنی استعداد کے مطابق ہی تعلیم کو پیش کیا گیا۔ ہر دور کے بعد زمانہ نے ایک نیا رنگ حاصل کیا۔ تعلیم بھی زمانہ کے ہر رنگ کے مطابق رہی۔ اسلئے علم اور عرفان ایک عالمگیر حیثیت اختیار نہ کرسکا۔ اُس وقت تک اختلافات نہیں مٹ سکتے جب تک کہ پیغمبر کی تعلیم عالمگیر حیثیت اختیار نہ کرے۔ عالمگیر حیثیت اختیار کرنے کے بعد۔ باطل قوت کے راستے مسدود رہینگے۔ ہر بازار میں حقیقت کی خرید و فروخت ارزاں ہوگی۔ اور مذہب انسان کو اپنے اصل مقام پر پہنچائیگا۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ پیغمبر کے مذہب کا کبھی اختلاف نہیں پایا گیا۔ بلکہ پیغمبر کے مذہب نے ہر زمانہ میں انسانی اصلاح کی۔ اگر اختلاف رہا تو انسان کی کم استطاعت (کمزوری) کی۔

استعداد نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی اس رنگ، میں۔ کہ حقیقت و باطل کی ٹکر رہی ـــــ رہا یہ سوال کے جب پیغمبر آئے تو انسان کو بگڑنے کا موقع کیوں ملا۔ اسکی وجہ یہی ہے۔ کہ انسان خود ذمہ دار ہے۔ ہرارادہ واختیار صرف اسلئے دیا گیا ہے۔ کہ وہ تلاش اصل کی طرف مائل ہو یہ انسان کا ذاتی فرض ہے۔ کہ وہ بجائے خود اس فرض کو پورا کرے۔ اس میں پیغمبر کا ہونا لازمی نہیں۔ یہ انسان کا ذاتی فرض ہے۔ یہی انسانی آزمائش اس کائنات میں ہے۔ اِسے اسی غرض سے تمام کائنات کے انعامات بلا معاوضہ عطا کئے گئے ہیں کہ وہ تفکر کرے اور اصل کو پائے۔ یہ فطرت اور خالق کا مزید احسان ہے۔ کہ اِسے اپنی راہ کے پہچاننے کیلئے ایک راہنما بھی دیدیتا ہے۔ جو اسے تمام طریق تفکر آسانی سے سکھاتا ہی نہیں۔ بلکہ اسے ہر بار منہ موڑنے پر اسکا رخ اپنے ہاتھ سے بار بار اس خالق حقیقی اور اسکے نصب العین کی طرف کراتا ہے۔ گویا انسان کا خاصہ یہ ہے۔ کہ وہ اپنے فرائض منصبی سے غفلت کر کے سو جاتا ہے۔ پیغمبر اسے آکر جگاتا بھی ہے اور کاندھے پر اٹھا کر منصب کی طرف لے بھی جاتا ہے۔ حالانکہ اگر پیغمبر کی ضرورت کو سمجھا جائے تو اسی قدر ہونی چاہیے کہ وہ اعلان کردے کہ جو شخص اپنے فرائض کو پورا کرنا چاہتا ہے میری طرف آئے میں اسے راہ دکھاؤنگا بس! اٹھا کر لے جانے کا سوال ہی نہیں۔ جھٹک جھٹک کر جگانے کا سوال ہی نہیں۔ یہ تو احسان ہی ہے۔ کہ فطرت نے کچھ نظام کائنات کی ترتیب ہی اسطرح دی کہ انسانی فرائض میں ایسے لوازمات پائے جاتے ہیں جو اسکے فرائض کی تکمیل کیلئے خود بخود اسکے لئے آسانی کے سامان بہم کر رہے ہیں۔ ورنہ اگر انسان پر ہی اس فرض کا بوجھ ہوتا تو کائنات میں اسکے لئے سوائے۔ رنج وعذاب اور تباہی کے کچھ نہ ہوتا۔ یہی مثال کافی ہے۔ کہ اگر انسان کو اپنی زندگی کے سامان میں سمندر سے پانی حاصل کرنا پڑتا۔ اور یہ ذرائع موجود نہ ہوتے۔ تو اسکی زندگی ایک ڈول پانی لانے میں ہی صرف ہوتی یہ اپنی زندگی کا سامان حاصل کرنے میں اسقدر مجبور ہوتا کہ۔ حیوانوں سے بدتر حالت میں ہو جاتا۔ مگر اسے فطری طور پر اشرف کا درجہ اسی لئے دیا گیا کہ انسان کا فرض اولین ایک حقیقت کا انکشاف کرنا ہے۔ اس میں اسے اپنا ارادہ واختیار اور تمام عالم پر بادشاہت اپنے نفع ونقصان کا

ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔اگر انسان باوجود عقل رکھنے کے اپنے فرائض سے کوتاہی کرے تو اس پر پیغمبر کے اصلاح کے بعد اسکی عدم تکمیل کی شکایت نہ پیغمبر سے ہو سکتی ہے نہ فطرت سے۔

بہر حال یہاں پیغمبر کی پوزیشن اسلیئے ہے۔ کہ وہ انسان کو طریق تفکر کی تحریک دلاتا ہے۔اور اسکی راہنمائی کرتا ہے۔اب انسان کو اپنے مفاد کو حاصل کرنے کیلیئے اتنی گنجائش ہے۔کہ یہ سب کچھ اسی کے لئے ہے۔وہ تفکر کا ارادہ کرے۔اور اسکا علم حاصل کرنے کیلیئے ایک ایسے مذہب کی راہنمائی حاصل کرے جس مذہب کو عالمگیر حیثیت حاصل ہے۔اور جس مذہب کے طریق تفکر (دین) مین مکمل تعلیم عرفان موجود ہے۔ جو قوانین فطرت کے مطابق اپنے نظریات کو پیش کرتا ہے۔سب سے بڑی دلیل اسکی صداقت کی یہ ہونی چاہیے کہ باقی مذہب کی طرح یہ باطل کے آگے دب کر کالعدم نہ ہو بلکہ ہر بار اسی کی فتح ہوئی ہو اور اسی دین نے تمام باطل راستے مسدود کر کے اس پر مکمل فتح و غلبہ حاصل کیا ہو ___ تا کہ انسان کو دوبارہ غلط روی اور نفس پرستی کیلیئے کوئی راہ۔کوئی ماحول۔کوئی ذریعہ میسر ہی نہ ہو سکے۔یہ چیز جہاں پیغمبر کی تعلیم حقیقی سے تعلق رکھتی ہے۔وہاں اس تعلیم کے علمبردار بھی اسی قسم کے ہوں۔ جو پیغمبر کی حمایت میں ایک عالمگیر دین کے اجرا کرنے میں پیغمبر کا ساتھ دیکر عرفان الٰہی کو عام کر دیں ___ یہی صورت ایک مستقل دین (مذہب) ہونے کی ہو سکتی ہے۔

مذاہب عالم کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔کہ گزشتہ زمانوں میں ایسی بھی مشہور ہستیاں گزری ہیں جنہیں۔ مفکر۔حکماً و فلاسفر کہا جاتا ہے۔اور انہوں نے بھی حد درجہ کی شہرت حاصل کی اکثر لوگوں نے انکے نظریات کو اپنایا۔ان میں خصوصی ہستیاں طالیس۔انیکسی منیڈر۔ انیکسی مینیز۔فیثا غورث۔انیکسا غورث۔فیلولاؤس۔ڈیمو قراط۔افلاطون۔ارسطو۔آپرخوس۔ بطلیموس۔ہیرا کلیٹس۔ایمپیڈ وکلس وغیرہ ہیں۔

یہی وہ فرقہ ہے۔جس نے تفکر میں کائنات (موجود مادہ) کو اپنے مادی حس سے مشاہدہ میں لانے کی کوشش کی مگر انکا مشاہدہ بھی تخیلی رہا۔دنیا کے متعلق انہوں نے کئی نظریات پیش

کئے جو اکثر حکماً فلاسفروں کے ٹھوس نظریے تسلیم کئے گئے مگر بالآخر غلط ثابت ہوئے۔ انہوں نے مادی مخلوق کا مادی عقل سے تجزیہ کیا اور ایک نتیجہ اخذ کیا۔ جو بوجہ قریب ہونے کے کچھ صحیح ہوا۔ مگر اسمیں بھی صحیح مشاہدہ نہ ہونے کیوجہ سے آخر کار کئی نظریات غلط ثابت ہوئے۔ اسی طرح بیرونی فضاً کے تجزیہ میں انہوں نے یہی طرز اختیار کی جس میں اکثر نظریات غلط ثابت ہوئے۔ جیسے سورج کا ساقط ہونا۔ زمین کا ساقط ہونا۔ اور دیگر چاند اور ستاروں کے متعلق معلومات جنہیں ایک وقت اِنکی خصوصی ذات (فلاسفر۔ یا حکماً) ہونے پر اعتماد کر کے بغیر کسی مشاہدہ وعلم کے صحیح تسلیم کیا گیا۔ مگر آخری تجربہ[1] نے انکے نظریات کو غلط[2] ثابت کر دیا۔ ہاں! ان میں ایسے بھی مفکر پائے گئے جنہوں نے عقل سلیم سے کام لیکر دنیوی اشیاً کا تجزیہ کیا اور انہوں نے ایک نا معلوم (ماوراً ادراک) اللہ کا وجود۔ بغیر مشاہدہ تسلیم کیا۔ ایک طرف یہ کائنات کی باریکی پر نظر ڈالکر تجسّس کرتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ ضرور اس نظام کو چلانے والا ایک علتِ لامحدود ہے۔ انہوں نے کائنات کی چند چیزوں پر عمیق نظر ڈالکر حیرت کا مظاہرہ کیا۔ اسکے مقابل پیغمبر ماوراً ادراک کا روحانی مشاہدہ کراتا ہے۔

زمانہ حال کا تحقیقاتی فرقہ بھی اسی گزشتہ حکماً وفلاسفر کی جماعت کی ایک کڑی ہے۔ گزشتہ محققین ومفکرین کو اسقدر ذرائع حاصل نہ تھے اسلئے انہوں نے اپنے مادی قیاس پر ہی اکتفا کیا۔ مگر جوں جوں زمانہ ترقی کی طرف جاتا رہا اسی قدر تحقیقاتی عنصر میں وسعت ہوتی گئی اور انہیں حکماً کے نظریات کو بنیادی طور پر لیکر انہیں نظریات کا تجزیہ کیا گیا۔ اور ترقی کے ساتھ ساتھ تحقیقاتی ذرائع بھی پیدا ہوتے گئے۔ جن سے کائنات کی ہر شے کو مشاہدہ کی صورت میں لایا گیا۔ اور

---

[1] آجکل کی تحقیق (سائنس) نے ہر چیز کو آلات کے ذریعہ عینی مشاہدہ میں لایا ہے۔ جن سے گزشتہ مفکرین کے اکثر نظریات کچھ غلط ثابت ہو رہے ہیں اور کچھ صحیح ہیں چونکہ آجکل کے جتنے نظریات ہیں یہ کسی خاص وسیلہ (آلات) کے ذریعہ مشاہدہ میں لائے جاتے ہیں انکا صحیح ہونا یقینی ہے۔ لیکن یہ آلات اپنی حد سے باہر ماوراً ادراک محسوس کرنے سے قاصر ہیں۔ لہذا یہ ذریعہ بوجہ مجبوری کے انسانی تکمیل کو تشنہ رکھ رہا ہے۔ اسکی نامکمل تحقیق کے باعث یہ علم بھی ناقص اور ادھورا ہے۔ [2] یہ چیزیں تحقیقاتی تواریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوسکتی ہیں۔

جو چیز مادی محسوسات (آنکھ۔کان۔اورذہن) میں آتی گئی اسکا مشاہدہ درست ہوتا گیا۔مگر جہاں مادی محسوسات بے کار ہیں اور لطیف نورانی قوتیں انکی زد سے باہر ہیں وہاں علت لامحدود تک تمام ماحول ومخلوق کے علم میں یہ عروجی زمانہ کے محققین بھی مجبور ولاچار ہیں۔اسکے لئے انکے پاس سوائے''شاید'' کے اوراپنی مجبوری کے اورکوئی علم مہیانہیں ہوسکا۔البتہ زمانہ حال کے مشاہدات بھی اسقدروسیع ہیں کہ جوانسان کی قابلیت کی حد ہیں۔یعنی وہ مشاہدات جوابتداً آفرینش کے نشانات کی صحیح تحقیق میں قابل تسلیم ہیں جن میں ڈارون۔نیوٹن۔آئن سٹائن۔وان وزیکر۔اور دیگر محققین کے نظریات جومادی مشاہدہ میں صحیح ثابت کئے گئے ہیں۔علاوہ ازیں کائنات کی دیگر مخلوق کا تجزیہ جسکا عینی مشاہدہ ہورہاہے اورانسان کے روزمرہ علم میں پیش کیا گیاہے۔قابل تحسین وقابل تسلیم ہے۔مگر باوجوداسقدر حقیقی عروج کے بھی یہ علم ادھوراہے۔کیونکہ اس علم میں تلاشِ حقیقت اوراصل علتِ لامحدود (ماوراًادراک) کا نہ تو تسلیم ہی ہوسکتاہے۔نہ اسکے تفکر کیلئے کوئی تحریک ہوسکتی ہے۔ جب تک کہ ایک ماوراًادراک ماحول ومخلوق اورعلتِ لامحدود کو بغیر مشاہدہ کے تسلیم کیا جائے۔ مادی مشاہدہ کی صورت میں یہ تحریک مانع ہوتی ہے (کہ جب تک ہر شے کوعینی مشاہدہ میں نہ لایا جائے اسکاتسلیم نہیں ہوسکتا) مگر روحانی قوت کے تسلیم کے بعد یہ تمام چیزیں ماوراًادراک مخلوق و ماحول اورعلت لامحدود کے تسلیم کیلئے ایک عینی دلیل ہوسکتے ہیں۔اورانہیں حقائق سے علتِ لامحدوداور ماوراًادراک مخلوق کاہونا یقینی ہوجاتاہے۔ضرورت اس چیز کی ہے۔کہ اولاً علت لامحدودکو تسلیم کیاجائے۔ورنہ جس علم سے اصل اورمنتہا تک نہ پہنچا جائے ناقص اورادھوراہوتاہے۔

بہت سے مشہور پیغمبر بھی گزرے جن میں خصوصی طور پر عالمگیر شہرت کے حامل ایسے پیغمبر گزرے ہیں جن کے نام سے ہر مذہب کا آدمی بخوبی واقف ہے جیسے آدم۔نوح۔لوط۔ داؤد۔سلیمان۔ابراہیم۔اسماعیل۔یعقوب۔یوسف۔موسیٰ۔یحیٰ۔زکریا۔عیسیٰ۔محمد صلے اللہ علیہ وسلم (علیہم السلام) یہ وہ مشہور ہستیاں ہیں جنکے نام سے ہر مذہب کا آدمی بخوبی واقف ہے۔اور گزشتہ مذاہب کے بانی ہوئے ہیں۔

انکے علاوہ دیگر مذاہب میں۔زرتشت۔گوتم بدھ۔کرشن۔رامچند روغیرہ انکے نام بھی مشہور عام ہیں اور انسے بھی ایک ایک مذہب متعلق ہے۔جو انہیں بانیانِ مذاہب کے نام سے منسوب ہیں۔جیسے۔یہودی۔عیسائی۔زرتشتی۔پارسی۔آریہ۔بدھی اور محمدیؐ (مسلم) وغیرہ۔ان کے علاوہ اور بھی بیشمار پیغمبر گزرے ہیں۔مگر زمانہ ابتدائی نامکمل دور اور طویل مدت کے باعث تواریخ انکے حالات سے ناآشنا رہی۔ایک تو اِنکی تعلیم مختصر قوموں میں رہی۔دوسرے زمانہ کی عدم تکمیل کے باعث وہ ذرائع میسر نہ ہو سکے جن سے انکے حالات کو تواریخی صورت میں لایا جاسکتا ہے۔تیسرے ہر زمانہ میں ایک نہ ایک فساد قوموں میں پیدا ہوتا ہی رہا۔اور پیغمبروں کے زمانہ کے مطابق پے درپے آنے کی وجہ سے گزشتہ طریق تعلیمات بھی منسوخ ہوتے رہے۔نہ پیغمبروں کا اقتدار باقی رہ سکا نہ قومیں ہی رہیں۔نہ ہی انکی تعلیم مستقل صورت اختیار کر سکی۔باقی پیغمبروں کے حالات جو کچھ ہم تک پہنچے ہیں۔تواریخ میں انہیں اس لئے جگہ ملی کہ انکی تعلیمات ایک طویل مدت تک قائم رہیں۔قومیں کثیر تعداد میں تھیں اسلیئے انکا اقتدار بھی عالمگیر رہا۔

تواریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔کہ ان پیغمبروں کی حیثیت زمانہ کی نوعیت کے لحاظ سے اعلیٰ پایہ تھی۔اور مدمقابل قومیں بھی اسی طرح زمانہ کے لحاظ سے کافی اقتدار پا چکی تھیں۔ ان قوتوں کا اقتدار باطل کے رنگ میں اسقدر وسیع ہو چکا تھا۔کہ انکے مٹانے کیلئے ایسے پیغمبروں کی ضرورت تھی جن میں ایسی جابر قوتوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہو۔ان قوموں کے باطلان و انحراف میں ایک خصوصی چیز پائی گئی۔وہ یہ کہ انکا انحراف بھی دین کے غلط رنگ میں پایا جاتا تھا۔اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی۔کہ انکے اقتدار نے انہیں اس مقام پر پہنچایا تھا۔کہ ایک طرف انہوں نے علت لامحدود کے مقابلہ میں خود ساختہ خدا (بت) بنائے تھے۔اور دوسری طرف وہ اپنے اقتدار کے نشہ میں خود کو خدا سمجھنے لگے تھے۔اور عام مخلوق کو اپنی جابر طاقت کے بل بوتے پر اپنا محکوم بنا کر اپنا خدا ہونا بہ جبر تسلیم کراتے تھے جیسے ابراہیمؑ۔داوٗدؑ۔موسیٰؑ۔عیسیٰؑ وغیرہ کے زمانہ میں نمرود۔ جالوت۔فرعون۔شداد وغیرہ۔انکا اقتدار اسقدر بڑھا ہوا تھا۔کہ تمام دنیا پر تسلط قائم کیا ہوا تھا۔اور

اپنی طاغوتی (شیطانی۔باغی) طاقتوں سے تمام مخلوق پر حاوی ہو چکے تھے۔

فطرت کو یہ منظور تھا کہ مخلوق کی صحیح راہنمائی ہو۔اسلئے ایسی جابر طاقتوں کیلئے ایسے پیغمبر منتخب ہوئے جو بظاہر ایک ادنیٰ حیثیت رکھتے تھے۔مگر منجانب اللہ ہونے کیوجہ سے انہیں تابانی ذرّات نے اپنے ایٹمی اثرات سے ایسے عظیم الشان پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرکے انکا نام صفحۂ ہستی سے ناپید کر دیا۔یہ ایک فطری امر ہے۔کہ ایک پہاڑ کے سامنے ایک ذرہ کی کچھ وقعت نہیں ہو سکتی۔ایک جابر حکمران جسکا حوصلہ اسقدر بڑھ چکا ہو کہ اسے دنیا میں کوئی ایسی طاقت نظر نہ آئے جو اسکا مقابلہ کر سکے۔اسکے سامنے ایک ذرۂ ناچیز۔ایک کم مایہ انسان۔جسکے پاس نہ دولت ہو۔نہ فوج ہو۔نہ طاقت ہو۔یہاں تک کہ اپنے قریبی رشتہ دار ماں باپ بھی ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔اسکی حالت ایک یتیم و بیکس کی سی ہو۔بجائے مددگار ہونے کے ہر شخص درپۂ آزار ہو۔یہ ناممکنات ہے کہ وہ ایسے جابر حکمران کے ساتھ مقابلہ کرنے کی جرأت بھی کر سکے! مگر پیغمبر ہونے کی صفت ہی یہ ہے۔کہ ایک صحیح تعلیم باطل کی تمام طاقتوں کو فنا کر سکتی ہے۔چنانچہ تواریخ میں کئی ایک ایسے واقعات کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔کہ ایک پیغمبر نے ایک عظیم الشان سلطنت کا تمام وقار صرف اپنی ایک ذات سے خاک میں ملا دیا۔یہ پیغمبر کی منجانب اللہ ہونے اور اصل تعلیم کا تقاضا تھا۔کہ پیغمبر کی تعلیم کو قوانین فطرت کے مطابق ایک عظیم الشان فتح حاصل ہو۔

باقی دیگر پیغمبروں کے حالات جن سے ہم تواریخ کے ذریعہ ہی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں مثلاً نوحؑ۔لوطؑ۔یعقوبؑ۔یوسفؑ۔سلیمانؑ۔اسماعیلؑ۔یحیٰؑ۔زکریاؑ۔وغیرہ۔انکے زمانہ میں بھی لوگ اکثریت میں منحرف ہو کر دین الٰہی کی مخالفت میں برسرپیکار ہو کر قوانین فطرت کی خلاف ورزی علے الاعلان کرتے تھے۔بالآخر انہیں پیغمبروں کے ذریعہ دین الٰہی کی فتح ہوئی اور منحرف قومیں۔تباہی۔طوفان اور ہلاکت کا شکار ہو کر نیست و نابود ہو گئیں۔علمی مشاہدہ نہ ہونے کے باعث ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تمام واقعات فرضی اور من گھڑت ہو سکتے ہیں؟ اگر اس اعتراض کو فرض کیا جائے۔تو ہمیں تواریخ پر بھی اعتماد نہیں ہو سکتا۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی

واقفیت کیلئے گزشتہ تفکر اور علم کا یہی تواریخ ذریعہ ہوسکتی ہے۔ اگر اس پر اعتماد نہ کیا جائے تو پھر ہمیں گزشتہ پیغمبروں اور گزشتہ حالات کی صحت پر بھی اعتماد نہیں ہوسکتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اسی تواریخ سے ہمیں پیغمبروں۔ حکماءَ۔ و مفکرین کا تعارف حاصل ہوتا ہے۔ جب ہم اِنکے وجود کو اسی تواریخ پر اعتماد کر کے تسلیم کرتے ہیں تو اِن واقعات کا تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔ جسکے لئے تواریخ کے مصنفین کا محقق ہونا مہر تصدیق کافی ہوتی ہے۔ تواریخ کے مصنفین بھی بالاِ تفاق تسلیم کئے گئے ہیں۔ لہذا انکی صداقت ہی تواریخ کی صداقت کے لئے کافی دلیل ہوسکتی ہے۔ جتنے بھی واقعات گزشتہ زمانہ میں رونما ہو چکے ہیں اِنکی تحقیق محققین کے ذریعہ ہو چکی ہے۔ موجود تحقیقاتی اداروں نے گزشتہ انقلابی واقعات کا تجزیہ کر کے تجربتاً ان باتوں کا انکشاف کیا ہے۔ جو قدیم کھنڈرات سے۔ زمین کی کھودائی میں لاکھوں سال پیشتر کے مخلوقی ڈھانچے [1] اور زمین کی تہوں میں انسانی آبادیوں اور انکے حالات [1] کا جائزہ لیکر عینی مشاہدہ میں لایا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی تحقیقات کو تواریخی بنیادوں پر ہی قائم کیا ہے۔ علاوہ ازیں گزشتہ قوموں کے نظریات بھی اِنکے وجود کے ثبوت ہیں۔ یہ تمام چیزیں گزشتہ تواریخی واقعات کے صحیح ہونے کیلئے کافی ہوسکتی ہیں۔

گزشتہ بانیانِ مذاہب کی تعلیمات اور انکے معتقدین (پیروؤں) کا زمانہ حال میں بھی وجود پایا جاتا ہے۔ جن میں اِنکے نظریات (اگر چہ وہ صحیح نظریات کی مسخ شدہ شکل بھی ہو) ابھی بھی موجود ہیں جن سے اِنکے وجود کا ہونا یقینی طور پر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ ان سب تعلیمات کا مسخ شدہ ڈھانچہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ چیز ثابت کرتا ہے۔ کہ انسان اپنے تفکر کی انتہا میں نامکمل رہا ہے یعنی انسان نے پیغمبر کی اصلی تعلیم کو اپنی خودغرضی کی بناءَ پر مسخ کر ڈالا۔ پیغمبر نے صحیح تعلیم کو پیش کیا۔ لوگوں نے اپنی اغراضِ نفسانی کے پورا کرنے کی خاطر نئے نئے خداؤں کو بتوں کی شکل میں

---

[1] فرعون کی لاش + کشتیٔ نوح + اور لاکھوں سال پیشتر جبکہ انسانی وجود بھی اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا۔ عظیم الشان حیوانی مخلوق کے جسیم ڈھانچے اور قدیم مصر کی زمینوں میں۔ آبادی۔ اور تہذیب و تمدن کے آثار تک (جہاں اکثر آبادیوں کا وجود تھا) کا انکشاف کیا جاچکا ہے۔

کھڑا کیا۔ کسی محتسب نگران (بالاتر قوت) کے خوفِ عذاب یا قانونی گرفت کا احساس نہ ہونے کے باعث دین الٰہی سے بغاوت کی گئی۔ جسکا نتیجہ انسانی نصب العین سے غفلت۔ ہوس رانی اور ناجائز افعال کا دور دورہ رہا۔

ابراہیمؑ: یہ ایک ایسی جلیل القدر ہستی تھے۔ جس نے ایک عظیم الشان سلطنت کے جابر حکمران نمرود کے وقت میں ظہور کیا۔ اس جابر حکمران نے ابراہیمؑ پیغمبر کے ختم کرنے کیلئے اپنی انتہائی قوتوں اور تدبیروں سے کام لیا۔ بالآخر ناکام ہو کر انہیں کے ہاتھ سے بمعہ اپنی تمام طاقتوں کے صفحۂ ہستی سے نابود ہوا۔ زمانہ کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے۔ جسکی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اِنکی تعلیم نے اسقدر عروج حاصل کیا کہ باوجود زمانہ کے کئی انقلابی دور گزرنے کے بھی اِنکی بنیادی تعلیم قائم رہی۔ بلکہ انکے بعد ہر پیغمبر نے انہیں کی تعلیم پر اپنے بنیادی عقائد کو استوار کیا۔ اور یہ تعلیم ہر زمانہ میں نئے نئے عنوان سے اپنا روپ دھارتی (اپنا رنگ جماتی) رہی۔ انکی تعلیم ایسی ٹھوس تھی کہ ہر زمانہ میں اس علمی (علم الٰہی) شجر میں ہر بار نئے نئے ثمر (میوہ) پیدا ہوتے رہے چنانچہ زمانہ حال کی اسلامی تعلیم (دین اسلام) میں بھی اس تعلیم اور طریق ابراہیمی کو بطور یادگار (عبادت کی صورت میں) دہرایا جاتا ہے۔ مثلاً مکہ میں اسلامی تعلیم کے ایک خصوصی رکن (جسے حج کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے) کو ہزاروں سال سے برابر پورا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح داؤدؑ و جالوت کا معرکہ مشہور عالم ہے۔ یعقوبؑ و یوسفؑ کی عظیم الشان مصری فرمانروائی ایک مثال ہے۔ نوحؑ و لوطؑ کے قہرمانی جلال کا مشاہدہ آج بھی مصری کھنڈرات سے عیاں ہو کر یورپین محققین کی حیرت کا باعث بن رہی ہے۔ موسیٰؑ کا فرعون شکن ڈرامہ کی شہادت آج بھی فراعنہ مصر اور فرعون کی لاش میں اپنا ثبوت خود پیش کر چکی ہے۔ عیسیٰؑ کی روحانی تعلیم تو ایک سورج کی مثال ہے۔ جس نے پنیطوس پلاطوس اور یہودا اسکرموتی کی تمام تدبیروں کو ناکام بنا دیا۔ زرتشت کا الٰہی دین دنیا پر سیلاب کی طرح پھیلا۔ کرشن کی معرکہ آرا جنگیں کورو پانڈو کے معرکے آج دنیا میں بطور نمائش اپنے فلک شگاف عمارات اور منقوش جنگی خاکوں سے اپنے واقعات سنا رہے ہیں۔ گوتم بدھ۔

اشوک۔رام چندر کی تعلیمات گویا کل کا واقعہ ہے۔

پیغمبروں کی تمام تعلیمات انسانیت کی فلاح کیلئے ہی فطرت نے پیدا کیں تھیں۔مگر فطرتِ انسانی اور زمانہ کی عدم تکمیل نے انکی تمام تعلیمات کو مستقل نتیجہ حاصل کرنے سے محروم رکھا۔

گزشتہ بانیانِ مذاہب کی موجودہ تعلیم[1] کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ تھا۔جبکہ انکی تعلیم صداقت پر مبنی تھی مگر پیروانِ مذاہب کی خودغرضی۔ہوس رانی نے انکی تعلیمات کی ایسی شکل بگاڑ دی کہ آج انہیں پیغمبروں سے منسوب شدہ تعلیم۔ہمیں انکی ذات پر اعتماد نہ رکھنے پر اُکساتی ہے۔مگر یہ حقیقت نہیں! کیونکہ جہاں تک پیغمبر کی ذات کا تعلق ہے۔ہمیں فطری طور پر انکے منجانب اللہ ہونے اور انکی تعلیمات کا منجانب اللہ ہونے سے انکار نہیں ہوسکتا۔البتہ جو تعلیم فی زمانہ انکی معتقد قوموں میں جاری ہے۔وہ ہمیں انکے مذہب[2] کو (مسخ شدہ تعلیم کے لحاظ سے) ایک مستقل مذہب تسلیم کرنے سے مانع ہے۔یہ اختلاف گویا پیغمبر اور اسکے مذہب سے نہیں بلکہ اس باطل مذہب سے ہوتا ہے۔اور یہ چیز فطری امر ہے کہ حقیقت و باطل کی آپسمیں مخالفت ہو۔

پیشتر بیان کیا جاچکا ہے۔کہ پیغمبر کا کام صرف انسان کی راہنمائی۔اور صحیح راہ پیش کرنا ہے۔اور انسان کا کام اپنے نصب العین کا خود احساس کرکے اسکی طرف رجوع کرنا ہے۔ایسی صورت میں انسان کی عدم تکمیل (تلاش حقیقت میں کوتاہی) کی ذمہ داری پیغمبر یا اسکی تعلیم پر نہیں ہوتی۔بلکہ انسان خود اس چیز کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔فطرت نے انسان کو تلاش حقیقت کیلئے ہر سامان پیدا کردیا ہے۔یہ انسان کا کام ہے۔کہ وہ اصل تک پہنچنے کیلئے ان ذرائع کو استعمال کرے۔ اگر ایک مریض کی صحت کیلئے حکیم ہر دوا مہیا کرتا ہے۔جس سے مریض کی صحت یقینی ہو۔تو مریض

---

[1] اسکے لئے مذاہب کے لٹریچر انکی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے۔''رحمۃ للعٰلمین'' میں ان مذاہب کے نقائص کا صحیح خاکہ دیا گیا ہے۔دیکھئے رحمۃ للعٰلمین جلد سوئم۔مصنفہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری۔

[2] ان کی تعلیمات کا اثر آج تک یہی پایا گیا ہے۔کہ ایک تو اس میں قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت نہیں۔دوسری چیز انسان کی عدم تکمیل تلاش اصل ہے۔

کے دوا استعمال نہ کرنے پر اسکی موت یقینی ہے۔ اسکی ذمہ داری حکیم یا دوا پر عائد نہیں ہوسکتی۔

دنیا میں جب تک اصل کی ایک ضد موجود نہ ہو اصل کی کیفیت کا احساس نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک موت نہ ہو زندگی کا احساس نہیں ہوسکتا۔ جب تک مرض نہ ہو صحت کی قیمت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ جب تک اندھیرا نہ ہو روشنی کو نہیں پہچانا جاتا۔ جب تک انحراف نہ ہو تسلیم کا وجود سامنے نہیں آتا۔ اسی طرح جب تک ہر شے کی ضد موجود نہ ہو اس شے کی حقیقت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ تسلیم و انحراف کا وجود دونوں حالتوں میں ہونا لازمی ہے۔ انحراف (باطل کی طرف رجوع) کرنے کیلئے انسان میں مادہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر یہ مادہ نہ ہو تو انسان کے بنانے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ پھر انسان پر کسی قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوسکتی۔ قوانین فطرت پر تسلیم اور عملدرآمد کا مقصد تب ہی پورا ہوسکتا ہے جبکہ اسکی ضد (انحراف۔ عمل سے کوتاہی کے اسباب) اسکے مدِ مقابل ہو۔ یہ تمام چیزیں براہ راست انسان سے تعلق رکھتی ہیں جن میں سے انسان کو ایک نہ ایک راہ اختیار کرنی ہے۔ انسان پر اسکی ذمہ داری اسلئے عائد ہوتی ہے۔ کہ اسکے لئے تسلیم کے مقابلہ میں انحراف کے مواقع بالکل قلیل صورت میں ہیں۔ دنیا کا ہر نظام فطری طور پر قوانین فطرت کا پابند ہے۔ خود انسان بھی بعض امور میں اسی پابندی میں محصور ہے۔ تاکہ اسے انحراف کے لئے بہت کم تحریک ہو۔ اور وہ تحریک بھی اسکے ارادہ میں پابند ہے۔ کہ اگر چاہے تو انحراف کرے۔ اسکے لئے ہر ماحول اسکی تسلیم کیلئے ایک راستہ ہموار کر رہا ہے۔ نظام کائنات کی ہر شے اسے تسلیم کی طرف پکار رہی ہے۔ اگر انسان ایسی صورت میں بھی انحراف پر آمادہ ہو تو یہ اسکی ذاتی غلطی ہے۔ زندگی کی ضد موت ہے! موت کا سبب زہر ہلاہل ہے! انسان اگر زہر استعمال کرے تو اُسے اس ہلاکت خیز حرکت سے باز رکھنے کیلئے زہر میں بھی موانعات کا مادہ موجود ہے! جو اسے ہلاکت سے باز رکھے۔ یعنی زہر میں شدت کی تلخی اور انسانی وجود پر حد درجہ تکلیف دہ اثر پہنچانے کا مادہ ہے۔ جسکے تصور سے انسان زہر کو چھونا تک پسند نہیں کرتا۔ اگر انسان باوجود ان موانعات کے زہر کھالے تو اسکی ہلاکت کی ذمہ داری خود انسان پر ہی ہوسکتی ہے۔!

فطرت نے انسان کو ایک مجسمہ تسلیم بنایا۔ باالفاظ دیگر انسان بذات خود ایک مجسمہ تسلیم کا مرکب ہے۔ اس میں تنزلی کیفیات کی نسبت عروجی (روحانی) کیفیات قوی و غالب صورت میں پائے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسے کسی راہنما۔ کسی محرک کی ضرورت نہیں۔ مگر انسان دیدہ دانستہ۔ انحراف کی طرف رجوع کرتا ہے! چاہیے تو یہ تھا۔ کہ اسکے عمل کے مطابق اسے اسی حال پر رہنے دیا جائے۔ مگر فطرت کے نظام مین۔ یہ چیز بھی انسان کے ساتھ رعایت ہے۔ بلکہ ایک احسان ہے۔ کہ اُسے خالص ماحول! ایک راہنما! ایک محرک! اور اسکی بازگشت کیلئے دوبارہ اسے اصل مقصد کی طرف رجوع کرایا جائے۔ اسکے لئے خصوصی طور پر پیغمبر کا وجود پیدا ہوتا ہے۔ اگر پیغمبر کا وجود صرف انسان کو راہ راست کی طرف رجوع کرانے کیلئے اور اسے منصب عالی پر دوبارہ لانے کیلئے ہے۔ تو پھر دین کی کمزوری۔ یا پیغمبر کی عدم تکمیل یا انسان کی عدم تکمیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گزشتہ پیغمبر اسی پوزیشن میں آئے انہوں نے صحیح تعلیم پیش کی۔ مگر انسان نے خود اپنے لئے غلط ماحول اور غلط طرز کو اختیار کیا۔ جسکی ذمہ داری براہ راست انسان پر ہی ہوسکتی ہے۔

تواریخ گواہ ہے! کہ ابراہیمؑ نے باطل (قوانین فطرت کی خلاف ورزی) کی مخالفت کی اور فتح حاصل کی انسان کو دوبارہ اپنے نصب العین کی طرف لانے کیلئے عالمگیر ماحول پیدا کر دیا۔

نوحؑ۔ داؤدؑ۔ لوطؑ۔ یونسؑ۔ سلیمانؑ نے سرے سے باطل ماحول کا قلع وقمع کر کے نیا نظام انسانیت پیدا کیا۔ موسیٰؑ و عیسیٰؑ نے باطل قوتوں کا شدید مقابلہ کر کے انہیں زبردست شکست دی اور ماحول سازگار کر دیا۔ انسان کو اپنے تسلیم کیلئے ایک فرمانروایانہ وسعت عطا کی تاکہ کوئی طاغوتی طاقت اسے تسلیم سے مانع نہ ہو۔ مگر اسکے باوجود انسان نے یہ تمام نظام دیدہ دانستہ اپنے ہاتھوں درہم و برہم کر دیا۔ اور انسان کو اسکے نصب العین تک پہنچانے کیلئے مذہب[1] کو کبھی مستقل نہ ہونے دیا۔

---

[1] یہاں یہ اعتراض ہوسکتا ہے۔ کہ انسانی انحراف مذہب کی کمزوری کی دلیل ہے۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ مذہب حقیقی بجائے خود مضبوط ہے۔ اگر کمزور ہوتا۔ تو ایک ادنیٰ ہستی ایک عظیم الشان جابر حکومت کو شکست نہ دے سکتی۔ اسکا انجام اسکی ابتدا میں ہی ظاہر ہوتا۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ فطری طور پر حقیقت کو ہر انسان کیلئے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فطری نظام کے تحت یہ چیز قابل تسلیم ہے۔ کہ انسان کی تلاش اصل کیلئے (ہر شخص کیلئے) ایک پیغمبر آتا رہا۔ تا کہ فطرت کا ہر عمل پورا ہو۔ اور ہر انسان فطرت کی فیض رسانی سے مستفید ہو۔ اسلئے انکے شمار بھی زمانہ کی طوالت کے اور مخلوق کی کثرت کے مطابق کثیر التعداد ہیں۔ مختلف مقامات میں مختلف قوموں میں بیک وقت ایک ایک قوم کیلئے ایک ایک پیغمبر آتا رہا۔ اس تقسیم اقوام کی وجہ سے بھی دین الٰہی۔ ایک مستقل صورت نتیجہ کے طور پر اختیار نہ کرسکا۔ تا کہ تمام عالم کی مخلوق کے لئے ایک پیغمبر ایک ہی تعلیم اور ایک ہی نظریہ قائم ہو جاتا۔ اور ہر قوم ایک ہی تعلیم پا کر ایک ہی نظریہ کو لیکر ایک مستقل مذہب کی شکل اختیار کر لیتی۔

زمانہ کے قدیم ادوار (دور) میں کیا بلکہ ہر دور میں تعلیم الٰہی کو تسلیم کرنے کا ایک ہی طریقہ رہا۔ اور اصول بھی یہی ہے۔ کہ پیغمبر کی تعلیم ایک عملی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسے لکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ اس تعلیم کو اسلئے رائج کیا جاتا ہے۔ کہ ہر شخص اس تعلیم پر عمل کر کے راہ حقیقت پر گامزن ہو۔ اسکی بنیاد مشاہدہ پر ہوتی ہے۔ جہاں ماورأ ادراک کا بغیر مشاہدہ تسلیم کرنا مقدم ہے۔ وہاں اسکی دلیل کے لئے مابعد مشاہدہ کا ہونا ضروری ہے۔ اسلئے مشاہدہ کی صورت میں عمل ہی کے ذریعہ اس تعلیم کا وجود قائم رہتا ہے۔ یعنی پیغمبر ایک ماورأ ادراک ماحول اور علتِ لا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ پر) وقف کیا جاتا ہے۔ جب انسان حقیقت سے منہ موڑ کر گمراہی کی طرف رخ کرتا ہے۔ تو حقیقت کا وجود رہتا ہے مگر انسان خود بخود اپنے آپکو باطل کا محکوم بنالیتا ہے۔ دراصل حقیقت وانحراف مسلط نہیں کئے جاتے بلکہ قبول کئے جاتے ہیں۔ ہر چیز کا وجود اپنی اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ جب حقیقت کو لیا جاتا ہے۔ انسان اپنا منصب پالیتا ہے۔ جب انحراف کی طرف رخ کیا جاتا ہے۔ تو انسان تنزل کی طرف جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض پیغمبروں نے لوگوں کے حالات سے متاثر ہو کر تعلیم الٰہی جو انہیں تختی (تحریر) کی صورت میں ملی تھی توڑ ڈالی انہوں نے لوگوں کی گمراہی سے متاثر ہو کر یہ اندازہ لگا لیا تھا۔ کہ جو کچھ ہو عمل سے ہو۔ ورنہ بعد میں ایسی غلط فطرت کے لوگ تاویلات میں صحیح تعلیم کو مسخ کر ڈالینگے۔ جیسا کہ موسیٰؑ نے کیا تھا (اسکی تشریح آگے بیان کی جائیگی) اور باقی پیغمبروں کی تعلیمات کو بھی اسی طرح جلا دیا گیا۔

محدود (نورانی وجود) کا نظریہ پیش کرتا ہے۔اسکے تحقیق کے لئے طریق تفکر پیش کرتا ہے۔تو لوگ طریق تفکر پر عمل کر کے ہی اس نظریہ کو مشاہدہ میں لانے کے بعد اسکی تصدیق کر سکتے ہیں۔(ورنہ بلا مشاہدہ تسلیم مثل مادی مفکرین کے غلط ثابت ہوگا) لہذا جو چیز عمل اور مشاہدہ میں آئے اسے ذہن میں خود بخود جگہ مل جاتی ہے۔اور یہ کام شب و روز کے عمل کی وجہ سے تحریر کا محتاج نہیں رہتا اسلئے دوبارہ اسکی یادداشت قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ایسی صورت میں پیغمبر کی تعلیم کا کسی کاغذ یا تختی پر منقش ہونا ضروری نہیں۔اور جب یہ طریقہ سلسلہ وار چلتا رہے تو عمل و مشاہدہ کی صورت میں ہی قائم رہتا ہے۔ان چیزوں کو تحریر میں لانے کی غرض صرف یہ ہوتی ہے۔کہ زمانہ کی روش ہر دور میں یکساں نہیں رہتی۔عمل اور مشاہدہ مکمل حیثیت میں قائم نہیں رہتا۔انسان میں کوتاہی کیوجہ سے عمل کم ہوتا جاتا ہے۔اور مشاہدہ کی قوت کم ہوتی جاتی ہے۔عمل رفتہ رفتہ کم ہو جانے سے۔اسکے ساتھ مشاہدہ کی قوت بھی مفقود ہوتی جاتی ہے۔اور بعد کے لوگوں کیلئے طریق تفکر کا یہی ایک ذریعہ ہو سکتا ہے۔کہ عمل کے ساتھ ساتھ آئندہ کیلئے اس تعلیم کو اصلی صورت میں قائم رکھا جائے۔چونکہ عمل کے ذریعہ یہ تعلیم مستقل رہنے سے قاصر ہے۔اسلئے اسکی اصلی صورت میں قائم رہنے کیلئے تحریر کا اہتمام کیا جاتا ہے۔تاکہ کوئی شخص بھی اگر بعد میں طریق تفکر کی تلاش کرے تو صحیح تعلیم اس تک پہنچ جائے۔انسان چونکہ فطرتاً خودغرض پایا گیا ہے۔اسلئے وہ صحیح تعلیم میں بھی تاویلات کرنے لگ جاتا ہے۔اور یہ تحریر کردہ تعلیم (عمل و مشاہدہ) بھی مفقود ہو جاتی ہے۔ایک زمانہ گزرنے کے بعد۔نہ عمل رہتا ہے۔نہ مشاہدہ رہتا ہے۔اور نہ ہی حقیقی تعلیم تفکر کا وجود مستقل رہ جاتا ہے۔اسکے لئے ایسے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک طرف تو حقیقی تعلیم سے خود بخود متاثر ہوں۔دوسری طرف ان میں بھی اتنی صلاحیت پیدا ہو۔جس سے دین الٰہی کے اجرا کیلئے اسقدر اہتمام کیا جائے کہ عمل و مشاہدہ کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔اگر مشاہدہ و عمل میں کمزوری ہو بھی گئی تو تحریری مواد اسقدر مستحکم کیا جائے جس میں تاویلات کی گنجائش کا موقع کسی کو بھی نہ ملے۔طرز تعلیم اس پیمانہ پر ہو کہ اس میں تاویلات کی تمام خامیوں کی راہ نہ پیدا ہو سکے۔اسکی صورت یہ ہے۔کہ تعلیم تفکر۔

قوانین فطرت اور کائنات کے تمام موجودات کے نظام سے مطابقت رکھتی ہو۔اس تعلیم میں۔ موجودہ نظام کائنات کے تمام آثار کے حوالے ہوں۔تاکہ کائنات کا ہر ذرہ اسکی حقیقت کی شہادت دے سکے۔اسکا اسلوب بیان ادب کے لحاظ سے اسقدر خوبصورت اور مستحکم ہو کہ اسمیں کسی نقطہ کے ادھر ادھر کرنے سے بھی اصل کی پکار آتی رہے۔اسکا ہر قانون قوانین فطرت کے مطابق صحیح الاصول ہو۔سب سے بڑی چیز یہ کہ یہ خود متاثر کرنے والی تعلیم ہو اور اس میں عالمگیر مفاد (فلاح و بہبودی) کا سامان موجود ہو۔

گزشتہ قدیم زمانہ میں تحریر کا کوئی خاص ذریعہ نہ تھا۔ بلکہ زیادہ تر مشاہدہ پر ہی عملدرآمد تھا۔اسلئے اکثر پیغمبروں کی تعلیمات کا وجود نہ پایا جاسکا۔البتہ زمانہ کے عروجی دور میں چند مختصر ذرائع پیدا ہو چکے تھے (جو چمڑے کی کھالوں۔پتھر کی تختیوں۔اور پتوں پر تحریروں کی شکل میں تھیں) اسلئے ہمیں انکی تعلیمات کا وہی نقشہ ملتا ہے۔جو زمانہ کی طوالت کی زد میں آکر اسکی تاویلاتی (مسخ شدہ) شکل میں ہوتا ہے۔جن قدیم پیغمبروں کی تعلیمات کا اثر انکے پیروں میں ملتا ہے۔وہ اسوجہ سے قائم ہوتا ہے۔کہ بعد کے اکثر پیغمبر گزشتہ کے پیغمبر کے دین اور تعلیم کی ہی تجدید کرتے ہیں۔انکی تعلیم کا اثر عالمگیر حیثیت اختیار کر جاتا تھا۔کیونکہ انکے کارنامے بھی عظیم الشان ہونے کیوجہ سے مدتوں تک دہرائے جاتے رہے۔مگر یہ تعلیم بھی زمانہ کی زد میں آکر اپنی اصل کھو بیٹھتی ہے۔باوجود عالمگیر ہونے اور ہر زمانہ میں تجدید ہونے کے بھی زمانہ کی طوالت اس پر اثر انداز ہوتی رہی۔طویل زمانہ کی رفتار اسقدر محقق نہ پیدا کر سکی جو اس تعلیم کو اپنی اصلی صورت میں آخر تک پہنچا سکیں مثال کے طور ابراہیمؑ کا دین حنیف (سچا دین) داؤدؑ۔سلیمانؑ۔یحییٰؑ۔زکریاؑ۔موسیٰؑ۔عیسیٰؑ کی زبور۔توراۃ۔انجیل۔جو آخری درمیانی دور میں جاری رہیں۔اور سب سے آخری تعلیم جو زمانہ کے آخری عروج پر جاری ہوئی حضرت محمد ﷺ کی اسلامی تعلیم ہے جنکے بعد تواریخ کسی پیغمبر کا وجود تسلیم نہیں کرتی۔گزشتہ پیغمبروں کی تعلیمات میں سے اب صرف زبور۔توراۃ۔انجیل اور زرتشتی۔پارسی ''ژندپاژند'' کرشن و گوتم کی وید اور چند مختصر قسم کی تعلیمات کے نقشے موجودہ زمانے میں پائی جاتی

ہیں اور آخری تعلیم جسکے بعد کسی تعلیم کا حوالہ تواریخ میں نہیں ملتا ''قرآن'' ہے۔

متذکرہ بالا تعلیمات سے ہی ایک مفکر کیلئے اسکے علت لامحدود اور ماوراٗ ادراک اور کائنات (مخلوق مادی) کے تجسس اور تحقیق کیلئے (پیغمبر اور اسکے علم (دین الٰہی) طریق تفکر) ہم ایک دین کو منتخب کرسکتے ہیں جس میں مکمل طور پر انتہا تک پہنچنے کیلئے مواد موجود ہو اور اس دین نے مستقل مذہب کی صورت اختیار کی ہو۔ جس میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہو۔

قبل اسکے کہ مختلف مذاہب کے تحریری اقوال و افعال کا موازنہ کیا جائے۔ یہاں چند اصولوں پر غور کے بعد انہیں تسلیم کرنا ضروری ہوگا گزشتہ بیانات سے جو کچھ واضح کیا جاچکا ہے۔ یہ علت لامحدود اور کائنات کے تفکر کیلئے ابتدائی بحث ہے۔ جب تک اس مباحث پر غور و تفحص کے بعد ایک صحیح مقام تک نہ پہنچا جائے آئندہ کے واقعات جو عقیدہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر یقین کرنا محال ہوگا۔ کسی مسئلہ پر غور کرنے کیلئے جب تک مسئلہ کے ابتدائی حالات سے واقفیت نہ حاصل کی جائے درمیانی اسباب پر مسئلہ کی نوعیت نہ سمجھی جاسکتی ہے اور نہ ہی مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ مذاہب کے اقوال و افعال سب ایک عقیدہ سے تعلق رکھتے ہیں جب تک مذاہب اور بانیان مذاہب اور اِنکے ابتدائی اصولوں کی وضاحت نہ کی گئی ہو کسی پیغمبر کے قول و فعل پر یقین کرنا بے معنی اور مبالغہ ہو جاتا ہے۔ گزشتہ بیانات میں جو کچھ پیش کیا جاچکا ہے۔ اسکا نچوڑ مندرجہ ذیل سطور میں دیا جاتا ہے۔ ان باتوں پر غور و تسلیم کے بعد مذاہب کے اقوال و افعال کا یقین کرنا یا تسلیم کرنا آسان امر ہوگا۔

اصول:

(۱) انسان کی دنیا پر کیا حیثیت ہے؟

(۲) انسان کیلئے تفکر و تجسس لازمی ہے۔

(۳) تفکر کیلئے ایک راہ مقرر کرنا ضروری ہے۔

(۴) تفکر میں کائنات اور انسان کی ابتدائی تخلیق پر نظر ڈالنی ــــ اور اسکے ابتدائی علتوں کا تصور اِنکی

ہیئتوں کے مطابق کرتے ہوئے ایک ایسی علت کے وجود کا تصور قائم کرنا جو تمام علتوں کی واحد علت ہو۔

(۵) اُس علت واحد کا تصور خواہ کسی رنگ میں ہو۔ علتِ لامحدود سمجھکر تفکر و تجسّس میں اسی علت کی تلاش میں اسی علت کی طرف رجوع کرنا۔ تمام کائنات خلقت کی جملہ صفات کے لحاظ سے علت لا محدود کو ان تمامی صفات کا بدرجہ اتم حامل سمجھنا۔

(۶) گزشتہ مخلوق کے اقوال وافعال کا جائزہ لیکر ایک نتیجہ اخذ کرنا۔ اور ہر مفکر قوم کے اقوال افعال کا بنیادی (ابتدائی) طور پر جائزہ لینا۔ اور ان کے آخری نتائج پر غور کرنا۔

(۷) ہر مفکر قوم کے جملہ عقائد میں سے صحیح (قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت کرنے والے عقائد سے) عقائد سے اپنی راہ تجسّس کو صحیح سمت پر لانا۔

شرح نمبرا

یہ تو گزشتہ بیان کیا جاچکا ہے۔ کہ باقی مخلوقِ کائنات کے مقابلہ میں انسان مجموعہ جواہر کی حیثیت سے سب سے افضل و برتر حیثیت حاصل کئے ہوئے ہے۔ اِسکا وجود مادی حیثیت سے کائنات کی تمام اشیأ سے افضل ہے۔ اسکے ساتھ ہی اس دنیا سے علاوہ۔ وہ مقامات جو علت کی حیثیت سے ضرور ایک قوی و تابانی وجود رکھتے ہیں! ان علتوں کے تاثرات کا احساس کرنے کیلئے بھی انسان میں ایک قوی قوت (روح) موجود ہے۔ جس سے انسان کو جملہ کائناتِ ارضی و سماوی پر فوقیت حاصل ہے۔ جہاں انسان کائنات ارضی کے جواہر کا مجموعہ ہے۔ وہاں روح کے ودیعت ہونے سے ماورأ ادراک قوتوں کے جواہر کا بھی (روح کے ذریعہ) اس سے تعلق ہے۔ اور انسان کو ماورأ ادراک قوی و تابانی قوتوں پر بھی شرف حاصل ہے۔ دنیا میں جو کچھ انسانی خلقت سے کار ہائے نمایاں ظاہر ہورہے ہیں۔ اگر ان پر عمیق نظروں سے مطالعہ کیا جائے۔ تو یہ تمام واقعات انسانی خواص کے تابع سمجھے جائینگے۔ ان واقعات کی رو سے انسانی وجود سے جو کچھ بھی ظاہر ہو اس میں شک کرنے کی گنجائش نہ ہوگی۔

دوسرے جو کچھ بھی انسان اور کائنات کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا ان تمام اشیأ کا وجود ابتداءً موجود ہوگا لہذا ۔۔۔ انسان کی کسی اختراع یا تحقیق میں کسی مبالغہ کا امکان نہیں ہوسکتا ہے۔ البتہ ان واقعات کا جائزہ لینے میں انکے ابتدائی اصول پر نظر ڈالنی ضروری ہے۔ ورنہ سطحی طور جائزہ لینے سے انسان ایک معمولی شے کو بھی غلط پیرایہ میں ادا کر کے اسے ایک عجوبہ سمجھنے لگے گا۔

شرح نمبر۲

اس تفوق کی وجہ سے انسان پر ایک خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کہ انسان اپنے وجود کی ہر کیفیت کو بے کار و بے مقصد نہ جانے دے۔ جہاں اس میں عقل ہے۔ وہاں یہ دنیا کی ہر شے سے اپنے مفاد حاصل کرنے کیلیئے اختراعات وایجادات سے اپنی زندگی کے سامان آسانی سے مہیا کرسکتا ہے۔ ہر شے کی چھان بین سے اپنی زندگی کے لئے امن وراحت کے سامان مہیا کرسکتا ہے۔

ایجادات سے سامان زندگی کی فراہمی میں جسقدر بھی آسانیاں حاصل کی جائیں ان پر یقین کرنا عقیدہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ چیز انسانی خواص میں ابتدائی طور پر ودیعت کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص اپنی ایجادات سے بادل بنا کر بارش برسائے تو یہ چیز انسانی خواص کی ایک صفت ہوگی۔ اس سے قوانین فطرت کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ یا اگر ایک محقق اپنی ایجاد میں ایسی دوا تیار کرلے جسے کسی مہلک مرض میں استعمال کرنے سے زندگی یقینی ہوجائے تو یہ بھی انسانی خواص کی ایک ایجاداتی صفت ہوگی۔ یعنی ایسی دوا کا وجود کائنات کے اجزأ میں موجود تھا جو کسی محقق کی دماغی کاوش سے مرکب کی صورت میں ظہور پزیر ہوئی۔ یہ چیز عقیدتاً ناجائز نہ ہوگی بلکہ انسانی عقل کا ایک کارنامہ ہوگا۔ کیونکہ یہ چیز انسانی خواص میں ابتداءً موجود تھی۔ ان ایجادات کا تعلق مادہ سے ہے۔ اسلئے جو چیز مادہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اور چشم دید (عینی مشاہدہ) مشاہدہ میں آئے اسمیں عقیدہ کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

انسانی خواص (خاصیت) میں باعتبار مجموعہ جواہر ایسی قوتیں موجود ہیں جن کو روبکار

لانے سے انسان مادی حیثیت سے بھی ایسی چیزوں کا اجرأ (ایجاد) کرسکتا ہے۔ جو کسی حد تک عام عقل انسانی کی درک سے بھی باہر ہوتی ہیں اور جہاں اس میں ایک تابانی قوت (روح) کا تعلق ہے۔ اس سے بھی کام لیکر ماورأ ادراک قوی اور روشن ہیئتوں سے مفاد حاصل کرسکتا ہے۔ وہ اسکا روحانی عروج کہلاتا ہے۔

انسان میں یہ چیز فطری طور پر پائی جاتی ہے۔ کہ جب انسان میں شعور مکمل ہو جاتا ہے۔ تو یہ ہر شے کی شناخت کیلئے تجسّسانہ انداز میں۔ ہر شے کیلئے سوال کرتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ ___ کیسے بنی؟ ___ کہاں سے آئی؟ وغیرہ اسلئے ان ہر دو صورتوں میں انسان کیلئے تجسّس و تفکر لازمی ہے۔ جبکہ تجسّس کا مادہ اسکی فطرت میں ابتدائی طور پایا جاتا ہو۔

شرح نمبر۳

انسان میں فطری طور پر صحیح رُخ پر جانے کی یا صحیح بات قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ یعنی جب تک انسان کسی شے کی ماہیت کی اصل کو ذہن میں نہ لائے اسکا تجسّس تشنہ رہیگا۔ اور کسی شے کی اصل ماہیت کو اسوقت تک ذہن میں نہیں لایا جاسکتا ہے۔ جب تک کہ اسکی ابتدائی بنیاد کا تصور ہمارے ذہن میں نہ آئے۔ اور جب تک کسی شے کی ادھوری شکل پر ہی تجسّس کی نگاہ رہی انسان کا ذہن مطمئن نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اسکے دل میں اس شے کیلئے بار بار سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ انسان اپنی تسلی کیلئے ہر بار نئی راہ ڈھونڈتا ہے۔ جب وہ صحیح مقام پاتا ہے۔ تو اسکی تجسّس کی مسافت یکسر ختم ہو کر انتہا کو پالیتی ہے۔ اور انسان مطمئن ہو جاتا ہے۔ گو صحیح راہ پانے سے مراد منزل مقصود کو ہی پانا ہے۔ راہ ڈھونڈنے کی غرض کسی منزل مقصود کی خاطر ہوتی ہے۔ جب تک منزل مقصود کو نہ پایا جائے۔ راہ کا پانا متصور نہیں ہوتا۔ یعنی باالفاظ دیگر راہ کا صحیح رخ کرنا منزل مقصود کو پانے کی ایک تحریک ہے۔

اسلئے تفکر کیلئے ایک صحیح راہ قائم کرنے سے پہلے ایک منزل مقصود کا اسکی اصلی حیثیت سے ذہن میں تصور لانا ضروری ہے۔ اور اسی منزلِ مقصود کو پانے کیلئے ایک سمت چلنا ہے۔ ورنہ

بغیر کسی خاص مقصد کسی خاص نصب العین کسی خاص منزل مقصود کے صحیح راہ قائم کرنا ناممکن ہے۔

کسی شے کے علم حاصل کرنے کیلئے انسان تب تک مطمئن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اسکی ابتدا ٗ انتہا کا تصور نہ کرے جہاں تک اسکے ذاتی تعقل کا تعلق ہے۔ انسان کسی شے کی اصل سے پوری طرح واقف نہیں ہوتا۔ اسکے لئے اسے ایک علم ایک راہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے ابتدائی علم میں کسی راہنما سے پہلا سبق شروع کرتا ہے۔ تو وہ اس علم اور اس سبق سے بالکل لا علم ہوتا ہے۔ مگر انسان کی یہ فطری خاصیت ہے کہ بغیر کسی حیل و حجت کے راہنما کی تقلید میں بغیر مشاہدہ پیروی کرتا ہے مثال کے طور پر جب استاد طالب علم کو تعلیم سکھانے کیلئے ایک حرف کی شناخت کراتا ہے یعنی الف پڑھاتا ہے تو بچہ (طالب علم) (ا) الف کو اپنے ذہن میں جگہ دیتا ہے اسے تسلیم کرانے کیلئے بظاہر کوئی شے معلوم نہیں ہوتی جسکی بنا پر ایک طالب علم اپنے استاد کی ہر بات بغیر تحقیق قبول کرلیتا ہے۔ یا اسے استاد ایک حرف ''SKY'' کی شناخت کیلئے ''آسمان'' کا ترجمہ کہہ دیتا ہے۔ طالب علم استاد کے کہنے پر ''آسمان'' کے لفظ کو صحیح جان کر اپنے ذہن میں جگہ دے دیتا ہے۔ یہ ایک فطری راہ ہے۔ جسے انسان اپنے تجسس کے لئے بغیر مشاہدہ وعلم کے ہر حال میں قبول کرلیتا ہے۔

جہاں تک انسان کی ذاتی ذمہ داری کا تعلق ہے۔ وہ کسی شئے کے علم میں تفکر کرنے کیلئے صرف اسی قدر کرسکتا ہے۔ کہ میں اسکی ابتدا ٗ کو پالوں جو اسکی ابتدائی علت ہے۔ اسکے بعد اُسے کسی سمت کی جستجو ہوگی وہ کسی علم کسی راہنما کی ضرورت محسوس کراتی ہے۔ اور جب انسان کسی منزل مقصود کا تصور قائم کرلیتا ہے تو اسکو منزل مقصود کی تلاش کا جذبہ کاوش وعمل کی طرف راغب کرتا ہے۔ اور اس حالت میں یہ بھی فطری بات ہے کہ وہ منزل مقصود پانے کیلئے ایک صحیح راہ ایک راہنما کو پالیتا ہے۔ کیونکہ انسان کی حیثیت کے مطابق جب اس پر تفکر لازم ہے تو ضروری ہے کہ اس وسیع کائنات میں ایک مفکر محقق کا وجود بھی پایا جائے جو منزل مقصود سے آگاہ ہو۔

شرح نمبر ۴

جہاں تک انسانی زندگی کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔انسان ایک علم کے حاصل کرنے میں فطری طور پر منہمک نظر آتا ہے اور یہ سب علم اسے ایک حقیقت کے انکشاف کیلئے حاصل کرنا پڑتا ہے۔اور وہ حقیقت انسان کی ابتدائی تخلیق اور کائنات کے اسباق کا مطالعہ ہے! جب تک انسان اس علم میں ابتدأ وانتہا کو نہ پالے اسکا علم ناقص رہیگا۔اسلئے انسان کے لئے ضروری ہے۔کہ وہ اس کائنات کے علم میں اسکی ابتدأ سے لیکر انتہا تک اسے حاصل کرے ورنہ عدم تکمیل میں اسکا ایک سطحی نتیجہ قائم کرنا علم کو ادھورا رکھنے کے مترادف ہوگا۔علم کے ادھورا رہنے پر انسان اگر کسی شے کے مکمل ہونے کا فیصلہ دے تو یہ فیصلہ قابل تسلیم نہیں ہوسکتا۔اسلئے کائنات اور انسان کی پیدائش کی ابتدائی علت کو تحقیق میں لانا ضروری ہے۔ جہاں ہم مادی اشیأ میں بہت سی خصوصیات اور قوی قوتیں پاتے ہیں وہاں ہمیں اسکی ابتدائی بنیاد کو بھی اسی حیثیت سے بدرجہ کمال خصوصیات اور قوتوں کا حامل قرار دینا ہے۔اور جب ہم ان تمام قوتوں اور تابانیوں کو ایک منبع پر لاکر مجتمع کریں تو جو کیفیت اس تصور میں قائم ہوتی ہے وہی علتِ لامحدود کہلاتی ہے۔

شرح نمبر۵

جہاں تک ہم اپنی قریبی اشیأ کا جائزہ لیتے ہیں۔ہمیں ان میں غیر مستقل شکل میں علت ومعلول کا ایک سلسلہ وار نظام نظر آرہا ہے۔اور جہاں تک ہم اِنکی ابتدأ کو ایک مستقل ہیئت میں نہ پاسکیں ہم انکے ابتدائی وجود کو صحیح معنوں میں تحقیق شدہ قرار نہیں دے سکتے۔اگر ہمارے قوائے عقلی اِنکی ابتدأ کو پانے سے قاصر ہوں تو ہم تخیلی رنگ میں ان صفات کے لحاظ سے ہی جو ہمیں ظاہری اشیأ میں محسوس ہوتی ہیں۔انکے ابتدائی وجود کو تسلیم کرینگے۔کیونکہ یہ سلسلہ اسوقت تک منقطع نہیں ہوسکتا جب تک ایک مستقل علت لامحدود کا وجود سامنے نہ آئے۔گو علتِ لامحدود ادراک واحساس میں سما نہیں سکتا مگر علت ہونے کی حیثیت سے ضرور موجود ہے۔کیونکہ ہمارے سامنے ایسی اشیأ کا وجود پایا جاتا ہے۔جو خود مستقل نہیں بلکہ معلول ہیں۔اور جہاں معلول کا وجود قائم ہوا سکے لئے ایک مستقل علت کا ہونا لازمی ویقینی ہے۔اور اسکے ماورأ ادراک ہونے کی دلیل

بھی یہی ہے۔ کہ ہر شے معلول کا وجود اسکی قریبی علت سے ہوتا ہے۔ لیکن جب تک اس علت میں استحکام اور لامحدودیت واقع نہ ہو ہر علت بھی بجائے خود ایک معلول ہی ہوتی ہے چونکہ ہر علت اپنے معلول سے قوت و تابانی میں زیادہ ہوتی ہے۔ اسلئے زمین سے باہر کی اشیأ میں بوجہ لطافت وقوت ایک ایسی ماہیت پیدا ہو جاتی ہے جو ظاہری قویٰ (آنکھ۔ کان۔ ناک۔ مس۔ چکھنا) یا عقل سے محسوس میں نہیں آسکتی اسلئے علتِ لامحدود کا وجود اپنی انتہائی لطافتوں اور تابانیوں کے باعث اگرچہ ادراک میں نہیں آسکتا۔ لیکن اسکے وجود سے انکار یا اسکا عدم قرار دینا بالکل ایسا ہے جیسا کہ سورج یا زمین کے وجود سے انکار کرنا ہے۔ اسلئے علتِ لامحدود (اللہ) کا تصور اسکی ہیئت لامتناہی کے اعتبار سے بغیر مشاہدہ ضروری ہے اور جب یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ کہ ہر معلول ایک علت سے اور تمام علتوں کیلئے ایک واحد علت لازمی ہے۔ تو تفکر کیلئے کیوں نہ اسی منبع حقیقی کو اسکی تابانی اور قوی ہیئت کے اعتبار سے تصور میں لایا جائے اور اسی ہیئت کو پہچانا جائے تاکہ تمام کائنات کا اندازہ اسی ہیئتِ لامحدود سے ہو جائے۔ اور انسان کو ہر چہار جہت میں ایک ایک چیز کو پرکھنے کی زحمت سے ہی نجات ہو۔

شرح نمبر ۶

کوئی شخص اپنی پیدائش سے قبل از وقت آگاہی نہیں پا سکتا۔ جب تک کہ اِسے ان واقعات کی آگاہی کیلئے ایک علم کی راہنمائی حاصل نہ ہو۔ جس میں گزشتہ کے واقعات۔ قول و فعل ۔ تفکر و تجزیہ۔ ایک نظریہ کی صورت میں موجود ہوں۔ جن سے آگاہ ہو کر انسان اپنے سے قبل زمانہ کے حالات پر اپنے تفکر کی نئی تعمیر شروع کر سکتا ہے۔ اسلئے گزشتہ مخلوق کے افعال واقوال کا جائزہ لیکر ہی آئندہ تفکر میں ایک نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے۔

شرح نمبر ۷

گزشتہ قوموں میں مختلف نظریات اور طریق تفکر پائے گئے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے خلاف بھی پائے جاتے ہیں۔ اسلئے صحیح تفکر و تجسس کیلئے ایک ایسے نظریہ کی ضرورت ہے جو

انسان کی راہنمائی میں واقعات کو اصلی روپ میں سامنے لا سکے۔

گزشتہ زمانہ کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تخلیق کائنات اور علتِ لامحدود کا تصور (بغیر مشاہدہ) اکثر لوگوں میں موضوع بحث رہا ہے۔ اور اس بحث نے ایک اہم حیثیت حاصل کی ہے۔ لہذا یہ دونوں چیزیں اپنے میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ کہ کائنات کی تخلیق پر اور علتِ لامحدود کے وجود پر انسان فطری طور پر تفکر کرے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر زمانہ میں ایک علتِ لامحدود (اللہ) پر قوموں میں مباحث رہے۔ تو یقینی ہے کہ اسکے وجود کا احساس انسان میں فطری طور پایا جاتا ہے۔ اور یہی مباحث ہمارے سامنے ایک ایک دین کی شکل میں اور انکے طریق تفکر ایک مذہب کی شکل میں قائم ہوئے۔ اسلئے ہمیں اس تفکر میں انہیں ادیان و مذاہب کے اقوال و افعال پر نظر ڈالنی ہوگی۔ اور اپنے تفکر کیلئے انہیں ادیان و مذاہب سے ایک دین کی تعلیم کو اختیار کرنا ہوگا۔ جس دین میں کلی طور اصل علت لامحدود کا صحیح تصور و مشاہدہ کا مواد موجود ہو۔

ایک ضروری ہدایت:۔

تفکر کیلئے دو باتوں کا خیال ضروری رکھنا چاہیے۔

(۱) اپنے علم کو وسعت دینے کیلئے خلوص نیت سے مطالعہ کرنا۔

(۲) اپنے نظریات (ذاتی) اور دیگر اصولوں کا موازنہ کر کے خلوصِ نیت سے ہی! اپنے نظریات اور دیگر اصولوں میں سے اُسی نظریہ کو قبول کیا جائے۔ جو فطرۃً صحیح مواد اپنے اندر رکھتا ہو۔

اسکے لئے دو طریقے ہیں۔ یا تو انسان خلوص نیت سے علم حاصل کرنے کیلئے اپنے نظریات کو ترک کر کے اصل اصول کو لیتا ہے۔ یا ہر نظریہ کو اپنے نظریات میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جو نظریہ اپنے نظریہ سے مطابقت کرتا ہوا سے ہی قبول کر لیتا ہے۔ باقی نظریات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے (اگر چہ ان نظریات میں صحیح یا غلط ہونے کی اسکے پاس کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہوتی) ان دونوں صورتوں میں کسی نظریہ کو قبول کرنے کی ایک شرط لازمی ہے۔ کہ

انسان جو نظریہ ذاتی طور پر قائم کرتا ہے۔ وہ مکمل دلائل وثبوت کے بعد لیا جائے۔ اسکے لئے بھی یہ شرط لازمی ہے۔ کہ ان نظریات کی چھان بین علم پر مکمل عبور حاصل کرنے کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔ اور قبل از وقت ایک طالب علم کے لئے یہ ناممکن ہے۔ کہ وہ کسی علم کی تکمیل کر سکے۔ اسلئے اسکا نظریہ بغیر تکمیل علم کے صحیح بھی نہیں ہوسکتا اور بغیر تحقیق ایسے نظریہ کو صرف اس بنا پر قبول کرنا غلط ہے۔ کہ یہ نظریہ انسان کے ذاتی خیالات سے مطابقت کرتا ہے۔ (اگر چہ وہ نظریہ انسان کو بغیر دلیل کے بھی پسند ہو) یہ نظریہ بغیر مکمل تحقیق کے صحیح نہیں ہوسکتا ہے۔

اسلئے جب کسی مذہب کے عقائد کا جائزہ لیا جائے تو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کہ اس کے نظریات کہاں تک فطرت کی کسوٹی پر اپنی پرکھ میں اصل نشان ظاہر کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں انسان ہٹ دھرمی سے علیحدہ رہ کر صرف صحیح علم کے پانے کی نیت سے کسی مذہب کے نظریہ کا مطالعہ کرے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص خدا کا قائل نہیں! پیغمبر کا قائل نہیں! روح۔ جزا وسزا۔ قیامت۔ اور معجزات کا قائل نہیں۔ وہ ان کیفیات کے نام سنکر ہی بغیر کسی مدلل فیصلہ کے ان سے چڑ جائے یا نفرت کرنے لگ جائے۔ یہ چیز خلوص نہیں۔ بلکہ ہٹ دھرمی اور جہالت ہوگی۔ اسکے لئے یہ ضروری ہے کہ اسکا علم اپنی انتہا کو پاکر ان چیزوں کے عدم کو ثابت کر چکا ہو۔ ورنہ بغیر دلیل اٹکل پچو پر ہی ان کیفیات کا ہٹ دھرمی سے انکار کرنا صحیح راہ اور صحیح علم کا پانا انسان کیلئے دشوار ہوگا۔ اور اسکا کوئی نظریہ قابل قبول نہیں ہوسکتا ــــ علم حاصل کرنے کیلئے دو ہی طریقے ہوسکتے ہیں۔ اپنے علم کو وسعت دینے کیلئے صحیح معنوں میں آمادگی ہو۔ خلوص نیت ہو تو اپنی عدم تکمیل علم کی کمزوری کا اعتراف کرے۔ اور صحیح دلائل حاصل کرنے کے بعد وہ ان پر یقین کرلے۔ ورنہ اپنے علم کے مکمل دلائل پیش کر کے انہیں جھٹلائے۔ اور جھٹلانے میں ہٹ دھرمی نہ ہو بلکہ اپنے علم کی وسعت کو مدنظر رکھتے ہوئے صحیح نتائج کو خلوص نیت سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ بصورت دیگر ہر نظریہ کو بغیر دلائل اٹکل پچو پر جھٹلانا۔ قوانین فطرت کی خلاف ورزی ہوگی۔

ان اصولوں پر غور کرنے کے بعد مختلف مذاہب کے اقوال وافعال پر ٹھنڈے دل سے

مطالعہ کرنے کے بعد انسان کو اپنے تفکر کیلئے ایک صحیح راستہ پانے میں آسانی ہوسکتی ہے۔اب ہم مختلف مذاہب وادیان کے نظریات وعقائد اور نتیجۂ اعمال کا جائزہ مطالعہ کرینگے۔اور انکے اصل و ناقص ہونے کیلئے مجموعی طور پر اس مواد کو تلاش کرینگے جو ہمیں اصل مقصد تک پہنچانے میں پوری راہنمائی کرسکتا ہو۔

تواریخ اور گزشتہ قوموں میں عقائد کی صورت میں مذاہب کے نقوش یا مسلسل تحریرات۔ جو ہمارے سامنے ہیں۔زمانہ کے آخری (یا قریبی) دور کے مذاہب میں سے چند ایسے مذاہب ہیں جن کا وجود ابھی تک پایا جاتا ہے۔جن میں یہودی (موسوی مذہب)۔عیسائی (عیسوی مذہب)۔پارسی (زرتشتی مذہب)۔ہندو (بدھی وآرین مذہب) اور دیگر چند غیر معروف مذاہب موجود ہیں۔ان مذاہب کی چھان بین انکی موجودہ تعلیم سے ہی ہوسکتی ہے۔

فی زمانہ جن مذاہب میں کائنات اور علت لامحدود پر بحث [1] جاری رہی۔ان کے مابین بہت حد تک تضاد پایا جاتا ہے۔لیکن ہر مذہب کی نسبت ایک پیغمبر سے ضرور ہے۔جہاں تک

---

[1] دیکھا گیا ہے۔کہ مذاہب میں رسمی طور پر مختلف نظریات کیلئے مختلف عقائد پائے جاتے ہیں۔بظاہر ان عقائد و نظریات میں کائنات یا علت لامحدود پر تفکر کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا ہے۔بلکہ دنیوی معاملات میں اصلاحی اصول اور ماوراٗ ادراک کے موہوم نقوش کے خاکے نظر آتے ہیں۔لیکن یہ تمام نقوش صرف ایک ہی مقصد کی ترجمانی کرتے ہیں۔کہ انسان میں جو کمزوریاں علتِ لامحدود اور کائنات کے تفکر کیلئے مانع ہیں انکی اصلاح کیلئے ایک قانون مرتب کیا جائے تاکہ انسان فروعات سے نکل کر اصل مقصد کی طرف راجع ہو۔اور ان عقائد کی حقیقتاً بنیاد یہی تفکر ہی ہے۔تفکر ایک واحد نصب العین ہے اور مذاہب کا اجرأ صرف اسلئے ہوتا ہے۔کہ وہ انسان کے انحراف کے بعد اسکے لئے صحیح راستہ استوار کرنے کے سامان پیدا کرے۔یہی چیز مذہب کہلاتی ہے۔اور انہیں اصولوں میں پیروان مذاہب تحریفات وتاویلات سے تضاد پیدا کرتے ہیں۔ورنہ مقصد ہر پیغمبر کا ایک ہی ہے۔جسے دین کہتے ہیں۔اس میں اختلاف نہیں۔کیونکہ علت لامحدود اور کائنات کے وجود کے انکار کیلئے آج تک کوئی دلیل مکمل طور پر پیش نہیں کی جاسکی ہے اور بنیادی طور پر ہر قوم میں انہیں دو کیفیات پر بحث ہوتی رہی ہے۔گویا ہر قوم میں یہ دو چیزیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں۔صرف انکے عدم اور وجود پر بحث میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

مذہب میں پیغمبر کی تعلیم کا تعلق ہے۔ان میں ہر پیغمبر ایک ہی مقصد ایک ہی نصب العین کو لیکر آیا۔ کہ انسان کو اپنی اشرف المخلوقاتی حیثیت کا احساس ہو۔اپنی انسانی شرافت کو قائم رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داری کا احساس کرے۔کہ انسان اپنی ذات اور کائنات پر تفکر کر کے علت لامحدود یعنی اپنی اور کائنات کی اصل کو پہچانکر اپنی ذات اور جملہ مخلوق کائنات کا جائزہ لیکر اپنے عروج کی طرف رجوع کرے ورنہ کوتاہی اور غفلت کی صورت میں انسان تنزل کی طرف جائیگا اور دنیوی زندگی میں بھی امن وراحت سے محروم رہیگا۔کوتاہی وغفلت ہی انسان کو خونریزی فساد وظلم کی طرف مائل کر کے انسانیت کو ذلت کی طرف دھکیلتا ہے۔

ان اسباب کے پیش نظر پیغمبر مجموعی حیثیت سے ایک دین (ایک مقصد ایک نصب العین) پیش کرتا ہے۔اور تنزل وخونریزی۔ذلت سے بچنے کیلئے چند قوانین الٰہی کا اجرأ کرتا ہے۔ جن پر چلکر انسان ہر برے اثر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔جسے مذہب کہتے ہیں۔پیغمبر کے بعد انسانی خودغرضی اور نفس پرستی انسان کو پھر تنزل وانحراف کی طرف مائل کر دیتی ہے۔اور پیروان مذاہب اصلی تعلیم کو اپنی نفسانی اغراض کے سانچے میں ڈھال کر تاویلات وتحریفات کی شکل میں لاتے ہیں۔ یہ مذہب کی دوسری محرف شکل ہوتی ہے۔اسی تحریف شدہ مذہب میں تضاد ہوتا ہے۔

ان مذاہب کی تعلیمات سے ضرورت اس چیز کی ہے۔کہ پیغمبر کی صحیح تعلیم کو اس کی اصلی حالت میں پایا جائے اور اگر پیغمبر کی تعلیم اصلی رنگ میں موجود نہیں۔تو وقتی تعلیم میں دیکھنا ہے۔کہ اس تعلیم میں تفکر کیلئے کس قدر مواد موجود ہے۔جس مذہب میں باوجود پیروان مذاہب کے انحراف و تحریف کے بھی صحیح تعلیم اور اسکے تاثرات قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت کریں اور اصولی طور اُس مذہب مین اصلاحی اصول کارآمد ثابت ہوں وہی تعلیم اور وہی مذہب قابل تسلیم ہوسکتا ہے۔

اب ہم مروجہ مذاہب پر مختصر سی بحث کرینگے۔جس میں یہ معلوم ہوگا کہ مذاہب میں کس مذہب میں تفکر اور انسانی عروج کیلئے زیادہ سے زیادہ اور حقیقی تعلیم کا مواد پایا جاتا ہے۔

یہودیت: یہودی مذہب۔جس کی نسبت حضرت موسیٰؑ پیغمبر سے ہے۔یہ قوم بنی اسرائیل کہلاتی

ہے۔یعنی یہ قوم حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) پیغمبر کی اولاد ہیں۔انکے نظریات وعقائد''توراۃ'' (الہامی کتاب) سے لئے گئے ہیں۔دین کے لحاظ سے باقی پیغمبروں کے ساتھ انکا بھی علت لا محدود (اللہ) کا ہونا اور اسی اللہ کی طرف سے پیغمبر کا ہونا اور اسکی کلام منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ تھا۔جسکے لئے انکے پاس مافوق الفطرت معجزات کی صورت میں ایک اعصأ[1] (لاٹھی) اور روشن[2] ہاتھ تھا۔یہ امر قابل ذکر ہے۔کہ ہر پیغمبر ایک ماحول کے مطابق اور لوگوں کے حالات خیالات کے مطابق تعلیم لیکر آیا جس زمانہ میں لوگوں کیلئے جس قسم کی تعلیم کی ضرورت تھی اسی قسم کی تعلیم پیغمبر لاتا۔حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں لوگوں میں سحر وساحری کا حد سے زیادہ چرچا تھا اور اس فن کو لوگ کمال تک پہنچا چکے تھے۔اسی نوعیت کے معجزات حضرت موسیٰؑ کو ملے۔تاکہ حقیقی معجزات سے باطل قوتوں کو شکست دیکر حقیقت آشکارا ہو جائے چنانچہ فرعون مصر (ولید بن مصعب شہنشاہ مصر) جو خود خدا بن بیٹھا تھا اور ساحروں کی مدد سے تمام لوگوں پر اپنا تسلط جما رہا تھا۔اسکا اقتدار اسقدر بڑھ چکا تھا کہ اسکی خدائی کا کوئی مقابلہ کرنے والا نہ تھا۔اسکے عہد میں قوم بنی اسرائیل پر بیحد مظالم ڈھائے جاتے تھے۔جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے دربار میں پیش ہوئے تو اپنے معجزاتی اعصأ کو دکھا کر تمام ساحروں کے کمال کو یکسر مٹا دیا۔جس پر تمام ساحروں نے حضرت موسیٰؑ کا دین قبول کیا ۔لیکن فرعون نے باوجود ایسے معجزہ سے متاثر ہونے کے بھی تسلیم نہ کیا۔بالآخر جب حضرت موسیٰؑ قوم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لے جانے لگے تو فرعون نے بمعہ اپنے تمام ساز وسامان اور اپنی پوری قوت سے حضرت موسیٰؑ پر حملہ کر دیا۔چونکہ پیغمبر ایک حقیقت کو لیکر آیا تھا۔اسلئے فطرت نے اسکی مدد کی۔یعنی دریائے نیل پر حضرت موسیٰؑ کی قوم دریا عبور کر گئی اور فرعون بمعہ اپنے تمام ساز وسامان کے غرق دریا ہو گیا۔اور ایک آن میں فرعونی حکمرانی کا نام ونشان دنیا سے مٹ گیا۔اور تمام مصر کی حکومت حضرت موسیٰؑ کے قبضہ میں آ گئی جسکے لئے حضرت موسیٰؑ نے یوشع بن نون کو قائم مقام بنا کر

---

[1]،[2] اسکی تشریح صفحہ ۵۴ تا ۵۶ میں کی گئی ہے۔

تمام انتظام حکومت اسکے سپرد کر دیا۔ اسکے بعد حضرت موسیٰؑ کو معجزہ کی صورت میں توراۃ ملی قوم بنی اسرائیل دین موسیٰؑ کو تسلیم کر چکے تھے اب انہیں تفکر اور عرفان الٰہی کیلئے ایک طریق کی ضرورت تھی وہ توراۃ کے ذریعہ ملا۔ توراۃ کیا تھی؟ ''توراۃ''۔ دو پتھر کی تختیاں تھیں جن پر احکام الٰہی [1] (منجانب اللہ) کندہ تھے۔ یہ دو تختیاں حضرت موسیٰؑ کو ''کوہ طور'' (پہاڑ) پر منجانب اللہ ملی تھیں۔ لیکن اس اثنا میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اُدھر حضرت موسیٰؑ طور پر (توراۃ حاصل کرنے کیلئے چالیس دن) مصروف عبادت رہے ادھر قوم میں ایک سامری (ساحر) نے مٹی کا بچھڑا بنا کر اسمیں سحر کے ذریعہ ایسا اثر پیدا کیا کہ اس سے ایک زوردار ہیبتناک آواز پیدا ہوئی جس آواز کو بنی اسرائیلی قوم نے سنا۔ اور اس ساحر نے کہا کہ یہ خدا ہے اسکی پوجا کرو۔ چنانچہ بہت سے لوگ منحرف ہو کر بچھڑے کی پوجا کرنے لگے۔ حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور سے توراۃ لیکر قوم میں آئے تو انہیں گوسالہ پرستی میں دیکھکر بے تاب ہو گئے۔ اور اسی غصہ کی حالت میں توراۃ کی دونوں تختیاں پھینک دیں۔ اور وہ گرتے ہی ٹوٹ گئیں۔ یہ امر یقینی تھا۔ کہ جس قوم کو فرعون مصر کی غلامی سے آزاد کرنے کیلئے حضرت موسیٰؑ نے ناقابل برداشت تکلیفیں اٹھائیں۔ اور جو قوم خود ظلم واستبداد کا عرصہ سے شکار رہ چکی تھی۔ اللہ کی امداد سے انہیں اس ذلت اور غلامی سے نجات ملی۔ تو پھر ایسے لوگوں کی فطرت کا یہ اندازہ کیجئے کس قدر ناشکری اور کم فہمی ہے۔ کہ پھر اسی محسن کے احسانات کو بھول کر انحراف کرنا اور خود کو دوبارہ غلامی اور ذلت میں ڈالنا۔ یقینی طور حضرت موسیٰؑ کے غصہ کا سبب بنی۔ انہوں نے اندازہ کیا کہ اس قوم میں انحراف کا مادہ زیادہ ہے۔ اور توراۃ جیسی الہامی کتاب بھی ان میں محفوظ نہیں رہ سکتی نہ ہی یہ قوم ان ہدایات سے کوئی فائدہ حاصل کر سکتی ہے۔ الغرض توراۃ ابھی پہنچی بھی نہ تھی کہ شکستہ ہو گئی۔ اسکے بعد حضرت موسیٰؑ نے شکستہ تختیوں کو جمع کر کے دوبارہ احکام الٰہی کو ''دس

---

[1] احکام الٰہی وحی کی صورت میں ملنا بھی پیغمبر کیلئے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کلام ہو بہو دو پتھر کی تختیوں کی صورت میں ملے یا وحی کی صورت میں ملے ہر دو صورتوں میں کلام الٰہی سمجھی جاتی ہے۔

احکام‘‘ کی صورت میں ترتیب دیا۔اورانکے ساتھ دیگر احکام شریعت مرتب کر کے قوم کیلئے ہدایات کا مواد جمع کیا۔اور دو شکستہ تختیوں کو عہد[1] کے صندوق میں رکھا گیا۔یہی ایک نسخہ تھا۔جو حضرت داؤدؑ کے وقت تک خیمۂ عبادت میں بحفاظت رکھا جاتا تھا۔کتاب سلاطین اول باب سے واضح ہوتا ہے۔کہ عہد صندوق جب خیمۂ عبادت سے ہیکل سلیمانی[2] (بیت المقدس) میں لایا گیا۔تو اس میں سوائے دو شکستہ تختیوں کے اور کچھ نہ تھا۔

حضرت موسیٰؑ کے عہد میں اگرچہ توراۃ شکستہ ہو چکی تھی لیکن اسکی تعلیم بدستور حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ جاری تھی۔ان کے عہد میں انکی قوم صحیح معنوں میں ایک سچے دین کی حامل تھی۔ کیونکہ یہ خود ایک راہنما کی حیثیت سے بھی موجود تھے۔

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ پیغمبر جسوقت مبعوث[3] ہوئے۔انہوں نے بھی موسوی دین کی تجدید[4] کی۔عہد کے صندوق میں جو کچھ بھی تھا وہ بجائے خود کلام الٰہی تھا اور یہی چیز دین سے تعلق رکھتی تھی۔خواہ وہ چمڑے پر ہو یا شکستہ تختیوں کی صورت میں ہو اسکی قدر و منزلت کلام الٰہی کے نظریہ کے تحت ہونی چاہیے۔قوم میں جو کچھ ہدایت کے طریقے تھے وہ بھی عمل کی صورت میں طریق تفکر کیلئے کافی تھے۔اس حد تک یہ کہا جا سکتا ہے۔کہ یہ دین طریق تفکر کیلئے اپنے میں پورا مواد رکھتا تھا۔کیونکہ اسکے تمام احکام واصول۔نظریات وعقائد ایک پیغمبر کی راہنمائی میں مرتب ہوئے۔جن کی وقتاً فوقتاً تجدید بھی ہوتی رہی۔چونکہ اسکی حفاظت کا سامان بھی مستقل طور پر بدستور قائم رہا۔اسلئے اس دین مذہب میں کسی قسم کی کمی یا نقص واقع نہیں ہوا۔لیکن حضرت سلیمانؑ کے

---

[1] عہد کا صندوق ایک متبرک صندوق تھا جو کلام الٰہی کیلئے بنایا جاتا تھا۔تاکہ اس میں کلام الٰہی رکھی جائے۔اسکے لئے ایک خیمہ بنایا گیا تھا جسے خیمۂ عبادت کہتے تھے اسی میں عبادت کی جاتی تھی۔(کتاب استثناٗ۔باب ۲۵)

[2] ہیکل سلیمانی۔حضرت سلیمان پیغمبر نے ایک مستقل عمارت (جسے ہیکل کہتے ہیں) بنا کر عبادت کا صندوق خیمہ سے نکال کر اس ہیکل میں رکھدیا تھا اسکے بعد خیمۂ عبادت کی جگہ مستقل عمارت ہیکل میں یہودی عبادت کیا کرتے تھے۔

[3] منتخب پیغمبر [4] تازہ کیا

عہد کے بعد اس قوم پر بے شمار مصائب اور طوفان نازل ہوئے۔سب سے پہلے بخت نصر نے مصر پر حملہ کیا۔اور تمام یہودیوں میں قتل و غارت شروع کر دی اور ہیکل سلیمانی کو بمعہ عہد کے صندوق کے جلا کر خاک کر دیا۔اور اس حد تک یہودی مذہب کا خاتمہ کیا۔کہ جس کے پاس کسی قسم کا نسخہ بھی ملا۔اُسے قتل کر ڈالا۔اور تمام نسخے چن چن کر جلا دیئے۔یہ واقعہ ۵۸۶ ق۔م کا ہے۔یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس سے توراۃ (کلام الٰہی) کا نشان یکسر نابود ہو گیا۔اسکی وجہ یہ نہیں کہ کلام الٰہی میں کچھ نقص تھا۔بلکہ قوم میں اسقدر انحراف پیدا ہو چکا تھا۔کہ وہ برائے نام یہودی تھے۔ان میں ہر قسم کے افعال ناقص کا ظہور ہو رہا تھا۔اِنکی کوتاہی کے سبب فطری طور اِنکی تذلیل لازمی تھی۔اور کلام الٰہی بھی ان میں ایک بے معنی شے بن کر رہ گئی تھی توراہ تو ختم ہوئی مگر وہ علم جو عملاً ابھی تک (دس احکام شرعی و دیگر شریعت) جاری تھا پورے طور ختم نہ ہوا۔اسکے بعد حضرت عزیرؑ پیغمبر نے ان احکام کی دوبارہ تجدید کر کے لوگوں کو حقیقت کی طرف لایا۔اور مذہب موسوی کی پوری ترتیب دی جسے یہودی توراۃ کہنے لگے۔اس کا ترجمہ یونانی زبان میں ابن توکس کے حکم سے ۳۰۰ ق۔م میں ہوا۔اسوقت ابن توکس خود یہودی تھا اور حکمران ہونے کی وجہ سے یہودی مذہب میں کسی قدر استحکام ہوا۔لیکن ابن توکس چہارم کے وقت میں اینٹوکس نے مصر پر حملہ کر کے پھر ہیکل کو جلا دیا۔اس سے قبل داراشاہ ایران کے عہد میں سردارانِ بنی اسرائیل نے ہیکل کو از سرِ نو تعمیر کیا تھا اور نیا عہد کا صندوق بنا کر اس میں گزشتہ پیغمبروں (داؤدؑ۔سلیمانؑ۔عزیرؑ) کے مرتب شدہ نسخے رکھے گئے تھے۔مگر اینٹوکس کے حملہ نے دوبارہ ان سب تعلیمات کو بھی جلا کر ختم کر دیا۔اور یہودیوں کو تلاش کر کے جہاں بھی کہیں کوئی نسخہ ملا۔جلا کر موسوی تعلیم کی تمام اصل و فرع (اصل و نقل) کو جلا کر ختم کر ڈالا۔یہ واقعہ ۱۶۶ ق۔م کا ہے اس دوران میں ایک بوڑھا کاہن (یہودی) اپنے تین لڑکوں کے ساتھ جان بچا کر اپنے وطن شہر بودن کو بھاگا جہاں اسکے لڑکے مقائیس نے یاداشت پر توراۃ کی شکل میں دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی جسکو مقائیس کے نام سے ہی منسوب کیا گیا۔اور یہودیوں کے چند فرقے اسی کو توراۃ تسلیم کرتے ہیں۔اسکے بعد بھی خسرو پرویز کا ایک طوفانی حملہ یہودیوں پر

ہوا۔ جس نے ۔ہیکل کو جلا کر تمام یہودی کاہنوں اور سرداروں کو چن چن کر ہلاک کیا تا کہ یہودیوں میں تعلیم کا ایک شائبہ بھی نہ رہنے پائے۔ اس حملہ سے یہودیوں کی رہی سہی تعلیم بھی یکسر نابود ہوگئی۔

ان حالات میں جبکہ پے درپے حملوں سے توراۃ اور یہودیوں کو فنا کیا گیا۔ ایک طویل مدت تک یاداشت کی صورت میں بھی صحیح تعلیم توراۃ کا مستقل صورت میں رہنا ممکن نہ تھا۔ اسکے ساتھ ہی یہودی قوم بنی اسرائیل شروع سے ہی انحراف پر مائل رہی۔ زمانہ میں لوگوں میں دماغی قابلیت بھی اسقدر نہ تھی۔ غرض پرست لوگ جسطرف سادہ لوگوں کو دھکیلتے رہے۔ انہوں نے اسی پر عقیدہ جما لیا۔ پیروانِ مذاہب نے اپنی نفسی اغراض پر لوگوں کو محکوم بنائے رکھا۔ اور اپنی اغراض پوری کرنے کیلئے مذہب کی آڑ میں جو کچھ چاہا من گھڑت افسانے توراۃ کی شکل میں بنالئے۔ اسلئے اس مذہب میں جو کچھ بھی تعلیم پائی جاتی ہے۔ وہ کچھ تو ناقص یاداشت پر یا پیروان مذاہب کے من گھڑت تاویلات وتحریفات پر قائم کی گئی ہے۔ چونکہ اس مذہب کی کوئی مستقل تعلیم یا جماعت قائم نہ ہوسکی اسلئے نتیجتاً یہ علم و مذہب بھی تکمیل انسانی میں کفیل نہ ہوسکا۔

عیسائیت: عیسائی مذہب: یہ مذہب حضرت عیسیٰؑ سے نسبت رکھتا ہے۔ انکی الہامی کتاب انجیل کے نام سے موسوم ہے۔

انجیل کے نام سے عیسائیوں میں چار کتابیں مشہور ہیں۔ (۱) انجیل متی۔ (۲) انجیل مرقس۔ (۳) انجیل لوقا۔ (۴) انجیل یوحنا۔ ان میں سے ہر انجیل ایک ایک ہستی سے منسوب ہے۔ یعنی متی۔ مرقس۔ لوقا۔ یوحنا۔ یہ چار بزرگ حضرت عیسیٰؑ کے حواری[1] تھے۔

درحقیقت انجیل[2] مقدس وہ کتاب ہے۔ جو منجانب اللہ حضرت عیسیٰؑ کو عطا ہوئی۔ گویا

---

[1] حواری: تبلیغی سلسلہ میں مددگار۔ دوست۔ اور ایمان لانے والے کو کہتے ہیں۔

[2] انجیل مقدس: یہ کتاب حضرت عیسیٰؑ کو منجانب اللہ وحی کی صورت میں دی گئی۔ اسکی نوعیت تحریری ہو یا وحی کی۔ تاہم یہ سب احکام کلام الٰہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلئے انجیل کی بھی وہی حیثیت تھی جو کلام الٰہی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کتاب کلام الٰہی تھی جس میں تفکر و تسلیم کیلئے وہ ہدایات تھیں جس سے انسان کو علت لامحدود پانے میں تمام راہنمائی حاصل ہوسکتی تھی۔ اس کتاب میں وہ احکام الٰہی تھے جن سے انسان انحراف سے نکل کر ایک صحیح راہ پاسکتا تھا۔ اور اس کتاب کی نسبت براہ راست حضرت عیسیٰؑ سے ہی تھی۔ اس کتاب کی حقانیت کی شہادت حضرت عیسیٰؑ کی ذات گرامی سے ہی ہوسکتی ہے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی یہ ایک معجزہ تھا۔ اور دیگر معجزات بھی انہیں عطا ہوئے تھے۔ جن میں۔ بیماروں کو درست کرنا۔ مادرزاد اندھوں کو روشنی دینا۔ مردوں کو زندہ کرنا۔ وغیرہ۔ یہ معجزات ایک پیغمبر کی شہادت کیلئے ضروری تھے۔ اور اس نوعیت کے معجزات اس لحاظ سے تھے۔ کہ اُس زمانہ میں فنِ حکمت اپنے عروج پر تھی۔ اطباً (حکیم) اپنے علاجوں میں حد درجہ کامل و ماہر تھے۔ انہیں اپنی حکمت پر بیحد فخر تھا جیسے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ساحری کا دور دورہ تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے انہیں اسی قسم کے معجزات دکھائے جسکے سمجھنے میں انہیں شک کرنے کی گنجائش نہ رہتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ باوجود انتہائی علاج کے کوڑھی تندرست نہیں ہوسکتے ہیں۔ مادرزاد اندھے بینائی نہیں پا سکتے۔ مردے زندہ نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا اس قسم کے واقعات کا ظہور پذیر ہونا مادی قوتوں سے ماوراٗ اور انسانی تعقل سے باہر ہیں۔ یہی چیز پیغمبر کی صداقت کی دلیل ہوسکتی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ قوم بنی اسرائیل کیلئے ہی منتخب ہوئے کیونکہ قوم بنی اسرائیل ہر طرف پھیلی ہوئی تھی انہیں پر زیادہ ظلم ہو رہا تھا اور یہی قوم زیادہ منحرف ہوچکی تھی۔ یہ زمانہ قوم بنی اسرائیل پر ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے وقت میں ان پر تھا۔ بلکہ اب پیشتر سے زیادہ اِنکی تباہ کن حالت ہوچکی تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ کو ایک طویل عرصہ گزرے ہوئے ہو چکا تھا۔ اسکے بعد بھی۔ داؤدؑ۔ سلیمانؑ۔ عزیرؑ وغیرہ پیغمبر اسی دین موسوی کی تجدید کر چکے تھے۔ مگر پیہم مخالفین

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کی ہونی چاہیے۔ اسکی شکل کتابی صورت میں ہو یا زبانی احکام الٰہی اعمال و افعال کی صورت میں ہو۔ یہ چیز زمانہ کے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ جیسے توراۃ یا دیگر الہامی کتابوں کی شکل پیدا ہوئی۔ یعنی جس زمانہ میں جیسے لوازمات میسر ہوں اسی صورت میں کلام الٰہی کتاب کی صورت میں لائی جاتی ہے۔

کے حملوں اور تباہیوں نے اور خود انکی غلط روی نے انہیں ذلیل کر دیا تھا۔ اور جو تعلیم حضرت موسیٰؑ نے انہیں دی تھی وہ بالکل معدوم ہو چکی تھی۔ اِنکے پاس جو کچھ تھا وہ سب پیروان مذاہب کے من گھڑت افسانے تھے جن میں حقیقت نام کو نہ تھی اور موسوی مذہب ایک بے معنی چیز بن کر رہ گیا تھا۔

حضرت عیسیٰؑ کا ظہور صرف اسی لئے ہوا۔ کہ اسوقت انسانیت اپنے انتہائی تنزل کے مقام پر پہنچ چکی تھی۔ اور انسان اپنے افعال کی وجہ سے مثل حیوانوں کے بدتر اور غلام ہو چکے تھے۔ ضرورت تھی کہ انسانوں کے انحراف و غلط نظریات کو نئے حقیقی سانچے میں ڈھال کر نئی شریعت (دین) کا آغاز کیا جاتا۔ اس وقت ایک ایسے دین کی ضرورت تھی۔ جو غلط نظریات کو یکسر ختم کر کے منسوخ کر ڈالے۔ حضرت عیسیٰؑ کی نئی شریعت انجیل کی صورت میں انہیں غلط نظریات کو مٹانے کیلئے آئی۔ اس شریعت عیسوی میں بھی اُسی قسم کے احکام و عقائد تھے جو گزشتہ پیغمبروں نے صحیح تعلیم کی صورت میں پیش کئے تھے۔ چنانچہ انجیل نے بھی حضرت موسیٰؑ کی شریعت کی تصدیق کی کہ حضرت موسیٰؑ پیغمبر تھے اور اُنکا دین سچا تھا۔ صرف ان عقائد و نظریات کی مخالفت کی جو پیروان مذاہب نے توراۃ کی شکل میں من گھڑت افسانے غلط اور گمراہ کن نظریات صرف اپنی خود غرضی نفس پرستی کیلئے بنائے تھے۔ یہودیوں کیلئے لازم تھا کہ وہ دین عیسوی کی تائید کرتے جبکہ انجیل دین موسوی کی حمایت و تصدیق کرتی تھی۔ لیکن یہودی اس تعلیم سے برافروختہ ہوئے کیونکہ انجیل انکے اپنے بنائے ہوئے دین کی تنسیخ کرتی تھی۔ کیونکہ اس تعلیم سے اِنکا باطل دین اور انکی من مانی کاروائیوں کا خاتمہ ہو جاتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ دین عیسوی کی شدید مخالفت شروع ہوئی اور حضرت عیسیٰؑ کے ہلاک کرنے کے منصوبے ہونے لگے۔ چونکہ تمام قوم بنی اسرائیل انحراف پر مائل تھی اسلئے پوری قوم نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی۔ اور حضرت عیسیٰؑ باوجود اپنی انتہائی کوششوں کے ایک آدمی کو بھی اصل پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ سوائے چند حواریوں کے (جن میں کچھ دھوبی اور کچھ مچھلیاں پکڑنے والے تھے) انکا کسی نے بھی ساتھ نہ دیا۔

اس زمانہ میں بیت المقدس شام اور مصر کے تمام علاقوں پر قیصر روم کی حکمرانی تھی اور یہ

بادشاہ بھی دین موسوی سے برائے نام تعلق رکھتا تھا۔اسلئے یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت حکمران طبقہ کی معاونت میں کی۔چونکہ تعلیم عیسوی سے حکومت پر بھی اثر پڑتا تھا۔اسلئے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کوروکنے کیلئے خود بھی قدم اٹھایا۔آخر یہودیوں کی سازش سے حضرت عیسیٰؑ پر بغاوت کا الزام لگا کر حکومت نے انہیں گرفتار کرنے اور سولی[1] پر چڑھانے کے احکام صادر کر دیئے۔اور حضرت عیسیٰؑ کو بزعمِ[2] خود سولی پر چڑھایا گیا۔

حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم اول تو کسی نے تسلیم نہ کی اگر کی بھی تو چند حواریوں نے۔انہیں حواریوں میں یہ تعلیم عملی طور پر جاری رہی گویا یہی حواری مجسمہ تعلیم بنے رہے۔جسکا نتیجہ یہ رہا کہ یہ تعلیم ایک مخصوص صورت میں صرف عملی حیثیت سے قائم رہی۔اسکے بعد حضرت عیسیٰؑ کے چند حواری ہی اس تعلیم کے عامل رہے۔جنہوں نے اس تعلیم کو تبلیغی صورت میں ہر اطراف میں جا کر جاری کرنے کی کوشش کی۔چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے سولی پر چڑھ جانے کے بعد جو حواری رہ گئے انہیں کے ذریعہ مسیح دین کی تبلیغ کا آغاز ہوا۔یعنی۔متی۔مرقس۔لوقا۔یوحنا تو خاص حواری تھے انکے علاوہ مبلغین میں پطرس اور انکے نائب پولوس۔فیلبس۔یوماوس۔شمعون۔برقہ وغیرہ۔

حضرت عیسیٰؑ کے بعد یہی حواری اطرافِ عالم میں پھیل گئے۔لیکن انہیں بھی ہر جگہ شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔چونکہ ہر طرف ظالم و جابر حکمرانوں کا دبدبہ نہایت شدت کے ساتھ تھا۔چنانچہ کئی حواری قتل بھی کیئے گئے۔قدرت کو اس دین کی اشاعت کی ضرورت تھی اور اس کے

---

[1] سولی۔قتل کرنے کا رائج الوقت طریقہ۔اس زمانہ میں مجرموں کو قتل کی سزا میں سولی پر چڑھایا جاتا تھا اسکی ترکیب یہ ہوتی تھی کہ مجرم لکڑی کی سولی (✞) پر رکھا جاتا۔اور مجرم کے ہاتھ اور پیر لوہے کی کیلوں سے اس پر جڑھ دیئے جاتے اور درمیان سینہ بھی کیلوں سے پیوست کیا جاتا اور اسی طرح زخمی کر کے سولی پر رہنے دیا جاتا یہاں تک کہ اسکی جان نکل جاتی۔

[2] حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور سولی پر چڑھانے کے واقعات معجزہ کی حیثیت رکھتے ہیں اسلئے اس مسئلہ پر بحث یہاں قبل از وقت ہوگی اسکی تفصیل آگے بیان کی جائیگی۔

اسباب کی بھی ضرورت تھی۔ اسلئے اس دین کی داغ بیل بھی حکمران خاندانوں میں ہی پڑی اور بت پرست روما نے عیسوی دین قبول کیا۔ حکمرانوں کے عیسوی دین قبول کرنے سے عیسائی مبلغین کی مخالفت کم ہوئی اور تبلیغ میں آسانیاں پیدا ہوئیں۔ رفتہ رفتہ دین عیسوی بھی پھیلنے اور اقتدار پانے لگا چنانچہ تھیوڈوس اعظم پاپائے روم نے ستائیس سال کی حکمرانی میں اپنا تمام زور لگا کر دین عیسوی کو وسعت دی اور تمام بت پرستوں کا بنوک شمشیر اپنی پوری سلطنت سے خاتمہ کر دیا۔ اور دین عیسوی ہر طرف سیلاب کی طرح جاری ہوا۔ اسی دور میں حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے اپنے عمل اور یادداشت سے انجیل مقدس کی ترتیب دینی شروع کی۔ جو انہیں حواریوں کے نام سے منسوب کی گئی۔ متی کی انجیل سب سے پہلے عبرانی میں شہر یہودا (واقع شام) میں لکھی گئی۔ لوقا کی انجیل رومی زبان میں لکھی گئی۔ اسی طرح مرقس۔ اور یوحنا نے بھی انجیل کو ترتیب دیا۔ ان اناجیل میں وہی احکام درج تھے جو انہوں نے حضرت عیسیٰؑ سے تعلیم پائے تھے۔ جب تک ان حواریوں کا علم و عمل اپنی اصلی حالت میں رہا۔ دین عیسوی ایک صحیح الٰہی دین سمجھا جاتا رہا۔ لیکن رفتارِ زمانہ اور طوالت کا یہ تقاضا ہے۔ کہ لوگوں میں اقتدار کے ساتھ ساتھ حصولِ دولت و امارت کی خواہش انہیں آرام طلبی۔ ہوس اور نفس پرستی کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ جسکا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ کہ پیروانِ مذاہب دین میں تحریف شروع کر دیتے ہیں۔ یہی حال دین عیسوی کا بھی ہوا۔ لوگوں میں دینی تعلیم پر عمل کم ہونے لگا نفس پرستی کی وجہ سے اصل تعلیم آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگی۔ اور زمانہ گزرنے کے بعد نہ عمل رہا اور نہ ہی اصل تعلیم موجود رہی۔ دین عیسوی ایک صدی تک ہی اپنی اصلی حالت میں رہا اسکے بعد اس میں تحریف شروع ہوئی۔ بلکہ ابتدائی دور میں ہی حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں سے چند حواریوں نے (جو خود مکمل طور پر حضرت عیسیٰؑ کی حمایت میں نہ تھے) جیسے پطرس جس نے حضرت عیسیٰؑ کی گرفتاری پر حواری ہونے سے انکار کیا۔ برقہ۔ پولوس وغیرہ اسی قسم کے حواری تھے جو بعد میں اپنے اوپر روح القدس کے نازل ہونے کا دعویٰ کرنے لگے۔ ان حواریوں نے بھی شروع سے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں تحریف شروع کر دی تھی۔ لیکن ابھی باقی

حواری موجود تھے اور انہوں نے تعلیم کو صحیح طریقہ پر رائج کیا تھا اسلئے انکی تحریف کا اسوقت کچھ اثر نہ ہو سکا۔ لیکن بعد میں انکی کتابوں کی وقعت بڑھ گئی کیونکہ یہ بھی محرف تعلیم سے ملتی جلتی تعلیم تھی۔ چنانچہ تواریخ دان محققین نے جن میں تقریباً سب عیسائی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنی تحقیق میں یہ بات ظاہر کر دی ہے۔ کہ ان چاروں خلفاً (حواریوں) سے جو کتابیں منسوب کی جاتی ہیں۔ ان میں حد سے زیادہ تضاد پایا جاتا ہے۔ کوئی کتاب ایک دوسرے سے تعلیم میں موافقت نہیں کرتی۔ ان میں پیروان مذاہب (پادریوں) نے تحریف کی ہے۔ اور اصل تعلیم کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ متی انجیل جسکا ترجمہ یونانی زبان میں کیا گیا ہے۔ اسکا عبرانی نسخہ ناپید ہو چکا ہے۔ اور کوئی محقق یہ ثابت نہ کر سکا کہ اسکا یونانی ترجمہ کب اور کس نے کیا ہے۔ نورٹن صاحب ایک عیسائی محقق ہیں انہوں نے وضاحت سے یہ بات ظاہر کی ہے۔ کہ موجودہ کتابیں اصل حواریوں کی تصنیف نہیں ہیں۔ باقی کتابیں بھی ایسے شارحین و مصنفین کی تصنیفات ہیں۔ جو تقریباً حضرت عیسیٰؑ کے صحیح پیرو ہی نہ تھے۔ نورٹن صاحب نے لکھا ہے کہ ان کتابوں میں جن اعجازی باتوں کا ذکر ہے ان میں جھوٹی روایات بھی شامل ہیں (کتاب الاسناد ص ۵۳۔ ص ۶۱ وغیرہ نسخہ مطبوعہ ۱۸۳۷ء)

تمام عیسائیوں کا اجتماعی عقیدہ ہے۔ کہ اناجیل اربعہ (چار انجیلیں) میں کوئی انجیل بھی حضرت عیسیٰؑ پر منجانب اللہ نازل شدہ نہیں ہے بلکہ یہ کتابیں انہیں مصنفین کی تصنیف ہیں جن کے نام سے یہ انجیلیں منسوب ہیں۔ ان انجیلوں کی نسبت حضرت عیسیٰؑ سے نہ ہونا انکے ناموں سے خود ثابت ہے۔ کیونکہ متی مرقس لوقا اور یوحنا خود حضرت عیسیٰؑ کے حواری تھے۔ دوسری بات یہ ہے۔ کہ ان کتابوں کی شرح ایسے پیرایہ میں کی گئی ہے۔ جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پیروان مذاہب نے انمیں تاویلیں کی ہیں۔ جس وجہ سے کوئی عیسائی بھی ان کتابوں کو حضرت عیسیٰؑ سے نسبت دیکر منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرنے کی جراٴت نہیں کرتا۔ کیونکہ اس قسم کا دعویٰ کرنے سے خود بخود انکے دعوے کی تکذیب ہو جاتی ہے۔ البتہ ان کتابوں کو الہامی صورت دینے کیلئے یہ دعویٰ عیسائی کرتے ہیں کہ ان حواریوں نے روح القدس (وحی) کے ذریعہ یہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔

لیکن انہیں عیسائیوں کے محقق اس دعوے کی خود تکذیب کرتے ہیں کہ ان کتابوں کی تعلیم میں تضاد پایا جاتا ہے اور ان میں تحریف کی گئی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اول تو اصل حواریوں کے نسخے ناپید ہیں جن کے حوالے سے ان کتابوں کی تصدیق ہوسکتی دوسرے ایک ہی تعلیم کے مختلف حصص ہوکر انکی ایک تعلیم میں آپس کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ تیسرے ان کتابوں میں مبالغہ آمیز معجزات اور غیر فطری عقائد پائے جاتے ہیں۔

نورٹن صاحب اور ہارون انجیل کے مشہور شارح ہیں ان کا متفقہ قول ہے۔ کہ ان چاروں انجیلوں کی تعلیم ایک دوسرے سے نہیں ملتی ہے۔ بلکہ اس میں تحریف کی گئی ہے۔ اسی طرح پادری فرنچ (ایک محقق اور شارح) انجیل میں تحریف و تاویلات کی تائید کرتا ہے۔ ان حالات کی روشنی میں جبکہ خود عیسائی شارح ہی انجیل کے صحیح ہونے کی تردید کرتے ہیں کسی غیر کے تردید کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

انجیل میں سب سے بڑی تاویل حضرت عیسیٰؑ کے متعلق یہ ہے۔ کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ حالانکہ وہ علت لامحدود جو بشری (انسانی) خاصیتوں سے مبرا ہے۔ شادی بیاہ بیوی یا اولاد ہونے سے پاک ہے۔ کوئی عیسیٰؑ ہی کو خدا مانتے ہیں۔ اور کوئی حضرت مریمؑ (حضرت عیسیٰؑ کی والدہ) اور حضرت عیسیٰؑ کو بھی خدا بناتے ہیں۔ اسکے علاوہ ان محرف اناجیل میں کچھ اس قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں جو خلاف قوانین فطرت پائے جاتے ہیں۔ عیسائیوں کا خصوصی نظریہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر اسلئے چڑھایا گیا۔ کہ ہر انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے یعنی حضرت آدمؑ نے گناہ کیا تھا۔ اور انسان بھی گناہ کرتے ہیں اسلئے جو انسان حضرت عیسیٰؑ کو پیغمبر تسلیم کر کے اسی مذہب پر ہمیشہ مداومت کرے اسکے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے۔ عیسائی ہونے سے انسان پر اپنے افعالِ نیک و بد کی پھر کوئی ذمہ داری نہیں رہتی۔ اسے تفکر کرنے یا حقیقت کو پانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ اناجیل کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں چند دعاؤں اور چند مخصوص نظریوں کے تفکر اور اصل علت لامحدود کے متعلق کوئی ٹھوس لائحہ عمل یا مکمل

نظریہ نہیں پایا جاتا۔

ان حالات میں جبکہ انجیل ایک پیغمبر سے نسبت ہی نہ رکھتی ہو بلکہ خود عیسائی محقق اسکی تعلیم کی تکذیب کرتے ہوں اور انجیل میں تفکر اور انسانی نصب العین کے لئے کوئی خالص نظریہ موجود نہ ہو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دور حاضرہ کی انجیل انسانی راہنمائی کیلئے کافی نہیں ہوسکتی۔

موجودہ زمانے میں یہ دونوں قومیں (عیسائی۔ یہودی) پائی جاتی ہیں۔ یہودی مذہب کا ایک موہوم نقشہ نظر آ رہا ہے۔ نہ ہی توراۃ اور اسکی تعلیم اور اسکی زبان کسی جگہ پائی جاتی ہے۔ البتہ خاندانی سلسلہ کی بنا پر یہ دین جدی پشتی نسلوں میں چلا آ رہا ہے۔ یہ قوم تجار ہونے کی وجہ سے متمول ہے۔

عیسائی قوم دنیا پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور کثیر تعداد میں پائی جاتی ہے۔ حکمران حیثیت سے انہوں نے مادی رنگ میں کافی اقتدار حاصل کرلیا ہے۔ کیونکہ اس قوم میں کثرت سے ایسے محقق پیدا ہوئے جنہوں نے مادی رنگ میں اپنی تحقیق کو بام عروج پر پہنچا کر ایسی اختراعات وایجادات کیں جن سے انہوں نے دنیا کے ۳/۴ تین چوتھائی حصہ پر قبضہ حاصل کیا۔ مگر یہ تسلط مادی رنگ میں ہوا۔ لیکن یہ بات قابل تسلیم ہے۔ کہ اِنکی ایجاداتِ مادی کائناتِ خلقت کے تفکر کی سطحوں پر رہی انہوں نے کائنات کے اجزأ پر تفکر کر کے ہی اتنا عروج حاصل کیا۔ مگر یہ عروج مادی تھا۔ اس میں ماورأ مادہ (روحانی) تفکر شامل نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیوی (مادی) اقتدار نے انمیں نفس پرستی اور ہوس پرستی کا مادہ زیادہ کر دیا۔ جس وجہ سے انہوں نے باوجود اپنی تحقیق کے صحیح ہونے کے بھی عمدأ ماورأ ادراک قوتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ کیونکہ انکا بڑھتا ہوا اقتدار جسکی بنیاد ہوس پرستی اور جاہ طلبی پر ہے۔ انہیں تسلیم کرانے اور روحانیت کی طرف رجوع کرنے سے مانع ہوتا ہے۔

روحانی حیثیت سے ان میں مذہبی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ جو ایک علٰیحدہ فرقہ کی حیثیت سے ہے۔ یہ لوگ قدیم مذہبی طرزوں کے راہب (پادری) ہیں جو اپنی نسبت عیسوی مذہب سے قرار دیتے ہیں۔ عیسائیوں کی تمام عبادت گاہیں اور مذہب عیسوی کی تمام رسومات انہیں پادریوں

کے ذمہ ہیں۔ان میں زیادہ تر تبلیغی جماعتیں ہیں جن میں عیسائی مرد (راہب۱۔ پادری) اور عورتیں (راہبہ۲۔ ننیں) تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔انکا کام ہر اطراف عالم میں تبلیغ کرنا عیسائی اداروں کا انتظام انجام دینا ہے۔اور دین عیسوی کو وسعت دینا ہے۔ہر ملک میں انکے تبلیغی ادارے اور گرجے (عبادت گاہیں) ہیں۔ہر ملک میں اپنے اقتدار کی وجہ سے آزادی سے تبلیغ کر سکتے ہیں۔ان کی تعلیم کا تمام مواد موجودہ محرف شدہ اناجیل سے لیا گیا ہے۔گو یہ تعلیم اپنی اصلی حالت میں نہیں۔تاہم ہر فرقے کے لوگ اس دین میں پائے جاتے ہیں لیکن یہ چیز قابل ذکر ہے۔کہ یہ لوگ دینی عقیدت کے لحاظ سے عیسائی دین حاصل نہیں کرتے۔بلکہ رسمی طور اسی قدر عقیدہ قائم کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں۔اور وہ انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر چکے ہیں اسلئے ہر معتقد نجات یافتہ ہے۔اس عقیدت میں بھی کوئی حقیقت نہیں۔کیونکہ ان میں تفکر یا مذہبی قوانین کی پابندی کا کوئی عمل نہیں پایا جاتا ہے سوائے اسکے کہ ہفتہ میں ایک بار گرجہ میں جا کر

۱راہب: قدیم زمانہ میں کلیساؤں میں یہ دستور تھا۔کہ نذر کے طور ہیکل سلیمانی (گرجاؤں) میں بچوں کو دیا جاتا تھا۔اور کلیسائی شرائط کے مطابق انکی زندگی دین کیلئے وقف ہوتی تھی۔انہیں اپنی تمام عمر میں عبادات مشاہدات میں مجرد (بغیر شادی و دنیاداری) حالت میں رہنا پڑتا۔اس تقدس کیوجہ سے انکا احترام کیا جاتا تھا۔چونکہ یہ لوگ احکام کی پابندی (عبادات) میں ہمہ وقت مشغول رہتے۔اسلئے انہیں لوگوں سے دین کی تعلیم واشاعت ہوتی تھی۔یہ لوگ تمام دنیوی امور سے (دنیاداری) لاتعلق رہتے۔اور اکثر گوشہ نشین رہتے انکے لئے کلیسا کے بازو میں ایک کمرہ مخصوص ہوتا جس میں انکا قیام ہوتا۔یہیں پر انکی ریاضت ومجاہدہ ہوتا۔اور انکی ہر ضرورت کے کفیل کلیسا کے منتظم اور عام لوگ ہوتے۔

۲راہبہ: یہ طریقہ حضرت مریمؑ سے شروع ہوا۔انکی والدہ نے نذر مانی تھی کہ۔میں اپنی اولاد کو پیدا ہونے پر کلیسا کی نذر کر دونگی چنانچہ انکی لڑکی پیدا ہوئی اور وعدہ کے مطابق کلیسا میں انہیں پیش کیا چونکہ یہ نذر مانی گئی تھی اسلئے۔انہیں ہیکل سلیمانی کی مجاورت میں شامل کیا گیا انکے لئے ہیکل سلیمانی میں ایک کمرہ مقرر کیا گیا جہاں وہ عبادت میں ہمہ وقت مصروف رہتی انہیں کی تقلید میں راہبہ دنیا کی ازدواجی زندگی ترک کر کے کلیسا میں شامل ہو کر راہبانہ زندگی اختیار کرتی ہے۔جیسا کہ فی زمانہ بھی یہ رواج موجود ہے۔

تمام زن و مرد چند ساعت کیلئے کچھ واعظ و تقریر سنیں یا چند دعائیں مانگ کر ہفتہ بھر کیلئے فارغ رہتے ہیں۔اور یہ چیز بھی رسمی طور پر ادا کی جاتی ہے۔ورنہ انکے نظریہ میں بھی کوئی جذبہ کام نہیں کرتا۔اسکی وجہ یہ ہے۔کہ ان عقیدت مندوں میں دو فرقے ہیں ایک اعلیٰ۔جو خالص مغربی یورپین قوم سے تعلق رکھتے ہیں انکی عبادت گاہیں علیٰحدہ ہیں یہ دوسرا فرقہ۔عام اقوام غیر یورپین قوم سے تعلق رکھنے والے ہیں یہ ادنیٰ فرقہ ہے۔ایک خالص یورپین ادنیٰ عیسائی گرجہ میں عبادت نہیں کر سکتا اور نہ ہی ادنیٰ درجہ کا عیسائی یورپین گرجہ میں جا سکتا ہے۔انکے پادری بھی اپنے اپنے فرقے کے ہیں۔ان میں علمی لحاظ سے سوائے پادری کے ہر شخص عیسائی مذہب سے پوری واقفیت نہیں رکھتا نہ ہی انہیں اس تعلیم سے زیادہ مس ہوتا ہے۔اگر ہو بھی تو پانچ فیصدی اندازہ سے ہو سکتا ہے۔وہ بھی مروجہ نصابی تعلیم ہو گی۔انکا مذہبی تعلیم کا میعار سوائے اسکے کچھ نہیں کہ ایک بار گرجہ میں جا کر دعا کرنا اور رسمی طور اس عقیدہ کو یاد رکھنا کہ حضرت عیسیٰؑ خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔اسکی وجہ یہ ہے۔کہ خالص طبقہ کے لوگ اپنے اقتدار اور غلبہ کی فکر میں رہتے ہیں۔دنیوی امارت و حکومت انہیں حاصل ہے۔اور یہ کسی خاص مشاہدہ یا تفکر کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔دوسرے انکی تبلیغی جماعتیں بھی کسی خاص مشاہدہ یا الہامی تعلیم کے تحت مذہب کو پیش نہیں کرتے بلکہ دولت و ثروت کے بل بوتے پر دین کو چلا رہے ہیں۔چونکہ باقی ادنیٰ طبقہ کی قوموں میں غربت و افلاس اور احساس کمتری نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔انہیں اثرات کے تحت لوگ ذاتی دنیوی منفعت حاصل کرنے کی غرض سے بطور شرط ان عقائد کو رسمی طور تسلیم کر کے ان میں شامل ہو جاتے ہیں۔تا کہ انہیں اس متمول مذہب سے روزمرہ زندگی کی ضروریات حاصل کرنے میں آسانی ہو۔اس تبلیغ سے دین عیسوی کی وسعت یا انسانی فلاح و عروج مقصود نہیں ہوتا۔بلکہ حکمرانی نقطۂ نظر سے ہر ملک میں ایک حکومت کی تائید میں آواز پیدا کرنے کیلئے ایک کثیر جماعت کا پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے جسکے لئے ان تبلیغی جماعتوں کیلئے حکومت کی طرف سے کروڑوں روپیہ وقف کیا جاتا ہے۔ایک طرف حکومت ایجادات اور امور حکمرانی میں ہمہ تن مصروف عمل ہے۔دوسری طرف تبلیغی مشن انکی حمایت

کیلئے ہر ملک میں صرف حکومت کے اقتدار کیلئے زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عیسوی مذہب برسر اقتدار ہے۔ یہ ایک حکومت ہے۔ جو صرف اپنی دنیوی امارت اور اپنی اغراض پوری کرنے کی سعی میں مصروف ہے ورنہ صحیح دین یا اصل نصب العین اس دین کا مقصود نہیں۔ اس دین کی طرف رجوع صرف اسی لئے ہے۔ کہ ہر شخص کی دنیوی اغراض اس دین سے پوری کی جاتی ہیں۔ اور ہر شخص فرداً فرداً خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ اپنے صحیح مقصد اور نصب العین سے یکسر غافل ہے۔ اسلئے یہ دین بھی باوجود اقتدار کے بھی (جبکہ انکا اصل دین سے مس ہی نہ ہو) انسان کیلئے باعث نجات یا باعث راہنمائی نہیں ہوسکتا ہے۔

پارسی مذہب۔ زرتشتی: یہ مذہب حضرت زرتشت سے منسوب ہے۔ اس مذہب کا رواج زیادہ تر ایرانی قوم میں پایا جاتا ہے۔ ایرانی قوم ایک قدیم قوم ہے۔ باقی پیغمبروں کی طرح حضرت زرتشت بھی منجانب اللہ پیغمبر ہوئے ہیں۔ پارسی لوگوں میں ژند۔ پاژند اور اُستا الہامی کتابیں مانی جاتی ہیں۔ لیکن ان کتابوں میں سے کسی کتاب کا الہامی منجانب اللہ ہونا کسی تواریخ سے ثابت نہیں ہوسکتا ہے۔ کہ ان میں سے ژند میں حضرت زرتشت کے الہام شدہ احکامات ہوں۔ لیکن اسکی نوعیت اسی طرح ہوسکتی ہے۔ جسطرح باقی پیغمبروں کو احکامات ملے ہوں۔

کتاب ژند تو زرتشت کے عہد سے پہلے ہوئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زرتشت کسی پیغمبر کے دین کی تجدید کرنے آئے۔ جیسے۔ داؤدؑ۔ سلیمانؑ وغیرہ نے موسوی دین (توراۃ) کی تجدید کی۔ اسکے بعد پاژند کو کلام الٰہی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ جسکے پچیس باب تھے اور اب صرف اسکا ایک ہی انیسواں باب وندیدار پایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کے اس قوم میں بھی ہدایات الٰہی پہنچیں ہوں۔ لیکن زمانہ کی رفتار اور انقلابی حالات کے ساتھ اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ جو باقی کتابوں کا ہوا۔

ژند پارسیوں کی ایک الٰہی کتاب مانی جاتی ہے۔ لیکن اسکا اصل وجود مشتبہ ہے۔ کیونکہ سکندر مقدونی کے فتح ایران کے بعد یہ کتاب معدوم ہوگئی تھی۔ سکندر مقدونی نے پارسیوں اور انکی

الہامی کتابوں کا وہی حشر کیا جو توراۃ اور یہودیوں کے ساتھ بخت نصر۔ اینٹوکس۔ اور خسرو پرویز نے کیا۔ سکندر کے بعد تین سو سال تک پارسی مذہب کی حالت ابتر رہی۔ اور جب اردشیر بابکان ایران کا بادشاہ بنا۔ اسکے عہد میں دوبارہ احکام الٰہی کو ترتیب دیا گیا جسے دساتیر کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اور اسے آسمانی کتاب کا درجہ دیا گیا۔ اردشیر پارسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا اسلئے اسکے عہد میں پارسی مذہب کو کسی حد تک اقتدار نصیب ہوا۔ اردشیر کے بعد مانؔی کا زمانہ آیا۔ اس نے اپنا خود ساختہ مذہب چلایا اور دساتیر کو اس نے ژند کی طرح تلف کرا دیا۔ مانی کے بعد ژروک نے بھی اسی طرح اپنا دین چلایا۔ اُس نے دساتیر کے رہے سہے نقوش اور مانی کا مذہب دونوں کو ختم کر ڈالا اور پارسیوں کی تمام کتابوں کو تلاش کر کے جلا ڈالا۔ اور پارسی مذہب کو یکسر نابود کر دیا۔

جہاں تک حضرت زرتشت کی تبلیغ کا تعلق ہے۔ یہ امر قابل باور ہے۔ کہ انہوں نے پیغمبرانہ حیثیت سے ظہور کیا۔ اور مخلوق تک ایک صحیح تعلیم کو پہنچایا۔ مگر پیغمبر کا تعلق ایک صحیح تعلیم سے ہوتا ہے۔ اسکی تعلیم اسوقت تک صحیح مانی جاتی ہے جب تک کہ وہ باطل قوتوں کی دست برد سے محفوظ ہو۔ جہاں لوگوں میں انحراف وخود غرضی پیدا ہوئی۔ یہ ایک فطری امر ہے۔ کہ باطل قوتیں اصل دین کو معدوم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دین کا وجود قوم کے تسلیم وتکمیل سے ظاہر ہوتا ہے۔ جب قوموں میں انحراف پیدا ہو جائے تو۔ باطل قوتیں خود بخود سامنے آجاتی ہیں جس سے حقیقت چھپ جاتی ہے۔ دور پیغمبر میں چونکہ دین پر عملدرآمد پوری طرح ہوتا ہے۔ اسلئے دین خود بخود اپنی روشنی پھیلا کر ظلمت (باطل) کو معدوم کر دیتا ہے حضرت زرتشت کی تعلیم جسوقت تک اپنی صحیح حالت میں رہی اسوقت تک تعلیم پوری راہنمائی کرتی رہی انکے بعد جب قوم میں انحراف ہونے لگا صحیح تعلیم بھی معدوم ہوتی گئی۔

حضرت زرتشت کا جس وقت ظہور ہوا۔ انہوں نے انسان کو غفلت سے نکالنے کی سعی کی۔ اِنکا ابتدائی آغاز آذربائیجان سے ہوا۔ ابتداً میں انکی تبلیغ پر شدت سے مخالفت ہوئی۔ آخر اپنا وطن چھوڑ کر ایران آئے۔ یہاں بھی مخالفت ہوئی۔ تو مشرق کی طرف رخ کیا۔ ترکستان سے

ہوتے ہوئے چین تک اسی تبلیغی مہم میں پہنچے۔ مگر ہر جگہ مخالفت ہوئی۔ اور دس سال کے عرصہ میں صرف ایک شخص موہنا انکا چچازاد بھائی ایمان لایا۔ وقت آ پہنچا تھا کہ پیغمبر کا دین جاری ہو۔ چنانچہ دوبارہ شہنشاہ ایران کے دربار میں پہنچکر نہایت حوصلہ مندی سے تبلیغ کی۔ دربار شاہی میں علمأ شاہی سے مباحثہ ہوا تمام علمأ بے بس ہوگئے۔ جس سے بادشاہ کے دل پر کافی اثر ہوا۔ اور بادشاہ ایمان لایا۔ لیکن علمأ و امرأ اس واقعہ سے انکے مخالف ہو گئے۔ اور بادشاہ کو بہکایا۔ بادشاہ نے امرأ و علمأ کے بہکانے سے حضرت زرتشت کو قید کرلیا۔ بادشاہ پر بعد میں حقیقت کھل گئی۔ انہوں نے حضرت زرتشت کو عزت واحترام سے قید سے نکالا۔ اور اپنے دربار میں لایا۔

گشتاسپ شاہ ایران کے مکمل ایمان لانے کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تبلیغ میں آسانی ہوئی۔ رفتہ رفتہ ایران میں پیروؤں کا زور بڑھنے لگا اور تمام ملک ان پر ایمان لایا۔ وزیر سلطنت جسماسپ اِنکا جانشین بنا۔ اور دوسرے وزیر فرشوترآ نے اپنی لڑکی کے ساتھ عقد کر دیا۔ گویا اس مذہب نے بھی ملوکیت کی شکل اختیار کر لی۔ روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ اور تمام ایران میں پارسی مذہب جاری ہوا۔ ایران کی حدود سے نکلکر ترکستان۔ چین اور ہندوستان۔ آسام وغیرہ ملکوں میں بھی اس مذہب کی اشاعت ہونے لگی اور تمام علاقوں میں یہ مذہب سیلاب کی طرح پھیلنے لگا۔ یہ واقعہ ۶۰۱ ق۔م کا ہے[1]۔

شاہ توران ارجاسپ پارسی مذہب کی اس ترقی سے جھلّا اٹھا کیونکہ اس طرح دین کے ساتھ شتاسپ کی حکمرانی بھی وسعت پکڑتی جاتی تھی۔ اس بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھکر اسے اپنی کمزوری کا خطرہ محسوس ہوا۔ اس نے شتاسپ شاہ ایران پر شدید حملہ کیا لیکن اسوقت شاہ ایران کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی ارجاسپ ایرانی اقتدار کی تاب نہ لا سکا۔ شکست کھا کر واپس ہوگیا۔ اسکے بعد تقریباً بیس سال تک ارجاسپ خاموش رہا اور اندرون تیاری میں مصروف رہا۔ ایک دن بے

---

[1] ماخوذ از رسالہ مولوی رسول نمبر ۱۳۵۸ھ

خبری کے عالم میں اچانک حملہ کردیا۔جس سے ایرانیوں کا کافی نقصان ہوا۔حضرت زرتشت اور شتاسپ کا بوڑھا باپ اسی حملہ میں شہید ہوئے۔ارجاسپ نے اس حملہ میں بیشار علماً کو قتل کرڈالا اور زرتشی عبادت گاہوں کو بھی جلا ڈالا۔اِسوقت شاہ ایران شتاسپ سیستان میں تھا۔حملہ کی خبر سنتے ہی ایران پہنچا اور ارجاسپ پر حملہ کردیا۔جس میں ارجاسپ خود مارا گیا۔اور شتاسپ کو مکمل فتح ہوئی۔اسکے بعد پارسی مذہب کا کوئی مخالف باقی نہ رہا۔حضرت زرتشت خودتو شہید ہوئے۔لیکن اب پارسی مذہب ایک عالمگیر اقتدار حاصل کرچکا تھا۔

زمانہ ہردور میں اپنی کروٹ بدلتا ہے۔اسی طرح بادشاہتوں میں بھی انقلاب پیدا ہو جاتے ہیں۔ہرمذہب میں اختلاف پیدا ہوتے ہیں۔اسکی وجہ زمانہ کی طوالت اور انسان کا اقتدار حاصل ہونے پرآرام طلب اور دنیا طلب ہو جانا مذہب کی کمزوری کا سب سے بڑا سبب ہے۔ پارسی مذہب میں جب اقتدار اپنی انتہا کو پہنچا اس میں بھی اس قسم کے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے دیگر پیروان مذاہب کی طرح مذہب میں رخنے پیدا کردیئے جس سے مذہب اور حکومت میں بھی کمزوری شروع ہوگئی۔نتیجہ یہ ہوا۔کہ مختلف حکمرانوں نے ایران پر حملے شروع کردیئے۔آخر پے در پے حملوں کی زد میں آکر یہ مذہب بھی اپنا علمی (الہامی) مواد کھو بیٹھا۔باطل قوتوں کے حملوں سے اسکی اصل تعلیم بھی اسی مقام پر پہنچی جہاں پیروان مذاہب کی تحریفات کا اِس پر اثر پہنچا۔ اور یہ مذہب بھی ایک من گھڑت افسانہ بن گیا۔

زمانہ حاضرہ میں پارسی مذہب کی کتاب دساتیر ہے۔جسے الہامی کلام سمجھا جاتا ہے۔ جوصرف چند دعاؤں کا مجموعہ ہے۔لیکن یہ کتاب اردشیر بابکان کے عہد میں جبکہ اس سے قبل۔ ژند۔پاژند اور استاً کی تعلیمات کو معدوم کیا جاچکا تھا اور اسی بادشاہ کے عہد میں یادداشت کے طور پر اصل مذہب کی تعلیم سے تقریباً پانچ سو سال بعد ترتیب دی گئی اسوقت نہ خود زرتشت تھا نہ اسکی اصل تعلیم ہی تھی اسلئے اس کتاب کا الہامی تسلیم کرنا غیر یقینی امر ہے اسکے علاوہ اُستا بھی ایک کتاب ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔اسکی بابت مشہور ہے کہ یہ قرآن کے بعد لکھی گئی ہے۔جس

سے شبہ ہوتا ہے۔ کہ اس کتاب کے مضامین قرآن سے ہی ماخوذ کیئے گئے ہیں اس صورت میں اس کتاب کی ذاتی حیثیت خود بخود معدوم ہو جاتی ہے۔

اس مذہب کے عقائد اکثر قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت کرتے ہیں۔ مگر کئی ایک ایسے عقائد بھی موجود ہیں جو اسکی تمام اصلیت کو مشتبہ و بے اثر کر دیتے ہیں۔ انکی کتاب دساتیر میں سوائے چند دعاؤں کے مجموعہ کے یا چند قوانین جو انسانی تمدن سے تعلق رکھتے ہیں کوئی مواد ایسا نہیں جس سے علت لامحدود اور کائنات خلقت کے تفکر یا انکے تجزیہ و تجسّس کا کوئی اشارہ بھی ملتا ہو۔ اسلئے تفکر کے لئے علم وراہنمائی اس مذہب سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

ہندو مت۔ ہندو مذہب: یہ مذہب قدیم آرین قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ قوم ابتداً سے ہندوستان میں آباد ہے۔ انکی مذہبی کتاب وید ہے۔ جسے الہامی کتاب کہا جاتا ہے۔ اس مذہب کی اور وید کی کس پیغمبر سے نسبت ہے؟ یہ بات وید کی تعلیم سے بھی صحیح طور تصدیق نہیں ہوتی کہ انکا ابتدائی پیغمبر کون ہے اور وید کس پیغمبر سے نسبت رکھتی ہے۔ البتہ اس مذہب میں کئی بزرگ ہستیوں[1] کا ذکر ہوتا ہے جنہیں اوتار (پیغمبر) کہا جاتا ہے۔ مگر وید کی نسبت ان سے بھی نہیں بتائی جاتی۔ اِنکے علاوہ ایسی ہستیاں بھی پائی جاتی ہیں جو ایک راہنما کی حیثیت سے اس قوم میں پیدا ہوئی ہیں جنہیں رِشی کہتے ہیں۔

یہ امر لازمی ہے۔ کہ ہر قوم کیلئے ایک پیغمبر ہو۔ کرشن یا رامچند رجی کا پیغمبر ہونا کسی حد تک صحیح ہو سکتا ہے لیکن وید کی انکے ساتھ کوئی نسبت معلوم نہیں ہوتی۔ اسلئے یہ بات صاف ظاہر ہے۔ کہ وید پیغمبروں میں سے کسی سے نسبت نہیں رکھتی اور ان پیغمبروں کو بھی کوئی کتاب نہیں ملی جو الہامی درجہ رکھتی ہو۔ یہ بات صاف ظاہر ہے۔ جسقدر کرشن یا رامچند رکا ہندو مذہب میں عزت و مرتبہ ہے۔ اسی قدر اِنکی تعلیمات کا وجود قائم ہونا یقینی ہے۔ مگر ہندو مذہب میں کرشن یا رامچند ر

---

[1] اوتار: کرشن۔ رامچند رجی وغیرہ۔

کے نام سے کوئی کتاب منسوب نہیں۔اسلئے یہ بات ثابت ہے۔کہ ہندو مذہب میں کسی پیغمبر سے نسبت رکھنے والی کوئی الہامی کتاب ہے ہی نہیں نہ ہی پیغمبروں کو کوئی کتاب ملی ہے۔

جہاں تک انکے تعلیمی مواد کا مطالعہ کیا جائے۔معلوم ہوتا ہے۔وید ایک کتاب پر مشتمل نہیں بلکہ مختلف قسم کی کتابوں کو بھی وید کے ایک ہی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔زمانہ حاضرہ میں سب ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وید چار[۱] ہیں (۱) رگ وید۔(۲) یجر وید۔(۳) سام وید۔(۴) اتھر وید۔ان میں چوتھے اتھر وید کو اکثر حصہ ہندوؤں کا تسلیم ہی نہیں کرتا۔منو جی مہاراج (رشی) کی ''منوسمرتی'' میں بھی صرف تین ویدوں کا ذکر آتا ہے۔رگ۔یجر اور سام چوتھے کا نام ہی نہیں پایا جاتا۔اور سنسکرت کی قدیم کتابوں میں بھی تین ویدوں کا ہی ذکر ہے۔اسکے علاوہ بعض ایسی بھی پرانی کتابیں ہندوؤں میں پائی جاتی ہیں جو وید کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں انکی تعداد ۳۲ کے قریب ہے۔گو انکی تعداد کا کوئی صحیح اندازہ نہیں۔تاہم۔عمومی۔حیثیت سے چار وید خصوصی سمجھے جاتے ہیں۔سب ہندو وید کو کلام الٰہی بتاتے ہیں لیکن ابھی تک یہ مکمل طور ثابت نہ ہو سکا کہ کس پیغمبر پر یہ الہام کی صورت میں نازل ہوئی ہے۔اسکے بارے میں صرف اسی قدر معلوم ہوا ہے۔کہ یہ چار وید چار ہستیوں پر اتری ہیں۔جنکا نام۔اگنی۔وایو۔ادتیہ اور انگرہ ہے۔لیکن چھاندوگیہ اپنشد پر پاٹھک نمبر ۴ کھنڈ نمبر ۱۷ کے منتر سے یہ ثابت ہوتا ہے۔کہ یہ نام انسانوں کے نہیں بلکہ آگ۔ہوا اور سورج کے ہیں۔منتر یہ ہے:۔''پرجاپتی نے کروروں کو تپایا۔جب وہ گرم ہو گئے تو اُس نے اِنکے رس نچوڑے تب اگنی زمین سے۔وایو آکاش سے۔سورج دیو کرۂ ہوائی سے پیدا ہوئے۔تب ان دیوتاؤں (اگنی۔وایو۔سورج) کو بنایا۔جب وہ گرم ہوئے تو اس نے (پرجاپتی نے) اِنکے رس نچوڑے۔تب ''رگ'' اگنی سے۔''یجو (یجر)'' ہوا سے۔اور ''سام'' سورج سے نکلے''۔اس منتر سے معلوم ہوتا ہے۔کہ وید تین ہیں اور یہ آگ۔ہوا۔اور سورج سے نکلے ہیں۔اور انہیں سے وید کی

---

[۱] جیسے انجیل چار کتابوں پر مشتمل ہے۔

نسبت ہے۔لیکن یہ بات بھی مشتبہ ہے کہ آگ ہوا۔سورج سے یہ الہام کیسے ظاہر ہوتے ہیں؟۔

ہندو کہتے ہیں کہ یہ رِشیوں کے نام ہیں۔لیکن اسکے لئے نہ وید میں کوئی الہامی شناخت ہے نہ اِنکے پیروؤں سے کوئی دلیل ملتی ہے۔نہ ہی یہ چیز ویدوں کے الہامی ہونے کی دلیل ہوسکتی ہے۔کیونکہ سوائے پیغمبر کے رِشیوں کے نام سے کوئی کتاب الہامی نہیں ہوسکتی ہے البتہ یہ چیز ثابت ہوتی ہے۔کہ وید کی زبان سنسکرت ہے۔جو بہت مشکل ہے۔کہ ہر شخص اس پر عبور حاصل نہیں کرسکا اور مخصوص رِشیوں نے اسکی شرح (ترجمہ) کی ہے۔چنانچہ مختلف ۳۲ کتابوں کا وید کے نام سے مشہور ہونے کا سبب یہی ہوسکتا ہے۔کہ ہر رِشی نے ایک شرح لکھی ہو اور وہ کتاب بھی اسی کے نام سے منسوب کی گئی ہو۔پھر بھی وید کے الہامی ہونے کیلئے ایک پیغمبر کے نام کی ضرورت رہ جاتی ہے۔جسکا کوئی ثبوت نہیں مل سکتا۔ان واقعات کی بناً پر اس مذہب کی ابتدأ ــــ پیغمبر کی نسبت اور الہامی کتاب کا اصل علم کسی طرح بھی صحیح ثابت نہیں ہوسکتا۔

دیگر مذاہب میں ایک قوم۔ایک پیغمبر۔ایک الہامی کتاب ان تینوں باتوں کی ایک دوسرے سے نسبت معلوم ہو جاتی ہے۔جس سے مذہب کی اصلیت اور علم کی اصلیت کا اقرار لازمی ہو جاتا ہے۔برعکس اسکے ہندو مذہب ان تینوں باتوں سے خالی ہے۔کہ ہندو مذہب کی بناً کس پیغمبر سے ہوئی۔اور پیغمبر کو کون سی کتاب ملی۔اور وید اگرچہ الہامی کتاب ہے۔تو اسکی الہامی حیثیت کس پیغمبر سے نسبت ہونے کے ذریعہ محکم و مستقل ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ہی خود ہندوؤں کے عقائد کے مطابق اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔یعنی ایک طرف ہندو کہتے ہیں کہ یہ کتاب چار رِشیوں سے نسبت رکھتی ہے۔دوسری طرف خود اسکے رِشی (منو جی مہاراج) اسے آگ ہوا سورج کی پیدائش ثابت کرتے ہیں۔اور تیسری بات انکی تعداد میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ان متضاد واقعات سے اس مذہب کی اصلیت اسکی اصل تعلیم اور الہامی ہونا کسی طرح بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سب ہندو متفقہ طور پر وید کو الہامی بتاتے ہیں۔لیکن ہندو مذہب کے اکثر محقق اور

شارح (علماً) اور رِشی بھی اسے غیر الہامی بتاتے ہیں۔اوران محققین کے اقوال بھی آپس میں تضاد رکھتے ہیں جس سے وید کی الہامی تعلیم بالکل مبالغہ بن کر یہ مذہب ہی ایک گورکھ دھندا بن جاتا ہے۔منو جی چار رِشیوں کے مقابلہ میں تین بتاتے ہیں۔اور وہ بھی انسان نہیں بلکہ آگ ہوا اور سورج۔لیکن نیائے درشن کا مصنف ''گوتم'' جو ہندوؤں کا ایک بڑا محقق ہے۔کہتا ہے۔کہ وید الہامی کتاب نہیں۔بلکہ انسان کا خود ساختہ کلام ہے۔گوتم ہندو مذہب میں ایک رِشی کا درجہ رکھتا ہے۔چنانچہ اسکا شاستر وید کے چھ شاستروں میں سے ایک ہے۔اوران ہر چھ شاستروں کو سب ہندو تسلیم کرتے ہیں۔

تانڈیہ برہمن بھی وید کو انسانی کلام بتاتا ہے۔چنانچہ اسکی تصنیف کے ایک منتر سے معلوم ہوتا ہے کہ وید خود ساختہ ہے۔منتر: چھوٹی عمر کا انگ رس منتر بنانے والوں کا بھی منتر بنانے والا ہوا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگرہ رِشی ہے جس نے منتر بنایا ہے۔

پاسک مُنی ویدک الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے رگ وید کے دسویں منڈل کا پہلا منتر لکھتے ہیں :۔'' کافی ہوادار اور کالری زمین میں پیدا ہوئے ہوئے پھل جو قمار بازی میں استعمال ہوتے ہیں مجھے مست کرتے ہیں۔اور بیدار کرنے والے پاسا منجواں پہاڑ پر ہونے والی سوم کی غذا کی طرح مجھے حوصلہ دلاتا ہے'' (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۳۴)۔انکا دوسرا منتر:۔'' یہ منتر پاپوں سے پریشان ہوئے ہوئے رِشی کے ہیں'' (ادھیائے نمبر ۹ کھنڈت نمبر ۸ سوکت نمبر ۱۰) اسکے علاوہ وید کے لکھے ہوئے منتروں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔کہ وید رِشیوں کی لکھی ہوئی کلام ہے۔لکھا ہے۔'' کنور رِشی تمہارے لئے منتر کو بناتے ہیں انکے شبد بانی کو اچھی طرح سنئے'' (رگ وید۔منڈل نمبر ا سوکت نمبر ۴۷ منتر نمبر ۲) ایک منتر سے کسی اور کی نسبت ظاہر ہوتی ہے:۔ ''اسے گھوڑوں کو جوتنیوالے اندر گوتم مہاراج کی سنتان (اولاد) نے تیرے لئے من کو صاف اور پوتر (پاک) کرنے والے۔کانوں کو اچھے لگنے والے منتروں کو بنایا ہے''۔(رگ وید۔منڈل نمبر ۱۰۔سوکت ۶۱۔منتر ۱۶) اس سے ظاہر ہوتا ہے۔کہ وید کو مختلف زمانوں میں مختلف رِشی اور فضلا وعلماً وقت کی

نوعیت کے مطابق لکھتے [1] رہے ہیں۔

ہندو مذہب زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔معلوم ہوتا ہے۔ان میں بھی ہادی (ہدایت کرنے والے پیغمبر) آتے رہے اور انہوں نے اس قوم کو احکام الٰہی سے آگاہ کیا۔لیکن انکے ساتھ کوئی الہامی کتاب نہیں آئی۔جیسے دیگر غیر معروف پیغمبر آئے۔انہیں ہادیوں میں کرشن۔ رامچند رجی اور دیگر مخصوص رِشی شمار ہوتے ہیں۔گویا ان پیغمبروں کی حیثیت بھی رِشیوں جیسی ہوتی ہے۔جو ایک الہامی تحریک کے تحت قوانین فطرت کا مطالعہ کر کے ایک الہام کی صورت میں صحیح نتائج پا لیتے ہیں۔اور اپنی قوم کے ناقص اعمال کی اصلاح کرتے رہتے ہیں۔انکے نظریات و اقوال الہامی رنگ میں قوانین فطرت سے مطابقت کرتے ہیں۔چنانچہ انکے اقوال و افعال ہی ایک مذہب کی صورت میں پیش کئے گئے۔

یہ مذہب ہندوستان میں ہی پایا جاتا ہے۔چونکہ اس مذہب میں کسی پیغمبر کی خصوصی نسبت ظاہر نہیں۔اسلئے اسکا نام اسکے قدیمی ملک ہندوستان سے ہی لیا گیا ہے یعنی ہند میں رہنے والی قوم ہندی یا ہندو۔چونکہ اس مذہب کا کوئی پیغمبرانہ نام پایا نہیں جاتا۔لفظ ہندو سے بھی کسی پیغمبر کا نام ظاہر نہیں ہوتا جو لفظ اس مذہب کے لئے مخصوص ہے اسلئے یہ قوم کسی۔خصوصی مذہب سے معروف نہیں۔

زمانہ قدیم میں جبکہ اس ملک (ہندوستان) میں کافی آبادی ہو چکی تھی۔اکثر سرحدوں کے لوگ تجارت کی غرض سے اسطرف آتے تھے تو سرحدی علاقہ میں ان پر ڈاکے پڑتے تھے۔ان تجاروں میں زیادہ تر ایرانی ہوتے تھے۔چنانچہ اس ڈاکہ زنی کے فعل سے انہیں ہندو کہا گیا۔کیونکہ فارسی زبان میں ہندو "چور" کو کہتے ہیں گویا اِنکی دانست میں ایرانی سرحد کے اس پار کے لوگ ہندو (چور) کے نام سے مشہور ہو گئے۔اور جب ایرانی قوموں کا ہندوستان سے آزادانہ رابطہ شروع ہوا۔

---

[1] ماخوذ از رسالہ مولوی رسول نمبر ۱۳۵۸ھ

تو یہ نام عمومی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ جس وجہ سے اس ملک کے لوگوں کو ہندو (چور) کے نام سے ہی پکارا گیا۔ اسکے علاوہ ہندی زبان میں ہندوستان کو بھارت کہتے ہیں یہ نام اسکا قدیمی نام ہے اور بھارت ہی اس ملک کا اصلی نام ہے۔ مگر اس نام کا انکے مذہب سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔

عام مذاہب اپنے بانی کے نام سے ہی مشہور ہیں۔ مثلاً دین ابراہیمی۔ دین موسوی۔ دین عیسوی۔ دین محمدیؐ۔ زرتشتی پارسی۔ دین بدھی وغیرہ لیکن ہندو مذہب کا نام سوائے لفظ ''ہندو'' کے کسی پیغمبر سے نسبت ظاہر نہیں کرتا۔ دوسرے کسی مذہب میں کسی ملک سے اسطرح کی نسبت نہیں پائی جاتی۔ زرتشتی (پارسی) مذہب ایران میں پیدا ہوا مگر پارسیوں کو ایرانی یا ایرانیوں کو پارسیتانی۔ یا موسوی عیسوی کو مصری شامی یا مسلمانوں کو صرف عربی نہیں کہا جاتا۔ ہندو لفظ ہندوستان کی کسی زبان کا لفظ نہیں یہ لفظ فارسی ہے۔ اس سے لفظ ہندو (چور) کی وضاحت آسانی سے ہو سکتی ہے۔ ان حالات کے تحت معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندو مذہب کسی پیغمبر کا مذہب نہیں نہ کسی رِشی کا مذہب ہے۔ بلکہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کا معروف نام ہے۔ اور مذہب خود بخود پیدا ہوا ہے جسکی حقیقت واصلیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس سے واضح ہوتا ہے۔ کہ یہ ایک اختراعی مذہب ہے۔ اور ہندوستان کی مختلف قسم کی آبادیوں کے باہم میل جول سے سوسائٹی یا سماج کی چند نیک نفس ہستیوں (جنہیں رِشی وغیرہ کہتے ہیں) کے اقوال وافعال سے اسکی بنیاد پڑی ہے۔ اس کے سوا ہندو مذہب اور کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

صرف ہندوستان میں اس مذہب کے پائے جانے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مذہب اس قدیم آبادی سے پیدا ہوا۔ جو بیرونی ممالک سے انقلابی حادثات کی وجہ سے ملک چھوڑ کر یہاں مقیم ہوئے۔ چونکہ اُس زمانہ میں۔ مکمل سکونت اور دیگر رہائشی ضروریات کے سامان نہ تھے۔ اکثر لوگ خانہ بدوشی کی حالت میں۔ جنگلوں۔ غاروں میں بسر کرتے تھے۔ جہاں کسی جگہ خطرے کا احساس ہوا۔ وہ جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ مستقر (قیام گاہ) بنالی۔ اسی طرح قدیم زمانہ میں جبکہ لوگ صرف گھاس پات پر ہی زندگی بسر کرتے تھے لوگ نقل مکانی کرتے کرتے یہاں آ کر مقیم

ہونے لگے۔اور اس جگہ رفتہ رفتہ آبادی کا ایک مستقل سلسلہ شروع ہوا۔انہوں نے ایک مخلوط تمدن اور طرز زندگی بھی اختیار کیا۔اور رفتہ رفتہ عروج کی طرف آ کر ایک مستقل مہذب زندگی اختیار کر لی۔اور جوں جوں آبادی مہذب اور متمدن ہونے لگی ضروریات زندگی نے وسعت پائی اور کاروباری سلسلے بھی جاری ہونے لگے۔جوں جوں ضروریات کا اضافہ ہوا۔لوگوں میں۔حصول کا مادہ بھی زیادہ ہونے لگا۔رفتہ رفتہ طاقتور لوگوں نے ناجائز حصول کیلئے اپنی طاقت کو استعمال کرنا شروع کیا۔اور یہ صورت ملوکیت کی شکل اختیار کر گئی۔چونکہ ان لوگوں میں کوئی بنیادی مذہب تھا نہیں۔ضرورت تھی کہ انکی اصلاح کے لئے کوئی پیغمبر پایا جائے۔فطری طور پر انمیں بھی پیغمبروں کا سلسلہ چلا لیکن یہ پیغمبر بھی باقی پیغمبروں کی طرح غیر معروف رہے لیکن اس قوم میں ایک علت لامحدود اور تفکر کیلئے۔ایک تعلیم کو پیش کر گئے۔جس سے اس قوم میں مذہب کا وجود نمودار ہوا — زمانہ کی طوالت اور قوم کی عدم صلاحیت نہ تعلیم کو محفوظ کر سکی نہ ہی پیغمبر کی نسبت کو برقرار رکھ سکی جستجو سے اس قوم میں کسی خاص پیغمبر کی نسبت کا پتہ نہیں لگ سکا۔صرف اس قدر رہا۔کہ اس قوم میں خدا اور اسکے اقرار و انکار کے نقوش پیدا ہو گئے۔

قدیم زمانہ ہونیکی وجہ سے انکے تمدن میں قدامت کا رنگ پایا جانا ضروری تھا۔چنانچہ ہندو تواریخ سے معلوم ہوتا ہے۔کہ ان میں جوں جوں آبادی مستقل ہوتی گئی۔ان میں بھی ملوکیت کا رنگ آتا گیا۔چنانچہ اس قوم میں بہادر۔جنگجو عنصر حکمران ہوتا گیا۔جنہیں راجہ یا مہاراجہ کے نام سے خطاب کیا گیا۔اور ایک مکمل دستور کے مطابق حکمرانی ہونے لگی۔دوسری طرف مذہب نے بھی اپنا رنگ قائم کر لیا۔چونکہ ملک غیر آباد جنگلوں سے بھرا پڑا تھا۔اسلئے ان میں ماحول کے مطابق اثر آنا ضروری تھا۔حکمران طبقہ اکثر وحشی جانوروں کا شکار کرتے رہے۔جس سے ان میں جنگجو یانہ سپرٹ (مواد) ابھرتا رہا۔اور یہ قوم اکثر جنگجو پائی گئی۔دوسری طرف مذہب نے جو نقوش پیدا کئے تھے۔اس سے مذہبی قسم کے لوگ ریاضت و مجاہدہ کی طرف مائل ہو گئے۔گوشہ نشینی اور جنگلوں میں تپسیا (ریاضت و مجاہدہ) کا رواج بھی ماحول کے مطابق پایا گیا۔اور جب ایک ہی جگہ ملوکیت

اور روحانیت کا وجود ہو تو لازمی ہے۔ مذہب ملوکیت میں بھی اثر کر جاتا ہے۔ اسطرح ملوکیت نے بھی مذہب کا رنگ اختیار کر لیا یہی وجہ ہے۔ کہ ہندو مذہب کی گزشتہ تواریخوں میں راجوں مہاراجوں اور انکے جنگی کارناموں کو ہندو مذہب میں عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ گویا یہ جنگی کارنامے بھی مذہب کا ایک جز قرار پائے۔ اور جب مذہب ملوکانہ رنگ اختیار کرے تو لازمی ہے۔ کہ مذہب مخلوط ہیئت اختیار کرتا ہے۔ جنگ و جدل کے کارنامے مذہبی رنگ میں دہرائے جاتے ہیں اور دوسری طرف رِشیوں کا اقتدار بھی روحانی رنگ میں دہرایا جاتا ہے۔ جب حکمران طبقہ بھی مذہب میں شامل ہو جائے تو روحانی طرزوں میں اور بھی جلال پیدا ہوتا ہے۔ اگر حکمران طبقہ صحیح اصول پر ہو تو مذہب صحیح حالت میں پایا جاتا ہے۔ اگر حکمران طبقہ جبر و استبداد کا حامل ہو تو مذہب میں بھی اسکے ساتھ خود غرض عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ جس سے ملوکیت اور روحانیت دونوں ناجائز تسلط قائم رکھنے کیلئے ظالمانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور زمانہ میں انسانیت کیلئے محکومی۔ جبر و استبداد اور ناروا مظالم کے ساتھ ساتھ پیروان مذاہب کے غلط اوہام اور غلط عقائد اور ہوس پرستی کا مادہ زیادہ ہو جاتا ہے۔

چونکہ زمانہ ہر دور میں خود غرض عنصر پیدا کرتا ہے جس سے روحانی فرقہ میں ایسے لوگوں کا وجود پیدا ہو جاتا ہے جو صرف اپنی غرضمندی کا اقتدار چاہتے ہیں اس لئے رِشی قسم کے لوگوں میں اقتدار کی طلب کی وجہ سے خصوصی فرقہ پیدا ہو گیا جنہیں برہمن کہتے ہیں۔ چونکہ انکا تعلق بھی ملوکیت کے ساتھ رہا اسلئے انکے لئے اعزاز میں خصوصیت پائی گئی۔ ملوکیت چونکہ غیر روحانی اثر رکھتی تھی۔ اسلئے براہمنوں کو ان مہاراجوں اور راجاؤں سے کافی مدد ملتی رہی۔ باقی عام مخلوق کے مقابلہ میں براہمنوں کا درجہ اعلےٰ تصور کیا گیا۔ چنانچہ مختلف وقتوں میں مختلف قسم کے شدید احکامات مثلاً انسانوں کی قربانی۔ یا براہمنوں کے متعلق خصوصیات۔ یا عام آدمیوں سے براہمنوں کے متعلق کسی قسم کی زیادتی گناہ تصور کیا جاتا۔ اور انہیں قتل کیا جاتا۔ براہمن اگر کوئی شدید جرم بھی کرے تو اسکا جرم قابل مواخذہ نہیں ہوتا۔ یہ سب برہمنوں کے پیدا کردہ اصول مذہب کا رنگ اختیار کر گئے۔

انسانی قوت کا خاصہ ہے۔ کہ جب بھی انسان کسی قسم کا مجاہدہ شروع کرے۔ دین و مذہب سے علیٰحدہ رہ کر بھی انسان اپنی قوتوں کو روبکار لا کران سے محیر العقول واقعات کا صدور کر سکتا ہے۔ اس میں پاکیزہ اخلاق یا قوانین فطرت کی مطابقت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ انسان میں مادی قوتیں بھی ایسی پائی جاتی ہیں جو اپنے میں بیحد اثر رکھتی ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ ماحول بھی سازگار ہو۔ رِشی قسم کے لوگ تپسیا (مجاہدہ) میں مشغول رہتے رہے۔ کیونکہ انکا کام سوائے روحانی طرز اختیار کرنے کے اور کچھ نہ تھا۔ انکی معمولی کرامات سے بھی لوگ متاثر ہوتے رہے۔ چنانچہ اس قسم کے لوگوں نے جو کچھ بھی کہا اسے الہامی احکام سمجھا گیا۔ اور یہی چیز ایک وقت میں مکمل مذہب کی شکل اختیار کر گئی۔ جس پر ہندو مذہب کی بنأ ہوئی۔ اس دوران میں اگر کسی نے صحیح تعلیم کا اجرأ بھی کیا ہو تو براہمنوں نے اپنی اغراض کے تحت اسے صحیح رنگ میں پھلنے پھولنے نہ دیا۔ بلکہ اس تعلیم کی آڑ میں اپنی غرض مندی من گھڑت خود ساختہ کاروائیوں کو اور بھی مستحکم کر دیا۔

ہندو تواریخ میں ایسے قسم کے اکثر واقعات نظر آتے ہیں جن میں حکمران طبقے کی جنگوں کو مذہب کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً ’’مہا بھارت‘‘ کورو پانڈو کی لڑائی۔ رامچندر جی کا بن باس اور راون سے جنگ جو ’’دسہرا‘‘ کے نام سے مشہور ہے۔ اور دیگر قسم کے براہمنوں کے واقعات جن میں انسانوں کی قربانیاں لی گئیں۔ کسی وقت انکی مخالفت میں بلیدان[1] کی رسم کی مخالفت میں شدید لڑائیاں ہوتی رہیں جس میں براہمنوں کے ساتھ حکومت نے بھی حصہ لیا۔ کرشن مہاراج سے جو جنگیں اور واقعات منسوب کیئے جاتے ہیں یہ بھی انہیں تاثرات کے نتائج ہیں جو قدیم زمانہ کے ماحول سے پیدا ہوتے رہے۔

ہندو مذہب ہمیشہ سے مخلوط مذہب (روحانی حکمرانی) چلا آرہا ہے۔ چونکہ ملوکیت کے ساتھ براہمنوں کا کافی اقتدار رہا اسلیئے کسی روحانی رِشی کے صحیح الہامی احکام کو پیغمبرانہ درجہ دینا کوئی

---

[1] بلیدان۔ قربانی۔ ہندوؤں کا دیوتاؤں کے سامنے چڑھاوا۔ بھینٹ دینا (ناشر)

بڑی بات نہیں۔لیکن مخلوط مذہب ہونے کیوجہ سے ان احکام کو زیادہ دیر رہنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ کیونکہ مخلوط مذہب میں زیادہ تر اثر ان براہمنوں کا رہا ہے۔جو اپنی من مانی کرنے کے ہمیشہ خواہاں رہے۔اور اپنے خود ساختہ من گھڑت عقائد بنا کر لوگوں سے اپنی پوجا کراتے رہے۔ جتنے بھی عقائد ہندو مذہب میں پائے جاتے ہیں اکثر انہیں محافظانِ علم براہمنوں کے اختراع کیئے گئے ہیں ۔مثلاً بتوں کی قسمیں۔شولنگ۔سورج۔ہاتھی۔سانپ۔کنول۔ہزاروں ہاتھ والے دیوتا۔یا کرشن مہاراج کے آٹھ دس ہاتھ۔یا سمندر کی دیوی۔اور دیگر قسم کی دیویاں جنکے آگے بھینٹ چڑھائی جاتی تھی جسکے لئے حکم تھا کہ اس بھینٹ کو صرف براہمن اپنے تصرف میں لاسکتا ہے۔اگر کوئی اور استعمال کرے تو اسکی زبان نکالی جاتی۔اور دیگر قسم کے دیوتا جیسے ہنومان بندر کی شکل والا آدمی جسکی دم لمبی ہے وغیرہ وغیرہ یہ سب اختراعیں براہمنوں کی ہیں تا کہ عوام ان عجیب الخلقت دیوتاؤں سے مرعوب رہیں۔اور کسی کو چوں چرا کرنے کی جرأت نہ ہو بلکہ عقیدت میں ہر قسم کی جانی۔مالی قربانی براہمنوں کے آگے پیش کرنے کو ہر وقت تیار رہیں۔اس قسم کی غیر معقول اختراعیں اسوجہ سے زیادہ مقبول ہوتی رہیں۔ایک تو براہمنوں کا ملوکانہ اقتدار انتہائی جابرانہ صورت اختیار کر چکا تھا۔دوسرے علم الہامی صرف براہمنوں کیلیئے وقف تھا۔اور کسی قسم کی تعلیم رائج نہ تھی بلکہ عوام کا تعلیم حاصل کرنا گناہ تصور کیا جاتا تھا۔لوگ محض علم سے نابلد ہونے کی وجہ سے عقیدہ میں کمزور تھے۔جاہل ہونے کی وجہ سے براہمن کے ہر کلام کو عقیدت کے لحاظ سے خدائی کلام تصور کرتے۔ان میں کسی شخص کو تصدیق کرنے یا سند مانگنے کی نہ جرأت تھی نہ ہی اس قسم کی تمیز تھی کہ وہ کسی معاملہ میں حجت کر سکیں۔یہی وجہ ہے۔کہ براہمنوں کا درجہ اعلیٰ پایا جاتا ہے۔اسکے علاوہ باقی لوگوں میں فرقے پائے جاتے ہیں۔اور اعلیٰ وادنیٰ کی خصوصیت رکھتے ہیں۔مثلاً برہمن۔کھتری یا چھتری (حکمران طبقہ) ویش (عوام میں اعلیٰ طبقہ کے لوگ) شودر (چمار۔بھنگی۔دھوبی۔نائی وغیرہ کا سبی قسم کے لوگ)۔ان میں شودروں کا درجہ حیوانوں سے بھی بر تر سمجھا جاتا ہے۔بلکہ انکے ساتھ جو سلوک کیا جاتا وہ انہیں انسانی درجہ سے بھی گرا چکا تھا۔

براہمنوں کی تعظیم ایک عبادت سمجھی جاتی ہے۔شودر کی ہوا بھی اگر برہمن کو لگے تو شودر واجب القتل ہو جاتا ہے۔گزشتہ زمانوں میں وید کی تعلیم (پڑھنا) صرف براہمنوں کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔شودر کے لئے تو وید کا پڑھنا گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا۔قدیم وید سنسکرت زبان میں لکھی گئی ہے۔اسکی تعلیم بہت مشکل سمجھی جاتی ہے۔اسکی وجہ یہی ہے۔کہ مذہبی تعلیم براہمنوں کیلئے وقف تھی۔تاکہ انکے سوائے کسی دوسرے کا مذہب میں دخل نہ رہے اور کسی کو بھی براہمنوں کے من گھڑت عقائد پر نکتہ چینی کرنے کا موقع نہ مل سکے۔اگر کوئی شودر کسی مقدس کتاب کو ہاتھ لگاتا تو وہ مجرم گردانا جاتا۔شودر جنیو[1] نہیں پہن سکتا۔حالانکہ وہ بھی ہندو کہلاتا تھا۔اور ہندو ہونے کی ایک خصوصی علامت جنیو پہننا ہے۔

زمانہ حاضرہ میں بھی ہندو مذہب کی الہامی کتابوں میں کچھ اس قسم کے عقائد پائے جاتے ہیں۔جن سے معلوم ہوتا ہے۔کہ کسی زمانہ میں اس قوم میں دین الٰہی کی داغ بیل ڈالی گئی ہے۔جسکے اثر سے اس قوم نے مذہب کی شکل پالی۔مگر قومی طرز اور ماحول نے اس قوم میں ایسے غرضمند انسانوں کا وجود پیدا کیا جنہوں نے اپنے اثر سے ہمیشہ صحیح تعلیم کو خود نابود کر کے ایک غیر فطری مذہب بنا ڈالا۔جس سے بجائے اصلاح کے ہمیشہ انسانوں کو گمراہی حاصل ہوئی مثلاً رِشی قسم کے لوگوں کو اسقدر درجہ دینا کہ اِنکی مورتیاں بنا کر پرستش کرنی اور عبادت گاہوں میں نصب کرنا۔ادنیٰ مخلوق۔ہاتھی۔بندر۔گائے۔مور۔سورج کے بت بنا کر اِنکی پرستش کرنا یہ سب طریق خلاف قوانین فطرت پائے جاتے ہیں۔پھر انکی تعلیم میں کچھ اس قسم کے اصول (منتر) پائے جاتے ہیں جو غیر مہذب اور اخلاق سے بعید ہیں مثلاً منتر۔پاسک منی کے الفاظ۔یہ منتر پاپوں سے پریشان ہو کر لکھے ہیں (سوکت ادھیائے ۹۔کھنڈت ۸)۔منتر دیہی پاسک منی کہتا ہے۔کہ قمار بازی[2] میں استعمال ہوئے پھل مجھے مست کرتے ہیں۔(رگ وید منڈل ۱۰۔سوکت ۳۴)

---

[1] زنار۔وہ بٹا ہوا دھاگا جسے ہندو لوگ گلے یا کمر میں ڈالے رہتے ہیں۔(ناشر) [2] جوا

ویدوں میں خدا کا حلیہ:- ''دن اور رات ایشور کی دو بغلیں ہیں۔سورج اور چاند اسکی دو آنکھیں ہیں سورج کی دھوپ اور بجلی کی چمک یہ دونوں ایشور (خدا) کے ہونٹ ہیں سورج اور چاند کے درمیان جو پول ہے وہ ایشور کا منہ ہے'' (رگوید آدی بھاشا بھولکا۔اشاعت اول ص ۱۳۵) دوسرا منتر: اے اندر دولتوں سے مالا مال پرمیشور (خدا) ہم سے الگ کبھی مت ہو اور ہمارے مرغوب سامان خوراک مت چرا اور مت چروا (رگوید اشٹک منڈل نمبر ۷ سوکت ۱۹۔منتر نمبر ۸)۔

اب برہمن کا کلام سنئے:- ہمارے گھر مدائن (اسقاط حمل) نہ کرنا۔پرماتمانے کشٹ (تکلیف) اٹھا کر سوشٹی کو پیدا کیا (گوپت برہمن ادھیائے امنتر نمبر ۲ یجروید ۶/۱۴)

اب ایشور کا الٰہی کلام ملاحظہ ہو:- اے بیاہے ہوئے مرد عورتو! تم دونوں رات کو کہاں ٹھہرے تھے۔اور دن کہاں بسر کیا تھا؟ تم نے کھانا وغیرہ کہاں سے کھایا۔تمہارا وطن کہاں ہے۔جس طرح بیوہ عورت اپنے دیور کے ساتھ شب باش ہوتی ہے۔یا جس طرح بیاہا ہوا مرد اپنی بیاہتا کے ساتھ اولاد کیلئے یکجا شب باش (ہمبستر) ہوتا ہے اسی طرح تم کہاں شب باش رہے۔(رگوید۔آدی بھاشا بھولکا اردو ص ۱۲۵) اسکے علاوہ سوجی مہاراج کے عضو مخصوص (شولنگ) کا بت بنا کر انکی خصوصی عبادت ہے وغیرہ وغیرہ۔یہ چیزیں عمومی (مادی) حیثیت سے بھی خلاف تہذیب اور مخرب اخلاق ہیں۔تہواروں[1] میں۔قمار بازی (جوا) شراب کا عام استعمال۔ایک عورت کو بیوہ ہونے کے بعد خاوند کرنے کی اجازت نہیں۔لیکن وہ دس مردوں سے اپنی خواہشات نفسانی کو ٹھنڈا کرسکتی ہے۔ایک بیاہتا بیوی اولاد نہ ہونے کی صورت میں دس مردوں سے اولاد حاصل کرسکتی ہے وغیرہ اس قسم کی تعلیم سے تمام وید کی کتابیں پُر ہیں۔

ان حالات سے پتہ چلتا ہے۔کہ جس مذہب میں سوائے برہمنوں کے اور کسی انسان کو بھی سوائے ایک موہوم عقیدہ رکھنے کے تفکر کرنے کیلئے موقع نہ دیا جائے اور مذہب کی تعلیم بھی اس قسم کی تعلیم ہو جسکو ایک مہذب اور با اخلاق انسان پڑھنے سے بھی شرمائے۔اس میں نہ کسی خصوصی

[1] مقدس دن

الہامی تعلیم کا مواد ہو نہ کسی پیغمبر سے نسبت ظاہر ہوتی ہو وہ مذہب انسانیت کی اصلاح کے لئے گمراہ کن ہی ہوسکتا ہے۔

ایک نامور فاضل پنڈت گرو پرشاد سین نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے۔ ''ہندو دھرم کوئی مذہب نہیں ہے۔ نہ اب ہے نہ پہلے تھا۔ وہ تو بالکل ایک سوسائٹی یا ایک نظام جو ہندوؤں پر سوسائٹی کی کچھ رسمیں پوری کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس میں مذہبی معیار کی کوئی سند نہیں۔ خدا کو ماننے نہ ماننے والے دونوں ہندو کہلاتے ہیں۔ دو متفرق عقیدوں میں مختلف نظریات میں تضاد رکھنے والے دونوں ہندو کہلاتے ہیں۔ وغیرہ'' اس صورت میں ہندو مذہب سرے سے الہامی مذہب نہیں کہلاتا اسلئے ہندو مذہب میں کوئی تعلیم ہی ایسی نہیں پائی جاتی جو انسان کی راہنمائی میں کارآمد ہو سکے۔

بدھ مت: بدھ مت کی ابتدا بھی ہندوستان سے ہی ہوئی۔ اس مذہب کے بانی مہاتما گوتم ہیں۔ جنہیں بدھ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک شاہی خاندان کا فرد تھا۔ اور چھتری (ہندو) خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ انکی حکومت نیپال سے دریا گنگا تک پھیلی ہوئی تھی۔ جسکا دارالخلافہ کپل وستو تھا اس حکومت کا راجہ شدودھن نامی تھا۔

گوتم نام اسکے ننہال والوں سے تھا۔ اسکا اصل نام سدارتھ تھا۔ ابتدائی عمر میں گوتم نے راجکماروں کی طرح محلات شاہی میں پرورش پائی۔ شاہی انداز سے اسے ہر قسم کے عیش و عشرت مہیا تھے۔ اور بڑے بڑے استاد و علماً سے تعلیم۔ فن سپاہگری اور ہر قسم کے فن سے آراستہ ہوا۔ لیکن گوتم کی فطرت میں شروع سے تنہائی اور خاموشی پائی گئی۔ اکثر تنہائی میں ایک قسم کی محویت طاری رہتی تھی۔ باوجود ہر قسم عیش و سرود کے بھی گوتم ان مشاغل سے متاثر نہ ہوتا۔ چنانچہ بیس برس کی عمر کے بعد چند ایک ایسے واقعات پیش آئے کہ شاہی عیش ونشاط ترک کرنے کا ارادہ کرلیا۔ گوتم نہایت حساس اور رقیق القلب تھے۔ ہر تکلیف دہ واقعات سے فوراً متاثر ہوتے تھے۔ اکثر آتے جاتے کمزور زخمی جانوروں پر بیجا ظلم۔ بوڑھوں بیماروں کی زبوں حالت دیکھکر دنیا سے نفرت ہونے لگی۔ ایک روز ایک پرندہ کو راستہ میں تڑپتے دیکھا بہت متاثر ہوئے۔ ایک ارتھی (مردہ) لوگوں کو

لے جاتے دیکھی تو زندگی کے انجام اور دنیوی مشاغل کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آیا۔دل برداشتہ ہوگئے کہ دنیا سراسر غم وآلام کا گہوارہ ہے۔

ایک روز چند جوگیوں (دنیا سے لاتعلق روحانی قسم کے لوگ) کو گیروے کپڑے پہنے دیکھا۔معلوم ہوا کہ یہ جنگلوں میں جا کر رہتے ہیں۔اور تپسیا کرتے ہیں۔اور دنیوی غم وتکالیف سے آزاد و بے پرواہ ہیں۔ان مناظر سے متاثر ہوکر گوتم نے دنیا ترک کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ راجہ کو اسکے خیالات کا پتہ چلا اس نے گوتم کو ان خیالات سے باز رہنے کی بہت کوشش کی اور محل شاہی میں ہر قسم کے عیش وسرود کے سامان اسکے سامنے لائے مگر گوتم دن بدن ان سے زیادہ متنفر ہوتا رہا۔آخر ایک دن ۔رات کی خاموشی میں گوتم اپنے خورد سالہ بچے اور بیوی کو بیخبر سوتے چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل گیا۔کافی تلاش کے بعد بھی گوتم کا پتہ نہ ملا۔گوتم کچھ عرصہ جنگلوں میں رہ کر فاقہ کشی اور تپسیا کرتا رہا۔مگر اطمینان حاصل نہ ہوا۔آخر دوبارہ مگدھ راج کے دارالحکومت میں آئے یہاں بڑے بڑے پنڈتوں سے شاستر پڑھا۔لیکن نہ جنگلوں کی تپسیا سے سکون ملا نہ شاستروں کی تعلیم سے تسلی پائی۔آخر آپنے دوبارہ جنگلوں کی طرف رخ کیا۔اور اچاریہ اورک کے پانچ چیلوں کو (جو اسی طرح دنیا چھوڑ چکے تھے) ساتھ لیکر چھ سال تک برابر جنگلوں میں ریاضت (مجاہدہ) کرتے رہے۔ یہاں تک کہ گوتم کی انسانی خاصیتوں کو فاقہ کشی اور یکسوئی سے جلا پیدا ہوئی اور روحانی کیفیات کا مشاہدہ ہونے لگا۔گوتم نے اپنے وجود کی جواہراتی خاصیتوں سے محیر العقول حالات کا مشاہدہ کیا۔ جب مشاہدہ میں کافی ترقی ہوئی تو لوگوں کی اصلاح کی طرف مائل ہوئے۔چنانچہ آپنے بنارس کا رخ کیا۔جنگلوں میں مجاہدہ کے دوران میں پانچ چیلے بھاگ کر بنارس آگئے تھے۔یہاں پہنچکر پہلے انہیں تلقین کی اور اپنے ساتھ ملالیا۔

یہاں سے گوتم کے مذہب کی ابتدا ہوئی۔گوتم نے حالات زمانہ کے واقعات سے متاثر ہوکر دنیا ترک کی ریاضت ومشاہدہ سے حقیقت کی جھلک پائی۔دنیا میں جو قباحتیں پائیں لوگوں میں اِنکے دور کرنے کی کوشش کی۔گویا یہ طریق پیغمبرانہ حیثیت سے نہ تھا۔بلکہ عمومی حیثیت سے ایسے

واقعات انسانوں سے رونما ہوتے ہیں۔ گویا ہر فرد کے لئے یہ طریق مجاہدہ لازمی ہے۔ گوتم نے بھی اسی طرح انسانی فرد کی حیثیت سے اپنے نصب العین کی طرف رجوع کیا۔ اور ایک خصوصی (راہنمایانہ) درجہ حاصل کیا۔ گو اس طرز کی نوعیت ایک علیحدہ قسم کی تھی تاہم یہ طریق بھی انسانی ترقی وعروج کیلئے مفید ہوسکتا ہے۔

گوتم بدھ سے پہلے آرین مذہب جاری تھا۔ اور اسی مذہب کے اصول۔ اور زمانہ کی تنزلی کیفیات سے متاثر ہو کر گوتم نے ایک نئی راہ پیدا کرلی۔ گوتم کیلئے آرین مذہب کے من گھڑت عقائد ہی ایک نئی راہ کے اسباب بنے۔ اسوقت آرین مذہب میں۔ کوئی صحیح تعلیم نہ تھی۔ حکومت کے ساتھ پنڈتوں براہمنوں کی حکمرانی تھی۔ کم مایہ لوگ محکوم اور خستہ حالت میں تھے۔ کسی فرد میں احساس نہ تھا۔ ظلم و استبداد کا زمانہ تھا۔ سب سے زیادہ براہمنوں کے من گھڑت افسانوں اور خودغرضیوں کا دور دورہ تھا۔ جس سے عوام میں جہالت اور مقصد سے کوتاہی پائی جاتی تھی۔ یہ سب چیز گوتم کیلئے قابل نفرت تھی۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے بنیادی چیزوں کی مخالفت کی۔ کمزوروں پر ناجائز تسلط کی مخالفت میں آواز اٹھائی۔ کہ جانوروں کو تکلیف نہ دو۔ کسی کو بلا وجہ قتل نہ کرو۔ کسی پر جبر نہ کرو۔ ہر شخص مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلئے کسی کی کسی پر ناجائز حکمرانی نہ ہو۔ اعلیٰ و ادنیٰ کی کوئی تمیز نہیں۔ دنیوی معاملات میں اعتدال اختیار کرو۔ زیادہ تر ریاضت و مجاہدہ کرو تاکہ تفکر کی راہ استوار ہو سکے۔ یہ سب احکام گوتم کی ذاتی اختراع تھیں۔ جو دنیا کے واقعات سے متاثر ہو کر انکے رد میں پیش کی تھیں۔ چونکہ اس نئے مذہب میں چند نئے اصول پیدا کئے گئے خصوصاً کمزوروں اور کم مایہ انسانوں کی حمایت تھی اسلئے جبر و استبداد سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کا اسطرف خود بخود رجوع ہوا۔ اور لوگ جوق در جوق اس مذہب کو قبول کرنے لگے۔ پنڈتوں براہمنوں نے اسکی شدید مخالفت کی کیونکہ ان عقائد سے انکا اقتدار خطرے میں پڑتا تھا۔ لیکن مخالفت میں چنداں کامیابی نہ ہوسکی کیونکہ یہ مذہب ہر شخص کے دلپسند تھا۔ آپنے زیادہ تر چماروں۔ بھنگیوں۔ دھوبیوں اور کسبی قسم کے لوگوں سے زیادہ میل جول رکھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ شودر فرقہ کے

لوگ سب اس مذہب میں شامل ہو گئے اور اپنی عزت ونجات اسی مذہب میں سمجھی۔ گوتم نے تبلیغ کرنے کے ساتھ ہی ملوکیت کی حمایت حاصل کی۔ جنگلوں سے نکلکر پہلے بنارس پہنچے اور بنارس کے ایک باغ میں انکی پہلی تقریر ہوئی جو بہت کامیاب رہی۔ اسکے ساتھ ہی راجہ مگدھ نے بھی بدھ مذہب اختیار کیا۔ جب گوتم کے والد کو اسکا علم ہوا۔ تو اس نے گوتم کو اپنی راجدھانی میں بلایا۔ گوتم اپنے فقیرانہ انداز میں ننگے پاؤں گیروے کپڑے پہن کر بھیک مانگتا ہوا۔ اپنے آبائی ملک میں داخل ہوا۔ لوگوں پر راجکمار کی اس فقیرانہ ہیئت کا کافی اثر ہوا۔ اور لوگ جوق در جوق بدھ مذہب میں شامل ہوئے آخر شدودہن نے بھی اس حالت سے متاثر ہوکر بدھ مذہب اختیار کیا۔ ممکن تھا۔ کہ ایسے وقت میں جبکہ ہندو مذہب ہندو راجاؤں اور جابر براہمنوں کے ہاتھ میں تھا۔ گوتم جیسے جوگی کی کچھ بن نہ پڑتی۔ لیکن گوتم کو اپنے ابتدائی قدم پر ہی ملوکیت کی حمایت حاصل ہوئی اسلئے اس مذہب کو پھیلنے میں روکاوٹ نہ ہوئی دوسرے اسکے اصول بھی عام لوگوں کے حسب دلخواہ تھے اور خود گوتم کی تقریریں بھی روشن قلب ہونے کی وجہ سے متاثر کرنے والی تھیں اسلئے گوتم کو حد درجہ کامیابی حاصل ہوئی۔

گوتم حقیقتاً دنیا کے عظیم الشان پیشواؤں میں سے گزرے ہیں۔ آپکے مرنے کے بعد اس مذہب کو بیحد ترقی ہوئی۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ سرحدیں عبور کر کے افغانستان سے لیکر تبت و چین تک یہ مذہب پھیلا۔ اشوک اعظم کے عہد حکومت میں تو اس مذہب کا ستارہ بام عروج پر تھا۔ اشوک موریہ خاندان کے فرمانرواؤں میں سب سے بڑا اقبال مند اور مشہور فرمانروا گزرا ہے۔ یہ چندر گپت کا پوتا تھا۔ جسکی حکومت کی حد کابل قندھار سے لیکر میسور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اشوک نہایت مدبر۔ منصف۔ عادل اور زبردست سپہ سالار تھا۔ آٹھ نو سال کے بعد اُس نے بدھ مذہب اختیار کر کے گیروا لباس پہن لیا اور بدھ مذہب کا پورا مبلغ بن گیا۔ اس طرح بدھ دھرم مکمل راج دھرم بن گیا۔ اشوک نے پوری قوت کے ساتھ بدھ مذہب کو پھیلایا۔ اور ہر ملک میں اپنے مبلغ بھیجد یئے۔ اشوک نے بدھ مذہب کے اصول لاٹوں پر کندہ کرا کر جگہ جگہ ہر اطراف میں نصب

کرائے جن میں سے آج بھی ہندوستان کی اکثر جگہوں پر ایسے نصب شدہ لاٹ پائے جاتے ہیں۔ یہ لاٹ اسی عہد کی ایک عظیم الشان مجلس میں بدھ دھرم کے اصول طے ہوکر پالی زبان میں کندہ کرائے گئے تھے۔ چنانچہ اسی عہد میں کشمیر۔ قندھار۔ تبت۔ برما اور سیلون تک مبلغ بھیجے گئے جنہوں نے ہر ملک میں بدھ مذہب کی تبلیغ کی۔ ان لاٹوں پر کندہ شدہ اصول یہ تھے۔ کہ ''گرو کی عزت کرو۔ ماں باپ کا کہنا مانو۔ ہمیشہ سچ بولو۔ جانداروں پر ترس کھاؤ'' خاص بات یہ ہے۔ کہ اشوک ہر مذہب کے عالموں کی عزت کرتا تھا۔ اور اسکے عہد میں کسی مذہب کو برا کہنا جرم تھا۔ یہ اشوک ہی تھا جس نے بدھ مذہب کو اس عہد کا سب سے بڑا مذہب بنا کر اسے دور دور تک پہنچایا۔ تھانیسر کے راجہ ہرش نے بھی بعد کو بدھ مذہب اختیار کر کے اسے بہت ترقی دی۔

الغرض بدھ مذہب ہندوستان کا سب سے بڑا مذہب بن چکا تھا۔ اسکے مقابل ہندو دھرم نام کا رہ گیا تھا۔ وہ بھی صرف ان پنڈتوں اور براہمنوں میں رہ گیا تھا۔ جنکے اقتدار کو بدھ مذہب کی ترقی کے باعث نقصان پہنچا تھا۔ لیکن ہندوستان میں اسوقت انکی کوئی وقعت باقی نہ رہی تھی۔ اعلیٰ وادنیٰ کی تمیز بدھ مذہب کی وجہ سے ختم ہو چکی تھی جسوجہ سے برہمنوں اور راجاؤں کا وقار بالکل ختم ہو چکا تھا۔ قومی ملکی زبان بھی بجائے سنسکرت کے پالی زبان ہو چکی تھی۔ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق بدھ مذہب کے اصولوں پر کھلے دل سے کاربند تھا۔

راجہ اشوک نے اس طنطنہ سے حکومت کی اور بدھ مذہب کو پھیلایا۔ کہ پانچ چھ سو سال تک اس حکومت کا اثر و اقتدار بدستور قائم رہا اسی طرح بدھ مذہب بھی اپنی شان میں قائم رہا۔ اور ہندوستان کے چاروں طرف بلخ۔ بدخشاں۔ قندھار۔ کابل۔ کشمیر۔ برما۔ آسام۔ چین و بنگال و میسور تک اس مذہب کی اشاعت ہوئی۔ اس مذہب کی ایک خصوصیت تھی۔ کہ غیر مذہب کے عالموں کی عزت کرتے رہے۔ اور کسی مذہب کی مخالفت نہیں کی۔ جب تک اس مذہب کا ملوکانہ اقتدار قائم رہا۔ اسوقت تک تو یہ مذہب بھی قائم رہا۔ کسی مخالف کو اسکی مخالفت کا موقع نہ مل سکا لیکن ہر مذہب کو آخر خود غرض عنصر کی ہوس رانی ہی کم مایہ کر دیتی ہے۔ اور ہر مذہب میں اپنے اقتدار پر

اس قسم کا عنصر پیدا ہوتا رہا۔ اس طویل عرصہ میں بدھ مذہب میں بھی کئی قسم کے نقائص پیدا ہو گئے۔ اس کے اصولوں کی خلاف ورزی ہونے لگی۔ غرض پرست لوگوں نے گوتم کے بت بنا کر پوجنے شروع کر دیئے۔ اور کئی قسم کے خود ساختہ اصول اور بت بنا کر سامنے کر دیئے۔ تا کہ اِنکی اغراض انہیں بتوں کی آڑ میں پوری ہو سکیں۔ ان میں بھی ایک فرقہ خصوصی پایا جاتا ہے۔ جو بدھوں کے عالم مانے جاتے ہیں۔ انہیں ''پھونگی'' کے خطاب سے پکارا جاتا ہے یہ فرقہ نہایت آرام طلب بیکار لوگوں کا ہے۔ آج بھی انکی عزت واحترام مثل براہمنوں کے کیا جاتا ہے۔ انکے لئے اعلیٰ قسم کی غذائیں اور اعلیٰ ساز وسامان (فرنیچر وغیرہ) سے مزین عمارتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ یہ لوگ جوگیوں کے لباس میں گوتم بدھ کی شبیہ پر بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس مذہب میں بھی تصنع اور افراط وتفریط پیدا ہوئی اور یہ مذہب بھی اپنی اصل تعلیم (بدھی اصول) قائم نہ رکھ سکا۔ دوسری بات اسکی تنزل کی یہ تھی کہ انہوں نے غیر مذاہب پر کسی قسم کی دست درازی نہ کی بلکہ ہر عالم کا احترام کیا۔ جس سے غیر مذہب مواد بھی بدستور جاری رہا جوں ہی اس مذہب میں خامیاں آنے لگیں ہندو مذہب نے بھی ابھرنے کی کوشش کی۔

ہندوؤں میں راجہ بکرماجیت بدھ کے پانچ سو سال بعد پیدا ہوئے۔ انہوں نے ہندو مذہب کی خستہ حالی دیکھکر اشوک کی طرح اسے عروج دینے کی کوشش کی۔ یہ راجہ نہایت جری بہادر اور مدبر سیاستدان تھا۔ اسکی حکومت نے بھی کافی وسعت حاصل کرلی۔ براہمنوں کے لئے یہ نادر موقع تھا۔ انہوں نے راجہ کی معاونت سے ایک ملوکانہ حیثیت میں پھرا بھرنا شروع کیا۔ ہر جگہ تبلیغ شروع کی اور حکومت کی حمایت میں ہر ملک میں اپنا تسلط جمانا شروع کیا۔ بدھ مذہب کے عروج میں براہمنوں نے اتنا فائدہ اٹھایا کہ انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا نہ ہی ان کے مندروں کو گرایا گیا۔ باقی مذاہب کو جب بھی ملوکیت کی پشت پناہی ملی انہوں نے مخالف مذہب کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ہر مذہب کا آخری انجام اسی طرح تباہ کن رہا برعکس اسکے بدھ مذہب کا سب سے بڑے حکمران راجہ اشوک نے بدھ مت کے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے ہر مذہب کا احترام کیا

یہی وجہ تھی کہ بدھ مذہب کے ساتھ ساتھ ہندو (ویشنو مت) مذہب بھی برقرار رہا۔اسی مذہب سے بکرماجیت بھی تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے اپنے اقتدار کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کی دوبارہ اشاعت کی۔راجہ خود بھی فاضل اور سنسکرت کا بڑا ماہر تھا چنانچہ اس نے دوبارہ پالی زبان کی جگہ سنسکرت زبان کو رائج کیا۔اور خود بھی فاضل ہونے کیوجہ سے تبلیغ شروع کی۔اسکے دربار کے نورتن مشہور ہیں۔جن میں مشہور شاعر کالیداس اسی دربار کا ایک رکن تھا۔چونکہ ہندو مذہب کو بکرماجیت کے زمانہ میں نئی زندگی حاصل ہوئی۔اسلئے ہندو سال کا آغاز سنہ بکرمی اسی فرمانروا کی حکومت سے شروع ہوتا ہے۔اور بکرماجیت ہندو مذہب میں ایک اوتار کی سی حیثیت رکھتا ہے۔اسکے بعد شنکر اچاریہ ملیبار میں پیدا ہوئے۔یہ بھی اچھا خاصا ہندو عالم تھا۔اس نے بھی ہندو مذہب کی اشاعت میں بیحد کوشش کی اسکی معیت میں بھی چند راجے ہوگئے جسکی وجہ سے شنکراچاریہ کی تبلیغی سعی بہت حد تک کامیاب رہی اسوقت بدھ مذہب کو ڈیڑھ ہزار سال کے قریب عرصہ گزرا تھا۔اور انکی حالت خستہ ہوچکی تھی۔شنکراچاریہ نے انکا رہا سہا اقتدار ختم کرکے ہندوستان سے اس مذہب کو ختم کردیا اور بدھ مت کے زوال کے بعد ہندو مذہب کو پھر ابھرنے کا موقع ملا۔ہندو مذہب کی ترقی کے باعث بدھ مذہب کا ملوکانہ اور عالمگیر اقتدار کم ہوتا گیا اور آخر یہ مذہب مختلف ممالک میں منتشر حالت میں منقسم ہوگیا۔چنانچہ آج بھی ہندوستان اور اسکے ہر اطراف میں بدھ مذہب کے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔لیکن یہ لوگ برائے نام بدھ ہیں ان میں نہ وہ اصول موجود ہے نہ وہ روحانی سپرٹ موجود ہے۔بلکہ ان میں بھی خلاف اصول بت پرستی اور من گھڑت افسانے پائے جاتے ہیں۔یہ مذہب بھی زمانہ کے طلاطم میں گھر کر اپنی اصلیت کھو چکا ہے۔چونکہ اس مذہب میں گوتم نے دنیوی حالات سے متاثر ہوکر چند ذاتی نظریئے قائم کرکے ایک مذہب کی بنا ڈالی۔اسلئے اس مذہب کی بنیاد بھی ہندو مذہب پر ہی قائم ہوئی ہے۔اس مذہب میں اور ہندو مذہب میں چند اصولوں کا فرق رہا ہے۔اس میں کوئی خصوصی الہامی تعلیم نہیں پائی جاتی۔

ہر مذہب کی خصوصیت پیغمبر اور اسکے منجانب اللہ کلام الٰہی سے پائی جاتی ہے۔اسکے بغیر

اگر کسی مذہب کے رِشی یا کوئی خاص ہستی چند ذاتی اصول اختراع کر کے ایک مذہب کی بنیاد ڈالدے اس مذہب کی خصوصیت قابل قبول نہیں ہو سکتی ۔ ہندو مذہب اور بدھ مذہب میں ۔ کسی پیغمبر کی خصوصیت یا صحیح کلام الٰہی نہیں پائی جاتی اسلیئے یہ مذہب بھی تفکر اور علت لامحدود کے تجسس و پہچان کیلیئے اپنے میں کوئی ٹھوس مواد نہیں رکھتا۔ان ہر دو مذاہب سے تکمیل انسانی کے نصب العین کیلیئے کوئی تعلیم حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

مذکورہ ادیان مذاہب میں سے جنکا گزشتہ ذکر کیا جا چکا ہے۔انکی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں پیغمبر آئے اصلاح کی مگر زمانہ کی طوالت اور انسانی فطری کمزوریوں کے باعث کسی مذہب میں بھی صحیح تعلیم اپنی اصلی حالت میں نہ رہ سکی۔ بلکہ بالکل مفقود ہو چکی ہے جب انکی اصلی تعلیم کا وجود (جسکا تعلق الہامی تعلیم سے ہے) نہ پایا جائے ۔ایسی صورت میں من گھڑت نظریات سے صحیح نصب العین میں راہنمائی حاصل کرنی ان مذاہب سے ناممکن ہو جاتی ہے۔

ان عام مذاہب میں جتنے بھی فرقے پائے جاتے ہیں۔ان میں ایک علت لامحدود (خدا) کے وجود پر بحث ضرور پائی جاتی ہے۔لیکن انکے نظریات میں خلاف فطرت اور مبالغہ آمیز تصورات پائے جاتے ہیں۔ ہر مذہب میں خدا کے متعلق مختلف عقائد پائے جاتے ہیں۔

یہودی مذہب کا عقیدہ ہے۔ کہ یعقوبؑ ۔داؤدؑ ۔عزیرؑ ان میں سے ہر ایک خدا کا بیٹا یا پہلوٹا بیٹا ہے۔خدا کو ایک لامحدود قوت مانتے ہوئے بھی اسے انسانی (تنزلی) خاصیتوں میں ملوث کر دیتے ہیں یہ چیز خلاف فطرت ہے۔ کہ ایک لامحدود قوت بیوی بیٹا رکھتا ہو۔شادی ہمبستری کرتا ہو (جو کہ انسانی خاصیت ہے) اور بیٹے بناتا ہو [1] ۔حالانکہ وہ لامحدود قوت جسکی تابانی و تپش بھی لامحدود ہے ان نفسانی خواہشات یا بیوی بنانے سے پاک ہے وہ اکیلا ہے۔اور سب پر حاوی ہے۔ اسے بیٹے بیوی رشتہ داری کی ضرورت نہیں۔

---

[1] ماخوذ از رحمۃ للعٰلمین فصل نمبر ۸ ص ۴۲۵

عیسائی۔ انکا اعتقاد ہے کہ عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے اور خود خدا ہے۔ اور حضرت مریم۔ عیسیٰؑ۔ خدا یہ تینوں ایک ہی چیز ہیں۔

ہندوؤں کا اعتقاد۔۲۴ اوتاروں کی نسبت کہ پرمیشر خود مادی جسم قبول کر کے مادی صورت میں اوتاروں کی شکل بن کر آیا۔

مہا بھارت کا بیان۔ کرشن مہاراج حقیقتاً خدا ہی تھے۔ اور کرشن کی صورت بن کر دنیا میں ظاہر ہوئے۔

پارسیوں کا اعتقاد۔ زرتشت کہ وہ جہان تیرتا سے آیا ہے۔ یعنی زرتشت انسانی اصل سے نہیں۔ بلکہ اس تابانی اور نورانی ماحول کی مخلوق ہے جو ماورأ ادراک دنیا سے باہر فضائے آسمانی سے بھی اوپر ہے۔ اور یہاں انسانی شکل اختیار کر کے فرشتہ ہی آیا ہے۔

بدھوں کا اعتقاد۔ مہاتما گوتم بدھ کی نسبت کہ وہ (ارہم) خود خدا ہے۔ گوتم کی شکل میں خدا زمین پر آیا ہے۔

سناتن دھرمیوں کا عقیدہ۔ پانچ پانڈو سورج کے بیٹے ہیں اور خدا اوتار کی شکل میں دنیا پر آتا ہے۔

تاتاریوں کا عقیدہ ہے۔ کہ آلنقوا بیگم کے بیٹے نور کے فرزند تھے۔ گویا باالفاظ دیگر خدا کے بیٹے تھے۔

یہ چند خصوصی عقائد ہیں انہی نظریات وعقائد پر ان مذاہب کی اساس ہے۔ اصولی طور پر معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ علت لامحدود سے متعلق اس قسم کے نظریات صریحاً مبالغہ اور من گھڑت بغیر مشاہدہ کے یا تو پیروان مذاہب کے خودساختہ بنائے ہوئے ہیں یا بغیر مشاہدہ ایک ناقص تصور کی بنأ پر قائم کیے گئے ہیں۔ حقیقتاً کسی مذہب میں پیغمبر کی اصل تعلیم موجود نہیں اور نہ ہی کسی مذہب کی مروجہ تعلیم میں حقیقت کو پانے کیلئے کوئی صحیح مواد پایا جاتا ہے۔ اسلئے ہر مذہب میں اپنی اصل کھونے کے باعث انسانی نصب العین کی تکمیل کرانے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے۔

زمانہ حاضرہ کا آخری مذہب جسکے بعد تواریخ کسی مذہب کا ثبوت نہیں دے سکتی صرف

ایک مذہب اسلام ہے جسکے بانی حضرت محمدؐ ہیں اور حضرت محمدؐ پر قرآن نازل ہوا ہے۔ اسلئے محمدؐ محمد الرّسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چونکہ اس مذہب کا تمام تعلیمی مواد بدستور قائم ہے۔ اسلئے اس مذہب پر تفصیلی بحث کرنا ضروری ہے۔

قبل اسکے کہ مذہب اسلام پر کچھ بحث کی جائے چند ضروری اصول بیان کئے جاتے ہیں جن پر کسی مذہب کے حقیقی ہونے کی دلیل پوری ہو سکے۔

مذہب یا دین کی نسبت اللہ سے ہوتی ہے۔ جسکا اجرأ پیغمبر سے ہوتا ہے۔ کیونکہ مذہب کی خصوصیت اللہ کی نسبت ہونے سے ہی ہوتی ہے بجز اسکے کسی بھی محقق کے مرتب کردہ اصول اگر مذہب یا دین سے تعبیر کئے جائیں تو انمیں خود ساختہ ہونے کی وجہ سے نقائص کا احتمال ہوتا ہے۔ خدائی مذہب کا کسی پیغمبر کے توسل اجرأ ہونا لازمی امر ہے۔ اسلئے ان تینوں باتوں کا قبل از وقت خیال رکھنا ضروری ہے۔

اللہ۔ پیغمبر۔ اور اللہ کی تعلیم بالواسطہ پیغمبران تینوں چیزوں کی حقیقت کے پرکھنے کیلئے مندرجہ ذیل اصولوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) مذہب کی نسبت اللہ سے ہو۔

(۲) کسی پیغمبر سے اسکا اجرأ ہو۔

(۳) پیغمبر کیلئے چند خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ مذہب کی حقیقت کا تمام دارو مدار پیغمبر کے کردار۔ (قول و فعل) پر ہی منحصر ہوتا ہے۔

(۴) پیغمبر کی ذاتی اور خاندانی شرافت جس سے پیغمبر کے اقوال و افعال پر اعتماد کیا جائے۔

(ا) پیغمبر کے ذاتی صفات کیا ہیں؟ (ب) پیغمبر کے جملہ خصائل جن پر اسکی بنیاد ہے۔ انکی نوعیت کیا ہے؟ (ج) پیغمبر ہونے سے قبل دعویٰ کرنے والے کا کردار کیسا تھا۔ پیغمبر ہونے کے بعد اسکا کردار قول و عمل کیسا ہے؟ (د) اس ہستی میں کہاں تک پیغمبرانہ قوتوں کا صدور ہوتا ہے (پیغمبر اپنی الٰہی قوتوں سے اقتدار حاصل کرتا ہے۔ کہ ملوکیت سے بلکہ پیغمبر کا ہونا ملوکیت کی ضد ہے)۔

(۵) پیغمبر کیلئے منجانب اللہ ہونے کی دلیل۔جس کے لئے کلام الٰہی ایک خصوصی علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۶) علم الٰہی (کتاب اللہ) کی خصوصیات

(ا) کتاب اللہ حقیقی معنوں میں کلام الٰہی ثابت ہو۔(ب) کتاب اللہ قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت کرتی ہو۔(ج) ہر انسان کیلئے فلاح و سعادت پانے کیلئے اس میں عمومی حیثیت سے راہنمائی حاصل ہوسکتی ہو۔(د) کلام الٰہی خودساختہ تحریفات وتاویلات سے محفوظ ہواور ابتدأ سے انتہا تک ایک مستقل حیثیت اختیار کئے ہوئے ہو۔(ر) ہر شخص اسے آسانی سے قبول کرسکتا ہو۔(س) انسانی طرز زندگی میں مستقل راہنمائی کرسکتی ہو۔اور سب سے بڑی بات کہ منتہائے مقصد کی مکمل طور اس میں وضاحت کی گئی ہو

(۷) پیروان مذاہب میں الہامی اصولوں پر عمل کرنے سے صحیح علم وعمل کا نقشہ پایا جائے۔جس سے کہ دین کی حقیقی شناخت ہوسکتی ہو۔

(۸) ماورأادراک کا علم۔ماورأادراک ماحول کی وضاحت اور اسکی شناخت کے تمام مواد موجود ہوں۔

(۹) ماورأادراک علت لامحدود (اللہ) تک تمام کیفیات و ماحول کا علم اور اسکے پہچان کیلئے ہر طریق تفکر مکمل طور پر حاصل ہوسکتے ہوں۔

(۱۰) کائنات خلقت اور ماورأادراک ماحول کے ہر ذرہ کا تجزیہ کیا گیا ہو۔

(۱۱) پیغمبر کے دین کو عالمگیر نصرت حاصل ہوچکی ہو۔اور اسکا قانون انسانی زندگی کیلئے سودمند ثابت ہو۔مذہب نہ ختم ہونے والی حیثیت اختیار کئے ہو۔

(۱۲) دین و مذہب میں موافقت ہواور سب قوانین خواہ عام ہوں یا خاص (ظاہر تمدن کیلئے ہوں یا باطنی عرفان کیلئے) ہر صورت میں قوانین فطرت کے ساتھ موافقت و مطابقت کرنے والے اور مستحکم (نہ بدلنے والے) ہوں۔

(۱۳) سب سے اہم چیز دین کے قوانین پر عمل کرنے سے اسکا مشاہدہ حقیقت کو عیاں کرسکتا ہو۔

ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ہر مذہب کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔گزشتہ مذاہب کے بیان سے یہ بات واضح ہے۔کہ پیروان مذاہب کی خودغرضی اور ہوس پرستی کے باعث باوجود ایک دین کے صحیح ہونے اور پیغمبر کے حقیقی ہونے کے بھی کسی مذہب میں نہ اصل مواد ثابت رہ سکا نہ اس پر کوئی قوم عمل پیرا رہی اور اگر رہی بھی تو من گھڑت مسائل کو اپنا کر ایک غلط دین کی شکل اختیار کی جس سے انسانیت علت لامحدود یا ماورأ ادراک ماحول وعلم کو قطعاً نہ پا سکی۔

اسکے بعد آخری مذہب اسلام کا درجہ ہے۔اس مذہب کو بھی ہم انہیں اصولوں کے تابع روشنی میں لائینگے تا کہ اسکے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے کی دلیل پوری ہو سکے۔

مذہب کی صداقت کا انحصار پیغمبر کی صداقت پر مبنی ہوتا ہے۔مذہب اسلام کے بانی حضرت محمد ﷺ ہیں۔انکی صداقت کی دلیل ہمیں انکی ذاتی زندگی سے مل سکتی ہے۔کہ انکی خاندانی شرافت کیا تھی۔یعنی اجداد سے اس خاندان میں کس کردار کے لوگ ہوئے ہیں۔

تواریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہے۔کہ جسقدر پیغمبر گزرے ہیں انمیں اکثر پیغمبروں کا ظہور عرب میں ہوا ہے یعنی عراق مصر سے لیکر مکہ تک انکا سلسلہ چلا آتا ہے۔گزشتہ قوموں میں زیادہ مشہور قوم بنی اسرائیل (یعقوبؑ کی اولاد) ہے۔اس سے قبل بھی قومیں موجود تھیں جنمیں پیغمبروں کا ظہور ہوا ہے۔اور یہ سلسلہ آدمؑ سے ہی شروع ہوتا ہے۔اور تقریباً ہر پیغمبر ایک خصوصی نسب سے تعلق رکھتا ہے۔گویا پیغمبروں کا خاندان شروع سے ہی ایک سلسلہ سے چلا آیا ہے۔جسکا شجرہ حضرت آدمؑ تک برابر پہنچتا ہے۔ان سب پیغمبروں کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے مختلف فرقوں میں بٹ جاتا ہے یعنی آدمؑ سے لیکر حضرت ابراہیمؑ تک نسب کا ایک مختصر سلسلہ چلا آیا۔اور حضرت ابراہیمؑ کے دو فرزندوں اسحاقؑ و اسماعیلؑ کی اولاد سے ہی تمام پیغمبروں کا ظہور ہوا ہے۔اسکے سوائے کسی اور قوم سے پیغمبر نہیں ہوئے ہیں۔گویا حضرت ابراہیمؑ تمام پیغمبروں کے جد ہیں جن سے مختلف زمانوں میں مختلف پیغمبر ہوئے ہیں۔

حضرت اسحاقؑ کی اولاد سے۔یعقوبؑ۔یوسفؑ۔موسیٰؑ۔داوٗدؑ۔سلیمانؑ۔عیسیٰؑ وغیرہ

پیغمبر ہوئے ہیں۔اور ہر زمانہ میں دنیا کے بیشتر حصہ پر خصوصاً عرب وحجاز پر ان پیغمبروں کے خاندانوں کا اقتدار رہا ہے۔جب بھی انسانوں میں قوانین فطرت کی خلاف ورزی۔ظلم۔فسق و فجور۔اور انحراف حد سے گزرا کسی پیغمبر کا وقت پر ظہور ہوتا رہا۔تا کہ لوگوں کو انکے اصلی نصب العین کی طرف رجوع کرایا جائے اور لوگوں سے ظلم وستم فسق وفجور اور انحراف دور کر کے انسانی زندگیوں کو مطمئن کیا جائے۔

قوم بنی اسرائیل اور جملہ پیغمبر حضرت یعقوبؑ و اسحاقؑ کی اولاد سے ہیں۔حضرت اسماعیلؑ کی اولاد بھی عرب میں رہی جنہوں نے ابتدأ سے عرب وحجاز میں حکمرانی کی ہے۔لیکن ان میں حضرت اسماعیلؑ کے بعد کوئی پیغمبر نہ ہوا۔اور آخر میں انکی اولاد سے حضرت محمد الرّسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبر کی حیثیت سے ظہور ہوا۔حضرت محمدؐ دنیا کے آخری پیغمبر ہیں جنکے بعد کسی پیغمبر کی تواریخ دلیل پیش نہیں کر سکتی۔نہ خاندان اسحاق سے پیغمبر ہوا نہ خاندان اسماعیل سے کوئی پیغمبر ہوا اسلئے دنیا میں انسانیت کیلئے یہ آخری دین ہے جس سے علم الٰہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

باقی پیغمبروں کا ظہور حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قبل عراق۔مصر۔بیت المقدس۔شام وفلسطین میں ہوا۔صرف حضرت محمد الرّسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ظہور اسماعیل علیہ السلام کے بعد مکہ میں ہوا۔چنانچہ انکا شجرہ مندرجہ ذیل ہے اس طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملتا ہے:-

مندرجہ ذیل شجرہ من وعن سیرۃ النبیؐ رحمۃ للعٰلمین سے لیا گیا ہے۔جس میں تفصیلاً شجرہ مبارکہ کی علمأ محدثین سے تصدیق کی گئی ہے۔اور توراۃ انجیل زبور سے بھی شجرہ ہذا کی تصدیق کی گئی ہے۔اس کتاب میں بالتفصیل اجداد کے امہات وآباء کے بھی نام درج ہیں مگر یہاں مختصراً خالص شجرہ درج کیا جاتا ہے۔شجرہ کی ابتدأ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والد ماجدؒ سے کی جاتی ہے۔

(۱) عبداللہ۔(۲) عبدالمطلب۔(۳) ہاشم۔(۴) عبدمناف۔(۵) قصّی۔(۶) کلاب۔(۷) مُرّہ۔(۸) کعب۔(۹) لُوّیَ۔(۱۰) غالب۔(۱۱) فہر الملقب بہ قریش۔(۱۲) مالک۔(۱۳)

نضر۔(۱۴) کنانہ۔(۱۵) خزیمہ۔(۱۶) مدرکہ۔(۱۷) الیاس۔(۱۸) مضر۔(۱۹) نزار۔(۲۰) معد۔(۲۱) عدنان۔

(۲۲) ادو۔ (۲۳) ھمیسع۔ (۲۴) سلامان۔ (۲۵) عوص۔ (۲۶) بوز۔ (۲۷) قموال۔(۲۸) اُبی۔(۲۹) عوام۔(۳۰) ناشد۔(۳۱) حزا۔(۳۲) بلداس۔(۳۳) یدلاف۔ (۳۴) طابخ۔(۳۵) جاحم۔(۳۶) ناحش۔(۳۷) ماخی۔(۳۸) عیفی۔(۳۹) عبقر۔(۴۰) عبید۔(۴۱) الدعا۔(۴۲) حمدان۔(۴۳) سَنْبَرْ۔(۴۴) یثربی۔(۴۵) نخزن۔(۴۶) یلحن۔ (۴۷) ارعوے۔ (۴۸) عیضی۔ (۴۹) دیشان۔ (۵۰) عیصر۔ (۵۱) اقناد۔ (۵۲) ایہام۔ (۵۳) مقصر۔ (۵۴) ناحث۔ (۵۵) زارح۔ (۵۶) سمی۔ (۵۷) مزی۔ (۵۸) عوص۔(۵۹) عرام۔(۶۰) قیدار۔

(۶۱) اسماعیل علیہ السلام۔(۶۲) ابراہیم علیہ السلام۔(۶۳) تارہ (آزر)۔(۶۴) ناحور۔(۶۵) سروج۔(۶۶) رعو۔(۶۷) فالج۔(۶۸) عابر۔(۶۹) ارفکشاد۔(۷۰) سام۔ (۷۱) نوح علیہ السلام۔(۷۲) لامک۔(۷۳) متوشالح۔(۷۴) اخنوع (ادریس علیہ السلام) ۔(۷۵) یارد۔(۷۶) ملہل ایل۔(۷۷) قینان۔(۷۸) آنوش۔(۷۹) شیث علیہ السلام۔ (۸۰) آدم علیہ السلام۔

یہ شجرہ عالیہ محققین نے مُسند تواریخوں سے حاصل کیا ہوا ہے۔حضرت محمد الرّسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حضرت آدمؑ تک لگا تار جا ملتا ہے۔حضور علیہ السلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے۔کہ دنیا میں کسی شہنشاہ کا اسقدر مصدقہ اور مکمل شجرہ نہیں پایا جاتا ہے۔اب ہم حضرت محمد الرّسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے شجرہ کی مشہور ہستیوں کا ذکر کرتے ہیں جس سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شرافت خاندانی ونسلی کا اندازہ لگ سکیگا۔

حضرت آدمؑ کائنات خلقت میں سب سے پہلے انسان ہیں جن سے انسانیت کی ابتدا ہوئی۔تمام بشری مخلوق امتیں اور پیغمبر انہیں کی نسل سے ہیں۔

حضرت حواؑ۔ حضرت آدمؑ کی اہلیہ کے پیدا ہونیکے متعلق کوئی وضاحت نہیں بتائی گئی۔ جیسا کہ حضرت آدمؑ کی پیدائش کے متعلق کی گئی ہے۔ حضرت حواؑ کے متعلق صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ آدم کی پسلی سے نکلی ہیں۔ لیکن اسکی ترکیب کا کچھ علم نہیں کہ کسطرح پسلی سے بنی ہیں۔ البتہ یہ چیز ضروری ہے۔ کہ جس ترتیب سے حضرت آدمؑ کی پیدائش ہوئی وہ ایک ہی نفسِ واحد کیلئے ہے۔ جنکا وجود مٹی اور پانی سے ظاہر ہوا۔ اسکے بعد حضرت حواؑ مثل آدم کے نہیں بنیں۔ بلکہ اسکی ترکیب آدم سے علیٰحدہ تھی۔ ورنہ ایک ہی ترکیب میں دونوں وجودوں کا ذکر کرنا ضروری تھا۔ البتہ تخلیق کی ترکیب جو انسان کیلئے مقرر کی گئی ہے۔ اگر چہ حضرت حواؑ کی کوئی ترکیب پیدائش ہو تو وہ ترکیب بھی انسانی تخلیق میں شمار ہوگی۔ چونکہ اس تخلیق کی ترکیب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اسلئے اس تخلیق کو عام تخلیقوں کی ترکیب میں سے ہی سمجھا جائیگا۔

حضرت حواؑ کی پیدائش کیلئے صرف اسلام ہی سے مواد ملتا ہے۔ ورنہ دیگر صحیفے انکی پیدائشی ترکیب بتانے سے خالی ہیں اور پسلی [1] سے ہونا بھی اسلامی علم سے ظاہر ہے۔ چنانچہ چودہ سو سال پیشتر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بتائی ہوئی تشریح آج چودہ سو سال بعد علم تحقیقات میں

---

[1] اسلامی علم کی اساس روحانی مشاہدات پر ہے۔ اور اسی مشاہدہ کے ساتھ آخری تفسیر اجتہاد روحانی پر ہوتی ہے۔ اور وہ اجتہاد قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت کرتا ہو۔ مشاہدات کی صورت میں علم کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے۔ اجتہاد چونکہ ظاہری تعقل سے وابستہ ہے اسلئے جب تک انسان کا روحانیت سے مس نہ ہوا اجتہاد غلط نظریہ پیش کرتا ہے۔ اسلئے قرآنی علم کی صحیح تفسیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کی ہوئی تفسیر ہی ہو سکتی ہے۔ جنکا مشاہدہ۔ اور اجتہاد دونوں وحی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مسئلہ میں حضور علیہ السلام کی کی ہوئی تشریح حقیقت پر مبنی ہے۔ جسے بلا حیل و حجت تسلیم کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ قرآن بھی واضح طور پر اسکی شہادت دیتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا (پارہ ۴ سورۃ ۴ آیت ۱) اے لوگو ڈرو اللہ سے جس نے بنایا تمکو ایک نفسِ واحد سے اور بنایا اسی نفسِ واحد سے اسکا جوڑا (مادہ) اور پھیلائے انہیں دو مرد عورت (آدم وحوا) سے کثیر لوگ۔ قوانین فطرت کے مترتب نظام کے تحت آدم کے وجود کی ابتدا بھی ایک زندہ جرثومہ لطیف سے ہے اور اس جرثومہ لطیف سے اسکا جوڑا بھی بنا اور انہیں دو وجودوں سے تمام مخلوقِ کثیر ہوئی۔

عینی مشاہدہ میں پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔اور اسکی تصدیق سائنس نے بھی کر دی ہے اور یہی ترکیب حضرت حوا علیہا السلام کی پیدائش کی ہوتی ہے۔کہ آدم کے وجود کی تکمیل کے دوران میں ہی حضرت حواؑ کا وجود حضرت آدمؑ سے نکلا۔اور اپنی آخری تکمیل پر دونوں وجود مستقل صورت پا چکے تھے۔ یہ بات ہو نہیں سکتی کہ آدم کے وجود کیلئے ایک ترتیب شدہ عمل کارفرما ہو اور حضرت حواؑ کیلئے صرف یہ ہو کہ آدم کی پسلی کی ہڈی نکال کر اسکو کسی چھومنتر سے انسانی شکل میں لایا جائے۔خدائے قدیر کی قدرت کاملہ سے بعید نہیں وہ جسطرح چاہے چھومنتر سے بھی بنا سکتا ہے لیکن مخلوق کائنات میں ایک مکمل نظام و ترتیب پائی جاتی ہے۔یہ ترتیب نظام کہیں اس سے بہتر صورت پیدا کرتا ہے۔ جہاں حضرت حواؑ کسی اور طریقہ سے پیدا ہوں۔جو ترتیب قوانین فطرت کے خلاف معلوم ہو۔جبکہ اسکے نظام میں حد درجہ خوبصورتی اور اعلےٰ و احسن ترتیب پائی جاتی ہے۔

سائنس اس چیز کو پایہ ثبوت تک پہنچا چکی ہے۔کہ کائنات میں اسقدر لطیف ذرات (واحد نفس) پائے جاتے ہیں جنکا دیکھنا محال ہے۔ہر ذرہ میں جان اور ہیئت بدلنے کی قوت ہے۔اور ایک جاندار ذرہ بھی لطیف ہوتا ہے۔جب یہ ذرہ ہیئت بدلنے کی طرف رجوع کرتا ہے۔تو ایک ہی ذرہ مواد حاصل کر کے دو حصوں میں تقسیم ہو کر دو وجودوں (نر و مادہ) کی شکل اختیار کرتا ہے اور جب یہ نر و مادہ مکمل ہو جاتے ہیں تو انہیں سے آئندہ سلسلہ تناسل شروع ہوتا ہے۔اور لاکھوں کروڑوں جراثیم اور کیڑوں کی تعداد میں ہو جاتا ہے۔یہ ایک فطری نظام ہے۔اس ترکیب نسلی کو ''پسلی سے ہونا'' تشبیہ دیا گیا ہے۔اور یہی ترکیب حضرت آدم و حواؑ کی پیدائش میں کارفرما ہے۔گویا حضرت آدمؑ کے وجود کے تکمیل پر حضرت حواؑ کا وجود بھی تکمیل پا چکا تھا یعنی آدم کی تکمیل پر ایک آدم ہی نہ تھے بلکہ اِنکے ساتھ حوا بھی تھیں۔اور انہیں دونوں انسانوں کے وجود سے انکی اولاد کا سلسلہ شروع ہوا۔

---

[1] اسی لئے قرآن بھی آدمؑ کی پیدائش کے بعد مجملاً آدم و حواؑ کا ذکر اکٹھے کرتا ہے۔یَـا اٰدَمُ اسْـکُـنْ اَنْـتَ وَ زَوْجُکَ الْـجَـنَّـۃَ ورنہ جہاں باقی مخلوق آسمان و زمین کی پیدائش کا ذکر علےٰ الترتیب ہوا۔وہاں حضرت حواؑ کی پیدائش کا ذکر بھی ضروری تھا۔

حضرت آدمؑ کی اولاد میں ہابیل اور قابیل کے علاوہ حضرت شیثؑ بھی پیدا ہوئے جن سے انسانی نسل جاری ہوئی باقی اولاد میں سے حضرت شیثؑ ہی ایک اولوالعزم ۱؎ درجہ رکھتے ہیں۔

حضرت شیثؑ کے بعد (حضرت محمد صلعم سے بہترویں (۷۲) پشت) نویں (۹) اولاد حضرت نوح علیہ السلام ہیں انکے درمیان کی آٹھ اولادیں بھی بدستور اپنے عالی درجہ کو حاصل کئے ہوئے تھیں۔ چونکہ اس وقت یہ نسل قلیل تعداد میں تھی اور ان میں کسی قسم کے انحراف کا مادّہ ابھی داخل نہ ہوا تھا۔ اس لئے اِن آٹھ بزرگوں کے پیغمبرانہ کردار میں کوئی خصوصی واقعات کا ذکر نہیں۔ اور نہ ہی ان کے واقعات کو دہرانے کی ضرورت ہے۔ جبکہ ہر فرد بجائے خود مشرف و مکمل انسان تھا۔ جسوقت حضرت نوحؑ کا زمانہ تھا اسوقت لوگوں کی کثرت تھی اور لوگوں میں انحراف و غلط روی کا مادہ قائم ہو چکا تھا۔ اور حضرت نوحؑ کو خصوصی طور اِنکی راہنمائی اور اصلاح کیلئے منجانب اللہ مامور کیا گیا تھا۔ حضرت نوحؑ کی اصلاحی کوششوں کے باوجود لوگ انحراف پر قائم رہے۔ چنانچہ قانونِ فطرت کے اصول کے مطابق فطرت نے اِن پر تباہی نازل کی اور تمام قوم طوفان کی نذر ہوگئی۔ حضرت نوحؑ نے ایک کشتی الہام ۲؎ الٰہی کے مطابق بنائی۔ اور اپنے ہمراہیوں سمیت کشتی میں سوار ہوئے۔ باقی تمام مخلوق فنا ہوگئی۔ طوفان ختم ہونے کے بعد حضرت نوحؑ نے زمین پر ٹھکانا کیا۔ اسکے

۱؎ یہ ابتدائی زمانہ تھا جبکہ انسان کو اپنے سامانِ زندگی کی فراہمی کیلئے کسی جدوجہد کی ضرورت نہ تھی۔ نہ ہی انہیں مادی لذات کی ہوس تھی۔ انکا تمام تر وقت بغیر کسی دنیوی حصول کے گزرتا تھا۔ اس حالت میں۔ انکا ذہن اس امر کی طرف راجع ہونا لازمی تھا۔ کہ ہم کیا ہیں؟ کیسے آئے۔ یہ مناظر جو ہمارے ماحول میں واقع ہیں کیسے بنے کس نے بنائے زمانہ خالص اور لطیف ہونے کی وجہ سے انکے ابتدائی لطیف احساسات بھی آسانی سے لطافت کو قبول کرتے تھے۔ اسلئے انہیں روحانی کیف کا جلد اثر ہو جاتا تھا۔ جس میں انکے تصورات خالق کو پانے میں جلد کامیاب ہو جاتے۔ اور انکے خواص اشرف المخلوقاتی متجلا رہتے۔ اور یہ اپنی خاصیت و شرافت میں اولوالعزم کا درجہ حاصل کئے ہوئے تھے۔

۲؎ اس میں شک نہیں کہ کائنات کا نظام ایک فطرت کے منضبط نظام کا پابند ہے۔ جس میں ہر کیفیت اعتدال سے تجاوز کرنے پر فطری طور فنا و بقا کا واقع ہونا ایک فطری لازمہ ہے۔ لیکن جہاں تک علت لامحدود (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بعد انہیں نجات یافتہ افراد میں سے دوبارہ افزائش نسل شروع ہوئی۔ حضرت نوحؑ کے چار لڑکے سام۔ حام۔ یافث اور یام تھے۔ یام طوفان میں غرق ہو گیا باقی تین لڑکے حضرت نوحؑ کے ساتھ رہے ان میں سام (سِم) حضرت نوحؑ کے بڑے لڑکے تھے۔ جنہیں یورپین مورخ ''سامو ٹیک'' کہتے ہیں انہیں سے دوبارہ نسل انسانی کی ابتدا ہوئی اسلیئے حضرت نوحؑ کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔ نوحؑ کے بعد سام بھی ایک اولوالعزم [1] پیغمبر کا درجہ رکھتے ہیں اِنکا وطن عرب ہی تھا۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کی وسعت واحاطہ اور ارادہ کا تعلق ہے۔ اس میں قدرت ہی ہر بقا وفنا کا کلی طور اختیار رکھتی ہے۔ اسکے ارادہ واحاطہ کا یہ تقاضا ہے۔ کہ جب اور جسطرح وہ قدرت چاہے اپنے ارادہ سے فنا و بقا کے نظام کو اپنی مرضی پر قائم کر سکتی ہے۔ گویا نظام کائنات میں جو کچھ بھی واقعات رونما ہوتے ہیں وہ سب اسکے ارادے اور اسکے حسب مرضی واقع ہوتے ہیں۔ نیز جو کچھ بھی کائنات میں ہوتا ہے وہ واقع ہونے سے قبل اللہ کے ارادہ میں ہوتا ہے۔ اگر اسکے ارادہ میں نہ ہو تو کوئی واقعہ رونما نہ ہو سکیگا۔ جب وہ کسی قوم کی بغاوت کو اصولی طور ناپسند کرتا ہے تو اپنے ارادہ سے اسے فنا کر سکتا ہے۔ اور اگر اُسے کسی قوم کے انحراف پر فنا نہ کرنے کی مرضی ہو تو اسکی قدرت کا احاطہ اسقدر تمام کائنات پر غالب ہے۔ کہ وہ باوجود فطری عادت کے قدرت کے احاطہ کی پابند ہے لہٰذا ہر کیفیت کا صدور ہونا ارادہ الٰہی کا محتاج ہے۔ کیونکہ اللہ تمام مخلوق پر حاوی غالب ہے۔ اسلیئے اسکا ارادہ بھی ہر فطری نظام و قانون پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جسے جی چاہے فنا کر سکتا ہے جسے جی چاہے بچا سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے اپنے ارادہ سے جب چاہا طوفان بپا کر کے قوم نوح کو فنا کیا اور اسی ارادہ کے تحت نوحؑ کو اس طوفان سے بچا لیا ورنہ ایک عالمگیر طوفان میں نوحؑ کا بچنا ناممکن ہو جاتا۔ مگر قدرت کا احاطہ ہی طوفان میں ایک کو غرق کرتا ہے دوسرے کو بچا سکتا ہے۔

[1] یہ ابتدائی زمانہ تھا جبکہ انسان اپنی سامان زندگی کی فراہمی کیلیئے کسی اختراع یا لوازمات کو ضروری نہیں سمجھتا تھا انکا ابتدائی قدم کائنات کی اشیأ کو دیکھکر اپنی ہیئت اور کائنات کی ہیئت کو محسوس کرنا تھا۔ کہ یہ سب کچھ کسی خالق کی بنائی ہوئی ہیں۔ اسلیئے اِنکے ذہن میں سوائے خالق کے تصور کے اور کچھ نہ تھا چونکہ ابھی تک انہیں کسی خوفناک واقعہ سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اسلیئے کائنات کی خوبصورتی کو دیکھکر انہیں اپنے خالق کا تصور بھی خوبصورت ہی تھا۔ یہ زندگیاں ابتدائی دور سے گزر رہی تھیں۔ اسلیئے اِنکی ہر ضرورت کی تکمیل خود فطرت کرتی رہی۔ چونکہ اِنکے وجود لطیف اور بے داغ تھے اسلیئے انہیں فطرت کی ہر تحریک کا آسانی سے علم ہو جاتا تھا۔ اِنکا ہر فعل قانون فطرت کے ساتھ مطابقت کرتا تھا۔ اسلیئے یہ لوگ اپنی شرافت وخاصیت میں اولوالعزم کا درجہ رکھتے تھے۔

سامی زبان کا وجود ایشیا اور افریقہ میں اب تک برابر پایا جاتا ہے۔فونی شین۔آرمیک۔اسیرین۔اِنھی۔زبانیں سامی زبان ہی سے نکلی ہیں۔ان میں عبرانی اور عربی زبانیں باقی زبانوں سے زیادہ مشہور اور علم وادب سے پُر زبانیں ہر دور میں مستعمل رہی ہیں۔مشہور قدیم مورخ سیر ینجر۔سکریدر۔سام کی اولاد کا وطن عرب [1] کو بتاتے ہیں اور اکثر قومیں اسی عرب کی سرزمین سے پیدا ہوئی ہیں۔جن میں سامی عادات واطوار بدستور چلے آتے رہے۔

اہل عرب کی زبان ہمیشہ محفوظ رہی کیونکہ یہ زبان اکثر سردار قوموں کی زبان رہی ہے انکے ساتھ ہی عربی زبان کا قریبی تعلق رہا ہے۔قوموں کے استحکام کے ساتھ ساتھ زبان کا استحکام بھی قائم رہا۔جسکی یادگار اب تک ''میشا'' یا ''سلواسم'' کا کُتبہ ہے۔یہودیوں کے زمانہ میں جبکہ اکثر حملہ آوروں نے بیت المقدس کی تباہی اور یہودیوں کے قتل وغارت سے توریت اور موسوی مذہب کو نابود کر دیا۔عبرانی زبان یہودیوں کے مختلف ممالک میں منتشر اور محکوم ہونے کے بعد ختم ہو گئی۔اور اسکی جگہ آرمیک زبان یہودیوں کی زبان بن گئی۔باقی زبانوں کو جو باقی مختلف نسلوں میں مروج تھیں ان میں بھی ردوبدل ہوتا رہا۔صرف ایک عربی زبان ہی اپنی مستقل ہیئت میں ابتدأ سے ہی قائم رہی۔اور یہی زبان عرب۔شام۔مصر۔فلسطین۔مراکو۔ٹیونس تک پھیلی اور عالم (دنیا) کے متمدن قوموں کی زبان رہی ہے۔

نوح وسام کے بعد آذر (حضرت ابراہیمؑ کے والد) تک سات اولادیں ہوئیں آٹھویں آذر اور نویں حضرت ابراہیمؑ ہوئے۔حضرت ابراہیمؑ حضرت محمدؐ سے باسٹھویں (۶۲) پشت ہیں۔اِنکے زمانہ میں دنیا میں صرف حامؔ۔یافثؔ کی اولادیں مختلف ممالک میں پھیلی ہوئی تھیں۔اور عرب سے لیکر عراق ومصر وفلسطین میں سامؔ کی اولاد برسراقتدار تھی۔اس زمانہ میں مصر میں ایک

---

[1] لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا (پارہ ۲۵ سورۃ ۴۲ آیت ۷) اس آیت میں مکہ کو بستیوں کی ماں بتایا گیا ہے۔گویا اکثر گزشتہ اجداد کا وطن مکہ ہی تھا۔

زبردست حکومت نمرود کی تھی۔ نمرود اپنے نشۂ اقتدار میں خود خدا بن بیٹھا تھا۔ اسکے عہد میں اور بتوں کے ساتھ نمرود کی بھی پرستش کی جاتی تھی حضرت ابراہیمؑ نے قوانین فطرت کے تحت کائنات کا مطالعہ[1] کیا۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کائنات کی ابتدأ ایک ایسے وجود سے ہونی چاہیے جو اس تمام کائنات کی ایک واحد علتِ لامحدود ہو۔ اور وہی اسکا خالق ہونا چاہیے۔

حضرت ابراہیمؑ ایک منتخب پیغمبر تھے ان میں تمام اشرف المخلوقاتی اوصاف بدرجہ اولیٰ قائم تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مجاہدہ وتفکر میں ایک ہستی لامحدود کو پالیا۔ اور اللہ نے انہیں وحی کے ذریعہ نمرود اور اسکی باطل قوتوں کے مقابل ایک خالق کائنات کے ہونے کا دعوے علے الاعلان کرنیکا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے تمام باطل قوتوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور آخر کار تمام باطل قوتیں حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں شکست کھا کر فنا[2] ہوگئیں۔ حضرت ابراہیمؑ ہی وہ پیغمبر ہیں جن سے تمام بنی اسرائیلی پیغمبروں کا سلسلہ لگاتار شروع ہوتا ہے۔ اسلئے انہیں ابو الانبیا (پیغمبروں کا باپ) کہا جاتا ہے۔ لوطؑ پیغمبر انکا برادر زادہ تھا۔ پچھتر (۷۵) سال کی عمر میں اپنے وطن سے نکلکر کنعان آئے۔ اِنکے ساتھ لوطؑ اور انکی زوجہ سریؑ تھیں۔ کنعان سے مصر آئے۔ یہاں فرعون مصر نے اِن[3] کی زوجہ سریؑ کو لینا چاہا۔ مگر وہ ایک پیغمبر کی بیوی تھیں فطرت نے محافظت[4] کی یعنی پیغمبر کی بیوی پر اسکا کچھ بس نہ چل سکا۔ آخر فرعون نے اپنی لڑکی حضرت ہاجرہؑ کو حضرت سریؑ

---

[1] اسکا ذکر آگے آئیگا۔ یہاں اسکا ذکر قبل از وقت ہوگا۔

[2] تواریخ اس واقعہ کی گواہ ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد آذر تک انکے مخالف ہو گئے اور حضرت ابراہیمؑ تنہا رہ گئے۔ دوسری طرف نمرود کی عظیم الشان سلطنت اور ایسے خدا کی طاقتوں کا اندازہ کیا جائے تو صاف عیاں ہوگا کہ فی الحقیقت پیغمبر منجانب اللہ ایک عظیم الشان عظمت اور نصرت الٰہی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اللہ اور پیغمبر باعتبار اپنی عظمت وروحانیت کے ان مادی قوتوں سے بیحد وحساب قوت کے حامل ہوتے ہیں۔ [3] مراد حضرت ابراہیمؑ (ناشر)

[4] پیغمبر کی بیوی بھی پیغمبر کی صحبت سے متاثر ہو کر اپنے میں شرافت وعظمت کی قوت رکھتی تھی۔ اسلئے ایسی قوت پر کسی فرعون کا ہاتھ پڑنا ناممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ نور مادہ پر ہر حال میں غالب ہوتا ہے۔

کے ساتھ بطور کنیز دیدیا۔ جسے حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی بنالیا۔انہیں دو بیویوں سے حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ ہوئے۔حضرت اسحاقؑ حضرت سارہؑ (سری) سے پیدا ہوئے انکی سکونت شام میں رہی اور انکی اولاد بھی شام کے علاقوں میں پھیلی چنانچہ حضرت عیسیٰؑ تک جتنے پیغمبر گزرے ہیں تقریباً سب کا ظہور شام کے علاقوں (بیت المقدس) میں ہی ہوا اور یہ تمام پیغمبر حضرت اسحاقؑ کی اولاد سے ہی ہیں۔

حضرت ہاجرہؑ سے حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہ کو بمعہ حضرت اسماعیلؑ کے مکہ میں چھوڑا اُسوقت مکہ ایک غیر آباد جگہ تھی۔حضرت اسماعیل وحضرت ہاجرہؑ کے مقیم ہونے سے مکہ میں آبادی کا سلسلہ قائم ہوگیا۔گویا مکہ کی آبادی کی بنیاد حضرت ہاجرہ و اسماعیلؑ سے ہی رکھی گئی۔اور بنی اسماعیل (اسماعیل کی اولاد) اسی مکہ میں ہی آباد ہوتے رہے۔ حضرت اسماعیلؑ کی شادی قبیلہ بنو جرہم کے سردار مسمی مضاض کی بیٹی سے ہوئی۔بنو جرہم عرب کا قدیم حکمران طبقہ تھا۔اور مضاض اپنے علاقہ کا واحد حکمران تھا۔اسطرح حضرت اسماعیلؑ کا تعلق حکمران قوم سے ہوا۔حضرت اسماعیلؑ بھی پیغمبر تھے اِنکی تبلیغ۔عرب۔حجاز۔یمن وحضرموت کے لئے تھی اِنکی مادری زبان قبطی تھی اور پدری زبان عربی تھی اِنکے سسرال کی زبان بھی خالص عربی تھی۔الغرض حضرت اسماعیلؑ ایک طرف پیغمبر بھی تھے اور دوسری طرف سرداران قوم سے بھی تھے اِنکی بارہ (۱۲) اولادیں ہوئی۔جن میں ہر فرزند ایک ایک قوم کا سردار ہوا ہے۔اور عرب میں انکے نام کی بستیاں اب بھی پائی جاتی ہیں۔

حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں حضرت محمدؐ سے اکاسٹھویں پشت سے بائیسویں پشت تک سب رئیس قوم اور نامور ہستیاں گزری ہیں۔اکیسویں (۲۱) پشت میں عدنان ہیں۔یہ بھی جلیل القدر ہستی تھے۔انکے دو بیٹے تھے معدؔ اور عکؔ معد کا نسب حضرت محمدؐ سے ملتا ہے۔عک نے یمن میں اپنی سلطنت قائم کی اسکی تصدیق اُن کتبات سے ملتی ہے۔جوایسٹ انڈیا کمپنی کو ۱۸۳۴ء میں حصن الغرائب سے ملے تھے۔(خطبات احمدیہ از سر سید احمد) منقول از رحمۃ للعلمین مصنفہ

سید سلیمان منصور پوری)

نزار: معد کے دو بیٹے تھے نزار اور قنص ۔نزار کے چار بیٹے مضر۔اماد۔ربیعہ۔انمار

مضر: حضرت محمدؐ کے نسب سے ملتے ہیں۔اونٹوں کے لئے حدی[1] انہوں نے ایجاد کی ہے۔ باپ (نزار) نے اِنکو سرخ رنگ کی چیزیں ترکہ میں دی تھیں۔اسلئے مضر الحمراء مشہور ہیں۔ مضر حضرت ابراہیمؑ کے دین پر تھے۔

الیاس: مضر کی اولاد الیاس تھے انکی کنیت ابوعمرو تھی جب یہ مرگئے تو اِنکی بیوی نے اتنا غم کیا کہ پھر عمر بھر سایہ میں نہ بیٹھیں۔انکی اولاد مدرکہ جو حضرت محمدؐ کے نسب سے ملتے ہیں۔باقی طانجہ جن سے بنوتمیم قیس عسلان کی اولاد سے بنوغطفان۔بنوذبیان۔بنوفرازہ۔بنوثقیف۔بنو ہوزان۔بنوسلیم۔بنوسعد۔بنوبکر کے قبیلے ہیں۔

مُدرکہ: مدرکہ سے کنانہ۔یہ بھی ایک اولوالعزم ہستی تھے۔اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے۔حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں حضرت اسماعیلؑ برگزیدہ مانے جاتے ہیں۔اور حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے بنوکنانہ شریف النسل سمجھے جاتے ہیں۔بنوکنانہ سے قریش اور قریش سے بنو ہاشم اور بنو ہاشم سے اعلیٰ مرتبہ کی ہستی حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

مدرکہ سے نضر۔مالک ۔عبد مناۃ۔عمر۔احابیش۔عافر۔ان سے بنونضر۔بنو عامر۔بنومصطلق وغیرہ قبیلے ہوئے۔

نضر: نضر کا نام قیس تھا۔مگر حسین ہونے کی وجہ سے عرب انکو نضر کہتے تھے انکی اولاد مالک ہیں انسے بنومالک قبیلہ ہے۔

مالک: مالک سے فہر اور حرث۔فہر سے قریش اور حرث سے بنومطیبین قبیلہ ہے۔

فهر: فہر سے حضرت محمد ﷺ کا سلسلہ ملتا ہے۔انکے وقت میں حسان حاکم یمن ایک فوج لیکر

---

[1] حدی۔اونٹوں میں مستی اور تیز گامی (رفتار) کیلئے ترنم سے گانا۔

مکہ معظمہ پر حملہ آور ہوا۔اسکا مقصد یہ تھا۔کہ خانہ کعبہ کو گرا کر ملبہ یمن میں لے جائے۔اور وہیں کعبہ کو تعمیر کرے۔فہر نے بمعہ اپنے بھائیوں کے حسان کا مقابلہ کیا اُسے شکست دی۔حسان کو گرفتار کیا۔تین سال قید رکھنے کے بعد فہر نے حسان کو آزاد کر دیا۔حسان یمن جاتے ہوئے راستہ ہی میں مر گیا۔اس فتح سے فہر کی عظمت کا سکہ عرب میں قائم ہوا۔فہر اور اولا دفہر عرب کے جملہ قبائل سے بہادر اور طاقتور قبیلہ تھا۔فہر خود زبردست طاقت کا حامل تھا۔شہسوار اور تلوار کا دھنی۔نڈر تھا۔ہر جگہ اسکی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔اسلئے اسے قریش کے خطاب سے پکارا جاتا تھا۔قریش لغت حجاز میں ویل مچھلی کو کہتے ہیں۔ویل مچھلی سمندری مخلوق میں عظیم الجثہ اور پر ہیبت ہے۔فہر کی ہیبت کی وجہ سے اسے بھی ویل مچھلی (قریش) کے خطاب سے پکارا جاتا تھا۔فہر کی اولاد سے غالب۔معارب۔

غالب: غالب سے لُوی۔اور تیم۔تیم سے بنو تیم یا بنو الادرم قبیلہ ہے۔

لوی: لوی سے کعب۔عوف۔عامر۔حرث۔ان سے بنو عوف۔بنو عامر۔بنو حارث قبیلہ ہوا۔

کعب: کعب بھی عالی اخلاق اور بلند شان کا حامل تھا۔عرب میں ان کا سنہ پیدائش جاری ہوا تھا جو واقعہ فیل تک تقریباً چار سو سال تک جاری رہا۔کعب کی اولاد سے مرہ۔ھصیص۔سھم۔جمح۔عدی۔انسے بنو ھصیص۔بنو سہم۔بنو جمح۔بنو عدی قبیلہ ہے۔عدی سے رزاح اور جراح ہیں رزاح کے سلسلہ سے حضرت عمر فاروقؓ کا نسب ملتا ہے۔

مرّہ: مرہ سے کلاب بنو کلاب۔تیم۔بنو تیم۔مخزوم بنو مخزوم حضرت خالد بن ولیدؓ کا نسب انسے ملتا ہے۔مرّہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے چھٹی پشت میں دادا لگتے ہیں۔

کلاب: انکا نام حکیم تھا۔کنیت ابو زہرہ۔شکاری کتے بہت پال رکھے تھے اسلئے کلاب کا لقب مشہور ہوا۔

قُصَّی: کلاب سے قصّی اِنکا اصل نام زید ہے۔شیر خوارگی میں ہی والد کا انتقال ہو گیا۔اور ماں نے دوسری شادی ربیعہ بن حزام الخذری سے کی اسکا قبیلہ شام کی سرحد پر سکونت پذیر تھا قصی نے

والدہ کے ساتھ شام میں ہی پرورش پائی۔ان دنوں مکہ پر بنوخزاعہ کی حکومت تھی۔حلیل سردار مکہ نے اپنی بیٹی المسماۃ حُبّٰی قصی سے بیاہ دی اور جہیز میں تولیت بیت اللہ کا حق بیٹی کو عطا کیا۔اور ابوغبشان کو بیٹی کا وکیل مقرر کردیا۔حلیل کے مرجانے کے بعد ابوغبشان نے شراب کے مشکیزہ کے عوض قصی کو حق وکالت فروخت کردیا اس طرح قصی کا قبضہ بیت اللہ پر ہوا۔

بنوخزاعہ نے اس فروخت کو تسلیم نہ کیا اور قصّی کے ساتھ جنگ چھڑ گئی۔آخر یعمر بن عوف کو ثالث مقرر کیا گیا۔اُس نے فیصلہ کیا کہ بنوخزاعہ کے جتنے آدمی مارے گئے قصّی اُنکا خون بہا ادا کرے اور بنوخزاعہ شہر کی حکومت چھوڑ کر مکہ سے باہر چلے جائیں۔اس طرح قصّی کا مکہ پر پورا قبضہ ہوگیا۔قصّی نے اپنی تمام قوم (اولاد فہر) کو جگہ جگہ سے بلا کر مکہ میں آباد کیا۔اسوقت اولاد فہر کی بارہ (۱۲) شاخیں ہوگئی تھیں۔قصی کی کوشش سے وہ سب ملکر مکہ میں آباد ہوئیں اور قریش (اولاد فہر) کی عزت وحکومت سارے ملک میں تسلیم کی گئی۔

حضرت اسماعیلؑ کے بعد بیت اللہ پر بنوجرہم کا قبضہ ہوگیا تھا۔بنوجرہم حضرت اسماعیلؑ کے سسرال تھے۔صدیوں تک انہیں کی حکومت مکہ پر رہی۔اور بیت اللہ کی تولیت (انتظام اور رکھوالی) انہیں کے سپرد رہی پھر عمالقہ کا قبضہ ہوا۔مکرر بنوجرہم نے اقتدار حاصل کر کے قبضہ کیا۔جب وہ ظلم کرنے لگے تو عمرو بن الحیٰ خزاعی نے جو بنوجرہم کا ہمشیرہ زاد تھا۔اِنکو مکہ سے نکالدیا۔بنوجرہم کا ظلم ختم ہوا۔لیکن خزاعی نے ۲۰۷ء میں بت پرستی کو رائج کیا۔اس نے مصر وشام میں عمالقہ کو بت پرستی کرتے دیکھا۔کہ انہیں بتوں کے طفیل مرادیں پوری ہوتی ہیں اسلئے وہاں سے ایک بت لاکر خانہ کعبہ کے اوپر نصب کیا اس بت کا نام ھبل تھا اسوقت سے خانہ کعبہ میں بتوں کا رواج ہوکر مختلف قسم کے بت خانہ کعبہ میں نصب کئے گئے۔جو بت حضرت محمدؐ کے وقت تک برابر موجود رہے۔اور تولیت کعبہ بنوخزاعہ سے قصّی کے ہاتھ آئی۔

قصی کے بعد اولاد قصی میں جائدادوں پر جھگڑے پیدا ہوئے۔جنکی وجہ سے بعد میں انہوں نے مختلف جماعتوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے لڑائیاں کیں۔اور بھی قبیلے اسی طرح

باوجود ایک ہی نسل کے ہونے کے آپس میں لڑتے رہے۔

قصی کی اولاد سے عبد مناف ۔عبدالدار۔عبدالعزیٰ۔

عبد مناف: عبد مناف سے حضرت محمدؐ کا نصب ملتا ہے۔بچپن میں والدہ مناۃ (بت جسے مناف بھی کہتے ہیں) پر لے گئی تھیں اسلیئے عبد مناف (مناۃ کا بندہ[1]) خطاب ہوا۔اپنے وقت میں بہت حسین تھے اسلیئے انکا لقب قمر البطحا (بطحا کا چاند) مشہور ہوا۔حد درجہ خدا ترس اور حق شناس تھے لوگوں کو بھی حق شناسی کی ترغیب دیتے تھے۔

عبدالدار حضرت عثمانؓ کا نسب انہیں سے ملتا ہے۔تولیت کعبہ اسی خاندان کو ملی اور کعبہ کا کلید بردار آخر تک یہی خاندان رہا۔یعنی قصی کی اولاد میں سے تولیت کعبہ عبدالدار کے حصہ میں آئی۔

عبدالعزیٰ بھی اسی لقب سے مشہور ہیں یعنی عُزیٰ (بت) کے بندے۔حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی پہلی زوجہ انکی اولاد سے ہیں۔

عبد مناف کی اولاد سے مطلب۔ہاشم۔عبدالشمس۔نوفل۔ابوعمر۔ابوعبیدہ وغیرہ ہیں۔

ھاشم: انکا نام عمر ہے۔ہاشم اسلیئے کہتے ہیں کہ مکہ میں قحط ہوا۔یہ شام میں تجارت کرنے گئے تھے۔انہوں نے سنا کہ مکہ میں قحط پڑا ہے۔تو بجائے دیگر اسباب خریدنے کے آٹا اور روٹیاں اونٹوں پر لاد کر لائے۔مکہ میں پہنچکر عام لنگر (دعوت خانہ) کھولدیا۔لوگوں کو گوشت اور شوربے میں روٹیاں ملا کر کھلائیں شوربے میں روٹیاں ملا کر کھانے کو "ثُرِیْد" کہتے ہیں۔یہ عربوں کی مرغوب اور پسندیدہ غذا ہوتی ہے۔روٹیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو ھشم کہتے ہیں۔اسلیئے انہیں ھاشم کے نام سے پکارا گیا۔اسکے بعد یہ سلسلہ ہر سال کعبہ کی زیارت والوں کے لئے جاری رکھا۔ہاشم خود بہت ذہین تھے عبد مناف کے بعد ہاشم ہی قوم کے سردار ہوئے۔لیکن عبدالشمس کی اولاد نے

---

[1] حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے جتنے بھی قبیلے ہوئے انکا مذہب دین ابراہیمی تھا۔صرف علم نہ ہونے کے باعث اور بنوخزاعہ کی باطل تجدید کے باعث اُنمیں بت پرستی کا رواج قائم ہوا۔جو بوجہ انحراف نہ تھا بلکہ ایک غلط نظریہ کے تحت رواجی صورت میں اختیار کیا گیا تھا۔

اِنکی سرداری تسلیم نہ کی اور آئندہ یہی اختلاف آپس کے عناد و فساد کا سبب ہوا۔ایک طرف عبدالمطلب اور ہاشم کی اولاد اور ایک جانب نوفل اور عبدالشمس کی اولاد دو جماعتوں میں بٹ گئی۔

ہاشم کی اولاد عبدالمطلب یعنی شیبہ۔صیفا۔اسد۔نضلہ۔

عبدالمطلب: انکا نام عامر اور لقب شیبہ ہے۔شیبہ کا ترجمہ بوڑھا ہے۔کہتے ہیں یہ لقب اسلئے پایا تھا۔کہ عمر دراز پائی تھی۔نیز جب پیدا ہوئے تو انکے سر پر چند بال سفید تھے۔

ہاشم کی وفات کے بعد اِنکے چچا مطلب نے بڑے ناز و نعم سے پالا جسو جہ سے انکا اصلی نام ہی عبدالمطلب مشہور ہوا۔اِنکو سیبته الحمد فیاض۔معطم الطیر السَّماء اور سیدِ قریش بھی کہا کرتے تھے۔حضرت محمدؐ کی تربیت آٹھ سال تک انکے زیر اثر رہی۔انہیں کی سرداری کے عہد میں واقعہ فیل [1] کا ظہور ہوا۔

عبدالمطلب کی نصیحت یہ ہوتی۔کہ ظلم و بغاوت نہ کرو۔اچھے اخلاق حاصل کرو۔اور نیک سیرت بنو۔وغیرہ۔چاہ زمزم [2] عمرو بن حرث جرہمی نے بند کر دیا تھا۔اور اسکا پتا نہیں ملتا تھا۔عبدالمطلب نے خواب میں نشان پا کر اسی جگہ کھودا۔تین دن کی کھودائی کے بعد اُن کو بنو جرہم کی

---

[1] واقعہ فیل۔سے مراد۔کہ ابرہہ ایک سردار مکہ پر حملہ آور ہوا۔اور بیت اللہ کو مسمار کرنے کا قصد کیا۔لیکن پرندوں کے غول آئے اور اوپر سے اسقدر کنکر برسائے کہ ابرہہ کی فوج اور ہاتھی کنکروں کی بارش سے گھاس کے مانند کٹ کٹ کر فنا ہوئے۔

[2] چاہ زمزم: اس چشمہ کا نام ہے۔جو اس مقام پر نکلا جہاں حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ و اسماعیلؑ کو ایک لق و دق ویران میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔اس جگہ زندگی کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔یہ عمل صرف حکم خداوندی کے تحت کیا تھا۔حضرت اسماعیلؑ شیر خوار تھے دھوپ کی تپش کی وجہ سے حضرت اسماعیلؑ کو پیاس لگی حضرت ہاجرہؑ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔مکہ کی ان دو پہاڑیوں پر جو صفا اور مروہ کے نام سے مشہور ہیں کئی بار اتریں اور چڑھیں لیکن پانی نہ ملا۔آخر ناچار واپس حضرت اسماعیلؑ کے پاس پہنچیں تو دیکھا کہ چشمہ جاری ہے۔اور پھر اس چشمہ کے سبب لوگ یہاں آباد ہونے لگے جسکے بعد مکہ میں آبادی ہوئی۔اسی واقعہ کو مسلمان ہر سال یادگار کے طور پر صفا اور مروہ پر (چڑھنے اترنے میں) دہراتے ہیں۔

مدفون اشیأ۔ تلواریں۔ زرہیں۔ اور شاخہائے۔ آہو ملنے لگیں۔ قریش کے لوگ تو پہلے انکے اس فعل کو لغو سمجھتے رہے لیکن مدفون اشیأ کے ملنے پر انہیں چاہ زمزم کے ملنے کی امید پوری ہوگئی انہوں نے بھی اس میں شرکت کرنے کی درخواست کی مگر عبدالمطلب نے کسی کو شامل نہ کیا۔ یہ چشمہ زمزم جس سے اب لاکھوں زائرین وحجاج سیراب ہوتے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ کیلئے قدرت نے مکہ کے لق ودق میدان میں عطا کیا تھا جو اب تک حضرت اسماعیل علیہ السلام کی یادگار کو تازہ کررہا ہے۔ جسے عبدالمطلب نے پھر تازہ کردیا تھا۔ اور حضرت محمد الرّسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد قُدسی سے اسنے دائمی شہرت پائی۔

عبدالمطلب کی اولاد تیرہ کے قریب ہیں۔ جن میں عبداللہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے والدِ ماجد بھی ہیں۔

عبداللہؓ: عبداللہؓ اپنے والد کے بہت لاڈلے فرزند تھے عبدالمطلب نے منت مانی تھی کہ اگر اِنکے دس لڑکے پیدا ہوئے تو ایک لڑکا خدا کی راہ میں قربان کرونگا۔ چنانچہ دس لڑکے ہونے کے بعد قرعہ ڈالا گیا۔ تو عبداللہ کے نام نکلا۔ عبداللہ نے اپنے والد کی خوشنودی کیلئے ذبح ہونا منظور کیا۔ لیکن ابو طالب نے اپنے برادر شفیق کے بچاؤ کیلئے مزاحمت کی۔ عبداللہ کے ننھیال والے بھی مزاحم ہوئے۔ آخر فیصلہ ہوا۔ کہ ایک مشہور کاہنہ کے پاس جاکر جو کچھ وہ کہے اس پر عمل کیا جائے کاہنہ نے کہا کہ قرعہ اونٹوں پر ڈالا جائے جب عبداللہ کو چھوڑ کر اونٹوں پر قرعہ نکلے اُتنے اونٹ قربان کیئے جائیں۔ چنانچہ قرعہ دس اونٹوں سے کیا گیا۔ یہاں تک کہ ایک سو اونٹوں تک قرعہ عبداللہ کے نام نکلا اور سو اونٹ پورے ہونے پر اونٹوں پر قرعہ نکلا اور حضرت عبداللہؓ کے فدیہ میں سو اونٹ ذبح کرکے منت پوری کردی گئی اس واقعہ سے پیشتر عرب میں انسانوں کا خون بہا دس اونٹ مقرر تھا اسکے بعد انسانی قیمت میں اضافہ ہوکر ایک سو اونٹ مقرر کیا گیا۔

حضرت عبداللہؓ فطرۃً شرمیلے۔ نیک نفس اور متحمل مزاج تھے۔ نہایت خوش خُلق۔ اور خوبصورت تھے۔ اِنکی زندگی کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ کہ **فاطمہ بنت مر الخثعیمہ** نے اِن سے

اظہارِ محبت کیا اور اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے سو اونٹ دینے چاہے۔ لیکن انہوں نے اس درخواست کو رد کر کے یہ شعر سنایا۔

اَمَّا الْحَرَامُ فَالْمَمَاتُ دُوْنَهُ ۔۔۔ وَالْحِلُّ لَاحِلَّ" فَاسْتَبِيْنَهُ

فَكَيْفَ اِلَى اِلَّا الَّذِىْ تَبْغِيْنَهُ ۔۔۔ يَحْمِى الْكَرِيْمُ عِرْضَهُ وَدِيْنَهُ [1]

(ترجمہ) فعل حرام کے ارتکاب سے تو مرجانا ہی بہتر ہے۔ حلال کو بے شک میں پسند کرتا ہوں۔ مگر اسکے لئے اعلان ضروری ہے۔ تم مجھے کیسے پھسلاتی ہو۔ مگر شریف انسان کو لازم ہے کہ اپنی عزت اور دین کی حفاظت کرے۔

یہ ہر دو واقعات حضرت عبداللہؓ کی بلند سیرت اور علو مرتبت کے آئینہ دار ہیں۔ کہ جس عالی قدر سردار کے فرزند کو پیغمبر عالم بن کر آنا تھا۔ اسکے آباءِ کرام کی سیرتیں ہر نوع میں پاک اور اعلےٰ تھیں۔

حضرت عبداللہؓ کا نام مبارک عبد اللّٰه (یعنی اللہ کا بندہ[2]) اس سے قبل کسی کا نام نہیں ہوا ہے۔ یہ پہلا نام ہے جو اپنی نوعیت میں اسلامی طرز کا نام ہے۔ اس نام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدرت نے اپنے دینِ فطرت کو ظاہر کرنے سے پہلے حضرت عبداللہؓ کے نام مبارک سے ہی داغ بیل ڈالدی ہے۔ ایک ایسے بندے کا ظہور ہوا۔ جو بجائے۔ عبد مناۃ۔ عبدالعزیٰ کے اللہ (علت لا محدود) کا بندہ ہے۔ اور اسی اللہ کے بندے کی پشت سے وہ بندہ پیدا ہوگا۔ جو اللہ (علت لا محدود خالق) کی حمد (پہچان) کرنے والا ہوگا۔

حضرت عبداللہؓ دین ابراہیم پر قائم تھے۔ دین ابراہیمی ایک مستقل دین تھا جسکی نسبت اللہ کے دین سے تھی اس سے پیشتر جو باقی ادیان۔ عیسوی۔ موسوی جاری ہوئے تھے۔ چونکہ وہ قوم

---

[1] خائص الکبریٰ جلد اول صفحہ ۴۰ ماخوذ از رحمۃ للعٰلمین جلد دوم صفحہ ۹۹

[2] اگر اللہ کی ہستی کا تصور نہ ہوتا تو دنیا کیسے نامِ عبداللہ سے مانوس ہوتی۔ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا تصور پیشتر ہی تھا۔

بنی اسرائیل کے لئے صرف شام کی حدود میں ہی جاری تھے اسلئے باقی قومیں جو مکہ میں آباد تھیں انہیں براہ راست دین ابراہیمی سے ہی نسبت رہی تھی۔ نیز باقی مذاہب کی تعلیمات بھی مسخ ہو چکی تھیں اسلئے ان پر عملدر آمد کرنے کی گنجائش نہ تھی برعکس اسکے دین ابراہیمی اولاد اسماعیل کے ساتھ علے التواتر چلا آرہا تھا۔ سرداران قوم اور انکے پیروان نے اس دین میں کسی قسم کا رخنہ نہ ڈالا تھا۔ اور نہ ہی کسی بیرونی حملہ آور کو اسطرف رخ کرنے کا موقع ملا جس سے دین کے اصولوں میں رخنہ ہونے کا اندیشہ ہوتا۔ سوائے اسکے کہ چند سرداران نے فروعی نظریہ کے تحت رواجی بُت پرستی شامل کر لی تھی۔ جس سے دین کے عقائد میں خلل واقع ہوا۔ لیکن توحیدی اصول بدستور قائم تھے۔ نیز سرداران قوم اسماعیلی فی ذلتہٖ نیک نفس تھے اسلئے ان میں دنیا طلبی کے زیر اثر ایک خدا سے انحراف نہ تھا۔ باقی قبائل میں جو اطراف و مضافات میں مختلف شکلوں میں بٹ گئے تھے ان میں یقینی طور پر شدید قسم کے نقص پیدا ہو گئے تھے۔ برعکس اسکے نسبِ پیغمبران ہر قبائح سے محفوظ ہی رہے اسلئے ان میں اکثر سرداران قوم دین ابراہیمی پر بدستور قائم رہے۔

اسی سلسلہ سے حضرت عبداللہؓ بھی دین ابراہیمی پر قائم تھے۔ آپ عبادت گزار۔ نیک طینت۔ شریف النفس۔ خلیق تھے۔ جھگڑوں سے کنارہ کش رہتے۔ بلکہ قومی جھگڑوں کو بری نظر سے دیکھتے تھے۔ غریبوں مسکینوں کی ہمدردی کرتے۔ اور سخی بھی تھے۔

حضرت عبداللہؓ کا نکاح سیدہ آمنہؓ سے ہوا تھا۔ اس نکاح کے بعد وہ ملک شام کو تجارت کیلئے چلے گئے۔ شام سے واپسی پر مدینہ میں قیام کیا۔ یہاں قیام کرنے کی غرض یہ تھی کہ والد کے حکم کے موافق کھجوروں کا سودا کرنا تھا۔ لیکن اسی دوران میں مدینہ میں ہی بیمار ہوئے اور اسی جگہ وفات پا گئے۔ حضرت عبداللہؓ کا انتقال ۲۵ پچیس سال کی عمر میں ہوا جبکہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ابھی شکم مادر میں ہی تھے۔

آمنہؓ: یہ حضرت محمد الرّسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی والدہ گرامی ہیں اِنکے والد وھب بنو زہرہ کے سردار اور قریش میں بھی نہایت ممتاز و محترم تھے سیدہ آمنہؓ نے اپنے چچا وھیب کے پاس پرورش

پائی تھی وہیب بھی اپنے بھائی کی طرح قوم کے سردار تھے اور سیدہ آمنہؓ کا نسب حضرت محمدؐ سے پانچویں پشت کلاب سے جاملتا ہے۔یعنی وھب۔عبد مناف۔زھرہ(برادر قصی) کلاب حضرت آمنہؓ زہرہ کے پشت سے اور حضرت محمدؐ قصّی کے پشت سے۔حضرت آمنہؓ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جب پانچ سال کے تھے اپنے گھر یثرب گئیں ایک ماہ قیام کے بعد جب واپس ہوئیں تو مقام ابواء پر انتقال ہوا۔گویا یہ بھی مدینہ کی حدود میں دفن ہیں۔

محمدؐ: حضرت عبداللہؓ کے فرزند عالی حضرت محمد ﷺ ہیں۔چونکہ حضرت عبداللہ نے ابتدائی ۲۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔جب حضورؐ ابھی شکم مادر ہی میں تھے۔اسلئے آپ کے بعد حضرت محمد ﷺ کی تربیت حضرت عبدالمطلب کے ذمہ ہوئی۔

عبدالمطلب قوم کے سردار تھے۔نہایت شاہانہ طریقہ سے قوم کی سرداری [1] کرتے تھے۔ان میں وہ تمام جوہر اور خوبیاں موجود تھیں جو ایک مصلح قوم اور سردار کیلئے ہونے ضروری تھے۔انہیں بنیادوں پر حضور ﷺ کی تربیت بھی خالص طریقہ پر تھی۔

جسوقت حضور علیہ السلام کی پیدائش کی خبر عبدالمطلب کو ہوئی اس وقت گھر آئے اور حضورؐ کو لیکر بیت اللہ میں گئے دعا مانگ کر واپس لائے۔ساتویں دن قربانی کی اور تمام قریش کو دعوت دی۔لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے بچہ کا نام کیا رکھا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ بچہ کا نام محمدؐ [2] رکھا ہے۔لوگ اس نام کوسنکر متعجب [3] ہوئے۔پوچھا کہ آپنے مروجہ ناموں کو چھوڑ کر ایک ایسا نام

---

[1] عرب میں قوم کی سرداری فی زمانہ کی لیڈری جیسی نہ تھی۔عرب قومیں نہایت جنگجو اور ضدی تھیں۔جہالت کی وجہ سے اُنمیں اکثر غلط کاریاں اور خلاف قانون فطرۃ رجحانات کا اثر قبول کرنے کا مادہ کافی پایا جاتا تھا۔ایسی حالت میں ایک قوم کو منظم کرنا۔ایک حد میں پابند کرنا۔ہر شخص کی اصلاح کرنا۔اور پھر ایسے ضدی قسم کے لوگوں پر اپنا اثر قائم رکھنا۔سردار قوم کیلئے بہت مشکل کام تھا۔اسلئے سردار قوم کیلئے اعلیٰ خصائل اور تدبر کا ہونا نہایت ضروری تھا۔

[2] حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی والدہ نے بھی حضورؐ کا اسم مبارک محمدؐ رکھا۔کیونکہ انہیں وحی (الہام) کے ذریعہ آگاہ کیا گیا تھا۔گویا یہ نام مبارک منجانب اللہ تھا اور عبدالمطلب کے ذہن (قلب) پر بھی مشیت الٰہی کے تحت القا کیا گیا۔

[3] ابوالفدا ص ۱۱۰۔نیز یسعیاہ ۹/۶ ''وہ اس نام سے کہلاتا ہے عجیب'' (ماخوذ از رحمۃ للعلمین ص ۴۴ جلد اول)

رکھا ہے جو آج تک کسی کا بھی نہیں ہوا ہے۔آپ نے فرمایا۔ کہ میں چاہتا ہوں۔ کہ میرا بچہ دنیا بھر کی ستائش وتعریف کا حامل ہو محمدؐ نام رکھنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پہلی خصوصیت ہے۔ اور یہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ کہ محمدؐ منجانب اللہ منتخب پیغمبر ہیں۔ کہ تمام دنیا اِنکے اوصاف جمیلہ کو سراہیگی۔اور محمدؐ ہی اللہ کے اسرار وآثار کا بدرجہ اولیٰ تمام انسانوں سے زیادہ ادراک کر کے اللہ کو پہچانینگے۔اور کائنات کا ہر ذرہ انہیں کی تعریف کا مظاہرہ کریگا۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضورؐ کی پیدائش سے لیکر آج تک کسی شخص نے حضورؐ کے نام مبارک محمد کے بغیر کسی اور نام سے نہیں پکارا۔

؎ اگر خواہی دلیلے عاشقش باش   محمدؐ ہست برہانِ محمدؐ

تواریخ گواہ ہے۔ کہ حضورؐ کے زمانہ میں عرب خصوصاً مکہ اپنے دور کے لحاظ سے علم وادب میں درجۂ کمال کو پہنچا تھا۔شاعری۔فسانہ گوئی۔ہجو گوئی اور دیگر مختلف مذاق کے ادب کی مکہ میں نمائش ہوتی تھی۔اور پھر قرآن جیسی فصیح وبلیغ کتاب الٰہی اسی دور میں انہیں لوگوں کی زبان میں اتری۔ ان حالات میں تمام لوگ محمد کی خوبی سے اچھی طرح واقف تھے۔لیکن کسی شخص نے محمد کے نام پر اعتراض نہ کیا۔ بلکہ تعجب ہی کیا۔

یہود ونصاریٰ اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی مکہ میں تھے جو لغت کے لحاظ سے عربی ادب کو اچھی طرح سمجھتے تھے ان لوگوں میں پیغمبر بھی ہو گزرے تھے لیکن کسی کو اس بات کا گمان نہ ہوا کہ محمد نام ایسا ہے۔جسکی صفت تمام صفات سے بدرجہ اتم اولیٰ وافضل ہے۔

ہر پیغمبر کا نام اسکی صفت سے ہی لیا گیا جیسے۔

آدم : کے معنی گندم گوں۔ابوالبشر کا یہ نام اُنکے جسمانی رنگ پر ہی پایا جاتا ہے۔

نوح : کے معنی آرام ہیں۔باپ نے ان کو آرام وراحت کا موجب قرار دیا۔

اسحٰق: کے معنے ضاحک۔یعنی ہنسنے والا۔ہشاش بشاش چہرے والا۔

یعقوب: پیچھے آنے والا۔یہ اپنے بھائی عیسو کے ساتھ توام پیدا ہوئے تھے۔

موسیٰ: پانی سے نکالا ہوا۔جب اِنکا صندوق پانی سے نکالا گیا تو اسی نام سے موسوم ہوئے۔

عیسیٰ: سرخ رنگ۔ چہرۂ گلگوں کی وجہ سے یہ نام تجویز ہوا۔

حضرت محمدؐ کا نام مبارک بھی انکی صفت کے لحاظ سے رکھا گیا۔ محمد: احمد یعنی بدرجہ اتم تعریف کیا گیا اور بدرجہ اتم اللہ کی حمد کرنے والا۔

اسے واقعات کہا جائے یا فطرت کی آواز۔ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان میں خصوصی اسمأ کا ہونا اس سے پیشتر کسی انسان سے ایسی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی۔

والد کا اسم مبارک عبد اللہ اول سے ہی تھا۔ والدہ کا اسم مبارک آمنہ (امن دینے والی) اور حضور کا اسم مقدس محمد ﷺ۔ زمانہ میں ان تینوں اسمأ سے کسی کا اختلاف نہیں پایا جاتا۔ ہر شخص انہیں انہیں اسمأ سے یاد کرتا ہے۔

جب آنحضرتؐ آٹھ سال کے ہوئے تو دادا عبد المطلب کا بھی انتقال ہوا۔ اسکے بعد اِنکی پرورش کا ذمہ انکے چچا ابو طالب نے لیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجداد کو اگرچہ امیری و سرداری حاصل تھی۔ لیکن سرمایہ دارانہ شان و شوکت نہ تھی۔ بلکہ اپنی شرافت و عالی کردار کی بناء پر ہی سرداری حاصل تھی۔

عبد المطلب کثیر الاولاد تھے۔ اسلئے اپنی گذر شریفانہ طور پر معمولی تجارت اور گلہ بانی پر ہی تھی۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر جب بارہ سال کی ہوئی تو آپکے سپرد گلہ بانی کی گئی۔ اور آپ جنگل میں بکریاں چرانے لگے اُسوقت عرب میں گلہ بانی شریف پیشہ تھا۔ شرفائے مکہ کے اکثر بچے بکریاں چرایا کرتے تھے۔ خاندانی وراثت آپکو تیر افگنی۔ تیراکی۔ کشتی۔ سپاہگری بھی حاصل ہوئی۔ چنانچہ گلہ بانی کے ساتھ ساتھ آپ ان فنون میں بھی ترقی کرتے رہے آپکے چچا تجارت میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے آپکو تجارتی گُر بھی سکھائے۔ چنانچہ آپ جب کسی سفر میں بغرض تجارت جاتے تو حضورؐ کو بھی ہمراہ لے جاتے۔ جس سے حضورؐ کو تجارت میں کافی تجربہ حاصل ہوا۔

انسان کی ابتدائی پرورش میں۔ والدین کے ذاتی عادات و خصائل کا کافی اثر پڑتا

ہے۔ بلکہ بچپن کے ماحول کے مطابق ہی انسان کی آئندہ زندگی کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ساتھ ہی جدی خون کے تاثرات (فطری نقوش) کا اثر بھی برابر چلا آتا ہے۔حضرت محمدؐ کے اجداد (خاندان) میں حضرت اسماعیلؑ سے لیکر حضرت عبداللہؓ تک تمام پشتیں ایک اعلےٰ کردار کی حامل تھیں۔ان میں اکثر قوم کے سردار تسلیم کیئے جاتے تھے۔انکے عادات واطوار قابل فخر تھے۔ان میں ہر شخص مصلح کی حیثیت رکھتا تھا۔اور اکثر ان میں عوام کی غلط کاریوں سے متنفر اور صحیح دین ابراہیم کے عامل تھے یہ تمام صفات خاندانی تاثرات کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں انکے ساتھ ہی عام ماحول کا تاثر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔جیسے زمانہ کے حالات قوموں کی تہذیب اور عقائد پائے جاتے ہوں ہر فرد پر ان عقائد کا اور مروجہ تہذیب کا اثر ضرور پڑتا ہے۔اسکے لئے اسوقت کے حالات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

واقعات عالم کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش کے وقت اطراف عالم کی حالت کیا تھی۔حضرت اسماعیلؑ کے خاندان کا ابتدائی حصہ خالص رہا اور یہ خاندانی شرافت ہر پشت میں بدستور چلی آتی رہی۔لیکن بعض قبائل کے غلط عقائد کی بناء پر جبکہ کعبہ میں بتوں کی پرستش کا سلسلہ شروع ہوا۔تو اس کا اثر ہر قبیلہ میں ہوا۔اور عقیدہ کے طور پر انہیں کعبہ میں جگہ دی گئی تو بیشتر نام ایسے پائے جاتے ہیں جن میں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمانہ کے عقائد و تہذیب کا اثر خواہ مخواہ ہر شخص پر اثر انداز ہوتا ہے۔جیسے عبد مناۃ عبد العزیٰ کے ناموں سے پتہ چلتا ہے۔کہ یہ نام صرف عام ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھے۔

اب مکہ کے ساتھ عالمی حالات کا مطالعہ کیا جائے تو دنیا کے نقشہ پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔کہ جزیرہ نمائے عرب کے مغرب میں بحیرہ احمر اور مشرق میں خلیج فارس شمال میں ملک شام اور جنوب میں بحر ہند ہیں۔

عرب کی وسعت فرانس کے مقابلہ میں دوچند ہے۔ملک کے مختلف حصے ہیں۔ہر حصہ اپنی خاصیتوں کے لحاظ سے مشہور ہے۔حضرت محمدؐ کے عہد مبارک میں عرب کی ملکی اور اخلاقی حالت

یہ تھی۔کہ ان کے جنوب میں سلطنتِ حبش اور مشرقی حصہ میں سلطنت فارس۔اور شمال میں روما کی مشہور سلطنت قسطنطنیہ کا قبضہ تھا۔اور اندرونی ملک عرب خصوصاً مکہ۔یہ تمام حصہ مدتوں سے آزاد چلا آتا تھا۔اس جگہ مختلف قبائل آباد تھے۔ہر قبیلہ ایک سردار کے تحت تھا۔یہ لوگ خود مختار تھے۔اور خود مختاری نے انہیں ہر قسم کے قانونی خوف اور پابندی سے آزاد کر دیا تھا۔ہر شخص بجائے خود آزاد اور خود سر تھا۔اپنی من مانی کرنے میں کسی کو رکاوٹ نہ تھی کیونکہ اسجگہ کوئی ملکی منضبط نظام نہ تھا۔نہ ہی کوئی مستقل قانون تھا۔جسکی وجہ سے بات بات پر شجاعت و جرأت میں تلواریں میان سے نکالنی اور آپس میں لڑنا ایک عام مشغلہ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔کسی اصلاحی قانون کے نہ ہونے کی وجہ سے۔بیکاری۔کاہلی۔جوا۔شراب۔ہر قسم کے مخرب اخلاق عادات ان میں پائے جاتے تھے۔ غیر ملکوں سے الگ رہنے کی وجہ سے اِنکی زبان بے لاگ تھی۔اِنکی نسلیں بھی بہت حد تک خالص تھیں۔عربی زبان کا رواج ہونے کی وجہ سے ان میں علم وادب کا چرچا بھی تھا۔لیکن یہ سب طاقت فحش گوئی۔شاعری اور خودستائی پر صرف ہوتی تھی۔باوجود علم ہونے کے اکثر لوگ اُمی رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔اسکی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے ذہن اسقدر قوی تھے۔کہ بغیر تعلیم کے شاعری۔ فلسفہ وغیرہ میں بحث کیا کرتے۔ایسی امی حالت میں کسی ادبی نکتہ پر بحث کرنا اِنکے لئے فخر تھا۔ اسلئے امی رہنا انہیں زیادہ پسند تھا۔اِنکا حافظہ اسقدر قوی تھا کہ اگر ایک ہزار اوراق کی داستان انکے سامنے ایک بار پڑھی جائے تو یہ اسے از بر یاد رکھ لیتے۔شاعری میں تو اتنا ملکہ تھا۔کہ عرب کا بچہ بچہ شعر کہتا۔شاعری کی طرف زیادہ دلچسپی اسلئے تھی کہ ہر شخص شجاعت۔سپاہگری۔اور دیگر فنون میں ماہر تھا۔ان خصائل میں شاعرانہ ماحول تازیانہ کا کام کرتا ہے۔سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آزادی کی وجہ سے فسق و فجور (شہوانی خیالات میں روانی) میں آزادی تھی۔عشق و محبت کے افسانے زوروں پر تھے اور اس معاشقہ کیلئے اشعار میں معشوق کی تشہیر کی جاتی تھی۔دوسرے عرب کا ماحول ہی کچھ ایسا ہے۔جہاں ہر شخص باوجود علم نہ ہونے کے بھی شعر کہہ سکتا ہے۔

علم نہ ہونے کے باعث غلط مسائل۔غلط نظریات پیدا ہو چکے تھے۔جسکی وجہ سے تو ہم

پرستی۔ بت پرستی۔ اور ہٹ دھرمی پیدا ہوگئی تھی۔ کسی صحیح قانون کی پابندی نہ ہونے کے باعث کھلے بندوں قتل۔ لوٹ مار۔ رہزنی۔ چوری۔ جبس بیجا۔ سرکہ بالجبر۔ زنا بالجبر۔ کھلے بندوں شراب پی کر شریف لوگوں کی عزت اتارنا۔ جبراً یا پھسلا کر عورتوں کو لے جانا۔ عورتوں کی تذلیل کرنا۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا۔ معمولی باتوں پر آپس میں لڑنا یہاں تک کہ خونریزی کی نوبت پہنچ جاتی۔ ان جملہ عیوب کی وجہ سے آزاد عرب گویا جملہ مذاہب باطلہ اور بدافعالیوں کا مرکز تھا ویسے بھی عرب خصوصاً مکہ تمام دنیا کا مرکز تھا۔ عرب لوگوں کا پیشہ تجارت تھا۔ ہر قوم۔ ہر مذہب کے لوگوں کی یہاں آمدورفت تھی۔ یہودی۔ عیسائی۔ آتش پرست۔ صابی۔ دہریے ہر قسم کے لوگ یہاں آباد تھے۔ اسلیئے تمام اطراف کے تاثرات سے متاثر ہونا لازمی تھا۔

ایسی حالت میں جبکہ مکہ کا ذرہ ذرہ مدتوں سے باطل وانحراف کے مہلک جراثیم سے بھرپور تھا۔ کسی خالص خاندان کا اپنی شرافت کو برقرار رکھنا عرب اور عربی کی ذات کیلیئے بسا مشکل تھا۔ لیکن باوجود اس کفر وانحراف کے خاندان اسماعیلی کا (حضرت اسماعیلؑ سے لیکر حضرت عبداللہؓ تک) جملہ آلائش باطلہ سے محفوظ رہنا ایک خصوصیت تھی۔ اس خصوصیت کا باعث صرف یہ تھا کہ وہ نورِ نبوت جس نے دنیا پر ظاہر ہو کر انسانیت کو ظلمت کی گہرائیوں سے نکالکر روشنی کی طرف لانا تھا۔ وہی فطرت کا چراغ اپنی روشنی تھامے چلا آ رہا تھا جو خاندان اسماعیلی کی اس خصوصی شاخ میں ہوتا ہوا عبداللہؓ تک پہنچا یہی وجہ ہے کہ اجدادِ حضرت محمد الرّسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں نسلی شرافت وصداقت انکے نیک خصائل اور نیک سیرتوں کی صورت میں برابر چلی آئی۔ اور یہی شرافت نسلی ظاہری طور حضرت محمدؐ میں نمایاں ہونی لازمی تھی۔ چنانچہ تواریخی طور پر حضرت محمدؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ حضرت محمدؐ اپنی بعثت سے قبل کس شرافت وصداقت کے مالک تھے۔

اس سے قبل جتنے بھی پیغمبروں کا ظہور ہوا ہے۔ وہ۔ مصر۔ شام۔ فلسطین (بیت المقدس) کی سرزمین سے ہوتا رہا۔ اور اکثر پیغمبر مختلف علاقوں میں علیٰحدہ علیٰحدہ قوموں کیلیئے منتخب ہوتے

رہے۔اور یہ سلسلہ تمام ایک ہی کڑی سے ہوتا رہا۔یہ سب پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے اسحاقؑ کی نسل سے ہوتے رہے۔حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے آخر تک کوئی پیغمبر نہیں ہوا۔لیکن حضرت محمدؐ کا ظہور عرب (مکہ) سے ہوا۔یہی ایک پیغمبر آخری حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے منتخب ہوئے ہیں۔اور اِنکا ظہور (حضرت عیسیٰؑ سے تقریباً چھ سو سال بعد) اسوقت ہوا جبکہ تمام دنیا پر کسی پیغمبر اور اسکی تعلیم کا کوئی نشان باقی نہ رہ چکا تھا۔تمام دنیا پر جہالت اور کفر والحاد کے بادل چھائے ہوئے تھے۔قوانین فطرت کے تحت ضرورت تھی کہ ایک ایسا پیغمبر مبعوث ہو جسکی تعلیم تمام عالم کیلئے ہو۔کیونکہ اسوقت آبادی تمام اطرافِ عالم میں کثرت سے پھیل چکی تھی اور علیٰحدہ علیٰحدہ پیغمبر بھی اس مقصد کو پورا نہ کرسکتے جب تک ایک عالمگیر قوت کا مالک ایک واحد پیغمبر دنیا کے مرکز سے پیدا نہ ہوتا۔چونکہ تمام عالم میں ہر فرد کفر وانحراف پر مائل تھا ایسے وقت میں قوانین فطرت کی موافقت کیلئے ایک ایسے پیغمبر کی ضرورت تھی جو تمام عالم کو ایک ہی سانچہ میں ڈھال کر صحیح راہ پر لاتا۔اسکے لئے ایک ایسے پیغمبر کا ہونا لازمی تھا جسے عالمگیر اصلاح وفلاح کا ملکہ حاصل ہو یہ بات ضروری ہے۔کہ ان حالات کو مدنظر رکھتے کسی پیغمبر کیلئے خدا کا نام زبان پر لانا آسان کام نہ تھا۔جبکہ اطراف میں ہرقل۔خسرو پرویز کی عظیم الشان سلطنتیں تھیں۔ایسی جابر وظالم حکومتوں کے علاوہ۔وسط مکہ کے باغی خودسر قبائل (جن کے سامنے انسان مولی گاجر کی طرح کٹ جاتا۔) موجود تھے۔انکے سامنے بہت مشکل تھا جب تک کہ پیغمبر کے ساتھ زمانہ کے مطابق ایک بااقتدار سلطنت کی حمایت۔ایک زبردست قبیلہ کی امداد۔علم وادب۔جرأت۔دولت غرض ہر قسم کی حمایت بدرجہ اولیٰ میسر نہ ہو۔لیکن پیغمبر منجانب اللہ منتخب ہوتا ہے۔اور بیشتر زمانہ کا یہی دستور رہا کہ پیغمبر ایک ادنیٰ سی حیثیت کا مالک ہوتا۔یعنی پیغمبر کے پاس اگرچہ دنیاوی طاقت نہیں ہوتی ہے۔تاہم وہ ایک ادنیٰ سی حیثیت میں ظلم وطغیان کا مقابلہ کرنے کیلئے منجانب اللہ برسرپیکار آمادہ ہوتا ہے۔

گزشتہ پیغمبروں کے تواریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے۔کہ سرکشوں اور جابر حکمرانوں نے پیغمبر کی مخالفت کی لیکن پیغمبر کو بروقت کسی حکمران قوت کی حمایت حاصل ہوئی اور پیغمبر کے دین

کوعروج کا موقع ملا۔ مگر حضرت محمدؐ کے عہد کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر چہ انکے خاندان میں سرداری تھی۔ لیکن ایک واحد قبیلہ تھا۔ اسکے مقابل کئی قبائل اپنے اقتدار کو قائم کئے ہوئے تھے۔ عبدالمطلب۔ عبداللہ۔ ابوطالب اسقدر امیر نہ تھے کہ دولت کے ذریعہ کسی کا مقابلہ کرسکتے بلکہ معمولی تجارت اور مختصر گلہ بانی میسر تھی۔ علم و ادب کا یہ حال تھا کہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بالکل امی تھے۔ صرف شجاعت و جرأت پر اتنی عالمگیر قوتوں سے مقابلہ کرنا بے نتیجہ ہوتا۔ البتہ اس شجاعت و جرأت کے ساتھ صرف پیغمبر کے منجانب اللہ منتخب ہونے کی امداد الٰہی ہی ایسا سامان ہوسکتی ہے جو سوائے حضرت محمدؐ کے کسی اور کو حاصل نہ تھی اسلئے حضرت محمدؐ منتخب پیغمبر زمانہ کے لئے ایک مکمل ہدایت کے ساتھ انسانیت کی تکمیل کیلئے آخری پیغمبر کی حیثیت سے ایک مکمل دین لیکر آئے جسکے بعد اب پیغمبر کی دنیا کو ضرورت نہ رہیگی بہ نظر غور اس بات پر سوچنا ضروری ہے۔ اور یہ چیز تمام دنیا کیلئے ایک کھلی شہادت ہے کہ حضرت محمدؐ کے بعد کسی امت کسی فرد نے نہ پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا نہ کسی پیغمبر کی اب پیش گوئی کی جاتی ہے۔ بلکہ کسی پیغمبر کے آنے کا خیال ہر فرد کے دل سے محو ہو چکا ہے۔ زمانہ اپنی انتہائی ترقیوں کی طرف جا رہا ہے۔ مگر حضرت محمدؐ کا پیش کیا ہوا دین (قانون الٰہی) کسی مقام پر کسی ترقی کسی علم کی کمی میں عاجز نہیں ہوسکتا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذاتی کردار پر نظر ڈالی جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ آپ اپنی نبوت سے پیشتر بھی اعلےٰ خصائل کے حامل تھے۔ آپکو فطری طور۔ غلط روی۔ دنیا کے لغو اور فضول مشاغل سے نفرت تھی۔ بچپن کے زمانے میں آپکا مشغلہ گلہ بانی رہا۔ اس اثنا میں سوائے تنہائی اور پرسکوت ماحول کے کسی شہری ماحول کی طرف اِنکی رغبت نہ رہی جسکا اثر یہ تھا کہ تنہائی اور پرسکون ماحول میں فطرت کے فطری مناظر میں دلچسپی اور ان پر تفکر کی تحریک ہوتی رہی۔ جن سے احساسات میں لطافت و نزاکت کا فطری جوہر ترقی پذیر ہونا لازمی نتیجہ تھا۔ احساسات میں کیف آنے سے انسان کو خود بخود مناظر فطرت پر غور کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے۔ جہاں شہری شور و شغب اور دنیوی مشاغل سے دماغ فارغ ہو۔ وہاں ضروری ہے۔ کہ انسان کسی نہ کسی تصور کو

ذہن میں جگہ دیتا ہے۔اور وہ تصورارد گرد ماحول کی ہیئتوں پر کائنات کی تخلیق پر تفکراور واقعاتِ عالم ہی ہوتے ہیں۔یہی کیفیت تلاش حقیقت یا تفکر فی الآفاق کیلئے ابتدائی قدم ہوتی ہے۔اور اسی تصور کی بنیاد پر ایک مفکر کی جستجو کی راہیں استوار ہوتی ہیں۔

جس ہستی کو اعلےٰ نسب اور شرافت نسلاً ورثہ میں ملی ہو تنہائی میں اسکے یہی شریف جواہر روبکار آتے ہیں۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی انہیں اوصاف سے واسطہ تھا۔اور بیابانوں کے پر سکون ماحول میں انہیں سوائے مخلوق اور خالق کے تصور کے اور کوئی نئی چیز کا تصور نہیں آتا۔چنانچہ حضورؐ اکثر خاموش فضا میں اسی خالق ومخلوق کے تفکر میں مستغرق رہتے رہے۔یہ امر لازمی ہے کہ جب انسان خاموش۔تنہا ماحول کا عادی ہو جاتا ہے۔اُسے باقی شور وشغب اور لہو ولعب کے مشاغل بالکل پسند نہیں ہوتے۔حضورؐ چونکہ فطری طور پر سلیم الطبع اور حسن اخلاق کا مجسمہ تھے۔آپ نے اپنے تفکر میں کائنات ارضی پر تفکر کرتے ہوئے ایک خالق حقیقی کا وجدانی تصور پالیا جب حقیقت کا نور حضورؐ کے قلب مبارک میں چمک اٹھا۔تو لازمی تھا کہ انہیں ہر برائی اور دنیوی فضولیات سے نفرت ہوتی۔اور اس کا اثر یہ تھا کہ حضورؐ کو عرب میں مروجہ رسومات اور مخرب اخلاق مشاغل سے یکسر نفرت ہوئی اور آپ ان مجالس سے دور رہ کر زیادہ تر وقت تنہائی۔یکسوئی اور استغراق میں ایک کیف آور سرور حاصل کرنے میں تصرف کرتے۔عرب میں اسوقت جہالت۔بے حیائی۔لغویات اور مخرب اخلاق عادتوں کی نمائش ہوتی تھی۔مگر حضورؐ کو کبھی ان باتوں سے دلچسپی نہ رہی۔بلکہ ہمہ وقت اپنی قوم کی بدعادات اور غلط روی پر متاسف اور متنفر رہتے۔آپ میں قوم کی اس جہالت اور غلط روی کو دور کرنے کا جذبہ بڑھتا رہا۔اور آپکی کوشش یہی تھی کہ قوم اس تباہی سے بچ رہے۔

حضورؐ جوں جوں عمر میں بڑھتے گئے ان پر اپنی بسر اوقات کے لوازمات بھی بڑھتے گئے۔کیونکہ آپکا سوائے اپنے چچا ابوطالب کے اور کوئی مددگار نہ تھا۔چچا بھی اسقدر فارغ البال نہ تھے کہ آپکی ضروریات کو پورا کرسکتے لہذا رفتہ رفتہ آپکو دنیوی امور میں بھی دخل دینا پڑا۔چونکہ ابتداً

اِنکی تدبر و تفکر میں گزری اور اِنکی بنیادی تعلیم بھی فطرت کے تفکر سے ہوئی۔ اسلئے دنیوی مشاغل کے مضر اثرات آپ پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ آپ نے دنیوی معاملات میں بھی ایک مکمل انسان کی طرح میانہ روی اختیار کی۔ آپ میں۔ دیانتداری۔ امانت۔ سچائی اور بہترین اخلاق حد درجہ پائے گئے۔ چچا نے آپکو تجارت کی طرف لگایا۔ جس میں آپ نے نہایت دیانتداری اور ایمانداری سے صحیح اصولوں پر تجارت کی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تجارت میں اکثر متمول تاجروں نے انہیں مال کی امانت سپرد کی اور حضورؐ اس سلسلہ میں امین و صادق مشہور ہوئے۔

دیکھا گیا ہے۔ کہ انسان اپنی تدبیر سے بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن چند ایک ایسی خوبیاں انسان میں پائی جاتی ہیں۔ جن میں تدبیر کا دخل نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں فطری کہلاتی ہیں۔ مثلاً حسن صورت و سیرت۔ خوش بیانی۔ خوش گلوئی۔ اور کسی خصوصی صفت ''شاعری'' وغیرہ کا پایا جانا۔ انہیں اوصاف میں آپؐ کو حسن صورت و سیرت۔ خوش بیانی اور رسیلی آواز بدرجہ کمال حاصل تھا۔ ان اوصاف کی بدولت آپکے اخلاق حسنہ کے ساتھ ہر شخص کے دل میں حضورؐ کی محبت و عزت پیدا ہوتی۔ ہر شخص آپکی عزت کرتا۔ اور حضورؐ کی ہر ادا ہر ایک کو پسند تھی۔

عرب کا یہ زمانہ کچھ اس قسم کا فحش زمانہ تھا۔ کہ کسی قسم کی حقیقی خوبی کسی انسان میں نہ پائی جاتی تھی۔ اگر کسی میں کوئی فطری خوبی تھی بھی۔ تو وہ خوبی اِنکے قبیح افعال میں گم ہو جاتی۔ جہاں پر فحش گوئی۔ شراب۔ قمار بازی۔ اور لغو شعر و شاعری کا دور تھا۔ کسی نیکی اور حقیقی خوبصورتی کی طرف لوگ مائل نہ ہو سکتے تھے مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خوبیوں میں کچھ اسقدر خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ جن سے ہر شخص متاثر ہوتا۔ چنانچہ یہی فحش گو۔ زانی۔ قمار باز اور رذیل خیالات کے لوگ آپکے اخلاق جلیل سے متاثر ہو کر آپکو امین و صادق کہہ کر پکارتے تھے۔ اور حضورؐ کی ہر بات کی تائید کرتے۔ یہ چیز اس امر کی کافی دلیل ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خوبیاں ایسی خوبیاں تھیں جن میں کسی شک و شبہ اور کسی تصنع کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ لوگوں میں آپکی خوبیوں پر کسی قسم کی بد اعتمادی نہ تھی۔ آپ جو کچھ کہتے بلا چون و چرا ہر شخص اُس پر پورا اعتماد رکھکر تسلیم کر لیتا۔

چنانچہ ان اوصاف جلیلہ کی بدولت اکثر سردارانِ قوم جو اپنے کبر ونخوت کے زعم میں کسی ادنیٰ فریق سے بات کرنی عار سمجھتے تھے۔ آپ کی صغرسنی (قلیل عمر) میں آپ سے بعض اہم معاملات میں مشورہ لیتے اور حضورؐ انہیں مستقل رائے دیتے جسکا نتیجہ ہمیشہ بہتر پایا گیا۔ آپؐ کی عہد جوانی کا ایک مشہور واقعہ ہے جسکو تاریخی دنیا کبھی جھٹلا نہیں سکتی۔ یہ واقعہ بیت اللہ کی تعمیر کا ہے۔ جب بیت اللہ (کعبہ) کی ازسرِ نو تعمیر کی گئی۔ اس تعمیر میں تمام قبائل عرب مساوی حیثیت میں شریک رہے۔ کیونکہ بیت اللہ کی عظمت ہر قوم میں ابتدأ سے چلی آتی تھی بیت اللہ کی تکمیل پر حجر اسود کو مقامِ مخصوص پر نصب کرنا تھا۔ ہر قبیلہ کی یہی خواہش تھی کہ یہ شرف ہمیں ہی حاصل ہو۔ یہ معاملہ نہایت نازک صورت اختیار کر گیا۔ اور قبائل میں نزاع پیدا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ تلواریں میانوں سے نکلکر تمام عرب میں ایک خونریز جنگ کا آغاز ہونے والا تھا۔ اور لاکھوں جانیں قتل ہونے کا احتمال تھا۔ اس خوفناک آغاز کا احساس لوگوں کو ہوا۔ کہ اگر ہر قبیلہ اپنی اپنی ضد پر اڑا رہا تو یقینی طور پر لاکھوں کا خون ضائع ہوگا۔ آخر ایک متفقہ کانفرنس ہوئی جس میں یہ طے پایا۔ کہ اس مسئلہ کو کسی نہ کسی طرح سلجھایا جائے۔ تمام قبائل کے سردار اس مسئلہ کو سلجھانے میں ناکام رہے۔ فیصلہ اس امر پر ہوا۔ کہ جو شخص علے الصبح سب سے پہلے بیت اللہ میں داخل ہو اُسی کو ہم سب سردار اپنا حکم مقرر کرینگے۔ جو کچھ وہ فیصلہ کرے وہ فیصلہ ہر ایک کو منظور ہوگا۔ جس قبیلہ کو وہ شخص یہ کام سپرد کرے وہی حجر الاسود کو نصب کریگا باقی قبائل اس شرکت سے محروم رہینگے۔ چنانچہ دوسرے دن علے الصبح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سب سے پہلے بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ تو ہر طرف خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔ ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں کہ امین آیا! صادق آیا!!! اور ہر شخص مطمئن نظر آنے لگا کہ اب معاملہ ہر صورت میں تسلی بخش نتائج پیدا کریگا۔ جب حضورؐ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا۔ تو حضورؐ نے بغیر کسی سوچ بچار کے فوراً کہدیا کہ ہماری معیت میں سب سردارانِ قوم چلے آئیں۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک چادر میں حجر اسود کو رکھکر تمام سردارانِ قوم سے کہا کہ اب ہر سردار اس چادر کو اٹھا کر نصب ہونے کے مقام پر پہنچائیں۔ اسطرح ہر شخص اس شرف سے

مساوی حیثیت میں مشرف ہوا۔نصب کرنے کے مقام پر پہنچکر حضورؐ نے خود حجر الاسود کو اٹھا کر مقامِ مخصوص پر نصب کر دیا۔اس طرح حضورؐ نے ایک نیک فال سے ابتداء کی کہ آپکی ذات سے بیت اللہ کی تکمیل از سرنو قرار پائی اور اس حسنِ تکمیل سے قوموں کی خونریزی اور دنیوی فساد ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا۔اسطرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی۔آپکی ابتدائی زندگی میں ہر قوم کو راہنمائی حاصل ہوئی۔اور دنیا میں فساد و خونریزی دفع کرنے کا یہ پہلا سبق تھا جو حضوؐر کی ذات گرامی سے انسان کو حاصل ہوا۔اس واقعہ سے تمام عرب کے قبائل حضوؐر کا عزت واحترام کرنے لگے۔اور ہر اہم معاملہ میں حضوؐر کا مشورہ حاصل کرنے لگے۔گو حضوؐر کی عمر مبارک ابھی ابتدائی دور سے گزر رہی تھی مگر عرب کے جہاندیدہ اور معمر لوگ بھی اس امین وصادق کے سامنے جھک گئے۔یہ چیز حضورؐ کے ذاتی کردار کیلئے ایک عظیم الشان دلیل ہے۔کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کبھی اپنی ذاتی اغراض کیلئے کسی فوقیت کسی سرداری یا امارت کو حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے۔

دوسرا واقعہ بھی تواریخ میں ایک اہمیت رکھتا ہے۔کہ جن لوگوں میں ابھی انحراف۔خود سری۔اور فحش بدستور قائم تھا۔انہیں لوگوں کو حضوؐر کی ذات گرامی نے اتنا متاثر کیا۔کہ لوگوں کو قوموں کے غلط طریق محسوس ہونے لگے۔حضورؐ نے ایک انجمن (انجمن قیام امن ونگرانی حقوق) قائم کرنے کا مشورہ دیا یعنی بری عادات اور وقت کی مخرب اخلاق رسوم وعادات کو یکسر ختم کرنا۔اور دوسروں کو بھی باز رکھنے کی کوشش کرنا۔بے امنی۔راستوں کا خطرناک ہونا۔مسافروں کا لٹنا۔غریبوں پر زبردستوں کے مظالم بند کرنا وغیرہ ایسی باتیں تھیں جنکا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مفصل تقریر میں سب کو احساس دلایا۔اور سب اس بات پر متفق ہو گئے۔جس میں بنو ہاشم۔بنو المطلب۔بنو اسد۔بنو زہرہ۔بنو تمیم شامل ہوئے۔اس انجمن کے ممبروں نے اس بات پر مکمل عہد حضوؐر کے سامنے کیا اور حضوؐر کو ہی اس انجمن کا صدر مقرر کر کے آپکے سامنے یہ اقرار کیا۔کہ

(۱) ہم ملک سے بدامنی دور کریں گے۔(۲) ہم مسافروں کی حفاظت کریں گے۔(۳) ہم غریبوں کی امداد کریں گے اور ہر ایک کے حقوق کی حفاظت کریں گے۔زبردست کو زیردست پر ظلم

کرنے سے روکیں گے۔[1]

واضح ہو کہ جہاں عرب کے لوگ ظلم و جہالت میں حد درجہ گزرے ہوئے تھے۔ وہاں انمیں غیرت اور عہد کی پابندی کا اسقدر احساس و پاس ہوتا تھا۔ کہ اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس تدبیرِ احسن سے انسانی دنیا میں امن وفلاح کی تدبیر ہوئی جس سے انسانی جانیں محفوظ و مامون ہوئیں۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ حضورؐ فطری طور انسان کی فلاح و امن کا مادّہ لیکر آئے آپ نے جو قدم بھی اٹھایا وہ آپکی اغراض سے وابستہ نہ تھا۔ بلکہ آپکا ہر اقدام صرف انسانی بہبودی کیلئے تھا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے دو دور تھے۔ ابتدائی بچپن کا دور۔ جس پر انسان کی آئندہ زندگی کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ زمانہ آپکا خالص تھا۔ تنہائی۔ اور سکوت کے ماحول میں آپکے مشاغل مناظر فطرت پر تفکر میں گزرا۔ اور جوانی کے زمانہ میں دنیوی مشاغل میں قوم کی اصلاح کی طرف مائل رہے۔ قوم کی غلط روی کو نفرت سے دیکھتے رہے۔ اور انکی اصلاح کرتے رہے۔ باوجود ان مشاغل کے چونکہ ابتداً میں آپکی طبیعت تفکر کی طرف مائل تھی۔ اسلئے آپکا اکثر وقت اب بھی تنہائی و تفکر کی طرف ہی رجوع رہا۔ دنیوی ضروریات کی طرف جب متوجہ ہوتے تو پوری امانت و دیانت سے کام لیتے۔ اور جب تنہائی میں جاتے تو تفکر استغراق میں اسقدر منہمک رہتے گویا دنیوی ضروریات کا احساس بھی نہ رہتا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب عرب خصوصاً مکہ کے لوگ اپنی تجارتوں میں دنیا کی قوموں سے سبقت لے چکے تھے۔ حضورؐ کی تجارت ایک نئے انداز سے تھی۔ نہ زیادہ نفع اندوزی تھی۔ نہ دھوکہ و فریب تھا۔ اس پر بھی لوگ انکے حسنِ اخلاق حسنِ تدبر سے متاثر تھے۔ چنانچہ عرب کی ایک متمول

---

[1] انگلستان میں نائٹ ہڈ کا آرڈر جس کے ممبر قریباً یہی اقرار کرتے تھے اس انجمن کے کئی صدیوں بعد قائم ہوا (ماخوذ از رحمۃ للعٰلمین)

خاتون حضرت خدیجہؓ نے جو کہ معزز و متمول تاجرہ مشہور تھیں حضورؐ کے اعلےٰ خصائل سے متاثر ہوئیں اور حضورؐ کو اپنے تجارت کے مال فروخت کرنے کی پیش کش کی۔ حضورؐ نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ اسنے حضورؐ کو اپنے تمام مال پر کلی اختیار دیا۔ اور بیرونی ممالک میں بغرض تجارت بھیجدیا۔ اور آپکی ہمراہی میں اپنا ایک خاص معتمد غلام بھیجدیا۔ اسطرح حضورؐ کی نگرانی میں تجارت کرنے سے حضرت خدیجہؓ کو بیحد منافع ہوا۔ اور حضرت خدیجہؓ نے بھی لین دین کے معاملہ میں آپکو حد درجہ صادق وامانت دار پایا۔ حضرت خدیجہؓ خود بھی ایک انسان شناس دانا عورت تھیں۔ انہیں حضورؐ کے خصائلِ حمیدہ میں بہت سی کرنوں کی جھلک محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے حضورؐ کو نکاح کی دعوت دی۔ حضورؐ نے اپنے چچا ابو طالب سے ذکر کیا۔ انہوں نے تائید کی اور حضورؐ کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ہوا۔ اُسوقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر شریف پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال اس تناسب سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیوی معاملات میں کس قدر اپنی ذاتی اغراض کو کام میں لاتے تھے۔ دنیا پرستی۔ جاہ طلبی انسان کو غرض مند بنادیتی ہے۔ مگر جس ہستی کا وجود مجسم پاکیزگی ہو اُسکے لئے دنیوی جاہ ایک بے معنی شے ہوتی ہے۔ اس شادی سے حضورؐ کو صرف اس قدر فرق ہوا۔ کہ حضورؐ کو دنیوی مشاغل سے کسی قدر فرصت ملی اسکے بعد حضورؐ کا سارا وقت تفکر وعبادت اور بنی آدم کی فلاح و بہبود میں صرف ہونے لگا۔ دنیا طلبی کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضورؐ کو ایسی متمول خاتون کے حاصل ہونے کے بعد اپنی دنیوی زندگی کو عروج دینے کا بہترین موقع تھا۔ کہ تجارت اور دولت کثیر سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرتے۔ حالانکہ یہ امر بھی کوئی عیب نہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر حضورؐ نے اس واقعہ سے صرف اتنا ہی فائدہ اٹھایا۔ کہ اپنی تفکر کی دنیا میں زیادہ دیر مستغرق رہنے کی مہلت حاصل کی۔ تواریخ اس بات کی شاہد ہے۔ کہ بعثت (پیغمبری) کے زمانہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس متمول خاتون کے ساتھ دنوں فاقے گزارتے رہے۔ حالانکہ انکے پاس ذاتی دولت اسقدر تھی کہ سالہا سال خرچ کرنے کے لئے کافی تھی۔ مگر حضورؐ سے نکاح کے بعد یہ تمام دولت بنی آدم کے اصلاحی کاموں میں صرف کر کے خود کو قناعت و فاقہ پر بخوشی

آمادہ کرلیا۔ اب ان حالات کی بناء پر یہ اعتراض ایک مبالغہ ہے۔ کہ حضورؐ نے شاید امارت یا دولت کے حصول کے لئے حضرت خدیجہؓ سے نکاح کرنا قبول کرلیا ہو۔

نکاح کے بعد حضورؐ دنیوی ضروریات سے فارغ تھے۔ اتنی ملکیت حاصل ہونے کے بعد بھی حضورؐ اپنی ضرورت خود مہیا کرتے اور "ضرورت بھی کیا تھی ایک نان جویں۔ یا جو کے ستو کی ایک قلیل مقدار" البتہ اپنی ضرورت پوری کرنے میں آسانی اور وقت کی بچت ہوئی۔ کیونکہ حضورؐ خود بھی زمانہ کے جہاندیدہ تاجروں میں سے تھے۔ انہیں اپنی قلیل ضرورت حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آسکتی تھی۔ اب آپکی ضرورت قلیل تھی اور جب دنیا سے فارغ رہتے تو جو کے ستو کی ایک تھیلی لیکر شہر سے دور غار حرا کی تنہائی میں تفکر و عبادت اور خالق کی جستجو میں مہینے گزار دیتے۔

انسان کو تفکر کرنا ضروری ہے۔ وہ کائنات اور اسکی تخلیق پر غور کرے۔ اسکے لئے تنہا اور پرسکون ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ دل و دماغ بیرونی تفکرات اور خیالات سے خالی رہے۔ اور ایک ہی مسئلہ کے حل کرنے میں دماغ کو جولانی کا موقع مل سکے۔ تفکر سے کیا ہوتا ہے؟ تفکر کسی شے کی اصل ـــــ کسی معاملہ کی تہ کو حاصل کرنے کیلئے اسکے منبع (بنیاد) کی طرف رجوع (کھوج) کرنے سے ذہن قلب و حافظہ کے Connection (توسط) سے ایک راہ نکال لیتا ہے۔ جس میں ایک تخیلی (تصوراتی) شکل پیدا ہو کر ایک وجدانی احساس پیدا ہوتا ہے۔ جسے استغراق کہتے ہیں۔

انسان کے احساسات جب لطیف ہو جائیں۔ اسکے ساتھ ہی وہ کسی معاملہ پر غور کرنا شروع کردے تو اس پر استغراق و بیخودی کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت اسقدر بڑھ جاتی ہے۔ کہ ایک وقت انسان سوچتے سوچتے دنیا و مافیہا سے بیخبر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب انسان کسی بھی معاملہ میں عمیق غور کرنا شروع کرتا ہے۔ تو اسے اردگرد ماحول کا شوروشغب۔ یا دیگر مشاغل اسکی یکسوئی میں رکاوٹ ڈالدیتے ہیں۔ تو وہ تنہائی اختیار کرتا ہے۔ تنہائی میں سوچنے سے وہ اسقدر محو ہو جاتا ہے۔ کہ اپنے ارگرد ماحول سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس محویت اور بیخبری کا

یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ انسان کے تصور میں قلب وشعور[1] کے ربط سے ایک خیالی دنیا قائم ہو جاتی ہے۔ اور جب حقیقت کی دنیا پر تفکر کیا جائے تو انسان کے تخیل کے ساتھ حقیقی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقی رنگ کیا ہے؟ ـــــ اُسی خالقِ لامحدود کی تابانی دنیا سامنے آجاتی ہے۔ جس میں مجسم نورانی کیفیتیں واقع ہوتی ہیں۔ جو ظاہری نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں۔ جن کے ادراک کیلئے انسان میں۔ قلب وشعور کے ساتھ ساتھ ایک نورانی کیفیت (قوت) یعنی روح ہوتی ہے۔ یہ روح انسانی ذہن میں شعور کو آگاہ کرتی ہے ـــــ تنہائی میں جب استغراقی کیفیت طاری ہو تو انسان کے ظاہری حواس اپنا عمل چھوڑ دیتے ہیں۔ اسوقت ایک تصوراتی دنیا سامنے ہوتی ہے۔ جسے روح محسوس کرتی ہے۔ اور یہ دنیا ایک نورانی کیفیت میں (تمثیلی اشکال میں) متشکل ہو جاتی ہے۔ اسلئے انسان اپنے نورانی خواص سے ہی ان انوار (نور) کو محسوس کرتا ہے۔

پیغمبر چونکہ منتخب ہوتا ہے۔ اسکے لئے ان انوار کی واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ اسلئے ابتداء پیغمبر کو بھی مخلوق۔ خالق۔ کی تخلیق کا پے در پے مشاہدہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خالق اسے اپنے تمام نورانی مراحل سے آگاہ کرتا جاتا ہے۔ یہی کیفیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہوتی رہی۔ تنہائی میں تفکر سے آپ کے سامنے نورانی کیفیات کا ظہور ہونے لگا۔ بعثت سے سات سال قبل جبکہ آپ کو اسی قسم کے انوار کی جھلکیں محسوس ہوتی رہیں۔ تو یہ انوار ظاہری حسن سے افضل ہے۔ اسلئے آپؐ اسی روشنی کے دیکھنے کے ہر وقت مشتاق رہتے۔ ان کیفیات کے ورود سے آپؐ میں خلوت گزینی کی عادت بڑھتی گئی۔ آخر آپؐ نے مکہ سے باہر جبل نور کے مقام پر ایک غار جسے ''غارِ حرا'' کہتے ہیں۔ منتخب کر کے اکثر اوقات اسی غار میں تفکر واستغراق میں بسر کرتے۔ کچھ عرصہ گھر میں رہنے کے بعد کچھ ستو اور پانی ہمراہ لیکر مہینوں اسی غار میں مصروف استغراق ومشاہدہ رہتے۔

---

[1] شعور کی تشریح آگے آئیگی۔

جب آنحضرتؐ کی عمر چالیس سال سے اوپر ہوئی تو حضورؐ کے انتخاب کا وہ دن آیا جس دن آپکو خلعت پیغمبری دیکر دنیا کی فلاح وسعادت کے لئے ظاہری طور تیار کیا گیا۔ واقع یہ ہوا کہ حقیقت نے اپنے پورے جمال کے ساتھ اپنی نورانی دنیا کا دروازہ کھول دیا۔ یہ نورانیت اگرچہ حضورؐ کیلئے وقف کردی گئی تھی۔ لیکن ابتدائی اجنبیت کے باعث حضورؐ پر اسکا اثر ہوا۔ اور آپ کو اس وفورِ تجلی سے بخار کی سی کیفیت محسوس ہوئی گھر آئے۔ حضرت خدیجہؓ سے ذکر کیا۔ کہ ہم پر نورانی کیفیتوں کا اسقدر ظہور ہو رہا ہے۔ کہ ہمارا وجود انکی تاب کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ جسوجہ سے جسم بھی اسی نورانی کیفیت میں گُھل کر بخار کی سی کیفیت محسوس کر رہا ہے۔ احتمال ہے کہ کہیں جسم بھی اس نورانی تجلی میں سما کر فنا نہ ہو جائے۔ گھر آکر لیٹ گئے اور آپکو بخار کی سردی سی کپکپی محسوس ہونے لگی۔ حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی حالت دیکھکر گھبرا گئیں۔ حضرت خدیجہؓ نے آپکو تسلی دینے کیلئے جن باتوں کا اظہار کیا ان سے معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ حضورؐ کی صداقت اور پیغمبری کیلئے یہ ثبوت کافی ہے۔

حضرت خدیجہ الکبریٰؓ نے کہا۔ آپکو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ پر قدرت کا انعام ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی ــــ کیونکہ آپ اقربا پر شفقت کرتے ہیں ــــ سچ بولتے ہیں ــــ رانڈوں بیکسوں کی دستگیری کرتے ہیں ــــ مہمان نوازی فرماتے ہیں ــــ مصیبت زدوں سے ہمدردی کرتے ہیں۔ اللہ آپکو کبھی اندوہگیں نہ کریگا۔

یہ ہیں وہ الفاظ جن سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ابتدائی زندگی میں شرافت۔ صداقت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایسے پیغمبر کی زبانی جو لفظ بھی نکلیں وہ کسی بھی صورت میں جھوٹ یا ذاتی اغراض کی بناء پر نہیں ہوسکتے۔ جس ہستی کی صداقت پر عرب کے وہ فحش گو اور انحراف سے پر۔ غیر مہذب لوگ اعتماد کریں۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ اسکی زبان سے نکلے ہوئے احکام (الفاظ) غلط یا خودساختہ ہوں۔

حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ اسلام کے پیغمبر ہیں۔ اور اسلام کی تعلیم کا اجرا آپکی ہی ذات مقدس سے ہوا۔ جو کچھ اسلام میں تعلیم ہے۔ وہ آپکی ذات کے اعتبار سے

منجانب اللہ ہے اور آپکو بذریعہ وحی آتی رہی۔ جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتی کوئی اختراع شامل نہیں۔

ہر انسان اپنے وقت میں ذاتی عروج حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسکے لئے دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو دنیاوی ذرائع سے عروج حاصل کرے۔ مال و دولت کی وسعت۔ یا ذاتی طاقت سے غلبہ حاصل کر کے حکمران ہو۔ دوسری صورت دینی لحاظ سے ہوسکتی ہے۔ جسکے لئے ایک واحد آدمی اپنی قابلیت کے بل بوتے پر پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ پہلی صورت میں انسان اپنے تدبر و عقلمندی سے کام لیکر دنیا پر غلبہ حاصل کرسکتا ہے۔ اس میں بھی اگر نیک نیتی اور اعتدال ہو تو بہتر نتیجہ پیدا ہوسکتا ہے۔ اگر جبر و استبداد سے غلبہ حاصل کیا جائے تو اس میں بھی کامیابی ہوسکتی ہے۔ لیکن انجام کار اسکا بہتر نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا۔ لیکن دعویٰ پیغمبری کرنا تدبر و عقل سے نہیں ہوسکتا۔ اس میں اگر عقل اور تدبر سے کام لیا جائے تو آخر کار ناکامی ہوتی ہے۔ خالص پیغمبری کیلئے کوئی تدبر کوئی عقل کوئی جبر و استبداد کوئی حیلہ چالاکی کارآمد نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اسکا تعلق طاقت سے نہیں ہوتا بلکہ مافوق الفطرت قوت سے ہوتا ہے۔ جس میں پیغمبر کے ذاتی کردار کو کافی دخل ہوتا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذاتی کردار کا اجمالی خاکہ: حضورؐ کی بعثت سے قبل زمانہ کے حالات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ آپؐ ایک عالی نسب خاندان سے تھے۔ آپکے قریبی پشتوں میں سے آپکے اجداد کا گو امیرانہ گزر نہ تھا۔ تاہم ذاتی قابلیت و شرافت سے قوموں کے معزز سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی باقی قبیلوں کے مقابلہ میں اپنے قریبی رشتہ داروں کی حمایت اور امیرانہ وجاہت سے خالی تھے۔ صرف حضورؐ کی ذاتی شرافت اور اعلےٰ خصائل سے ہی آپنے جملہ قبائل میں ممتاز درجہ حاصل کیا۔ حضرت خدیجہؓ جیسی زمانہ کی متمول خاتون سے نکاح کے بعد اگر آپؐ دنیوی عروج حاصل کرنا چاہتے تو اپنی ذاتی شرافت کے ذریعہ وہ تمام عرب پر بھی حکمرانانہ غلبہ حاصل کرسکتے۔ جبکہ عرب کی اکثر قومیں بعثت سے قبل بھی آپکو اپنا سردار اور حکم تسلیم کر رہی تھیں۔ اگر حضورؐ اپنی ذاتی اغراض کے تحت دنیوی غلبہ کے خواہشمند ہوتے تو آپؐ

کیلئے یہ موقع بہت کافی تھا۔عرب کے تمام قبائل آپکو اپنا سردار تسلیم کر کے اپنی جانیں نچھاور کرنے پر آمادہ تھے۔مگر یہ غلبہ فطرۃ کے خلاف تھا۔کیونکہ زمانہ میں انسان تخریب کی طرف جارہا تھا۔اسکے لئے اصلاح کی ضرورت تھی۔یہ وقت حصول دولت وحکمرانی کا نہ تھا۔لوگوں پر حکمرانی اور دولت حاصل کرنے کی کافی تدبیریں میسر تھیں۔لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مطمح نظر اپنی ضرورت نہ تھی بلکہ ان غلط راہ لوگوں کی اصلاح وفلاح وسعادت تھی۔اور زمانہ اسی چیز کا محتاج تھا۔زمانہ اپنی روش پر جاتا حضورؐ کی معیت میں شریف کی عزت محفوظ ہو جاتی۔مظلوم کو حمایت حاصل ہو جاتی۔قوم آسودہ ہو جاتی امن وامان بھی ملتا اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو بادشاہت مل جاتی مگر انسان کو اپنا نصب العین نہ ملتا۔جسکے لئے حضرت محمدؐ رسول اللہ منتخب ومبعوث ہوئے تھے۔اسی ضرورت کو آپنے منجانب اللہ پورا کرنا تھا۔اور آپکا مقصود بھی بادشاہت نہ تھی بلکہ تمام مخلوق کی اصلاح وسعادت تھی یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے۔کہ جب آپکو دنیوی امارت وعروج مفت مل رہا تھا تو آپکو پیغمبری دعویٰ کرنے سے عروج حاصل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذاتی کردار اس امر کی بین دلیل ہے کہ آپؐ کی ذات مقدس صرف انسانی فلاح وسعادت کیلئے ہی وقف اور منتخب تھی۔

آپؐ نے چالیس سال کی عمر میں پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب آپؐ غلبہ ومال دونوں صورتوں میں ترقی پر تھے۔مگر حضورؐ نے ان میں سے کسی قوت کو خاطر میں نہ لایا۔اور پیغمبر ہونے کے بعد بھی تواریخ شاہد ہے کہ آپؐ نے یتیموں کی پرورش۔بیکسوں بیواؤں کی مدد۔مظلوموں کی حمایت کی۔باوجود لاتعداد دولت حاصل کرنے کے بھی۔دولت اور مرغن غذاؤں آرام دہ بستروں کی رغبت نہ کی بلکہ اکثر جو کے ستو۔اور فاقوں پر ہی قناعت کیا۔جس قوم نے۔امین۔صادق۔اور اپنا حکم تسلیم کیا۔دعوئے پیغمبری کرتے ہی سب بدل گئے۔زمانہ مخالف ہوا۔ایذائیں پہنچائیں۔تیہ (شعب ابی طالب) کے مقام پر تین سال محبوس کردیا۔ــــ پتھراؤ کیا۔گالیاں دیں۔گلے میں پھندے ڈالے۔بالآخر آپکو گھر میں محصور کر کے قتل کرنے پر آئے۔مگر حضورؐ نے اپنی نبوت کا اعلان جاری رکھا ــــ بھلا نبوت کا اعلان کرنے سے ان میں کیا نئی چیز

آئی ؟ ــــــ وہی امین جو لوگوں کی چیزیں امانت رکھتے ۔ وہی صادق جنکے ہر لفظ پر بغیر تحقیق اعتماد کیا جاتا ۔ آج اعلان نبوت پر آپکی صداقت بھی بھول گئے ــــــ ! اور مدتوں اس عزیز قومی جوان سے متنفر ہو گئے ۔ !! بھلا وہ تو سرداری بھی تسلیم کرتے تھے ۔ پھر مخالفت لینے کی ضرورت کیا تھی ؟

ــــــ وہ چیز یہ تھی کہ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْــًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۶۴) یعنی اے اہل کتاب ۔ آؤ ــــــ ایسی بات پر اتفاق کریں ۔ جو ہمارے تمہارے درمیان مساوی ہے ۔ یعنی خدا کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کریں ۔ اور کسی چیز کو بھی اسکا شریک نہ ٹھہرائیں ۔ اور خدا کے سوا خدائی کا درجہ ہم اپنے جیسے انسانوں کیلئے تجویز نہ کریں ۔ گو پیغمبر اپنے قانون الٰہی ــــــ تعلیم الٰہی کو جاری کرنا چاہتا تھا ۔ جس سے ۔ انحراف ۔ غلط روی ۔ ظلم و ستم ۔ ناجائز حصول ۔ جاہ پرستی ۔ خود غرضی کا قلع قمع ہوتا تھا ۔ ایک شخص اپنی جان دینے پر تیار ہوتا ہے ۔ مگر اپنے دل کی من مانی مٹتی دیکھکر برداشت نہیں کرسکتا ۔ وہ جانتے کہ صادق سچ کہتا ہے ۔ اب ہماری تمام طاغوتی قوتیں ختم ہونگی ۔ ہمیں یکسر ایک خدا کی غلامی میں اسکے قانون کے آگے جھک جانا پڑیگا ۔ آقا و غلام کے درمیان برتری و کمتری ختم ہوگی ۔ ہمارے اٹھنے بیٹھنے اور حصولِ دولت میں من مانی کرنے میں ایک پابندی ہوگی ۔ یہ چیز نفس پرستوں کیلئے نا قابل برداشت امر تھا ۔ عرب کے تمام سرداروں کو جب یہ آگ بڑھکتی نظر آئی تو انہوں نے حضورؐ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی ۔ اور اِنہیں اس نئے دین کے طوفانی انقلاب کا شدت سے احساس ہوا ۔ کیونکہ زمانہ اپنی پہلی رفتار میں کئی حادثات پیش کر چکا تھا ۔ لوگ حضرت ابراہیمؑ ۔ نوحؑ ۔ لوطؑ ۔ موسیٰؑ کے واقعات کو سن چکے تھے اور وہ ان واقعات کے اثرات سے خائف تھے ۔ چنانچہ انہوں نے مشورہ کیا کہ کسی طرح اس تحریک سے حضورؐ کو باز رکھیں ۔ عرب کے غیرت مند ممتاز سردار جو ایک ادنیٰ پوزیشن کے انسان سے کیا اپنے برابر کے انسان کی برابر کی شان دیکھنا برداشت نہ کرتے تھے ۔ حضورؐ کے سامنے جھک گئے اور کہا ۔ کہ اگر آپ دولت چاہتے ہیں تو جتنی دولت ہمارے پاس موجود ہے سب آپکے حوالے کرنے

پر تیار ہیں۔ اگر آپ امارت چاہتے ہیں تو ہم پہلے ہی آپکو اپنا امیر و سردار تسلیم کر چکے ہیں۔ اگر آپ خوبصورت عورتیں چاہتے ہیں۔ تو تمام قبائل عرب کے سرداروں کی جولڑکی آپکو پسند ہو ہم حاضر کرنے کو تیار ہیں۔ مگر حضورؐ نے صرف یہ جواب دیا۔ کہ اگر تم ایک ہاتھ میں چاند اور ایک ہاتھ میں سورج لا کر رکھدو تو تب بھی میں ان کی خواہش نہ رکھونگا۔ ہمیں تو قانون الٰہی کا اجرا کرنا ہے ! جس میں انسانیت کو فلاح و سعادت نصیب ہو۔ یہ واقعہ اس بات کی بین شہادت ہے کہ ___ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک خصوصی کام کی تکمیل کے لئے آئے جس میں آپکی ذاتی نفس پرستی یا غرض کا کوئی دخل نہ تھا۔

عرب کی جاہل قومیں جنگجو قومیں تھیں۔ جانوروں کے پانی پینے پر تلواریں نکالتے تھے۔ ایک دوسرے کی ہجو کہنے پر قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا تھا۔ اب یہ حالت ہے۔ کہ ایک یتیم۔ بے خانماں۔ جسکا کوئی سہارا نہیں۔ اپنے بھی منہ پھیر جاتے ہیں۔ نہ دولت ہے۔ نہ سرداری ہے۔ نہ امارت ہے۔ نہ ہی وہ پہلا سا وقار ہے اب ___ ان خونخوار تلواروں میں کیوں آب و تاب نہیں؟ کہ ایسی بے مایہ ہستی کو ایک آن میں ختم کر دیتے۔ ! یہ پیغمبرانہ قوت و جلال اور نصرتِ الٰہی کا مظاہرہ ہے۔ کہ ایک طرف غالب منحرف قوتیں برسرآزار ہیں۔ دوسری طرف حضوؐر کا جوشِ نبوت بڑھتا جاتا ہے۔ جہاں ایک انسان کو سر چھپانے کا موقع نہ مل سکتا ہو بھلا وہاں اسکی حمایت کی جرأت کون کر سکتا ہے۔ اور پھر عرب اور مکہ میں جہاں قتل و خونریزی انکی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہو۔ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ برعکس اسکے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حقانی آواز کا ہر ادنیٰ و اعلیٰ پر برابر اثر ہوتا جارہا ہے۔ کہیں ابوبکرؓ صادق کے فیض سے صدیق کا خطاب پانے کو ہیں۔ کہیں بلالؓ حبشی غلام تپتے ریگزاروں پر احد احد کے نعرے لگا رہا ہے۔ کہیں صہیبؓ رومی غلام۔ رسول اللہ کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ باوجود انتہائی مظالم کے دل پتھر کئے ہوئے ایک پیغمبر کی حمایت سے منہ نہیں موڑتے۔ یہاں تک کہ اسی نشہء سرمدی میں جان دے دیتے ہیں۔ اگر غلاموں کو آزادی اور مظالم کی نجات نے آمادہ کیا تو پھر بغیر حصولِ مطلب جان دینے کے کیا معنی ___؟!

گزشتہ پیغمبروں کو کامیابی کا موقع جب ملا۔ جب انہیں حکومتوں کی حمایت حاصل ہوئی۔ اور یہاں غلاموں کی حمایت نے دنیا کے جابروں کے تشدد کے پرخچے اڑا دئے جب کہ انہوں نے دیکھا کہ یہ دیوانے لوہے کی گرم سلاخوں سے۔ پتھر کی چٹانوں سے زیادہ اپنا ایمان مستحکم کر چکے ہیں یہ چیز ان جابروں کیلئے یقینی طور مافوق الفطرت تھی۔ یہ چیز پیغمبر کی پیغمبرانہ قوت کا مظاہر تھی۔ جسے کفارِ عرب نے سمجھکر تسلیم کیا۔ کہ یہ سحر ہے۔ ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْن" انہیں انحراف و باطل پرستی نے اس بات پر آمادہ نہ کیا کہ وہ پیغمبر کو پیغمبر مانتے۔ اور نتیجہ یہ ہوا۔ کہ باطل قوتیں پسپا ہونے لگیں۔ کفار کو ہر طرف سے شکست کھانی پڑی۔ ہزاروں کی تعداد ـــ لاکھوں کی تعداد تین سو تیرہ کے مقابلہ میں شکست کھا گئے اور اسلام بغیر کسی حکمران حمایت کے عالمگیر قوت حاصل کرنے لگا۔ مدینہ شریف میں حضورؐ نے ہجرت کی تو مخالفین نے بے شمار حملے کئے۔ مگر سب کے سب ناکام رہے حالانکہ اسوقت مسلمانوں کے پاس مخالفین کے مقابلہ میں نہ پوری فوج تھی۔ نہ گھوڑے اونٹ تھے۔ نہ ہی سامان جنگ پورا ہوتا تھا۔ باوجود اسکے بھی ایک قلیل تعداد بے سروسامان جماعت ہزاروں کی تعداد فوج کو شکست دیتے رہے۔ اور اِن معرکوں میں کفار کے بے شمار لوگ قیدی کئے جاتے۔ لطف یہ کہ اکثر قیدی بغیر معاوضہ لئے رہا کر دئے جاتے۔ یہ اسلئے ہوتا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقصد جنگ نہ تھا بلکہ مخالفین خود حملہ آور ہوتے۔ آپکا مقصد تو انسان کی فلاح وسعادت ہی تھا اور آخر فتح مکہ کا آخری واقعہ دنیا کے سامنے پیش ہوا۔ جس نے دنیا کو دکھا دیا کہ محمد رسول اللہؐ برحق پیغمبر ہیں اور آپکا مقصد جبر و استبداد سے حکمرانی کرنا نہیں بلکہ انسان کو انسانیت کے مقام پر لانا ہے۔ اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ آپؐ کسی سرداری۔ بادشاہت۔ جاہ و حشمت کیلئے نہیں۔ بلکہ منجانب اللہ پیغمبر ہو کر فلاح انسانی کیلئے مبعوث ہوئے ہیں۔ تواریخ شاہد ہے۔ کہ ایک لاکھ مسلمانوں کا قافلہ جب مکہ میں فتح و نصرت کے ساتھ داخل ہوا تو حضورؐ کیلئے یہ بہتر موقع تھا کہ اپنے مخالفین کی زہرہ گداز اذیتوں کا آج انتقام لیتے۔ مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دوران سفر ہی یہ اعلان کر دیا تھا۔ کہ آج کسی شخص پر تلوار نہ اٹھائی جائے۔ کیونکہ آج حق۔ باطل پر غالب آچکا ہے۔

جسکے لئے ہمیں مبعوث کیا گیا ہے آج حق باطل پر کلی طور غالب آ چکا ہے۔اب تلوار کا زور بھی ختم ہوا۔لہذا تلوار کی ضرورت نہ رہی۔اسلئے کسی کو قتل نہ کیا جائے اس سے بڑھکر کیا پیغمبرانہ سطوت کا مظاہرہ ہوسکتا ہے۔کہ ابوسفیان جس نے ابتدأ سے لیکر انتہا تک حضورؐ کو تکلیفیں پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔مسلمان اور اسلام کو مٹانے کیلئے قسمیں کھا کھا کر لشکر کشی کرتا رہا۔مقرب اور عزیز ہستیوں کا داغ حضورؐ کے دل مبارک کو پہنچایا۔مگر حضورؐ نے اعلان کر دیا۔کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اس کو کلی طور امان دی جاتی ہے۔مکہ میں داخل ہو کر بیت اللہ کی عظمت کو رسول کے دست مبارک از سر نو تازہ کرتے ہیں۔دربار شاہی لگتا ہے۔زمین و آسمان پر وہ پیغمبرانہ رعب طاری ہے۔کہ فضا کے ہر ذرہ میں سکوت طاری ہے۔تمام مخالفین چار و ناچار دربار میں حاضر ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تخت شاہی [1] پر متمکن ہیں۔ہر متنفس پر سکتہ طاری ہے یہاں تک کہ ہر شخص کے سانس کا اتار چڑھاؤ بھی سنا جاتا ہے! ہر شخص کی آنکھوں میں موت کا سماں چھایا ہوا ہے۔کہ آج عمر بھر کی اذیتوں کا انتقام لیا جانے والا ہے۔اچانک رحمت و شفقت کا دریا موجزن ہوتا ہے! وہ پیغمبر جو انسانیت کی فلاح و سعادت کیلئے مبعوث ہوتا ہے۔ایک دلکش آواز میں اعلان فرماتے ہیں!۔اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔فرمایا جاؤ۔تم سب آزاد ہو۔اور تم پر آج کوئی مواخذہ نہیں۔آج کا دن انسانیت کے باطل سے آزاد ہونے کا دن ہے۔جب فلاح و سعادت مقصود ہے۔تو تخریب فنا ہوگئی۔لوگوں کی جان میں جان آگئی۔یکلخت گونج پیدا ہوتی ہے۔کہ یہ دنیا خود بخود نہیں بلکہ ایک لامحدود علتِ (غالب خدا) سے ہے!تمام لشکر اسلامی میں اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی ہے اور اسلام کا پرچم زمین کی انتہائی گہرائیوں میں پیوست ہو کر آسمان کی انتہائی بلندیوں میں پھریرے مارنا شروع کر دیتا ہے۔

---

[1] یہ وہ تخت شاہی نہیں جیسے جابر و منحرف حکمرانوں کا تخت تھا۔یہ تختِ جلالت وہ تخت تھا جسکی وسعت زمین و آسمان میں سما نہیں سکتی۔ایک گودڑی پوش جماعت میں گودڑی پوش ملا ہوا بیٹھا ہے مگر پیغمبرانہ جلال کہیں آسمانوں سے پرے ہے۔

ان واقعات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہے۔ کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کسقدر بلند ہے۔ حضورؐ اُس زمانے میں عام انسانوں کے مقابلہ کسقدر پاکیزہ ہستی تھے۔ ایسے وقت میں جبکہ زمانہ معصیت۔ فسق وفجور۔ ظلم وستم اور دیگر مخرب اخلاق برائیوں سے پُر تھا۔ ایسے وقت میں ایک پاکیزہ ہستی کا۔ ظلم سے متنفر ہونا۔ یتیموں کی دستگیری کرنا۔ سچائی۔ امانت داری۔ اور حسنِ اخلاق کا ہونا۔ اس بات کی دلیل ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہر قول وفعل مبنی برصداقت ہے اور جو کچھ آپنے کہا اور جو کچھ آپنے کیا اس میں کسی اعتراض اور شبہ کرنے کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ ایسے امین وصادق کی زبان سے اگر یہ اعلان ہوتا ہے۔ کہ میں پیغمبر ہوں تو آپکی امانت وصداقت ہی آپکے پیغمبر ہونے کیلئے کافی ہوسکتی ہے۔ آپکے جملہ اوصافِ عالی اِس بات کے شاہد ہیں کہ واقعی آپکو منجانب اللہ وحی (کلام الٰہی) آتی ہے۔ اور آپؐ منتخب پیغمبر ہیں۔

منجانب اللہ پیغمبر مصطفےٰ ہونے کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقدس اِسم سے ہی ہوتی ہے؟ کہ ''محمدؐ ہست برہانِ محمدؐ''۔

چودہ سو سال سے حضرت محمد رسول اللہؐ کی تعریف اسمِ محمدؐ سے ہی ہو رہی ہے۔ کوئی قوم کوئی فرقہ کوئی منکرِ دین۔ منکرِ خدا۔ ''اسلام'' اور ''محمدؐ'' کے نام مبارک سے انکار نہیں کرسکتا۔ کہ آپ کا نام ''محمدؐ'' نہ تھا۔ آپکا جاری کردہ مذہب اسلام کے نام سے پکارا نہیں جاتا۔ گویا بانئے اسلام وہ ہستی ہے جنکا نام ''محمدؐ'' ہے۔

تواریخ اس بات کی شاہد ہے۔ کہ بغیر بانئے اسلام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے تخلیقِ اول سے آج تک کسی شخص کا نام ''محمد'' نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی ایک انتخاب ہے! یہ بھی ایک معجزہ ہے!! لفظ ''محمد'' پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس مخصوص نام میں کس قدر وسعتیں مضمر ہیں۔ یہ لفظ عربی ہے۔ جسکے معنے تعریف کیا گیا۔ اور اسقدر تعریف کہ بدرجہ اتم جسکے بعد کوئی تعریف باقی نہیں رہتی۔ اور محمدؐ کے ساتھ آپکا نام احمدؐ رکھا گیا۔ کہ اس اتم تعریف کا سبب یہ ہے کہ آپنے بدرجہ کمال اور سب سے زیادہ تعریف کی۔ وہ تعریف کیا ہے۔ یعنی پہچاننا ــــ پہچان سب سے زیادہ اس شے کی

ہو سکتی ہے۔جسکے پہچاننے میں۔تمام مخلوق ادھوری رہ چکی ہو۔وہ شے خود علتِ لامحدود اللہ ہے۔
آپنے اللہ کی ذات کو تمام مخلوق سے زیادہ پہچانا اور جملہ مخلوق نے محمدؐ کو پہچانا۔پہچان سے
مراد ''عرفان'' ___ گویا جملہ مخلوق کے وجود سے ہی ''محمدؐ'' کو پہچانا جا سکتا ہے۔ہر قریبی شے
اپنے قریب شے کو زیادہ پہچان سکتی ہے۔اسکی دو صورتیں ہیں ایک تو دور سے قریب ہونا۔دوسرے
باعتبار تخلیق ہر علت کو اسکا قریبی معلول زیادہ پہچان سکتا ہے۔یہ دونوں صورتیں حضرت محمدؐ ہی کو
حاصل ہیں علت کی حیثیت سے محمد کی حیثیت کو ملا کر دیکھا جائے تو بدرجہ اتم پہچاننے کی نوعیت یہی
ہو سکتی ہے کہ آپ تمام مخلوق سے زیادہ قریب ہیں جسکا مطلب یہ ہے کہ سب سے اول جب تخلیق
کی ابتداٗ ہوئی تو اللہ کے لامحدود نور سے محمدؐ ہی معلول ہوئے بالالفاظ دیگر جب تخلیق کی ابتداٗ ہوئی تو
سوائے اللہ لامحدود کے اور کچھ نہ تھا جب اللہ سے تخلیق کا اجراٗ ہوا تو وہ شکل نورِ محمدیؐ ہی کی ہوئی جسکے
متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود فرمایا کہ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ۔سب سے پہلے جو
شے تخلیق ہوئی وہ میرا نور تھا۔اسکے بعد اگر تخلیق کا سلسلہ جاری رکھا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ
میں آسکتی ہے۔کہ تخلیق کی آخری مخلوق تک سب کچھ اسی نور سے بنیگا۔اور یہی تخلیق محمدؐ کے نام کی
دلیل ہے یعنی باعتبار قربت محمدؐ ہی نے اللہ کو پہچانا۔اور باعتبار تخلیق ہر شے مخلوق میں محمدؐ ہی کو پہچانا
جائیگا۔اس علت و معلول کے تسلسل کا یہ قاعدہ ہے۔کہ جب تک ایک علت میں لامحدودیت نہ
پائی جائے وہ کسی شے سے ہی مخلوق ہوگی گویا مخلوق ہونے کی صورت میں اس میں دوام نہ ہوگا۔اور
علتِ لامحدود وہی علت ہو سکتی ہے جسکے معلول میں بھی لامحدودیت پائی جائے۔ایسی صورت میں
اللہ کی ذات چونکہ لامحدود ہے اسکی معلول نور محمدیؐ بھی اسی ہیئت میں پائی جاتی ہے۔کہ وہ بھی
اولین معلول کی حیثیت میں لامحدود میں پائی جائیگی۔ایک طرف وہ نور ذات باری کے نور سے ہی
متعلق ہے دوسری طرف اس میں اتنی وسعت ہے کہ تمام مخلوق ارضی و سماوی اسی نور کی علے الترتیب
معلول ہیں۔اس صورت میں نام ''احمدؐ'' قریب اور بدرجہ اتم پہچاننے والا اور ''محمدؐ'' سے مراد ہر مخلوق
اسی کی تعریف کرنے والی ہے اور اسی کے وجود سے مخلوق ہے۔یہی تعریف محمدؐ کے نام سے مترشح

ہے۔اسی لئے آپکا نام ازل سے ''محمدؐ'' تھا اور مخلوق میں بھی ''محمدؐ'' نام پایا۔یہی وجہ ہے۔کہ ابتدائے آفرینش سے کسی کا نام محمد نہیں ہوا۔کیونکہ کسی مخلوق میں اس خوبی کی اہلیت نہیں پائی جاتی تھی اور جب آپکا ظہور دنیا پر مثل بشر ہوا۔چونکہ یہ نام آپکے لئے ہی وقف تھا اسلئے آپکو ہی یہ نام دیا گیا۔اور یہ نام اول سے آخر تک کسی کا نہ ہوا ہے۔نہ بعد میں کسی کا ہوگا۔آدم سے لیکر آخر قیام دنیا تک بڑے بڑے با جبروت عظیم الشان شہنشاہ۔اور پیغمبر۔محقق اجل فضلاء وفلاسفر ہوئے ہیں۔لیکن کسی شخص کا یہ نام نہیں رکھا گیا۔یہ خصوصیت سوائے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اور کسی میں نہیں پائی جاتی۔

لامحدود کی خاصیت یہ ہے۔کہ اس سے ماسوا کوئی مقام ایسا نہیں ہوسکتا جو اُسکی لامحدودیت سے باہر ہو ورنہ اگر کوئی خالی مقام تصور کیا جائے تو اس میں لامحدودیت کی صفت نہیں رہ سکتی۔اسلئے لامحدود ہونے کی صورت میں کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔جب کوئی ماسوا مقام موجود نہیں تو تخلیق کا وجود خود اسی سے ہوگا اسی میں ہوگا۔تو معلول اولین کی تعریف یہی ہوگی کہ وہ اپنا معلول بھی خود ہی ہے اور اپنے میں ہی ہے۔تو معلول بھی لامحدود ہیئت میں پایا جائیگا۔یعنی وہ لا محدود علت جس میں ارادہ۔حرکت سب کچھ موجود ہے۔جب تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے ہی نور کا نام اور رنگ پیدا کرتا ہے۔یہ نور (معلول) کسی دوسرے مقام پر علیحدہ ہوتا نہیں۔اسلئے باطن اسکا لامحدود ہوا۔اور اسکا ظہور اسکے نام (محمدؐ) سے ہوا اور اِسے ایک رنگت سے ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔اور اپنی نوع کے اعتبار سے اس میں بھی وہی خاصیت۔بدرجہ اتم تابانی وغلبہ کی ہوگی جو علتِ لامحدود میں ہوگی۔گویا صوری صورت میں یہ معلول صرف معلول ہے اور معنوی (حقیقی) صورت میں خود علت ہی معلول ہے۔کیونکہ معلول میں علت کی ہی خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔اگر علت سے معلول ظاہر ہو۔تو علت منتشر ہو کر اپنی ہیئت کھو بیٹھتا ہے۔لیکن لامحدود علت اپنی لامحدودیت کے اعتبار سے اپنی اصل نہ کم کرسکتا ہے نہ اسکی ہیئت عدم ہوسکتی ہے۔اسلئے معلول کی صورت میں بھی اصل سالم ہیئت میں اصل ہی رہتی ہے۔جب اصل سالم ہیئت میں ہو تو معلول صرف صفت کے رنگ میں معلول ہوگی اور بنیادی حیثیت میں معلول کی ذات لامحدود رہیگی۔اس میں دوصورتیں

ہیں اگر معلول بجائے خود لامحدود ہو جائے تو ایک مقام پر ایک زمانہ میں دو لامحدود علتیں قائم نہیں ہو سکتیں۔اور دونوں علتیں لامحدود کی صفت میں نہ آسکینگی جہاں ایک کی لامحدودیت علیٰحدہ ہو وہاں ایک کی لامحدودیت ختم ہو جائیگی۔اسطرح دونوں علتوں کی حد ظاہر ہوگی اور دونوں علتیں لامحدودیت کی صفت سے باہر ہونگی مگر علت لامحدود کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ذات ہر حال میں خود لامحدود ہی رہیگی اور اسکا معلول خود علت ہی ہوگا۔اور وہ علت لامحدود ایک طرف علت ہے۔اسکی ذات نوری میں انقطاع [1] (ٹکڑے) نہ ہوگا۔دوسری طرف معلول کی صفت میں ظاہر ہوگا۔گویا علت اول اسم ذات ہے اوراس میں معلول کی شکل صفت کے اعتبار سے ہوگی۔مثال کے طور پر ایک ذات ہے جسکا نام زیــــد ہے یہ نام خود اسمِ ذات ہے۔زید حسین ہے۔یہ زید ہی ہے۔لیکن رنگت ہونے سے اسکی صفت کا ظہور ہوا۔جہاں تک زید کی ذات مستقل ہے۔وہاں تک زید کی صفت بھی با اعتبار ذات مستقل ہے۔

اسی طرح چونکہ احمد بدرجہ اتم تعریف کرنے والا (پہچاننے والا) ہے اسلئے قرب اور لامحدودیت کے اعتبار سے احمد ہی بدرجہ اتم پہچان سکتا ہے۔قرب اور تعریف کا تقاضا یہی ہے کہ اس معلول کا نام "احمد" ہو۔جب کائنات میں سوائے محمدؐ کے اور کسی کا نام احمد نہیں۔تو ثابت ہوتا ہے۔کہ علت لامحدود (ذات اللّٰہ) کا پہلا معلول حضرت محمدؐ ہی ہیں۔علت لامحدود مجسم لامحدود۔تابانی اور لطافت ہے۔اسلئے اسکی صفت بھی اسی اعتبار سے لامحدود تابانی و لطافت کی حامل ہے۔جو مجسم نور اور لطافت ہے۔چونکہ کائنات میں مختلف قسم کی کیفیات نوری و مادی واقع ہیں اسلئے لامحدود علت ہونے سے تمام کیفیتوں کا وجود اسی معلول سے ثابت ہے۔گویا تمام کائنات کا وجود علے الترتیب ایک منضبط نظام کے تحت اسی نورِ مقدس سے وابستہ ہے۔باالفاظ دیگر تمام کائنات کی اشیاءً ذات کے اعتبار سے محمد ہیں اور صفت کے لحاظ سے ہر شے کے وجود کے مطابق نوری ہو یا مادی

---

[1] اسکی تشریح آگے آئیگی۔

اسکی صفاتی ہیئت سے محسوس ہوتی ہیں۔یعنی جملہ کیفیات آسمانی جو مجسم نورانی اور لطیف ہیں انکا وجود ذات کے لحاظ سے ''محمد'' ہے اور صفات کے لحاظ سے۔عرش۔ ملائکہ۔آسمان۔اور اِنکے اندرونی کیفیات کے نام۔سورج۔چاند۔زمین اور انکی تمام مخلوق۔یہ سب ایک فرضی نام سے منسوب ہیں۔اور معلول اول کی خود ذات ایک علت لامحدود کی ذات سے وابستہ ہے۔اسلئے ہر شے اسی علت لامحدود کی طرف رجوع کرنے والی ہے۔گویا ہر شے محمد ہے۔اور محمد معلول کی حیثیت میں صفاتی نام سے موسوم ہے۔اسکی ذات فرضی ہے۔حقیقتاً سب کچھ ہی علت لامحدود ''اللہ'' ہے۔

جملہ مخلوق میں منتشر حالت میں ہونے کے باعث علت و معلول کی شکل میں بٹ کر تقسیم ہو جاتی ہے۔صرف ایک ہی علت اور اسکا معلول اپنی ہیئتِ نوری کے اعتبار سے نہ عدم ہو سکتی ہے۔نہ بٹ کر اپنی ہیئت کو عدم کر سکتی ہے۔ بلکہ ہر حال میں قائم و دائم ہے۔یہی صفت ''محمدؐ'' کی ہے۔کہ محمدؐ کے اسم مقدس سے ہی انکی صفت انکی عظمت ثابت ہوتی ہے۔یہ صفت یہ عظمت انکے منجانب اللہ پیغمبر ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔کیونکہ نور ہونے کی صورت میں جبکہ یہی نور سب مخلوق سے افضل و اعلےٰ ہو تو مثل بشر ہونے کی صورت میں بھی آپ کو تمام مخلوق سے قوی قوتیں حاصل ہونگی۔گویا آپکا جسم مبارک بظاہر مثل آدم ہے۔لیکن محمد ہونے کی حیثیت میں آپکا جسم مبارک بھی بظاہر خاکی جسم ہے لیکن یہ جسم بھی مجسم[1] نور ہے جو باقی مخلوق کے مقابلہ میں ہر قوت میں غالب ہوگا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ صفت ازلی تھی اور اس ہیئت کی کیفیت نورانی تھی اور اسی نور مقدس کے ایک حصہ سے محمد و احمد کے نام سے آپکا ظہور (جسمانی طور) ہوا۔گویا حضرت محمد

---

[1] اسکا مطلب یہ نہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود مقدس جو تمثیل آدم کی شکل میں نمایاں ہے۔علت لامحدود کہلاتا ہے۔بلکہ یہ تعریف صرف اس نور کی ہے۔جو ابتدائے تخلیق میں بنا۔ویسے مخلوق کے لحاظ سے آپکا جسم مبارک اسی نور کا ایک منتخب اور مخصوص حصہ ہے جس نے جسم کی شکل اختیار کی ہے۔

رسول اللہ کا وجود مقدس ازل سے ہی منتخب کیا گیا جو باقی مخلوق سے ارفع و اعلیٰ تھا۔اور باقی مخلوق کی جواہراتی قوتوں سے بالاتر قوت و لطافت کا حامل تھا۔اسکی ترکیب یوں سمجھی جاسکتی ہے۔کہ ہر مخلوق ذی عقل کے ساتھ ایسی لطیف روح وابستہ ہے۔جو ازل سے ہی بنائی گئی ہے اسی روح کے مطابق خاکی (مادی) وجود قائم ہوتے ہیں۔ابتدأ میں جب روحیں بنیں تو وہ سب اسی نور محمدیؐ سے بنیں۔اور اسکے علاوہ جو کچھ آسمانی کیفیتیں پائی جاتی ہیں وہ بھی علے الترتیب اسی نور سے بنتی رہیں۔یہاں تک کہ مختلف کیفیات بنتے بنتے زمین تک نوبت پہنچی۔اور زمین سے اجسام خاکی بنے اور وقت پر ہر جسم خاکی کے ساتھ ایک روح منسلک ہوئی۔گو زمین کی مخلوق میں خصوصاً انسان جو دو روحوں کا مرکب ہے اس میں نور ازلی کے اعتبار سے اول نور (روح) محمدیؐ ہے۔اور جسم خاکی کے اعتبار سے بھی انسانی وجود کا منبع نور محمدیؐ سے ہی ہے۔رہا سوال یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو باقی مخلوق سے کیا فوقیت ہے۔وہ یہ کہ جسطرح عام انسانوں کی پیدائش کا تسلسل آدم سے نطفہ کی صورت میں ہوا۔اسطرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نہیں ہے۔بلکہ جسطرح ایک نور روح کی صورت میں ہوکر مادی ہیئت اختیار کرسکتا ہے۔اسی طرح حضورؐ کے جسم مقدس کیلئے اِنکے ازلی نور سے مخصوص کیا گیا۔اور اسی نور نے مثل عیسےٰ علیہ السلام کے انسانی شکل [1] اختیار کی جس نور نے مادیت سے ملوث ہوکر شکل انسانی اختیار کی اسلئے اپنی اصل (نورِ مخصوص) کے اعتبار سے حضورؐ کا جسم مقدس بھی نوری قوت کا حامل ہے۔یہی تفوق حضور علیہ الصلوٰہ والسلام کو باقی مخلوق کے مقابلہ میں حاصل ہے یہ سب تعریف صرف اسم احمد و محمد میں مضمر ہے۔

غور و تفکر کا یہ لازمہ ہے۔کہ جب انسان اپنے وجود اور کائنات پر تفکر کریگا۔تو اُسے تمام مخلوق میں نورِ محمدیؐ ہی محسوس ہوگا۔یہاں تک کہ وہ اس علت و معلول کے تسلسل کو عبور کرکے

---

[1] جہاں ایٹم یا دیگر ایتھری اجزأ کو مادی وسائل کیلئے ٹھوس شکل میں لایا جاسکتا ہے۔وہاں نور (جوہر لطیف) میں بھی بذات خود ٹھوس مجسم ہیئت میں آنے کی صلاحیت پائی جاسکتی ہے۔

اس مقام پر پہنچیگا جہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام مقدس احمد (حقیقت محمدیؐ) کا مقام ہوگا ـــــ ازلی حقیقت محمدیؐ سے جب واقفیت (مشاہدہ) ہوئی گویا علت لامحدود سے ہمکنار ہوا۔ اور اس سب کارخانۂ فطرت کی راہیں حضرت محمدؐ کے ظاہری وجود سے ہی ملیں گی۔ تفکر میں جب انسان اپنی تخلیق پر قدم زنی کریگا تو یہ سلسلۂ تفکر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود نوری پر پہنچیگا۔ کیونکہ محمد کے معنی ہی تعریف کیا گیا۔ یعنی محمد کو آپکی ظاہری باطنی خوبیوں سے پہچانا گیا جب عرفان کا مقصود ہی ''پہچان'' ہے۔ تو یہ پہچان بغیر محمد کی پہچان کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اسلئے طریق عرفان و مشاہدہ میں پہچان کیلئے محمدؐ کی ذات مقدس کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے۔ اگر آپکی ذات سے علاوہ کوئی اور مقصود مدنظر رکھا جائے تو وہ راہ کوئی اور راہ نہیں ہوسکتی جس راہ سے منزل عرفان طے ہوسکتی ہے۔ اسلئے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس کو پیغمبر کی صورت میں تسلیم کئے بغیر چارۂ کار نہیں اور بغیر تسلیم کئے ہر طریق تفکر بے معنی و بے سود رہیگا اور پیغمبر ہونے کی یہی ایک صورت ہے کہ پیغمبر کو تمام ماوراٗ ادراک قوتوں کا تا علت لامحدود علم و مشاہدہ ہوتا ہے۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس اپنی نوعیت کے اعتبار سے خود شاہد (جسکا مشاہدہ کیا جائے) اور خود مشہود (مشاہدہ کرنے والے) ہیں اس سے بڑھکر پیغمبر کی صداقت اور منجانب اللہ ہونے کی اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

پیغمبر کی تصدیق کیلئے معجزات (مافوق الفطرت واقعات) ضروری ہوتے ہیں۔ گزشتہ انبیاٗ (پیغمبروں) کو ظاہر طور معجزات دئے گئے۔ مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس قسم کے کسی معجزہ کا اظہار نہیں کیا۔ محمد ﷺ کیلئے ایسے معجزات کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ آپ خود مجسم معجزہ تھے۔ اگر آپ کیلئے معجزہ کی ضرورت ہے۔ تو یہی کہ انسان تفکر کرے۔ وہ آپکو مجسم معجزہ پالیگا۔ جہاں تمام کائنات کی قوی و تابانی قوتوں کے وجود کا انحصار نور محمدیؐ پر ہی ہو وہاں کائنات کا ہر ذرہ۔ ہر ایٹم۔ ہر ایتھر۔ ہر قوی سے قوی اور لطیف سے لطیف قوت کا وجود بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ جہاں لطیف زندگی ہر نوری و مادی شے کیلئے وجہِ حیات ہے۔ وہاں کسی مادی غیر ناطق۔ غیر ذی روح کا ناطق و

ذی روح (جاندار) ہونا بجائے خود معجزہ ہے۔سورج انہیں کے نور کا ادنیٰ معلول ہے ایٹم آپکے ہی نور کا ادنیٰ معلول ہے۔ایتھر آپکے ہی نور کا ادنیٰ معلول ہے۔انسان آپکے ہی نور کا ادنیٰ معلول ہے جب آپکے ہی نور سے ہر شے زندگی حاصل کئے ہوئے ہے۔تو پھر آپکے لئے پتھر کا ناطق (بولنے والا) ہونا۔مردہ زندہ ہونا۔ایٹم کا ایک آن میں فنا کرنا ایک ادنیٰ صفت میں شمار ہے۔ جہاں معجزہ طلب کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

حضورؐ کی ذات گرامی کا تواریخ سے مطالعہ کیجئے۔تو معلوم ہوگا کہ حضورؐ کی ذات عالی۔ اعلےٰ خصائل وفضائل کی حامل ہے۔دنیا پر ظہور کرنے کے بعد مردہ روح انسانوں کو نئی زندگی بخشی۔ گزشتہ جابر طاقتوں نے انسانیت کو محکوم بنا رکھا تھا۔عورت کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔غلاموں سے کُتے سے بدتر سلوک کیا جاتا۔لڑکیوں کو زندہ دفن کیا جاتا خوبصورت دوشیزاؤں کو ناقص خداؤں کے بھینٹ چڑھایا جاتا۔الغرض انسانیت ذلت وپستی کے عمیق گڑھے میں گری ہوئی تھی۔مگر حضرت محمد ﷺ نے انسانیت کو اپنا شرفِ اشرف المخلوقاتی عطا کیا۔غلاموں کی آزادی یہاں تک پہنچی کہ آقا غلام کے اونٹ کی مہار (لگام) پکڑنے لگا۔عرب کے ممتاز سرداروں نے غلاموں کو اپنی دامادی میں قبول کرنے میں شرف سمجھا۔عورت کو مرد کا لباس (زینت) بنایا گیا۔غریب کو امیر پر سبقت کرنے کا موقع ملا۔اور ایک ہی صف میں غلام وآزاد مساوی حیثیت سے کھڑے ہوگئے۔ تواریخ شاہد ہے۔کہ ان کم مایہ انسانوں کو کسی زمانہ میں ایسا عروج نہ ملا ہوگا۔۔۔اور جو کچھ انسانیت پر احسان حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیا کسی پیغمبر۔کسی عظیم الشان شہنشاہ کے زمانہ میں ایسا نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔الغرض حضورؐ کی تمام زندگی مجسم معجزہ ہے۔

مادی محققین کائنات کا تجزیہ اپنی عقل سے کرتے ہیں۔انکا تجزیہ صرف اسی حد تک ہو سکتا ہے۔جہاں تک انکے پاس مادی دنیا کے مشاہدہ کیلئے مادی ذرائع ہیں۔اور جو کیفیتیں ماوراۓ مادہ ہیں انہیں انکا تصور نہیں آسکتا ہے بالفرضِ محال اگر یہ لوگ ماوراۓ کا بھی تصور باندھ لیں۔تو یہ قیاس کی اساس پر ہوگا۔جسکا نتیجہ صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ بغیر دیکھی۔بغیر محسوس کی ہوئی شے کا اندازہ

تخیلی ہوگا۔ حقیقی نہیں ہوسکتا۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ مادی محقق کے پاس ماوراۓ ادراک کیفیت کو محسوس کرنے کا کوئی مخصوص ذریعہ نہیں۔ یہ مخصوص قوت سوائے پیغمبر کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ یہی قوت روحانی پیغمبر اپنی صداقت کیلئے پیش کرتا ہے۔ اور اس روحانی قوت کے ثبوت کیلئے مافوق الفطرت واقعات کے ظہور سے اپنی دلیل پیش کرتا ہے۔ یعنی مادی محقق معجزات کا نہ قائل ہے۔ نہ ہی وہ معجزات پیش کرسکتا ہے اور معجزات ہی پیغمبر کی صداقت کی دلیل ہوسکتے ہیں۔

گزشتہ زمانوں میں ہر پیغمبر نے زمانے کی رفتار کے مطابق معجزات پیش کر کے لوگوں کو قائل کیا۔ اور وہ معجزات [1] براہ راست قدرت (علتِ لامحدود) کی طرف سے دئے گئے تھے۔ جیسے داؤدؑ کو لوہا نرم کرنے کی قوت دی گئی وہ ہاتھ سے لوہا نرم کر کے زرہیں بناتے تھے۔ اُس وقت اِس قسم کے فن کو عروج حاصل تھا۔ اور حضرت داؤدؑ نے اسی فن کے مطابق معجزہ پیش کیا کہ اس کمال سے بالاتر۔ محیر العقول واقعہ پیش کیا۔ حضرت سلیمانؑ کے وقت قوت واستبداد کا دور تھا۔ چنانچہ آپکو بھی اسی نوع کا معجزہ دیا گیا۔ کہ کائنات کی ہر شے آپکی مطیع تھی۔ ہوا۔ وحوش وطیور۔ جنات وغیرہ ہر شے پر آپکی حکومت تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے وقت سحر وساحری کا دور تھا۔ چنانچہ آپنے لاٹھی کا سانپ۔ روشن ہاتھ کا معجزہ پیش کیا جس سے تمام سحر وساحری عاجز آ گئی۔ حضرت عیسیٰؑ کے وقت حکمت (طب) کا دور تھا چنانچہ آپکو۔ کوڑھی۔ اندھے۔ بیمار اچھے کرنا۔ مردے [2] زندہ کرنے کا معجزہ دیا گیا۔ اسی طرح ہر زمانہ میں پیغمبروں نے اپنی تصدیق کیلئے معجزات پیش کر کے دنیا کو قائل کیا۔

ضروری ہے کہ ان واقعات کو بعد کا فرضی افسانہ تصور کیا جائے۔ لیکن۔ گزشتہ اقوام

---

[1] ضروری ہے کہ ایک مادی عقیدت مند معجزات کو فرضی افسانہ کہہ کر جھٹلائے۔ تردید کردے۔ لیکن اس بات کی تردید سے پیشتر ہر شخص کو یہ لازم ہے۔ کہ وہ کائنات کی ہر شے کو اپنی انتہا پر پہنچا کر تحقیق کی تکمیل کے بعد ہی ان واقعات کی تکذیب کرے۔ ورنہ بغیر علم بغیر تحقیق کسی الہامی (روحانی) مسئلہ کی اہمیت کو ہٹ دھرمی سے۔ صرف مذہب کے نام پر جھٹلانا عبث اور بے معنی ہے۔

[2] اگر مردہ زندہ کرنے کا معجزہ مبالغہ سمجھا جائے۔ تو آجکل یورپین محققین کو موت پر قابو پانے کی کیوں سوجھی ہے۔

کے واقعات ہم اسوقت تک نہیں پا سکتے جب تک تواریخ ہمیں اسکی شہادت نہ دے۔اگرچہ ہم گزشتہ زمانہ اور اسکے اکثر عمومی واقعات کو تواریخ کی شہادت پر ہی قبول وتسلیم کرتے ہیں۔تو بعضے واقعات کو جنہیں ہمارا تعقل قبول نہیں کرتا ہم کیسے جھٹلا سکتے ہیں جبکہ ان واقعات کا ذکر تواریخ ہی کی زبان سے ہوتا ہو۔البتہ ہمارا تعقل ان واقعات کو قبول نہیں کریگا کیونکہ یہ واقعات قلب وشعور سے تعلق رکھتے ہیں۔اسلئے جب تک انسان۔تحقیق وتفکر کی تمام راہیں مکمل نہ کرلے اُسے کسی خبر۔شعوری۔غیر شعوری کے جھٹلانے کا حق حاصل نہیں۔معجزات چونکہ مافوق الفطرت واقعات ہیں اسلئے انکا تسلیم بغیر تحقیق عقلی کے ازبس لازم ہے۔

گزشتہ پیغمبروں سے جتنے بھی معجزات کا صدور ہوا ہے۔وہ اُنکی روحانیت سے متعلق ہیں۔اور ان معجزات کی قوت بھی منجانب اللہ عطا کی گئی تھی۔اسی طرح حضور علیہ الصلوٰہ والسلام سے بھی پیغمبر ہونے کے لئے معجزات کا صدور ہوا لیکن آپ کے معجزات باقی پیغمبروں کے معجزات سے اپنی نوعیت میں بالاتر ہیں۔آپکا سب سے پہلا معجزہ یہی ہے۔کہ آپنے ایک کمزور وبیکس حالت میں۔ان لوگوں کے سامنے دعوٰے پیغمبری کیا۔جو صرف پانی پینے پر تلوار نکال کر ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔ایسے وقت میں جبکہ کمزور انسان ذلیل ومحکوم تھا۔جہالت وکفر۔اور جملہ معیوب ترین افعال کا دور دورہ تھا۔ایسے وقت میں کسی جابر سے جابر انسان کی جرأت نہ تھی کہ وہ کسی شخص کی شان میں کسی قسم کے سخت الفاظ۔استعمال کرسکے۔چہ جائیکہ انکے خداؤں کو جھٹلایا جائے۔یا زمانے کے جاہ طلب۔خود غرض۔دنیا پرست انسانوں کے تمام مفادات کو مٹانے کا ارادہ کیا جائے۔مگر حضور علیہ الصلوٰہ والسلام نے بغیر کسی قوت کی امداد کے بغیر کسی خاندانی وجاہت واستعانت کے ایسے سفاکوں کے تمام مخرب اخلاق اصولوں کی نکتہ چینی کی۔انکے خداؤں کو جھٹلایا۔جسکے نتیجہ پر تمام دنیا کی جابر قوتوں میں ایک ہیجان پیدا ہوا۔اور غم وغصہ سے آپکو گرفتار کرنے کیلئے آئے۔مکہ کے تمام قبیلوں نے کانفرنسیں کیں اور آپکو تکلیفیں پہنچانے کیلئے کمیٹیاں بنائی گئیں۔ایک کمیٹی بنائی گئی جسکا صدر ابولہب تھا۔اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچائی جائیں۔حضور علیہ

الصلوٰۃ والسلام کے تبلیغی مشن میں شدت کے ساتھ روکاوٹ ڈالی جائے اور اسے ابھرنے نہ دیا جائے۔ ہر جگہ پر حضورؐ کو تکلیف پہنچائی جائے تاکہ آپ اس مشن میں ناکام رہیں۔ چنانچہ حضورؐ کو اسقدر اذیت پہنچائی گئی کہ اکثر ان کافروں کے پتھراؤ سے تمام جسم سے خون بہنے لگ جاتا۔

اعلان رسالت کے بعد آپؐ نے جملہ اطراف کے تمام شہنشاہوں کو دعوت اسلام کے پیغام بھیجے۔ (یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حضورؐ کا ابتدائی دور تھا۔ اور آپکے ساتھ سوائے چند کمزور مسلمانوں کی جماعت کے اور کوئی طاقت حمایت میں نہ تھی۔) جن میں چند ایک نے صاف طور پر قبول اسلام کیا۔ باقی شہنشاہوں نے انکار کیا۔ خسرو پرویز کے نام عبداللہ بن حذافہؓ کے ذریعہ پیغام بھیجا گیا۔ اُس وقت خسرو پرویز نصف مشرقی دنیا کا حکمران تھا۔ زرتشتی مذہب رکھتا تھا۔ حضورؐ کا نامہ مبارک پڑھکر برافروختہ ہوا۔ اور نامہ مبارک چاک کر ڈالا۔ اور زبان سے کہا میری رعایا کا ادنیٰ شخص مجھے خط لکھنے کی جرأت کیونکر کرسکتا ہے؟ ـــــ اسی وقت بازانؔ کو جو یمن کا وائسرائے تھا اور عرب کا تمام ملک اسی کے زیر نگیں تھا۔ حکم بھیجا کہ حضرت محمدؐ کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیجدو۔ بازان نے خسرو نامی ایک فوجی افسر کے ساتھ ایک دستہ فوج دیکر حضورؐ کو گرفتار کرنے کیلئے بھیجا۔ مگر حضورؐ کے گرفتار ہونے سے پیشتر خسرو پرویز کو اِسکے بیٹے نے قتل کر ڈالا۔

خسرو پرویز کے نام جو پیغام آپؐ نے بھیجا اسکا مضمون درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ رئیس فارس کے نام

سلام ہے اس پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور خدا اور اسکے رسول پر ایمان لائے۔ اور یہ گواہی دے کہ خدا ایک ہے۔ یہ کہ خدا نے مجھے پیغمبر بنا کر مبعوث کیا ہے۔ تاکہ میں ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلاؤں۔ تو اسلام قبول کرلے۔ کہ اس حالت میں سلامت رہیگا۔ اور اگر انکار کیا تو تمام مجوسیوں کے گناہ کا وبال بھی تیرے ہی سر پر ہوگا۔

خسرو پرویز نے یہ خط سنکر نامہ مبارک چاک کیا۔ اور حضورؐ کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اِدھر پیغامبر حضرت عبداللہ بن حذافہؓ جب حضورؐ کی خدمت میں پہنچے تو خسرو پرویز کے دربار کا سارا

قصہ بیان کیا۔حضورؐ نے جواب میں فرمایا۔کہ خسرو پرویز نے ہمارا نامہ چاک کرڈالا۔ہم نے اسکی سلطنت کو پارہ پارہ کردیا۔ادھر جس وقت۔کافر خسرو اور بالویہ نے مدینہ پہنچکر حضورؐ کو صرف خسرو پرویز کا حکم سنایا۔تو حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ خسرو کو اسکے بیٹے شیرویہ نے قتل کردیا ہے۔یہ دونوں متحیر ہوئے کہ مدینہ میں یہ خبر ہم سے پیشتر کیسے پہنچ سکتی ہے۔آخر واپس بازان کے پاس آئے۔وہ بھی یہ خبر سنکر متحیر ہوا۔آخر انہیں تصدیق ہوگئی کہ واقعی خسرو پرویز کو اسکے بیٹے شیرویہ نے اندھا کر کے قتل کرڈالا۔اسکے بعد سلطنت فارس پارہ پارہ ہوگئی۔

قیصر روم کے پاس دحیہ بن خلیفۃ کلبیؓ فرمان رسالت لیکر گئے۔قیصر کے سامنے جب نامۂ مبارک پیش ہوا۔اس نے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ دربار منعقد کیا۔تمام امراؑ وزرأ کو جمع کیا ان میں روم کے پادری بھی موجود تھے۔دربار کے بعد اس نے حکم دیا۔کہ اگر عرب کا کوئی شخص ملے تو اسے دربار میں پیش کرو۔اتفاقاً بیت المقدس میں غزہ کے قریب قریش مکہ کے تاجروں کا قافلہ مقیم تھا۔لطف یہ کہ اس قافلہ میں سے جو شخص قیصر کے پیش ہوتا ہے۔وہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ابوسفیان تھا۔قیصر نے ابوسفیان پر چند سوال کئے!

قیصر:۔یہ جو عرب (مکہ) میں نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔اسکا خاندان کیسا ہے؟۔

ابوسفیان:۔نہایت شریف۔

قیصر:۔کیا اس خاندان میں اس سے پہلے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے؟ یا کوئی بادشاہ ہوا ہے؟۔

ابوسفیان:۔نہیں۔

قیصر:۔جن لوگوں نے اسکا مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور ہیں یا صاحب اثر؟

ابوسفیان:۔کمزور ہیں۔

قیصر:۔اسکے مذہب کے پیرو گھٹتے جاتے ہیں یا بڑھتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان:۔روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔

قیصر:۔جو لوگ اس مذہب کو قبول کر چکے ہیں۔ان میں سے لوگ بیزار ہو کر مذہب چھوڑ بھی دیتے

ہیں؟

ابوسفیان:۔ابھی تک کسی نے ایسا نہیں کیا۔

قیصر:۔دعوئ نبوت سے پہلے کبھی اسکے جھوٹ کا بھی تجربہ ہوا ہے؟

ابوسفیان۔اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔

قیصر:۔کیا کبھی عہدو پیمان کی خلاف ورزی بھی کی ہے؟

ابوسفیان:۔اب تک تو ایسا نہیں کیا۔اب جو معاہدہ (حدیبیہ) ہوا ہے۔دیکھیں پورا کرتا ہے یا نہیں۔

قیصر:۔اسکے ساتھ تمہاری جنگ بھی ہوئی ہے؟

ابوسفیان:۔کئی مرتبہ جنگ ہو چکی ہے۔

قیصر:۔جنگ کا نتیجہ کیا رہا؟

ابوسفیان:۔ہم غالب ہوئے کبھی وہ غالب رہے۔

قیصر:۔وہ کیا تعلیم دیتا ہے؟

ابوسفیان:۔یہ کہتا ہے۔کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ۔پاک دامنی اختیار کرو۔سچ بولو۔لوگوں سے اچھا سلوک کرو۔باپ دادا کے مشرکانہ طریقے چھوڑ دو۔لوگوں کے حقوق ادا کرو۔نماز پڑھو۔

قیصر:۔نبی موعود کی علامتیں یہی بتلائی گئی ہیں۔مجھے یقین تھا کہ عنقریب ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے۔لیکن یہ گمان نہ تھا کہ عرب میں ہوگا۔ابوسفیان!اگر تم نے جھوٹ نہیں بولا۔تو ایک روز وہ اس جگہ کا جہاں میں بیٹھا ہوں ضرور مالک ہو جائیگا۔اے کاش!میں انکی خدمت میں پہنچ سکتا۔تو اُنکے پاؤں دھوتا۔اسکے بعد نامۂ مبارک پڑھنے کا حکم دیا۔نامۂ مبارک:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔محمد کی جانب سے جو خدا کا بندہ ہے۔اور رسول ہے۔

ہرقل۔قیصر روم کے نام

اس پر سلامتی ہو جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ اسکے بعد میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لاؤ گے تو سلامت رہو گے۔ اللہ تمہیں اسکا دوگنا اجر عطا کریگا۔ اگر تم نہ مانے اور اسلام قبول نہ کیا۔ تو رعایا کا گناہ بھی تمہارے سر ہوگا۔ اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کریں۔ اور نہ کسی کو اسکا شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم اللہ کے سوائے کسی دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔ اگر تم نہیں مانتے تو اس امر پر گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔ محمد رسول اللہ

قیصر کے تاثرات اور نامۂ مبارک سنکر پوپ اور اہل دربار سخت مشتعل ہوئے۔ قیصر نے حالات بدلتے دیکھکر دربار برخواست کیا اور دحیہ رضی اللہ عنہ سے کہا۔ کہ اگر مجھے اپنے لوگوں کا خوف نہ ہوتا تو میں ضرور تمہارے نبی کا اتباع کرتا۔ آخر حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت میں روم فتح ہوا۔ اور روم و کسریٰ کی دولت غلامان محمدؐ کو حاصل ہوئی۔

عرب کے تمام قبائل نے خصوصاً یہود و نصاریٰ اور قریش نے انتہائی مخالفت کی اور ناقابل برداشت تکلیفیں پہنچائیں۔ مگر باوجود اسقدر اقتدار و استبداد کے کوئی طاقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات پر غلبہ نہ پاسکی! بلکہ رفتہ رفتہ فنا ہوگئیں! ۔ خسرو پرویز شہنشاہ ایران جسکے خاندان کی حکومت چار پانچ سو برس سے تقریباً نصف دنیا پر رہی۔ آخر ایک ذاتِ واحد کے ارادہ کا مقابلہ نہ کرسکا۔ وہی قبائل قریش جنکی وسعت و امارت سام بن نوح سے مسلسل عرب اور مکہ پر لگاتار رہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقابلہ کرتے کرتے آخر فنا ہوگئے اور آخر کار سب کے سب اسلام کے محکوم ہوگئے۔ یہ ایک معجزہ ہی تھا۔ کہ تمام عالم کی بادشاہتوں کو ایک بے یار و مددگار۔ یتیم پیغمبر نے صرف اپنے پیغمبرانہ کردار و تدبر سے سرنگوں کردیا۔

اگر خواہی دلیلے عاشقش باش　　　　محمدؐ ہست برہانِ محمدؐ

اگر محمدؐ کے پیغمبر ہونے کی دلیل چاہتے ہو۔ تو آؤ محمدؐ کی زندگی ــــ محمدؐ کے کردار۔ محمدؐ کے خلوص۔ محمدؐ کی انسانیت سے ہمدردی۔ اور انسانیت کی فلاح کیلئے ان تکالیف کا جو آپ نے صرف انسان کی

ہدایت کی خاطر برداشت کیں اور کسی فرد بشر کو اپنی طرف سے تکلیف کا جواب تکلیف سے نہ دیا۔
ان تمام باتوں پر صمیم قلب سے غور کرو اور محمدؐ کے اجرأ کردہ دین کی طرف رجوع کرو۔ تو تمہیں محمدؐ کی عظمت کا قائل ہونا پڑیگا۔ اور اگر تم میں شرافت کا مادّہ ہے تو پھر سوائے اسکے انسان کیلئے کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ آپکے احسانات کو محسوس کرتے ہوئے اپنے دل میں اُنکی عظمت و محبت کو جگہ دے ۔ یہ تو فطری اصول ہے۔ انسانی اخلاق و شرافت کا تقاضا ہے۔ کہ محسن کے احسانات کو دیکھکر مشکور ہو۔ لیکن حضرت محمد ﷺ کی شان کچھ اسقدر اعلیٰ ہے۔ آپکا نورانی حسن کچھ اسقدر دلکش ہے۔ کہ بس آپکے تصور سے ہی محبت پیدا ہوتی ہے۔ یہ محبت ہی ہے۔ کہ عرب کی امیر ترین ہستیوں نے اپنی تمام دولت و ثروت اپنی خاندانی وجاہت و غرور کے مقابلہ میں حضرت محمدؐ کی غلامی کو ترجیح دی! ـــــ امیر ہی نہیں غریبوں نے بھی اپنی جانوں کی عزیز قربانی پیش کی ـــــ! غریب و محکوم انسان دنیا میں بسر کرنے کیلئے۔ آزادی۔ اطمینان۔ اور دو وقت کے کھانے کا متمنی ہوتا ہے۔ مگر غریب کی محبت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے۔ کہ بلال حبشیؓ نے صرف نام محمدؐ سنا۔! نام کی چاشنی دل میں اثر کرگئی۔ اور بے اختیار۔ ''احد'' ـــــ ''احمدؐ'' پکارا۔ یہ ایک یہودی کا غلام تھا۔ یہودی مالک نے اسے اس نام سے باز رکھنے کیلئے تپتی ریت پر لٹایا۔ سینہ پر بھاری پتھر رکھکر عرب کی جھلستی دھوپ میں بے آب تڑپایا۔ بازاروں میں گھسیٹا۔ لیکن محبت نے کسی تکلیف کو خاطر میں نہ لایا۔ اور ہر تکلیف پر احد و احمدؐ کی پکار میں جوش و سرور ہی ظاہر ہوا۔ یہ تمام تکلیفیں بلالؓ کے سینہ سے عشق محمدؐ نہ نکال سکیں۔ عمار بن یاسرؓ غلام اور عمار کی والدہ سُمیّہؓ کو ابوجہل نے شدید ترین عذاب پہنچائے حضرت سمیہؓ کو نیزہ مار کر ہلاک کرڈالا مگر ان غلامانِ محمدؐ نے محبت کو آزادی پر ترجیح دی۔ یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ دعوت رسول ہر شخص کے دل میں خود بخود گھر کرجاتی اور اس دعوت کو دنیا کی کوئی طاقت نہ دبا سکی۔

ان حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد حضرت محمد ﷺ کے پیغمبر ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ سکتی۔ اور جو کچھ آپ سے بحیثیت پیغمبر صدور ہوتا ہے۔ وہ سب ایک معجزہ ہے اور آپکے کسی کلام میں نہ شبہ ہوسکتا ہے نہ ہی اس کلام میں کوئی خامی پائی جاسکتی ہے!۔

پیغمبرانہ حیثیت سے اگر آپ کا دعوےٰ ہے کہ ہمیں وحی کے ذریعہ کلام الٰہی حاصل ہوتی ہے۔تو اس میں کسی شبہ کی صورت نہیں۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کہنے پر جب ہم کلی طور اعتماد رکھتے ہیں۔تو ہمارے لئے ہر صورت میں ایک خدا کا قائل ہونا لازمی ہے۔اور جب آپ کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ کی طرف سے کلام (دین) بذریعہ وحی ملتے ہیں تو بلاشبہ آپکا ہر کلام۔وحی۔کلام الٰہی ہی ہے۔اور جب ہم یہ تصور کرلیں کہ ایک خدا۔خالق کائنات اپنی ہر شے سے واقف ہے۔اور ہر شے اسی علت لامحدود سے معلول ہے (لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) تو اسکی قوت و برتری کے لحاظ سے۔اسکی ہر بات۔ہر حکم ایک مستقل قانون کی صورت میں پختہ و مکمل ہو سکتی ہے جس میں کسی اعتراض۔کسی نکتہ چینی کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔یہ سب کچھ ہم حضور محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو شاہد رکھکر بغیر کسی دلیل و حجت کے تسلیم کر لیتے ہیں۔چنانچہ کلام الٰہی (قرآن) خود بھی اپنی منجانب اللہ ہونے کی دلیل میں اعلان کرتا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں اللہ نے ہمیں منتخب کر کے پیغمبر کی حیثیت سے دنیا پر بھیجا ہے۔اور قرآن منجانب اللہ ہم پر نازل ہوا ہے:

حٰمٓ ۚ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ○ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۗ وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۙ

(پارہ ۲۵ سورۃ ۴۵ آیت ۱تا۴)

حم۔یہ کتاب اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے اتاری گئی ہے تحقیق آسمانوں اور زمین کے بیچ میں ایمان والوں کیلئے البتہ نشانیاں ہیں اور تمہاری پیدائش میں بھی۔اور اس چیز میں کہ پھیلایا جانوروں سے۔نشانیاں ہیں واسطے یقین کرنے والوں کے۔

یہ آیات قرآنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے احکام ہیں۔ جن میں اللہ تعالیٰ اپنے خالق ہونے اور قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل پیش کرتا ہے۔کہ یہ کتاب منجانب اللہ نازل کی گئی ہے تنزیل۔اللہ تمام کائنات کا خالق ہے۔علت لامحدود ہونے کی

حیثیت سے وہ تمام کائنات سے قوت وتابانی میں بدرجہ اتم قوی وغالب ہے ۔تمام کائنات اسکی گرفت میں پابند ہے۔اور وہ خود ہر شے پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔اسلئے وہ ہر شے کے وجود سے پوری طرح علم رکھتا ہے۔جہاں ماورا ادراک قوتیں واقع ہیں۔اسکا بھی اسے پورا پورا علم ہے۔اگر میرے خالق ہونے میں تمہیں کسی طرح کا شبہ ہے۔تو پھر آسمانوں۔اور زمین کی اشیأ پر غور وتفکر کرو۔تو دیکھو کہ یہ اشیاء جس منبع سے نکلی ہیں۔اسکی کیا حقیقت ہے؟ جب تم اِن اشیأ پر غور وفکر کرو گے۔تو لازمی طور تمہیں ہر شے کی علت کا ابتدائی مقام نظر آئیگا تو تم پر یہ خود ثابت ہوگا کہ تمام کائنات ایک علتِ لامحدود سے پیدا ہوئی ہے۔اور وہی علتِ لامحدود ایک خدا ہے۔تم اپنی پیدائش (بناوٹ) اور اپنے وجود سے ہی اس چیز کا اندازہ کرو کہ تمہارے وجود میں کیا خاصیتیں۔کیا مشینری ۔کیا کاریگری۔پائی جاتی ہے۔تو جب تم اپنی ابتدائی علت کا اپنے وجود کے اعتبار سے ہی تفکر کرو فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ط (پارہ ۲۱ سورۃ ۳۰ آیت ۳۰) (اللہ انہیں خاصیتوں کا بدرجہ اتم مالک ہے جو خاصیتیں انسان میں پائی جاتی ہیں) تو معلوم ہوگا کہ جس قوت میں مخلوق کی تمام خاصیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں وہی اللہ کہلاتا ہے اور اسی اللہ کی طرف سے یہ کتاب نازل کی گئی ہے۔گویا یہ ثابت ہوتا ہے۔کہ اللہ ہے۔اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ پر منجانب اللہ قرآن نازل کیا گیا ہے۔

دوسری جگہ خود اللہ تعالیٰ ہی اس امر کی آگاہی دیتا ہے!۔

حٰمٓ ۚ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۚ (پارہ ۲۵ سورۃ ۴۳ آیت ۱ تا ۳) حم۔قسم ہے کتاب بیان کرنے والی کی۔تحقیق کیا ہے ہم نے اسکو قرآن عربی میں تا کہ تم تعقل سے بھی سمجھو۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں قسم کھا کر اپنے احکام کی صداقت کا اعلان کرتا ہے۔عربی میں قسم کھانے سے مراد اپنی صداقت کی دلیل ہوتی ہے۔اور وہ دلیل مبین یعنی کھلی نشانیوں کے ساتھ ہوتی ہے۔جسکا انکار نہیں کیا جا سکتا۔جسکی تحقیق ہر ایک پر ثابت ہو۔ثبوت کیلئے تحقیق کرنے کی

تحریک دی جاتی ہو۔اور تحقیق کے بعد اسکے مشاہدہ سے صداقت مصدقہ ہو جائے۔یعنی یہ قرآن اپنے بیان میں خود اپنی دلیل ہے۔جسکا جی چاہے اسکے حکم کو پرکھ کر دیکھ لے۔یہ کتاب غلط نہیں ہو سکتی۔اسکی صداقت کیلئے ہی اسے عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔تاکہ کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔اور عربی زبان میں کھلی کھلی باتیں بیان کی گئی ہیں۔اس کو سمجھنے کیلئے کسی گورکھ دھندے میں نہیں پھنسایا جاتا۔بلکہ تمہاری اصطلاحیں۔تمہارے استعارے۔اور تمہارے عام تمدن و معاشرہ کے مطابق دلیلیں دی گئی ہیں تاکہ تم اپنے تعقل [1] سے بھی خالق کائنات کو تصور میں لاسکو۔اللہ تعالیٰ اپنے بیان میں صاف اعلان کرتا ہے۔کہ اگر تمہیں اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں شک ہے وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ص وَادۡعُوۡا شُہَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ○ (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۲۳) جو کچھ میں نے اپنے بندے پر نازل کیا۔تو تم بھی اس قسم کے احکام بنا کر لاؤ جو میرے قرآن کے مقابل آیات پیش کرے۔اور تم اپنے حکماء۔فلاسفر۔اور ادیبوں کو اکٹھا کر کے قرآن جیسی ایک آیت بھی تو پیش کرو؟ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا (پارہ ۲ سورۃ ۲ آیت ۲۴) پس تم نہیں ایسا کر سکو گے اور یہ دعویٰ اور حقیقت ہے کہ تم سے ایسا نہ ہوسکیگا۔تو میں قسم کھاتا ہوں اس قرآن کی کہ تم اس قرآن کی آیات کو اس کے بیان کے مطابق پرکھو۔تو ضرور یہ تمہیں اللہ اور اسکی راہ عرفان کا نشان بتا دیگا۔عربی زبان اسقدر وسعت رکھتی ہے۔کہ ہر زمانہ اور ہر قوم کیلئے اسمیں وقت کے مطابق تمدن و معاشرے کے مطابق ہدایت حاصل ہوسکتی ہے۔باقی کسی زبان میں اتنی وسعت نہیں۔اور ہر شے کی اصل ماہیت کو ظاہر کر کے رکھ دیتی ہے۔گویا ان الفاظ میں مقصد چھپا نہیں رہ سکتا۔اسکے الفاظ اور الفاظ کے معانی واضح اور روشن ہیں۔یہ زبان باقی زبانوں سے فصیح ہے اسلئے اسکے احکام کو سمجھنے میں کسی قسم کی الجھن یا کسی قسم کی غلط فہمی کا احتمال نہیں ہوسکتا۔

---

[1] تعقلون میں تعقل کی طرف اشارہ ہے۔تعقل وہ حصۂ دماغ ہے جو حواس خمسہ کے ذریعہ آگاہی پاتا ہے۔

حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۚ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۙ (پارہ۲۴ سورۃ۴۱ آیت ۱ تا ۳) حم۔نازل کی گئی رحمٰن اور رحیم کی طرف سے۔یہ کتاب کہ جدا کی گئیں ہیں آیتیں اسکی (یعنی تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں نشانیاں اسکی) قرآن عربی میں اُنکے واسطے جو علم جانیں۔

گویا یہ کتاب اللہ رحمٰن اور رحیم کی طرف سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل کی گئی ہے اس میں اللہ کے خالق و معبود ہونے کیلئے واضح دلائل ہیں۔اور نشانیاں بتائی گئی ہیں۔یہ نشانیاں اٹکل پچو نہیں۔بلکہ سمجھنے والے بے شک غور و تفکر میں اِن نشانیوں کو لائیں تو نتیجتاً وہ حقیقت کو سمجھ لینگے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۗ (پارہ۲۳ سورۃ۳۹ آیت ۱،۲) نازل کی گئی ہے یہ کتاب اللہ عزت والے اور حکمت والے کی طرف سے۔تحقیق ہم نے اتاری۔اے محمد۔تیری طرف یہ کتاب ساتھ حق کے۔پس اللہ کی بندگی کر خالص کر کے واسطے اسی کے ہے عبادت۔

یعنی یہ کتاب نازل کی گئی اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے۔اس میں حقیقت و صداقت ہے۔اس میں خالق کائنات ہونے کی دلیلیں موجود ہیں۔اس میں عرفان الٰہی حاصل کرنے کا تمام مواد موجود ہے۔یہ کتاب اے محمد ﷺ ہمنے آپ پر بھیجی تمام اسرار و رموز سے بھرپور! پس تسلیم کرواے لوگو اس بات کو کہ یہ قرآن خالقِ کائنات کی طرف سے ہے۔اور یہ بات اظہر من الشمس ہے۔کہ وہ اللہ خالق ہونے کی حیثیت سے معبود ہے۔یعنی جسکی پہچان کرنی ہم پر لازم ہے ۔پس اس قرآن میں سے وہ مواد حاصل کرو جس سے تمہیں ہم تک پہنچنے کا سبق ملتا ہے۔پس اسی کو عبادت کہتے ہیں۔کہ میرے پہچاننے کے لئے وہ قدم اٹھاؤ جو تمہیں قرآن ہم تک پہنچنے کیلئے سکھاتا ہے۔اور اپنے لئے صرف یہی کام مخصوص کرو۔کہ ہم اللہ تک پہنچیں۔اور اسے پہچانیں۔

یہ بیان حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے وہ وحی شدہ بیان ہے۔جو خالص

منجانب اللہ ہے۔اب قرآن کی فصاحت و بلاغت ملاحظہ کیجئے کہ اس میں قوانین فطرت کے ساتھ کتنی موافقت ہے۔اور خود قرآن کائنات کی نشانیوں ہی سے اپنی صداقت کی دلیل پیش کرتا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۔ وَ فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ط اَفَلاَ تُبْصِرُوْنَ ○

تحقیق زمین و آسمان کی پیدائش (بناوٹ) میں یقین کرنے والونکے لئے (خالق کی) نشانیاں ہیں۔اور تمہاری (فطری بناوٹ) تخلیق میں بھی (نشانیاں) ہیں کیا تم نہیں دیکھتے؟

''کیا تم نہیں دیکھتے؟'' یہ الفاظ دلیل کیلئے ہیں۔تبصرون (دیکھتے) ظاہری حواس (آنکھوں) کیلئے کہا گیا ہے۔یعنی میرے خالق ہونے کیلئے زمین و آسمان میں ایسی نشانیاں پائی جاتی ہیں جو اٹکل پچو صرف عقیدہ سے نہیں۔ بلکہ ظاہراطور آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہیں۔افلا تبصرون میں واضح دلیل پیش کی گئی ہے۔کہ زمین و آسمان کی بناوٹ ان اشیا کا ضبط و نظام اور منظم ترتیب۔ ہر شے کی پابندی اور انکی ابتداًاور فنا یہ ایسی چیزیں ہیں جنکے لئے ایک خالق کا ہونا یقینی ہے۔اَفَـلاَ تُبْصِرُوْ نَ ۔دعوتِ غور و فکر۔دعوت تحقیق ہے۔ہمارے کلام کی تصدیق کیلئے غور و فکر تجسس و تحقیق کرو یقیناً تخلیق کائنات اور انسانی وجود میں۔انسانی فرائض۔غور و تفکر۔علت لامحدود کا عرفان سب کچھ عیاں ہوجائیگا۔یہ ایک شرط ہے ___!اپنے دعوے کی دلیل ہے۔!

وہ دلیل کیا ہے؟ وہ یہی ہے۔کہ ہر معلول ایک علت سے وابستہ ہے۔ہر علت اپنے معلول سے قوی و غالب ہے۔جب ہم کائنات کی کسی شے کا بنظر عمیق تجزیہ کریں۔اور نظام کائنات پر غور کریں تو ہمیں ایک لامتناہی تسلسل کا پتہ چلتا ہے۔کہ جسقدر معلول کی علتیں ہونگی انکا ہر صورت میں ایک علتِ لامحدود سے تعلق قائم ہوتا جائیگا۔وہ سورج ہو یا ہوا۔سمندر ہوں یا پہاڑ۔ ذرہ ہو یا ایٹم ہر شے کیلئے ایک قوی علت ضرور ہوگی۔اور ہر معلول کی صفت کے لحاظ سے اسکی علت انہیں صفات میں بدرجہ اتم اولیٰ و افضل اور غالب ہوگی۔اسی طرح اگر انسان اپنی بناوٹ اپنی پیدائش پر نظر ڈالے تو اسکی علت بھی اسکی صفات کے لحاظ سے بدرجہ اولیٰ غالب و وسیع ہوگی جہاں

ایٹم اسقدر لطیف وقوی ہے۔وہاں اسکی علت اور علتِ لامحدود لا انتہا قوت کی حامل ہوگی۔ جہاں انسان سمیع و بصیر قدیر و وسیع ہے وہاں اسکی علت اور علت لامحدود بہ ہمہ صفات بدرجہ اتم ان اوصاف کی حامل ہے جب وہ علتِ لامحدود سمیع وبصیر قدیر و واسع ہے وہاں اسکے اختیار بھی مخلوق کی صفات کے اعتبار سے متصف ہوتے ہیں۔نظام کائنات میں ۔پابندی۔احاطہ۔نظم۔ہم آہنگی۔ ربط۔اسباب وعلل اور ربوبیت کا مکمل قانون جاری ہے۔اسی اعتبار سے وہ ان تمامی امور کا خالق ہے۔تو لازمی بات ہے۔کہ ہر شے اسکی ربوبیت سے قائم ہے۔ جہاں اللہ کے اختیار میں ہر شے کی فنا و بقا ہو۔وہاں ہر شے مخلوق اسی اللہ کی محتاج ہے۔اسی احتیاج کو بندگی (بندہ ہونا۔غلام ہونا یا پابند ہونا) سے تعبیر دیا گیا ہے۔ جہاں وہ اپنے ہر فعل پر کلی طور مختار ہے وہاں ہمارے لئے اُسکے آگے عاجز ہونا لازمی ہے۔ جہاں اس نے اپنے ارادہ سے ایک منظم نظام مقرر کیا ہے۔وہاں اُس نظام کا ایک انجام اور نتیجہ بھی قائم کیا ہے۔یہ چیز فطری ہے۔کہ جب انسان کیلئے دنیا پر سوائے جملہ مخلوق سے استفادہ کرنے کے اور کوئی کام نہیں۔تو اس منضبط نظام کا خاصہ ہے کہ ہمارے لئے کوئی مقرر کام ضروری ہے۔ جب ہم کائنات کے نظام میں کسی خرابی۔ کسی بدنظمی کو تباہی اور فنا کے انجام میں پاتے ہیں۔تو یقینی طور ہماری بدنظمی اور خلاف فطرت نظام کیلئے بھی تباہی۔ ذلت و فنا ہی ہو سکتی ہے۔ چونکہ انسان ایک مخصوص انداز میں بنایا گیا ہے۔اسلئے اپنی اصل تک پہنچنا ہی اسکا خصوصی کام ہے۔اصل تک پہنچنے کیلئے انسان بذات خود عاجز ہے۔اسلئے اسے اللہ کے بتائے ہوئے قانون سے ہی راہنمائی حاصل کرنی ہے۔ جسے وہ قرآن سے حاصل کر سکتا ہے۔یہی وہ طریق حصول عرفان ہے جسے انسان۔ بندہ بن کر۔اپنی محتاجی و عاجزی سے عبادت کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے۔اور اسی نسبتِ بندہ و معبود کو انسان نے تسلیم کرنا ہے۔اور اللہ کو معبود تصور کرنے کیلئے کائنات کی تمام اشیأ اور اشرف المخلوقات انسان کی تخلیق۔انکی بناوٹ انکی ترکیب اِنکے ضبط نظام انکی پیدائشی ترکیب اور اِنکے اجزأ۔اِنکی ابتدا و انتہا کے تصور یہ سب چیزیں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں ان پر غور و تفکر سے ہمیں یقینی طور ایک معبود (خالق) کا سراغ لگ سکتا ہے۔اب

دعوے ہے کہ یقین کرنے کیلئے اللہ کی طرف رجوع کرنے سے تمہیں یہ چیز مل سکتی ہے۔ ورنہ ہٹ دھرمی اور غرض پرستی ہر اچھی شے میں بھی نقائص پیدا کر لیتی ہے۔ یہی سبق قرآن نے اپنے بیان بالا میں انسان کو بتا دیا ہے۔

یہ ایک مجمل بیان۔ قرآن کا ہے۔ اسکی تفسیر میں اپنی شہادت کیلئے کئی جگہ اشارہ دیا ہوا ہے۔ لیکن ضرورت اس چیز کی ہے۔ کہ انسان صحیح دماغ سے اور ہٹ دھرمی سے خالی ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے۔ اور اسکی نشانیوں کو بھی خلوص نیت سے مطالعہ کرے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (پارہ ۲۰ سورۃ ۲۹ آیت ۲۰) کہو (ان منکرین خدا سے) کہ جاؤ سیر کرو زمین میں اور دیکھو اللہ نے مخلوق کی ابتدأ کیسے کی۔

رگوید۔ آدی بھاشا۔ بھولکا۔ اشاعت اول ص ۱۳۵ میں ہندو مذہب کی الہامی کتاب۔ خدا اور مخلوق کے متعلق یہ علمی نظریہ پیش کرتی ہے۔ کہ ''دن'' اور ''رات'' ایشور (خدا) کی دو بغلیں ہیں۔ ''سورج'' اور ''چاند'' اسکی دو آنکھیں ہیں۔ ''سورج کی دھوپ'' اور ''بجلی کی چمک'' یہ دونوں ایشور کے ہونٹ ہیں سورج اور چاند کے درمیان کا پول ایشور کا منہ ہے۔

اس منتر کے مطالعہ سے ایک ادنیٰ شخص بھی جو خدا کی ہستی کا قائل ہو یا نہ ہو۔ خود فیصلہ کر سکتا ہے۔ کہ اس مخلوق کی پیدائش کی ترکیب میں خدا کے ذاتی وجود کا کوئی دخل نہیں۔ بلکہ ایک منضبط نظام کے ماتحت کسی علت کے منتشر اجزا ہیں۔ جن میں خدا کی بغلوں۔ آنکھوں۔ ہونٹوں وغیرہ کو کوئی دخل نہیں۔ محققین مغرب نے عینی مشاہدہ میں اس مخلوق کی وجودی ترکیب کو منظر عام پر لا کر رکھ دیا ہے۔ پھر اس عقیدے کو قبول کرنا سراسر جہالت ہو گی۔

اسلام کا علمبردار قرآن اس مخلوق کے بارے میں۔ اپنے نظریہ سے متعلق ایک چیلنج کرتا ہے۔ کہ یہ چیزیں ایک مکمل نظام کے تحت کسی خالق کی کاریگری سے بنی ہیں۔ ان اشیاً کا وجود خود اپنی تخلیق اور خالق کی شہادت دیتا ہے۔ اور اسکے لئے شرط یہی رکھی ہے۔ کہ تم زمین کی سیر کرو۔ زمین پر پھر کر مخلوق کی ابتدائی پیدائش کی چھان بین کرو۔ یہ چیز کوئی چھپی بات نہیں بلکہ

فـــانـظـرو نظارہ کرنے سے تمہارے حواس (آنکھوں) کے احاطہ میں آسکتی ہے۔ یہ چیز تمہاری تحقیق پر رکھی جاتی ہے۔ تحقیق کے بعد تمہیں خود معلوم ہوگا۔ کہ یہ چیزیں قوانین فطرت کے ماتحت ایک تسلسل کے ساتھ پیدا ہوئی ہیں۔ اور جب تم اسکی ابتدأ (بَدَا) پر پہنچو گے تو تمہیں خود بخود معلوم ہوگا کہ اس تمام مخلوق کا منبع حقیقی ایک علت لامحدود ''خدا'' ہے۔ جس نے ایک منضبط ترتیب کے ساتھ ان اشیأ کے وجود کو ایک نئی اور ابتدائی تخلیق میں ظاہر کیا۔

یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ ہر شے کی ایک علت ہے اور ہر علت اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس میں لامحدودیت نہ پائی جائے۔ تو یہ امر خود تحقیق ہو جائیگا کہ ہر شے کی اصل علت علتِ لامحدود سے وابستہ ہے۔ لیکن خدا کی صناعی کی اس میں کسطرح خصوصیت پائی جاتی ہے؟ اسکی حقیقت انسان کے تفکر پر ہی منحصر ہے۔ کہ وہ ان تمام اشیأ کی پیدائشی ترکیب پر نظر کرے۔ کہ ہر شے میں ایک خوبصورت اور متحیر کُن نظام پایا جاتا ہے۔ جس میں کسی مبالغہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ ایک ذرہ کی لطیف زندگی کو دیکھیں کہ اس میں زندگی پیدا نہیں ہوتی بلکہ خود مجسم زندگی ہوتا ہے۔ یہ زندگی کہاں سے آئی؟ یہ زندگی اس مجسم زندگی سے آئی جو اپنے میں لازوال زندگی رکھتا ہے۔ پھر اس ذرہ میں زندگی اور ارتقاء کی کسقدر منظم ترکیبیں پائی جاتی ہیں۔ یہ ترکیبیں اگر خود بخود بھی ہیں۔ لیکن کسی شے (علت) سے ورثہ میں ضرور ملی ہیں۔ ایک مچھر کی لات پر نظر ڈالیں جب تک اس میں دورانِ خون کا اور جسم کی بناوٹ کیلئے ذرائع (Nerves) اور جسم بننے کے سامان پورے میسر نہ ہوں اسکی ارتقا (زندگی) ممکن نہیں۔ اس ذرہ بمقدار کی ایک حقیر جز کے لئے بھی فطرت نے اتنا ہی ترتیبِ نظام رکھا ہے۔ جتنا ایک ہاتھی کیلئے اور جتنا انسان کیلئے ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر ضبط نظام کا یہ ضابطہ ہے۔ کہ ہر شے کیلئے اسکی ہیئت کے مطابق حسب ضرورت سامان زندگی۔ سامان نشو ارتقا مہیا کر رکھا ہے۔ ایک پتا جو درخت کی شاخ سے وابستہ ہے اپنی انتہائی چوٹی پر بھی اپنی غذا حاصل کر رہا ہے پھر اس پتہ کی باریک لکیروں پر نظر ڈالو جو اسکی نشو و نما کیلئے خون کی رگوں کا کام دیتی ہیں۔ پہاڑ کا پتھر جسے بے معنی اور بے جان شے سمجھ کر ٹھکرایا جاتا ہے۔ ایک زندہ شے

ہے۔ بظاہر ایک ٹھوس شے ہے۔ مگر اس میں بھی ہیئت تبدیل کرنے کی خاصیت ہے۔ اسکی ارتقائی نشو ونما کا سامان اس میں بھی موجود ہے۔ فطرت اس بات کی طرف تحریک دیتی ہے۔ کہ خود نظارہ کرو (فانظرو) کہ ایسے بے معنی اشیأ میں بھی نشو وارتقا کا ایک منضبط نظام نظر آئیگا۔ اسقدر باریکی اور تنظیم بے معنی نہیں ہوسکتی۔ اگر بے معنی نہیں تو کسی حکمران کی حکومت کا ضرور واسطہ ہے۔ بظاہر یہ نظام خود بخود نظر آتا ہے۔ مگر ہر شے کی خاصیت اسکی باریکی۔ اسکا نظام۔ اسکی خوبصورتی۔ اور خوبصورت ترتیب بھی تو کہیں سے فطرۃً ورثہ میں آئی ہے! کیونکہ کوئی شے جب تک لامحدود نہ ہو جائے اپنی پیدائش میں ابدی نہیں ہوسکتی بلکہ کسی لازوال۔ لاابتدأ سے ہی اسکی ابتدأ وابستہ ہے۔

اسلام اپنی صداقت میں ایک مدلل دلیل پیش کرتا ہے۔ اور اپنی صداقت کیلئے چیلنج کرتا ہے کہ تمام کائنات ایک خدا سے بنی ہے اور وہ خود اسکا پیدا[1] کرنے والا ہے۔ جسکے لئے غور و پرکھ کی دعوت دیتا ہے کہ یہ زمین و آسمان۔ یہ مخلوق مختلف الانواع۔ خود نہیں بنی۔ نظر کرو اِنکی باریکی نزاکت

---

[1] قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِىٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۝ نِ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝ (پارہ ۲۳ سورۃ ۳۶ آیت ۷۹۔۸۰) ترجمہ:۔ کہو (اے محمدؐ) پیدا کرتا ہے وہی اللہ جس نے پہلی بار تمہاری ابتداء کی وہ خود بدرجہ اتم ارادہ رکھتا ہے۔ وہ پیدا کرسکتا ہے۔ پھر وہ اپنے ارادے سے مار بھی سکتا ہے۔ وہ اپنی پیدا کی ہوئی تمام اشیأ سے بخوبی واقف ہے۔ آج نہیں بلکہ آدم کے ابتدائی ادوار سے۔ جبکہ آدم اپنے ابتدائی اور درمیانی ادوار (تخلیق کائنات کے ساتھ آدم نے بتدریج ارتقا کرتے کرتے مدتوں بعد شکل آدم اختیار کی۔ لیکن آدم اپنی ارتقا میں واحد اور مخصوص تھا) سے گزر رہا تھا۔ (ابھی آدم کی شکل مکمل نہ ہو چکی تھی) اس طویل مدت میں بے شمار قسم کے وحوش وطیور۔ جنگل اور جنگلوں کے ہزار ہا سالہ درخت۔ جنگلی جانور۔ جنکے ابتدائی وجود۔ جدید قسم کے حیوانات سے ساخت و بناوٹ میں مختلف وقوی تر تھے۔ اگر انکا تصور کیا جائے۔ تو ایسا محسوس ہوگا جیسے ہاتھی جتنا پرند اڑتا نظر آئے۔ تو یہ بھی مبالغہ سمجھا جائیگا۔ لیکن محققین یورپ نے یہ مناظر بھی منظر عام پر لا کر فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ اور فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ اطراف عالم کی سیر میں ہزاروں میل کھدائی کرکے ایسی عجیب الخلقت پیدائش کا پتہ لگایا۔ جسکا تصور کرنا بھی مبالغہ نظر آتا ہے۔ وہ قوی الجثہ جانور۔ وہ عظیم الشان اشجار جو فطرت کے ارادہ سے پیدا ہوتے رہے۔ اور فنا ہو گئے۔ آج بھی اِنکے نشانات فطرت کی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور منضبط نظامِ ترتیب پر تم دیکھو کیا کوئی بھی اسکا بنانے والا ہے۔ ءَ اَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ○ (پارہ ۲۷ سورۃ ۵۶ آیت ۵۹) کیا تم اسکے بنانے والے ہو یا ہم (اللہ) بنانے والا ہیں؟ اس کائنات کی ہر شے کی بناوٹ کو غور سے دیکھو کہ کیا کوئی شے بغیر اسباب و

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) غمازی کر رہے ہیں۔ اور یہی پیدائش گھل سڑ کر کہیں تانبے کی ہیئت اختیار کر گئے اور کوئی فولاد (لوہا) کی ہیئت میں بدل گئے۔ اور وہ عظیم الجثہ درخت جو ہزاروں لاکھوں سال زمین کی تہوں میں تہ در تہ زمین کی گہرائیوں میں دب کر رہ گئے۔ کوئلہ کی شکل میں بدل گئے۔ اسی طرح نامعلوم زمانہ میں نامعلوم واقعات جو کائنات پر ہوتے رہے۔ اور انسانی علم سے پوشیدہ رہے۔ ان سب کی ابتدا و انتہا سے وہ علیم پوری طرح واقفیت رکھتا ہے۔ اسی لئے وہ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ کی طرف اشارہ کر کے اس پر اسرار تخلیق کی طرف انسان کی تحقیق کو تحریک دیتا ہے۔ کہ جب انسانیت اس عالم سے بے خبر تھی ان گزشتہ واقعات پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا۔ کہ اس تخلیق کا طریق کب سے۔ کہاں سے۔ اور کس تنظیم سے ہوتا رہا ہے۔ اور اس تحقیق سے تمہارے قلب و نظر میں وسعت پیدا ہوگی۔ اور محسوس ہوگا کہ یہ دنیا یہ کائنات عبث نہیں۔ بلکہ کسی خاص مقصد کسی خاص نظام کے تحت ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○ (پارہ ۱۸ سورۃ ۲۳ آیت ۱۱۵) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے معنی بلاوجہ پیدا کیا؟ اور تم نے پھر اسی منبع حقیقی کی طرف رجوع نہیں کرنا ہے؟ یہی قرآن ہے جس کے علم نے کائنات فطرت کے ان واقعات کا صحیح نقشہ (جو قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت کرتے ہیں) محمد عربی ﷺ کی زبانی اسوقت پیش کیا۔ جسوقت نہ انسانی علم مکمل تھا۔ نہ وہ سامان ہی موجود تھے جن پر آج محققین مادہ اپنے مشاہدات کی تصدیق کرتے ہیں۔

وَ هُوَ الَّذِىْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ط قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ○ (پارہ ۷ سورۃ ۶ آیت ۹۸) وہی ہے جس نے تم کو ایک جان واحد سے بنایا ____ پس اسکی پیدائش کا ایک مقام بنایا۔ پھر اسکی پیدائش کا مقام بدل دیا۔ پس ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنی نشانیاں سمجھنے والوں کیلئے بیان کیں۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ج (پارہ ۴ سورۃ ۴ آیت ۱) اے لوگو ڈرو اللہ سے جس نے تم کو ایک واحد جان سے بنایا۔ اور اسی سے اسکا جوڑا بنا پھر اسی جوڑے سے کثیر مرد اور عورتیں بنے۔

محققین یورپ کی انسانی تحقیق اظہر من الشمس ہے۔ انسان کے اجزائے ترکیبی پر انہیں اتنا عبور ہے کہ آجتک کسی قوم کو اتنا ملکہ عطا نہیں ہوا۔ انسان کے ذرہ ذرہ کا تجزیہ کیا گیا۔ دل ایک (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

علل کے بنی ہے؟ اگر نہیں تو کوئی ضرور اسکا بنانے والا ہونا چاہیے۔تو وہ بنانے والا خود علتِ لا محدود اللہ ہی ہوسکتا ہے۔اَوَ لَيۡسَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؕ بَلٰى ۚ وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِيۡمُ ۞ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـئًـا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) نہایت لطیف و نازک اندام ہے اسکا اپریشن کرنے میں بھی یورپین محقق کامیاب ہو چکا ہے۔کائنات کے لطیف اور باریک ذروں تک دوربینی آلات سے مشاہدہ کر چکا ہے۔اور اسکا یہ عمل عینی مشاہدہ تک پہنچ چکا ہے۔یہ مشاہدہ اسے سالہا سال کی جانفشاں کاوشوں کے بعد حاصل ہوا۔مگر اسلام کے پیغمبر اُمّی نے بذریعہ کلام قدسی چودہ سو سال پیشتر علے الاعلان اپنے حق کے استدلال میں بتلا دیا۔کہ انسان ایک لطیف ذرہ (جرثومہ) سے بنایا گیا ہے۔اور بتدریج مدتوں کے بعد اپنی آخری ارتقائی شکل میں نمودار ہوا۔پھر اِسکے اجزائے ترکیبی بھی بوضاحت بیان کئے۔کہ انسان کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ كَالۡفَخَّارِ ۙ وَ خَلَقَ الۡجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ ۚ (پارہ ۲۷ سورۃ ۵۵ آیت ۱۴۔۱۵) انسان کو ٹھیکری کے مانند بجتی ہوئی مٹی سے اور جنوں کو آگ لوؤں (شعلوں) والی سے بنایا۔خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۚ وَالۡجَآنَّ خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ ۞ (پارہ ۱۴ سورۃ ۱۵ آیت ۲۶۔۲۷) انسان کو بجتی مٹی۔کیچڑ سڑی ہوئی سے بنایا اور اس سے پہلے جنوں کو لوؤں (شعلوں) والی آگ سے بنایا۔

لیس دار مہین کیچڑ اور ٹھیکری سی بجتی مٹی دو مختلف صورتیں ہیں لیس دار کیچڑ بیک وقت ٹھیکری سی بجتی ہوئی مٹی نہیں کہلاتی۔اور بیک وقت مٹی کی یہ دونوں صورتیں پیدا نہیں ہوسکتی ہیں۔البتہ دو زمانوں میں علیحدہ علیحدہ یہ کیفیتیں ہوتی ہیں۔قرآن نے بھی ان دو صورتوں کو دو زمانوں سے متعلق کر کے ابتدائی آفرینش کا تصور دلایا ہے۔یہ امر پایا ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔کہ زمین کی ابتدائی کیفیت ان دونوں حالتوں سے گزر چکی ہے۔یعنی زمین ابتدا میں ایک ملتہب کرۂ نار تھی اسکی کیفیت انتہائی درجہ نار (آگ) کی صورت میں تھی ترتیب نظام کے تحت اس میں لوئیں (شعلے) اٹھتی رہیں۔یہ ایک ناری وجود کی صورت میں تھیں جو اس کرۂ نار سے علیحدہ ہوتے رہے انہیں مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ کے نام سے ''جن'' تعبیر دیا گیا۔اور ترتیب نظام کے تحت ہی زمین کی کیفیت ٹھوس مادے کی طرف رجوع ہوتی رہی۔پانی۔بخارات سے پیشتر ایک ایسی کیفیت میں آئی جسے صَلۡصَالٍ كَالۡفَخَّارِ (مٹی مانند ٹھیکری کے) سے تشبیہ دیا گیا۔یہ پہلی ترکیب انسانی اسی کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔اور زمین کی دوسری کیفیت اسکا آخری دور ہے۔جبکہ بخارات اور پانی سے زمین ٹھنڈی ہوئی اور اس میں پانی کے بعد (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فَیَکُوْنُ ○ (پارہ۲۳سورۃ۳۶آیت۸۱۔۸۲) کیانہیں ہے وہی (اللہ) جس نے پیدا کیا آسمان اور زمین ۔قادر ہے اس پر کہ پیدا کرے مانند اُنکے۔البتہ (بیشک) اور وہی ہے پیدا کرنے والا۔جاننے والا۔سوائے اسکے نہیں کہ حکم اسکا۔جب ارادہ کرتا ہے کسی شے (کے بنانے کا) کا یہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) روئیدگی کے آثار شروع ہونے لگے۔تمام پانی خشک ہوکر ایک نشیبی مقام پر کچھ عرصہ لیس دار کیچڑ کی صورت میں جمع رہا اسی نشیبی مقام پر جہاں پانی سے لیس دار کیچڑ بنا۔اسی مقام پر آدم کے وجود خاکی کی ابتدا ہوئی جسے طیـــن الازب سے تشبیہ دی گئی اسکے استدلال کیلئے قرآن نے ایک مقام پر پیدائش کی ترکیب میں بتایا۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَيٍّ ط (پارہ۱۷سورۃ ۲۱آیت۳۰) اورہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی بخشی۔یہ زندگی خاکی نمود کی زندگی تھی۔جب تک کرۂ ناری صورت میں زمین تھی۔اگرچہ اسوقت بھی اس میں زندگی موجود تھی۔ لیکن مادی ہیئت میں نمودار نہ تھی۔بلکہ ناری وجود میں تھی۔یہ محسوسات سے ماوراُتھی۔پانی کے پیدا ہونے اور زمین پر برسنے سے ہی اس زمین میں خاکی زندگی کے آثار نمایاں (محسوس) ہوئے۔اور یہی پانی اور مٹی لیس دار کیچڑ کی شکل تخلیق آدم میں ظاہری زندگی کا سبب بنی۔پھر قرآن تخلیق کے ہر دور کا نشان بتلاتا ہے کہ اسے کئی شکلوں میں تبدیل کرتے ہوئے خوبصورت اعضأ میں مزین کرکے اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ میں لاکر ثُمَّ سَوّٰہُ پھر سنوارا۔پھر اس تقویم کی تکمیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ثُمَّ اَنْشَانٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ پھر آخری پیدائش پر لاکر شکلِ انسانی کی تکمیل کردی۔

بعض محققین یورپ سِیْـرُوْا فِـی الْاَرْضِ فَـانْـظُـرُوْا کَیْفَ بَدَاَالْخَلْقَ کی تحقیق میں زمین کی تحقیقات میں (جوانہوں نے ہزاروں میل کھدائی سے ڈھانچوں کے نشانات حاصل کئے ہیں) مادی تحقیقات اور قیاس کی بناء پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔کہ ابتدائی تخلیق پانی سے ہوئی جس میں کیڑے مکوڑے پیدا ہوئے اوران اجرام (کیڑوں) نے ارتقا کی طرف ترقی کرتے جانوروں کی صورت اختیار کی ان میں سب سے قوی ہیئت بندر کی تھی یہی بندر ترقی کرتے کرتے انسان کی صورت اختیار کرگیا۔چنانچہ چند ایک ڈھانچے ایسے دریافت ہوئے ہیں جو وسطی ایشیا۔مصر۔افریقہ۔جرمنی۔فرانس۔انگلینڈ وغیرہ اور دیگر ممالک میں زمین کی کھدائی میں پائے گئے ہیں انہیں کیمیاوی ترکیب سے مکمل کیا گیا ہے اور انکی شکل انسان کی شکل سے مشابہ پائی گئی۔انکے نام نمبرا آدم پلٹ ڈون یہ کھوپڑی انگلستان کے ایک مقام پلٹ ڈون سے کھدائی میں دستیاب ہوئی۔اسلئے اسے آدم پلٹ ڈون کہتے ہیں۔یہ کھوپڑی آج سے چارلاکھ سال پہلے کی کھوپڑی ہے اسوقت انگلستان جزیرہ نہ تھا بلکہ یورپ کا ایک جزیرہ نما تھا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ کہتا ہے اُس شے کے واسطے ''ہوجا'' پس وہ ہو جاتی ہے۔کائنات کی تخلیق اور اپنے خالق ہونے کیلئے اللہ خود اپنی نشانیوں کی دلیل دیتا ہے۔اپنی اپنی دلیل کے لئے دعویٰ کرتا ہے۔ کہ کوئی جھٹلانے والا ہے؟ جو میری بتلائی ہوئی نشانیوں پر غور کرکے۔صحیح نتیجہ سے خالی ہو؟ پھر ہر شے کی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) دوسرا۔آدم جاوا۔یہ کھوپڑی جزیرہ جاوا کی کھدائی میں ملی ہے۔اندازہ ہے۔کہ یہ کھوپڑی آج سے پانچ لاکھ سال پہلے کی ہے محققین کی رائے ہے کہ ایسا انسان دس لاکھ سال پہلے بھی موجود تھا۔اور جنوبی ایشیا کے گرم ملکوں میں رہتا تھا۔یہ نسل اب دنیا سے معدوم ہو چکی ہے۔

تیسرا آدم نے انڈرتھال۔یہ کھوپڑی جرمنی کے ایک مقام نے انڈرتھال سے دستیاب ہوئی ہے۔ اسلئے اسے آدم نے انڈرتھال کہتے ہیں۔اندازہ کیا گیا ہے کہ اس قسم کے انسان آج سے سات لاکھ سال سے دو لاکھ سال تک پائے جاتے تھے۔یہ نسل بھی معدوم ہو چکی ہے۔

چوتھی۔کرومیگنن۔یہ کھوپڑی فرانس کے ایک گاؤں کرومیگنن سے برآمد ہوئی ہے۔اسلئے اسے آدم کرومیگنن کہتے ہیں۔اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کھوپڑی کا انسان موجودہ نسل انسانی کے بالکل مشابہ ہے اور یہ کھوپڑی آج سے پانچ لاکھ سال قبل کی ہے۔اسلئے موجودہ نسل اسی آدم کرومیگنن کی اولاد سمجھی جاتی ہے گویا آدم کرومیگنن ہی موجودہ انسان کا جد امجد ہے۔اسکے علاوہ بندروں کی ارتقائی تبدیلی کو بھی انسانوں سے مشابہت دی جاتی ہے۔لیکن قرآنی رو سے یہ سب تحقیق غلط ثابت ہوتی ہے۔

قرآن تخلیق آدم کیلئے ایک خصوصی حوالہ دیتا ہے۔اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط۔میں زمین پر ایک جانشین بنانے والا ہوں۔خلیفہ کے لفظ میں ایک خصوصیت پائی جاتی ہے وہ یہ کہ خلیفہ سے مراد اپنا قائم مقام ــــ قائم مقام سے مراد وہ ہستی جس میں اللہ کی صفات پائی جائیں۔علت و معلول کی رو سے قرآن اسکی بھی شہادت دیتا ہے۔فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ط (پارہ ۲۱ سورۃ ۳۰ آیت ۳۰) اللہ کی فطرت ویسی ہے جیسی فطرت پر انسان (لوگ) ہیں۔اسکا مطلب یہ ہوا کہ خلیفہ کا اشارہ صرف انسان سے ہی متعلق ہے۔کیونکہ باقی مخلوق کے مقابلہ میں انسان ہی اشرف و ذی عقل ہستی ہے۔اسلئے خلیفہ کا اشارہ براہ راست انسان سے ہی ہے۔پھر دوسری جگہ ایک اور حوالہ دیا ہے۔اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ خَالِقٌ م بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ ○ (پارہ ۲۳ سورۃ ۳۸ آیت ۷۱۔۷۲) جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے تحقیق میں پیدا کرنے والا ہوں ایک بشر مٹی سے پس جب اسکو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صداقت کیلئے اٹکل پچو میں نہیں پھنساتا۔ بلکہ تجربہ و تحقیق کا انجام مشاہدہ میں لاکر دکھاتا ہے۔ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ" لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (پارہ ۲۶ سورۃ ۵۱ آیت ۲۰،۲۱) خالق کے ہاتھ سے زمین و آسمان کی پیدائش میں یقین کرنے والوں کیلئے بہت سی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) درست کروں اور اپنی روح پھونکوں پس تم اسکے واسطے سجدے میں پڑ جانا۔ اِنِّیْ خَالِقٌۢ" م بَشَرًا۔ میں ایک بشر بنانے والا ہوں۔ بشر کا اطلاق سوائے انسان کے کسی اور مخلوق پر نہیں آسکتا۔ ان دو حوالوں کی روشنی میں انسان کی خصوصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ابتداء سے لیکر آخر تک کے تمام حیوانات کا تجزیہ کیا جائے تو کسی جانور میں انسان کی ارتقائی خصوصیات نہیں مل سکینگی یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ بندر میں وجودی اعتبار سے اعضے خصوصاً ہڈیوں میں انسان سے مناسبت پائی جاتی ہے۔ یہ مناسبت انسان کے تمام وجود اور خواص کے لحاظ سے کافی نہیں ہو سکتی ہے۔ پھر ابتداءً انسان صرف ایک انسان تھا۔ جو نسل انسانی کیلئے واحد وجود کی حیثیت سے چلا آتا رہا اسلئے قدیم آثار میں اسکا وجودی ڈھانچہ ملنا ناممکن تھا۔ البتہ یہ بات قابل تسلیم ہے کہ ایک ذرہ سے لیکر آدم کی تکمیلی شبیہ تک جو شکلیں آدم نے بدلیں ان شکلوں سے ارتقائی ادوار میں گزرنا ضروری تھا اور یہ شکلیں دوسری حیوانی شکلوں کے مشابہ ہوسکتی ہیں لیکن حیوانی اور انسانی خواص اور خصوصیات میں ضرور فرق ہے۔ کہ حیوان حیوان بن کر ہی ترقی کرتا رہا اور انسان مخصوص انداز میں ترقی کرتا رہا۔ علاوہ ازیں آدم کی تکمیل کے بعد جب نسل کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس قسم کے ڈھانچے آدم کرومیگنن۔ آدم پلٹ ڈون۔ آدم جاوا۔ آدم نے انڈرتھال کی شکل میں پائے گئے تو اسکا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ ڈھانچے بندروں کے ہونگے بلکہ وجودی مناسبت کے لحاظ سے اگر یہ ڈھانچے بندروں کے ڈھانچوں سے مناسبت رکھتے ہوں لیکن انسانی خصوصیات کے لحاظ سے یہ بندر نہیں کہلا سکتے بلکہ حقیقتاً یہ ڈھانچے انسانی ڈھانچے کہلائینگے۔ کیونکہ ہمارے پاس اس طویل زمانے کی تاریخ نہیں۔ یہ اندازہ صرف قیاس اور علم الابجد کی رو سے ہے۔ لیکن آدم اول کی ابتدائی پیدائش کا کوئی محقق فیصلہ نہیں کرسکتا کہ آیا وہ اس قسم کی نسلوں سے پیشتر بھی تھا یا نہیں تھا۔ اسلئے ہوسکتا ہے۔ کہ آدم اول کی پیدائش اس قسم کی نسلوں سے پیشتر ہو۔ اور آج سے دس لاکھ یا سات لاکھ یا پانچ لاکھ سال کی نسل انسانی بھی خود آدم اول ہی کی اولاد ہو۔ اور مختلف زمانوں میں تلاش معاش یا غیر تسلی بخش موسم اور ماحول کی وجہ سے منتشر ہوگئے ہوں۔ اور اسی اولاد آدم کی مقام کے مطابق شکلیں اور ہیئتیں مختلف ہوں اور انکا معدوم ہونا لازمی تھا جبکہ ہر شے مخلوق اپنے ماحول اور فضا کے مطابق ہیئتیں بدلتی رہتی ہے۔ دراصل یہ ہیئتوں کا اختلاف زمانہ اور ماحول کیوجہ سے ہے۔ ورنہ یہ سب نشان آدم اول سے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نشانیاں ہیں اور انسان کی پیدائش میں بھی یہ وہ نشانیاں ہیں جو بالغیب عقیدہ سے نہیں بلکہ ''بصر'' میں آنے والی ہیں۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ'' بِیضٌ'' وَّ حُمْرٌ'' مُّخْتَلِفٌ'' اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِیبُ سُودٌ'' ○

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) بعد کے ہیں۔اور اگر انہیں نسل انسانی کی بنیاد سمجھا جائے تو یہ کیمیاوی ترکیب اپنے استدلال میں کافی نہیں ہوسکتی ہے۔کیونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے۔کہ انسان اور بندر کی ہڈیاں تقریباً ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔اور سر کی کھوپڑی بھی۔یعنی اگر بندر کی کھوپڑی پر بھی کیمیاوی ترکیب سے گوشت چڑھایا جائے تو اسکی شکل بھی انسان کی سی ہوگی۔فرق صرف بالوں کا ہوگا۔اسلئے ایسی کھوپڑیاں جہاں انسانی جسم کی ساخت ظاہر کرسکتی ہیں وہاں بندر کی ساخت صرف بال لگانے سے ہی ظاہر کرسکتے ہیں اور اگر بندروں کے ڈھانچے تصور کئے جائیں تو انکی کھال اور بال تو پہچانی نہیں جاسکتی اگر انہیں ڈھانچوں کے کیمیاوی وجود پر بال بھی لگائے جائیں تو انہیں براہ راست بندر نہ کہنے میں کیا دلیل ہوسکتی ہے۔اسلئے یہ استدلال کافی نہیں ہوسکتا کہ اس قسم کی کھوپڑیاں صرف انسان کی شکل ظاہر کرتی ہیں۔اور موجودہ نسل انسانی انہیں کی اولاد ہے۔بلکہ یہ سب نشانات آدم اول سے بعد کے ہیں۔آدم اول چونکہ ایک مخصوص انسان تھا۔اور اسکی ترکیب پیدائش بھی اسی وقت سے شروع ہوتی ہے۔جسوقت سے زمین میں روئیدگی کے ابتدائی آثار نمودار ہوئے۔ایک طرف مخصوص طور پر مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے اپنے تمام جواہراتی اور کلی قوتوں کو لیکر اسکی ابتدا شروع ہوئی دوسری طرف زمین میں ہر قسم کی روئیدگی کیڑوں مکوڑوں سے۔نباتات۔حیوانات۔جمادات وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوا۔آدم کی ترکیب پیدائش بتدریج بڑھنے لگی اسلئے جب تک آدم مکمل انسانی ہیئت تک پہنچا باقی قسم کے حیوانات بھی کثرت سے ہوتے رہے جن میں مچھلی سے لیکر بندر تک سلسلہ تخلیق نے ترقی کی اور اس تخلیق کی آخری منزل بندر ہی تھا۔اسکے بعد اور کوئی وجود اس تخلیق میں موجود نہ تھا جسکا وجود قائم ہوتا۔اور اگر تھا تو وہ صرف ایک ہی وجود تھا جو ابتداء سے اپنی تمام قوتوں کو سمیٹ کر ترقی کر رہا تھا اور وہ شکل اس تمام مخلوق کی انتہا سے بالاتر شکل آدم کی تھی جو اپنے مخصوص انداز میں اس سب مخلوق کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا جا رہا تھا۔فرق صرف اتنا ہے۔کہ زمانہ کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔کہ آدم بندر بننے سے پہلے اپنا انسانی وجود حاصل کر چکا تھا؟ یا بندر بننے کے بعد اسکا وجود مکمل انسانی شکل میں آیا۔یہ دونوں صورتیں صرف انسان کی عمر سے اندازہ ہوسکتی ہیں۔اسکا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ آدم کی شکل انسانی بننے میں اتنی مدت صرف ہوئی جتنی مدت ایک نفس واحد کو بتدریج ترقی کرتے کرتے انسانی شکل میں آنے تک لگنی چاہیے۔ابتدائی زمانہ لطیف (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۲۲ سورۃ ۳۵ آیت ۲۷) اور پہاڑوں میں عظیم الشان علیحدہ علیحدہ طبقے ہیں کوئی سفید۔ کوئی سرخ مختلف رنگوں کے اور ان میں ایسے بھی ہیں جو بھجنگ کالے ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مقدس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ کہ آپ سچے

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) زمانہ تھا اسلئے بعد کے زمانہ اور اس زمانہ میں فرق ضرور ہوسکتا ہے۔ اور اسی زمانہ کے مطابق اسکا تعین ہوسکتا ہے کہ آدمی کو اپنی شکل اختیار کرنے میں (دو لاکھ ستائیس ہزار سال کے لگ بھگ صرف ہوئے) کافی عرصہ صرف ہوا اسی اثنا میں باقی مخلوق بھی ترقی کرتی رہی۔

قرآنی حوالہ کے مطابق صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ اور طِيْنٍ لَّازِبٍ ہر مخلوق کیلئے بنیادی ترکیب نہیں ہو سکتی بلکہ انسان ہی شرفِ انسانیت میں اس تخلیق کیلئے اپنی بناوٹ کے اعتبار سے اشرف اور مخصوص ہوگا۔ اور ارتقائی قوت کا (از روئے تحقیق مغربی) تقاضا بھی یہی ہے۔ کہ غیر شعوری (حیوانات۔ نباتات۔ جمادات) وجود انسانی ارتقا کے مقابلہ میں فنا ہوتے رہے اور تبدیل ہوتے رہے۔ لیکن انسانی ہیئت آدم کی تکمیل کے بعد فنا اور مبدل نہیں ہوئی بلکہ لگاتار چلی آرہی ہے۔ زمانہ ماضی کی ہزارہا حیوانی ہیئتیں زمانہ حال کی ہیئتوں میں تبدیل ہوچکی ہیں۔ لیکن انسانی ہیئت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اسلئے قرآنی استدلال مادی محققین کے استدلال سے زیادہ واضح مکمل اور قوی ہیں۔

جب انسان کی تخلیق مکمل ہوئی۔ اسوقت اسے حیوان ناطق (تعقل سے بولنے والا) کہا گیا۔ لیکن انسان کی تکمیل پر اسے حیوانوں کی طرح رکھنا منظور نہ تھا۔ بلکہ اِنِّیْ جَاعِلٌ" فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کی حیثیت سے رہنا تھا اس میں عالی صفات کا پایا جانا ضروری تھا۔ یہ عالی صفات بے معنی بے ضرورت نہ تھیں۔ بلکہ اسکے ذمہ ایک خاص کام سپرد تھا۔ وہ اشرف الخلوقاتی صفت یعنی ایک نصب العین سامنے رکھنا تھا۔ وہ نصب العین یہی تھا۔ کہ اپنی پہچان کرے اپنے خالق کی پہچان کرے جسکے لئے آجتک زمانے کے محققین ثبوت بہم نہ پہنچا سکے بلکہ اپنی نارسائی کی وجہ سے اس چیز کے قائل بھی نہیں۔ کہ انسان میں ایک ایسی لطیف قوت بھی ہے۔ جو حواس کے ذریعہ مادی ذرائع سے محسوس نہیں کی جاسکتی۔ جسے نوری قوت یعنی روح کہا جاتا ہے۔ جسکے متعلق قرآن نے انسانی تخلیق کے حوالہ میں بتایا کہ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ یعنی انسانی تکمیل کے بعد میں نے اس میں اپنا جوہر (روح) پھونک دیا۔ تاکہ اس روح کی مدد سے وہ ماوراادراک کیفیتوں کا تاعلت لامحدود ادراک کرے۔

قرآن نے مطابق قوانین فطرت دلائل دیئے ہیں۔ کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پیغمبر ہیں۔آپ نے کلام الٰہی (قرآن) کومنجانب اللہ ''وحی'' فرمایا۔ پھر قرآن کے ہر لفظ کو کلام الٰہی بتایا۔ حضورؐ کی ذات مقدس اس امر کی بین دلیل ہے۔ کہ قرآن کلام الٰہی ہے۔ جہاں حضورؐ کی ذاتی صداقت کا تعلق ہے۔ وہاں اس شبہ کی گنجائش نہیں کہ آپ اپنی ذاتی قابلیت سے یہ کلام بتاتے

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ج (پارہ ۴ سورۃ ۴ آیت ۱) یعنی میں نے تمہیں ایک جان واحد سے بنایا اور پھر اسی جان سے ہی اسکا جوڑ ابنایا۔ فَمُسْتَقَرٌّ'' وَّ مُسْتَوْدَعٌ'' ط قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ○ (پارہ ۷ سورۃ ۶ آیت ۹۸) یعنی پہلے اسکی تخلیق کی ایک ترکیب ایک مقام مقرر تھا۔ جب اسکی تکمیل ہوئی اور جوڑا بھی تیار ہوا تو انسان کی تخلیق کا دوسرا طریقہ دوسرا مقام مقرر کیا۔ جہاں انسان انہیں سابقہ+ ترکیبوں سے گزر کر مکمل انسانی شکل اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن بھی ان ترکیبوں کا ذکر کرتا ہے۔ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ج ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ج ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ط قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ (پارہ ۲۱ سورۃ ۳۲ آیت ۷ تا ۹) اور ابتداءً پیدا کیا انسان کو مٹی سے پھر اسکی نسل بنائی ایک حقیر پانی (منی) سے پھر اسے درست کیا (مکمل انسانی شکل میں) پھر اس میں پھونک دی اپنی روح اور بنائے اسکے واسطے کان۔ آنکھ اور دل ودماغ بہت کم ہیں جو شکر کرتے ہیں۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ج ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ق ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ط (پارہ ۱۸ سورۃ ۲۳ آیت ۱۲ تا ۱۴) البتہ تحقیق پیدا کیا ہم نے انسان کو بجتی مٹی سے۔ پھر بنایا ہم نے اسکو نطفہ (منی) پھر بنایا نطفہ کو جما ہوا لہو۔ پھر جمے ہوئے لہو کو گوشت کی بوٹی۔ پھر بوٹی سے ہڈیاں۔ پس ہڈیوں پر گوشت پہنایا۔ پھر اسکو (آخری بناوٹ دی) بنایا آخری تخلیق۔ پس بہت برکت والا ہے بہتر پیدا کرنے والا۔

یہ بیان قرآن نے اسوقت دیا ہے جسوقت کہ دنیا میں تحقیقاتی ذرائع بالکل موجود نہ تھے۔ انسانی بناوٹ کی یہ ترکیب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے وحی شدہ الفاظ ہیں۔ جسکی دلیل میں چودہ سو سال بعد کی سائنسی دنیا (جو بغیر Mater کے خدا کے قائل نہیں) اپنے تجربات کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

+ اس تحقیق کو محققین مغرب نے اس حد تک پہنچایا۔ کہ سائنس کا ابتدائی طالب علم بھی اسے سمجھ سکتا ہے۔

ہوں۔تواریخ شاہد ہے۔کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اُمّی تھے۔کسی اُستاد کی راہنمائی اِنہیں حاصل نہ تھی پھر یہ وہ زمانہ تھا۔جبکہ تمام یورپ وحشت و جہالت کے دور سے گزر رہا تھا۔اور عرب کی تواریخ تو مشہور زمانہ ہے۔کہ کس قدر جہالت تھی۔ایسے زمانے میں اس قسم کے مشاہدات منظر عام پر نہیں تھے۔جیسے بعد میں یورپ نے اپنی مادی تحقیق سے ان اشیأ کا تجزیہ کر کے فطرت کے پوشیدہ خزانوں کو منظر عام پر لایا لیکن قرآن نے نہایت واضح طریقہ پر ان نشانیوں کا حوالہ دیکر انسان کو غور و تفکر کی تحریک دی۔یہ مشاہدہ چودہ سو سال قبل کا مشاہدہ ہے۔جسوقت کہ انسان کو ان اشیأ کی طرف مائل بہ تحقیق ہونے کا کوئی مادّہ ہی نہ تھا ان لوگوں کیلئے جو چیلنج کیا گیا۔وہ صرف عقیدہ پر ہی قائم نہ تھا۔بلکہ اپنے دعوے میں ایک حقیقت رکھتا تھا۔اور قرآن کا ہر اشارہ ہر نشان قوانین فطرت کے بالکل مطابق تھا۔جسے یورپ آج ہزار جانفشانیوں کے بعد تحقیق کر چکا ہے۔کہ پہاڑوں میں کس کس قسم کے پتھر۔جواہرات۔معدنیات۔کوئلہ وغیرہ اسکی تہوں میں پایا جاتا ہے۔اسکے علاوہ قرآن میں جتنے بھی غور و تفکر کیلئے نشانات بیان کئے گئے ہیں حقیقتاً اپنی تخلیق اور خالق کے تعلق کو پکار پکار کر ظاہر کر رہے ہیں اور اسکے استدلال میں یورپ کے محققین بھی بعد از بسیار کاوش ان اسرار کو پہچان چکے ہیں۔ان آیات میں مبالغہ کی کوئی گنجائش نہیں۔بنظر عمیق ان آیات کو پرکھا جائے تو

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ذخیرہ میں ماں کے رحم میں انسان کی ابتدائی کیفیت و آفرینش کے ہر دور۔ہر تبدیلی وجود (جو ماں کے رحم میں ہوتی ہے) کو شیشے کے آلات میں جمع کر چکا ہے۔اور دوربینی آلات سے انسان (مرد اور عورت) کے مادۂ منویہ کے قطرات کو معائنہ میں لا چکا ہے۔جسکو قرآن پیشتر زبان وحی سے بیان کر چکا ہے۔
فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْ ۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ (پارہ ۳۰ سورۃ ۸۶ آیت ۵ تا ۷) پس دیکھنا چاہیے کہ انسان کس چیز سے پیدا کیا گیا۔پیدا کیا گیا اچھلتے پانی سے۔نکلتا ہے درمیان پیٹھ اور چھاتی سے۔یہ تمام کیفیتیں رحم مادر کی کیفیتیں ہیں جنہیں بغیر خصوصی آلات کی امداد کے نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بغیر کسی تحقیقات مادی کے اِن کیفیات کو بیان کیا۔جو آج چودہ سو سال کے بعد بھی مغربی سائنس کے علم کی پر حیرت کتابوں کی وجہ رونق ہیں۔

ان میں لاانتہا اسرار ورموز آشکارا ہونگے۔ اسلام کے قرآن نے وہ وہ رموز انسان کو بتائے ہیں۔ کہ یورپ باوجود اپنی انتہائی ترقی کے اس قرآن کے اکثر رموز کو پوری طرح سمجھنے سے عاجز ہے۔ اور آج جبکہ یورپ کا محقق اپنے دعوؤں کا بہ بانگ دہل اعلان کر رہا ہے۔ اپنی صداقت کو عینی مشاہدوں میں قبولوا رہا ہے۔ ابھی تک قرآن کے فطری نشانات کو حتمی طور پورا کرنے سے قاصر ہے۔

گزشتہ زمانے کے فلاسفر۔ حکما۔ (مادی محققین) کے نظریات قرآن نہیں۔ بلکہ خود ایک لادینی مذہب کے بانی قرآن سے انکار کے باوجود قرآن کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اور اپنے نظریات کا رخ قرآن کے بتائے ہوئے نظریات کی طرف موڑتے ہیں۔ گزشتہ زمانوں میں ہر زمانہ کے محقق نے کائنات اور اسکی تخلیق کے بارے میں مختلف نظریئے پیش کئے اور ہر نظریہ کی تردید میں ایک محقق نے دوسرے کا رد پیش کیا۔ اور کوئی نظریہ مستحکم صورت اختیار نہ کرسکا۔ نہ عقیدہ کی صورت میں اور نہ مشاہدہ کی صورت میں۔ مگر اسلام نے قرآن میں جو ایک بار اپنا نظریہ پیش کیا وہ کبھی نہ بدلا۔ نہ کوئی آجتک اسکی تردید ہی کرسکا نہ ہی کوئی اسکے نظریات کو مشاہدہ میں غلط ثابت کر سکا۔ اس سے بڑھکر اسلام اور قرآن کی تعلیم کی صداقت وحقانیت کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔

مسلمان مدتوں سے اس تعلیم کو کھو چکا ہے۔ اس کا اسلامی تعلیم سے دور ہونا۔ ایجادات کی رو سے نہیں بلکہ روحانیت کی رو سے ہے!۔ کیونکہ اسلام ایک خالص روحانی مذہب ہے۔ اور اسکے تفکر کی اساس بھی روحانیت پر ہے۔ ابتداء اسلام میں بھی قرآن کا تفکر فی الآفاق سے یہ مقصد نہ تھا کہ مسلمان اشیاءً کائنات میں چھان بین کر کے ایجاداتی ترقی حاصل کر کے دنیا کا مالک بنے۔ ابتداءً مسلمان کو ان کی تحقیقات کی ضرورت نہ تھی۔ اسلئے کہ یہ قرآنی آیات صرف مادی منکرین کیلئے۔ ایک خدا۔ ایک پیغمبر کی صداقت کیلئے بطور دلیل پیش کئے جاتے تھے۔ لیکن دین کی اساس اِنکے مشاہدہ پر نہ تھی۔ بلکہ اسلام میں دین کی اساس پیغمبر کی روحانی عظمت اور ماوراٗ ادراک مشاہدات پر تھی۔ جسکا تعلق قلب وشعور سے تھا۔ جسکے لئے صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ذاتی کردار ہی کافی تھا۔ کہ آپ رسول اللہ ہیں۔ اور آپ پر کلام الٰہی وحی ہوتی ہے۔ اور کلام الٰہی انسان

کو اسکے اشرف المخلوقاتی منصب پر پہنچاتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہے۔ کہ انسان ایک طرف اپنے نصب العین کی تکمیل میں حقیقت سے ہمکنار ہو کر ایک غیر فانی قوت کا مالک بن جاتا ہے۔ اور دوسری طرف امن و راحت سے دنیا بھر جاتی ہے۔ جس سے انسانی تمدن۔ معاشرت اور دیگر امور دنیوی خود بخود ترقی پذیر ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم صرف یہ تھی۔ کہ مخلوق کائنات کو کسی خالق سے متعلق کر کے۔ اسے ہی خالق و معبود تسلیم کیا جائے۔ معبود ماننا ہی اسکی پہچان کا طریق ہے۔ پیغمبر خود ماورأ ادراک کے تمام اسرار سے واقف تھا۔ اسلئے مسلمان کو آسانی سے مقصد انسانی حاصل تھا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے۔ کہ مسلمانوں نے اگرچہ ان آیات کو مغربی محققین کی طرح ایجادات میں نہ لایا۔ پھر بھی مسلمانوں نے دنیا پر ایک ایسا نظام قائم کیا۔ جس میں انسان کیلئے مکمل فلاح و سعادت تھی۔ مکمل حکومت و خلافت تھی۔ دولت و عظمت کی فراوانی تھی۔ اور دنیا پر امن و سلامتی کا دور دورہ تھا ـــــ آخر ان تمام ایجادات سے بھی تو یہی نتیجہ حاصل ہے۔ کہ یورپ تقریباً دنیا کے تین چوتھائی (۳/۴) حصہ پر قابض ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ وہ مسلمان اپنے نصب العین سے قریب تھا۔ اور آج کا محقق یورپ اپنے نصب العین سے دور۔ مسلمان کا ہر قدم دنیا انسانیت کیلئے باعثِ نجات تھا۔ اور یورپ کا ہر قدم بوجہ عدم تسلیم خدا و رسول۔ دنیا کیلئے نتیجتاً تباہ کن اور انسانیت کیلئے پریشانی و اضطراب کا باعث بن رہا ہے۔ ان مشاہدات اور تحقیق سے تو صرف ماورأ ادراک کا تسلیم کرنا۔ اور اسکے مشاہدۂ روحانی سے عرفان الٰہی منظور تھا۔ نہ کہ دنیوی سطوت۔ یورپ نے اگرچہ خداوندی حکم میں سے تفکر فی الآفاق کو اپنایا۔ یا یوں کہیے کہ انکے ذاتی تجربات سے ہی انہیں یہ عروج حاصل ہوا۔ لیکن انکا نصب العین مقصد اصلی سے ہٹ کر رہا۔ اسلئے انکے مشاہدات اور تحقیقاتی انکشاف قانونِ خداوندی کی ضد بنے۔ یعنی خداوندی قانون کی مخالفت ہے۔ اصولِ اسلام۔ یا الٰہی تعلیم سے ہٹ کر۔ جاہ طلبی۔ خود غرضی۔ نفس پرستی۔ جو اثر دولت و امارت کا ماحصل اور نتیجہ ہوتا ہے۔ قوانین فطرت کی خلاف ورزی ہوتی ہے جو کہ منشائے خداوندی کے سراسر خلاف ہے۔ قرآن نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی ایک آن میں ہلاکت کیلئے یہ آیات نہیں بتائیں۔

بلکہ انسان کی امن وسلامتی اور حقیقت سے آگاہ کرنے کیلئے۔انسان کو صرف ایک علتِ لامحدود اور اسکے منظم نظام کو تسلیم کر کے ماورأادراک ماحول سے واقفیت حاصل کرتے ہوئے اس تک پہنچنے اور پہچان کرنے کیلئے بتائے ہیں۔غلط نتائج کے ظہور کی وجہ صرف یہی ہے۔کہ تحقیقات سے قبل قرآنی تعلیم کا تسلیم کرنا لازمی ہے اور قرآن اپنی صداقت کیلئے ہی قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت کرنے والے نشانات کا حوالہ دیتا ہے۔جو نشانات مادیت پرست منکر قرآن اپنے تحقیقاتی مشاہدات میں صحیح پاتے ہیں۔اندریں حالات قرآن کی تعلیم۔تعلیم الٰہی ہونے کیلئے کسی تردید یا شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔اور انسان اپنی فلاح وسعادت خواہ دینی ہو یا دنیوی اسی قرآن سے اخذ کرسکتا ہے۔

قرآن نے انسان کے انحراف پر دوبارہ بازگشت کیلئے ایک مکمل قانون پیش کیا ہے۔ جسکے ذریعہ انسان اپنا اشرف المخلوقاتی شرف و مرتبہ دوبارہ حاصل کرسکتا ہے۔قرآن نے اپنے ماننے والوں کیلئے ایک صحیح راستہ (دین) پیش کیا ہے۔جس میں باوجود مدتیں گزرنے کے کبھی تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔مسلمانوں کے انحراف اور تنزل کے باوجود بھی اس میں ایک زیروزبر کی تاویل نہ ہوسکی۔

گزشتہ زمانوں میں جتنے بھی پیغمبر گزرے ہیں انہوں نے درحقیقت کلام الٰہی دین کی صورت میں پیش کیا لیکن پیغمبر کے گزرنے کے چند سالوں بعد ہی پیروانِ مذاہب نے اس تعلیم الٰہی کو اپنی خودغرضی کی بناء پر اصلی علم کو مسخ کرڈالا۔لیکن قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی یہ ایک خصوصی خوبی ہے۔کہ باوجود اسکی ابتدأ میں ہی شدید مزاحمت اور مخالفت ہونے کے آجتک کوئی شخص بھی اسکی تعلیم میں ایک حرف کو بھی بدل نہ سکا جیسی اسکی ابتدائی تعلیم ہے۔بدستور ویسی ہی جاری رہیگی۔ جسکی دلیل میں قرآن خود پیشگوئی کرتا ہے اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ۝ (پارہ ۱۴ سورۃ ۱۵ آیت ۹) تحقیق ہم نے خود یہ قرآن (کلام) نازل کیا اور ہم اپنی کلام کے خود محافظ ہیں۔ یہ کلام الٰہی ہونے کی تاثیر ہے۔قرآنی تعلیم کی جب ابتداء میں بت پرستوں نے مخالفت کی تو قرآن نے علے الاعلان چیلنج کیا۔وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۲۳) ترجمہ:-اور یہ کہ اگر تمہیں اس کتاب میں (جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا) اسکی سچائی یا حقیقت پر کچھ شبہ ہے۔تو پھر تم اسکے برابر یا اسکے مقابل کوئی ایسی تعلیم پیش کرو جو اس قرآنی علم سے بہتر علم ثابت ہو سکے۔تم اپنے خداؤں کی کوئی تعلیم پیش کرو جو قرآن جیسا علم بتا سکے تو تم سچے سمجھے جاؤ گے لیکن کوئی خدا کوئی فلسفہ دان کوئی ادیب زمانہ قرآنی تعلیم جیسا علم یا اس قسم کی فصاحت و بلاغت کی تحریر پیش نہ کر سکا۔ بلکہ مخالفین کی یہ حالت تھی کہ جب قرآن انکے سامنے پڑھا جاتا تو بیساختہ مبہوت و بیخود ہو جاتے۔اور یکلخت پکار اٹھتے کہ واقعی یہ کلام دلوں پر اثر کرتی ہے۔یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتی۔اور بعض ہٹ دھرم۔نفس پرست۔جاہ طلب انسان جو قرآن کی شدید مخالفت پر قسم کھا کر آمادہ ہوئے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت میں شب و روز کوشاں رہتے تھے۔انکے دلوں پر بھی یہ آواز اثر کئے بغیر نہ رہتی۔اور وہ شقاوتِ قلبی کے باعث کانوں میں انگلیاں دیتے۔تا کہ وہ یہ آواز نہ سن پائیں۔چنانچہ ابتدائے اسلام کے چند مشہور واقعات ایسے تواریخی [1] ہیں جنکا انکار کسی صورت میں نہیں کیا جا سکتا۔

(۱)۔ہجرت کے وقت ایک سو ایک مرد عورتوں کا قافلہ ہجرت کر کے حبشہ پہنچا۔کفار مکہ نے انکا پیچھا کیا۔اور شاہ حبش نجاشی کے دربار میں پہنچکر مسلمانوں کو واپس لے جانے کا مطالبہ کیا۔اسوقت حضرت جعفر طیارؓ مہاجر نے شاہ حبش کو قرآن کی ایک آیت سنائی۔جس پر وہ مسلمان ہوا۔

(۲) ابولہب خود حضورؐ کے ساتھ اِنکی تبلیغ میں روکاوٹ ڈالتا۔اور کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہوتی کہ قرآن کے الفاظ اسکے دل کو انحراف و کفر سے متزلزل نہ کر دیں۔

(۳) انیس ابوذر کا بھائی ایک مشہور شاعر تھا۔وہ مکہ میں آیا اور حضورؐ کی زبان مبارک سے قرآن سنکر مسلمان ہو گیا۔

(۴) مکہ کا مشہور سردار عتبہ۔نبی صلعم کے پاس نصیحت کرنے کیلئے آیا کہ اس قسم کی تبلیغ بند کر دو جسکے

[1] تواریخ سیرت ابن ہشام

جواب میں حضورؐ نے قرآن کی ایک آیت پڑھکر سنائی۔عتبہ پر ایک محویت کا عالم طاری ہو گیا واپس آکر قوم سے کہا۔کہ محمدؐ کو اسکے حال پر چھوڑ دو۔اس پر لوگوں نے کہا کہ عتبہ پر محمدؐ کا جادو چل گیا۔

(۵) حضرت عمر فاروقؓ حضورؐ کو قتل کرنے کیلئے گلے میں تلوار ڈالکر چلے۔اثناءً راہ معلوم ہوا۔کہ آپکی ہمشیرہ بھی مسلمان ہو چکی ہے۔واپس لوٹے۔ہمشیرہ اور بہنوئی کو اسقدر مارا کہ خود بھی مارتے مارتے تھک گئے۔آخر پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے تھے۔حضورؐ کے ایک صحابی نے سورۃ طٰہٰ۔کا پہلا رکوع پڑھکر سنایا۔تمام غصہ سرد ہوا۔اور روتے ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کیخدمت میں پہنچکر مسلمان ہوئے۔

مکہ میں ہر سال عکاظ میں میلہ لگتا تھا۔جہاں تمام عرب کے ادیب شاعر فلسفی جمع ہوکر اپنے فن کا کمال دکھاتے ان میں کئی ایک ایسے بھی لوگ تھے۔جو اُمی ہوتے لیکن شاعری۔ادب میں کمال کرتے۔ان سب کے ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص قرآن کی ایک آیت نہ بنا سکا۔در حقیقت یہ قرآنی حقیقی تعلیم کا خاصہ تھا کہ خونخوار دشمنوں کے دل میں تیر ونشتر کی طرح اثر کر جاتی۔ حقیقتاً کوئی ایسی تعلیم نہیں جو اسقدر محفوظ اور موثر ہو جسکی کوئی نظیر پیش کرسکتا ہو۔قرآن نے علے الاعلان اپنے چیلنج کے بعد ایک پیشگوئی بھی کردی۔فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۲۴) یعنی کہ دنیا کی کوئی طاقت نہ ایسی کوئی تعلیم پیش کرسکتی ہے نہ اسے جھٹلا سکتی ہے۔

صدیاں گزریں زمانہ میں اسلام نے کئی رنگ دیکھے: ابوالحکم (ابوجہل)۔ابولہب۔عتبہ۔شیبہ۔ابوسفیان وغیرہ اور اِنکے بعد ہر زمانہ میں اسلام کے شدید مخالف پیدا ہوتے رہے۔ یہودی۔عیسائی۔بدھی۔ہندو آریہ قوموں میں بھی عالم گزرے۔جنہوں نے اسلام کی شدید مخالفت کی۔لیکن ان میں سے کوئی ایسی مستقل تعلیم پیش کرسکا نہ ہی انمیں سے کسی کو قرآنی علم میں ردّوبدل کرنے کا موقع مل سکا۔گزشتہ مذاہب کے پیروؤں نے۔اپنے پیغمبروں کی تعلیم کو مسخ کر ڈالا۔کچھ حملہ آوروں کے جبر واستبداد نے تعلیم کو ختم کر ڈالا۔لیکن اسلامی تعلیم میں یہ ایک خصوصی خوبی رہی۔کہ باوجود شدید مخالفتوں کے اسلامی تعلیم صحیح وسالم رہی یہ قرآنی مستقل تعلیم کا ہی اثر

ہے۔ کہ اسلام نے دنیا کے ہر کونہ میں اپنا اثر پہنچایا۔ ہر دل میں قرآن جمع ہوا۔ اور اسکا علم ہی ایسا الٰہی علم ہے۔ کہ اس زبان میں کسی قسم کی تحریف و تاویل کی گنجائش نہیں مل سکتی۔ اسلام کا ہر شخص فرداً فرداً اس قرآنی علم سے آگاہ ہے۔ گویا جب تک اسلام کا ایک بچہ بھی باقی ہے۔ یہ تعلیم اسی سے دوبارہ جاری ہو سکتی ہے۔ لیکن اس تعلیم کو کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کے چار پانچ سو سال بعد جسوقت۔ مصر۔ عراق۔ بغداد۔ نیشا پور اسلامی علوم کے مراکز تھے اس زمانہ میں مسلمانوں میں کئی فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ جنہوں نے تاویلات اور تحریفات سے اسلامی عقائد الجھا دیئے تھے۔ مگر ایسے ہی وقت میں قدرت نے اس اصلاح کیلئے ایسے محقق پیدا کئے جنہوں نے قرآنی علم کو اسقدر وسعت دی اور قرآنی تفسیر میں وضاحت کی جن سے علم کلام۔ فلسفہ۔ منطق۔ معقول وغیرہ ایجاد ہوئے۔ اور اسی قرآنی فلسفہ کلام اور منطق کی بنیادوں پر تمام اسلامی عقائد و علوم کی اساس قائم ہے۔ تواریخ اس بات کی شاہد ہے۔ کہ جرمنی۔ فرانس۔ برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں باوجود یہود و نصاریٰ کی اکثریت کے آج بھی انکی یونیورسٹیوں۔ اور عجائب خانوں میں اسی دور کا اسلامی لٹریچر محفوظ کیا گیا ہے۔ جنکے کئی زبانوں میں ترجمے کئے گئے ہیں۔ اور دنیا کی ہر قوم اس علم سے جس قسم کی چاہیں منفعت حاصل کر رہی ہے۔

گزشتہ پیغمبروں کے ذریعہ جو تعلیم الٰہی پیش کی گئی وہ تعلیم الگ الگ قوموں کیلئے تھی۔ قوموں میں پیغمبر آتے رہے۔ اور اپنے ساتھ ایک مخصوص تعلیم لاتے رہے۔ اور ایک ہی وقت میں کئی قوموں میں پیغمبر آئے۔ لیکن قرآنی تعلیم کسی خاص قوم کیلئے مخصوص نہیں کی گئی۔ اسکا خطاب يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ (اے لوگو) ہے۔ وہ یہودی ہو۔ نصاریٰ ہو۔ زرتشتی ہو۔ بدھی ہو۔ آریہ ہو۔ جرمنی ہو۔ یا انگریز۔ چینی ہو یا افریقی غرض عالمگیر حیثیت سے انسان کیلئے پیش کیا گیا۔ اسلئے اسکی تعلیم حاصل کرنے کیلئے بھی کسی قوم کی خصوصیت کی قید نہیں۔ جو شخص اسکی تعلیم کی طرف رجوع کریگا۔ وہ اپنے مقصد کو ضرور اس سے پاسکیگا۔ وہ معاملہ اقتصادی ہو۔ تمدنی ہو یا معاشرتی ہو۔ روحانی ہو یا دنیوی۔ دیوانی ہو یا فوجداری۔ اٹھنے۔ بیٹھنے۔ رفع احتیاج سے متعلق ہو۔ ہر امر میں قرآن پوری راہنمائی کرتا

ہے۔ جنکا عقیدہ ہے۔ کہ قرآن ایک قدیم زمانہ کے مطابق پرانی تعلیم ہے۔ اب زمانہ جدید دور سے گزر رہا ہے۔ یا قرآن کے علم پر اعتراض کرتے ہیں۔ انکے غلط عقیدہ کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ وہ قرآن کا عجمی طریقہ پر مطالعہ کرتے ہیں۔ دراصل وہ لوگ قرآنی تعلیم کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے۔ کیونکہ جہاں قرآن ایک آسان علم ہے۔ وہاں اسکے رموز و آثار اسقدر دقیق ہیں۔ کہ ان رموز کا بجز تبحر علمی پانا بھی آسان نہیں۔ مثال کے طور پر ایک ابتدائی قاعدہ پڑھنے والا۔ قاعدہ سمجھکر اس سے اپنی بساط کے مطابق ہی علم حاصل کرسکیگا۔ اگر وہ بی۔ اے کے کورس کی کوئی کتاب پڑھ لے تو بوجہ استعداد علمی نہ ہونے کے وہ صحیح علم حاصل نہ کرسکیگا۔ قرآن کے ایک حرف پر بھی اگر نظر عمیق ڈالی جائے۔ تو اسکے اتنے معانی حاصل ہونگے جو ہر زمانہ اور ہر رنگ میں پورے اترتے نظر آئینگے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے۔ کہ پڑھنے والا قرآنی علم کی استطاعت رکھ سکتا ہو۔ البتہ ایک صحیح راہ پانے والے کے لئے اسقدر آسانی سے علم حاصل ہوسکتا ہے۔ کہ اسکے لئے صرف عربی پڑھنا اور معنی سمجھنا بھی کافی ہو سکتا ہے۔ قرآن نے یٰاَیُّھَا النَّاسُ پکار کر یہی دلیل دی ہے کہ اس قرآن کو کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہ کیا جائے۔ بلکہ ہر وہ شخص جو کم سے کمتر سمجھنے کی طاقت رکھتا ہو۔ کسی فرقہ سے تعلق رکھنے والا ہو۔ کسی تہذیب سے وابستہ ہو۔ ہر انسان کیلئے اس میں راہنمائی کا مواد مل سکتا ہے۔

قرآن اپنے علم کے دو حصے بتاتا ہے۔ ایک وہ حصہ جو ہر انسان کیلئے مساوی حیثیت سے راہنمائی کرتا ہے۔ دوسرا وہ حصہ جسکے ایک ایک حرف میں بے شمار ہدایتیں ہیں لیکن یہ حصہ صرف ان لوگوں کیلئے ہے۔ جو تعقل و شعور میں کامل استعداد رکھنے والے ہوں۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ج وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ م وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ لا کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۷) وہی ہے جس نے تم پر کتاب (کلام الٰہی) اتاری اس میں آیات (نشانیاں) ہیں محکم وہی آیتیں کتاب کی ماں ہیں یعنی وہی آیتیں شریعت کی اصل ہیں

جنہیں احکام الٰہی کہتے ہیں جو کتاب کا اصلی مقصد ہیں انکا سمجھنا ظاہری طور آسان ہے جیسے ۔نماز قائم کرو۔روزہ۔زکوٰۃ۔حج۔قرض حسنہ۔صدقہ۔سچ بولنا۔جھوٹ سے پرہیز۔کم نہ تولنا۔احسان۔ جہادغرض دینی اوردنیوی امور کی اصلاح کیلئے احکام یہ احکام واضح طور ہیں جو ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔اوراس قسم کی دوسری آیتیں ہیں جن میں الارض کی اشیأ میں غوروفکر کرنا۔جیسے اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۔ اٰیٰت" لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ۙ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ○۔ان آیات میں ۔زمین۔ پہاڑ۔ چاند۔ستارے۔دریا۔ابر (بادل) ۔بارش کا برسنا۔رات۔دن۔ نباتات۔جمادات۔حیوانات۔انسان اور دیگر مخلوقِ ارضی کی تخلیق اور پیدائش پر غور کرنا۔اورانہیں چیزوں کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔کہ انسان۔بصراور عقل سے اِنکی ماہیت واصلیت سمجھ سکتا ہے۔

دوسرا حصہ ان آیات کا ہے۔جسے متشابہات کہا گیا۔یہ آیات انسان کی عقل سے باہر ہیں۔یعنی حواس خمسہ کی حدود میں انکا ادراک نہیں آسکتا نہ ہی انسان کے تصور میں انکی اصلی صورت قائم ہو سکتی ہے۔جب تک کہ وہ ماوراءِ ادراک قوتوں کے ادراک کیلئے قوت نہ رکھتا ہو۔ جیسے ۔قیامت۔جنت۔دوزخ۔حشر (اپنے اعمال کا نتیجہ جزا وسزا کی صورت میں) ۔روح۔ ملائکہ وغیرہ۔ان آیات کا بیان اسلئے کیا گیا ہے۔کہ جو کچھ حواس خمسہ کی حدود میں آکر انسان سمجھ سکتا ہے۔اتنا ہی نہیں۔بلکہ اسکے علاوہ بھی اور کیفیات واقع ہیں۔جو انسانی تعقل میں نہیں آسکتی ہیں جن کیفیات میں اللہ کا وجود بھی موجود ہے۔

قرآنی علم سے راہنمائی حاصل کرنے کیلئے چاہیے تو یہ۔کہ قرآن نے جن چیزوں کو تعقل۔سمع۔بصر کے ساتھ متعلق کر دیا ہے۔اُن اشیأ پر غور کریں اور وہ احکام جو قرآن نے عمل کیلئے بتائے ہیں۔ان اشیأ کے تحقیق تجزیہ کیلئے اُن آیات پر عملدرآمد کرے تا کہ انسان پہلے اسلام کے ابتدائی رکن یعنی تسلیم اللہ پر آمادہ ہو جائے۔جو طریق تفکر کیلئے لازمی چیز ہے۔جب انسان اللہ کو تسلیم کر لیگا۔اوراسی کے قانون کے ماتحت اپنے نصب العین (عرفان الٰہی) کی طرف رجوع کریگا تو اسکے لئے ابتداءً کائنات خلقت میں انہی اشیأ پر تفکر کرنا ہوگا جو اسکے حواس کے احاطہ میں آ

سکتی ہیں۔ان پر تفکر و تحقیق رفتہ رفتہ انسان کو اس مقام پر پہنچائیگا جہاں ماوراءِ ادراک اشیا (متشابہات) کا مشاہدہ ہوسکیگا۔البتہ ابتدائی صورت میں انسان کو ایمان بالغیب (بغیر دیکھے ماوراۓ ادراک کیفیتوں کے وجود کو تسلیم کرنا) پر ہی اکتفا کرنا پڑیگا۔جب تک انسان ان مادی اشیأ پر عبور حاصل نہیں کرتا۔اسکے پاس ماوراۓ ادراک وقوعہ کے عدم ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہوسکتی۔کیونکہ ایک مادی چیز کے ظہور میں جب اسکے پسِ پردہ۔ایک اور وجود کا انکشاف ہوتا ہے۔تو ماوراۓ ادراک کیلئے وجود ہونا اگر یقینی نہ سمجھا جائے۔تو بھی Automatically یقین کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ یہی چیز ایمان بالغیب سے تعبیر کی جاتی ہے۔جب انسان کو کسی ماوراۓ چیز کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔تو وہ چیز ایمان بالغیب کی حد میں نہیں رہتی۔قرآن نے متشابہات بیان کرنے سے اس کیفیت و ہیئت کے وجود کا اظہار کیا ہے۔جو انسانی تعقل کے احاطہ میں اگرچہ نہیں آتی۔لیکن اسکا ایک وجود ضرور قائم ہے۔اسلئے قرآن کی وہ تعلیم جس میں ایمان بالغیب کا مضمون ہے۔اس پر اسوقت تک سوائے ایمان بالغیب کے کوئی بحث کرنی عبث ہے۔جب تک کہ انسان اپنے تمامی مشاہدات کی تکمیل بدرجہ اتم نہ کر پائے۔اور بغیر قوتِ مشاہدہ کے ان آیات پر بغیر استطاعت۔غلط فہمی اور گمراہی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔یہی وہ دوسرا حصہ ہے جسے متشابہات سے تعبیر دیا گیا ہے۔اور اسکے علم کیلئے علم راسخ ہونا ضروری ہے یعنی ان آیات کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنکے پاس علم راسخ ہو۔ راسخون فی العلم ۔علم راسخ دونوں صورتوں میں لازمی ہے۔ان اشیأ کیلئے بھی جو حواس کے احاطہ میں آنے والی ہیں۔اور ان احکام کیلئے بھی جو عام فہم ہیں اور متشابہات کیلئے بھی!۔مادی کیفیات کیلئے انسان میں تعقل کا صحیح ذریعہ موجود نہ ہو تب بھی وہ ان کائنات خلقت کی اشیأ کے ظاہری مشاہدہ اور حقیقت کو نہیں پا سکتا۔مثلاً ایک محقق کا قیاسی قول یہ ہے۔کہ زمین نہیں گھومتی۔یہ آسمان حدنظر ہے۔زمین سورج سے نکلی اور ہر شے خود بخود پیدا ہوئی اسکی کوئی لامحدود علت نہیں ہوسکتی وغیرہ وغیرہ۔اسی طرح قرآنی احکام کو اپنی ذاتی محدود رائے (اجتہاد) سے پرکھنا یہ بھی غلط نتائج پیدا کرتا ہے۔اور متشابہات پر بغیر قوتِ ادراک کے قیاس پر فیصلہ دینا یہ سب صورتیں غلط

نتائج پیدا کرنے والی ہیں۔اسکے برعکس کائناتِ خلقت کی تحقیق میں کسی شے کے وجود وعدم پر پوری دلائل کا حاصل کرنا جو عقل وحواس کے احاطہ میں بھی آئے علم راسخ کہلاتا ہے۔جیسے قدیم زمانہ کی اشیأ کی تحقیق میں انکے اصلی ہیئتوں کا ثابت کرنا اور انکی تمام علتیں قائم کرنا۔مخلوق حیوانی کا تجزیہ کرکے انکی اصلی ہیئتوں کا ثابت کرنا۔جیسے۔وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ۔ہر شے زمین سے پیدا ہوئی اور ہر چیز نے پانی سے زندگی ظاہری حاصل کی اور ہر شے کی تخلیقی ترکیب ۔مثلاً حیوانات کی ابتدائی زندگی کیسے بتدریج بدلتی رہی ان وجودوں کی ماہیت کیا ہے۔اسی طرح نباتات۔جمادات اور انسان جسکے وجود کے تمام ذرات کا تجزیہ کرکے بتایا گیا ہے کہ انسان میں کیا کیا قوتیں موجود ہیں۔اسی طرح چاند۔سورج۔پہاڑ۔دریا۔سمندر۔وغیرہ کی ماہیت۔یہی کیفیت احکام شریعت کی ہے۔کہ ان احکام کے صحیح مطالب فقہ کرنا (سمجھنا) اور متشابہات کیلئے جو ماوراءً ادراک ہیں انکے لئے اس قوت کا حاصل کرنا جو ماوراء ادراک کا مشاہدہ کراتی ہے۔جسے روح۔قلب اور شعور سے تعلق ہے۔

قرآن کا صحیح طریق سے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اسکے علم سے آگاہی حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کے علم کے سمجھنے کیلئے ایک ایک علیٰحدہ ذریعہ مخصوص کیا ہے۔مادی علم کی وسعت اور اسکے سمجھنے کا ذریعہ۔متشابہات کا علم اور اسکے سمجھنے کا ذریعہ گویا کائنات کا تمام علم بھی اس میں اور علم سمجھنے کے ذرائع بھی بتائے گئے ہیں جو اشیأ سمع وبصر کے احاطہ میں آتی ہیں انمیں کھلی اور واضح نشانیاں [1] ہیں۔جو اشیأ ماوراء ادراک کیفیتوں میں واقع ہیں۔انکے لئے بھی ایک وجدانی تصور حاصل ہوتا ہے۔جسکے مشاہدہ کیلئے انسان کو شعور۔روح۔قلب ملا ہے۔اگر انسان بغیر کسی حجت اور ہٹ دھرمی کے علم حاصل کرنے کی نیت سے قرآن کا مطالعہ کرے تو یقیناً اسے صحیح راہنمائی حاصل

---

[1] یہی نشانیاں آج محققین مغرب کی سمع وبصر کی حدود میں آکر تحقیق ہو چکی ہیں۔جس میں زمین کی تمام قوتیں ۔چاند۔ستارے۔سورج وغیرہ کی تحقیق کی گئی ہے۔

ہوسکتی ہے۔ ورنہ دین ومذہب سے ضد اسکی خوبصورتی میں بھی عیب نکال سکتی ہے۔ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ ج جن کے دلوں میں کجی (ضد) ہے وہ متشابہات پر عقل سے بحث کر کے شعور میں آنے والی کیفیتوں حواس کے ذریعہ عقل میں لانا چاہتے ہیں۔ وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ وہ نہیں سمجھ سکتے عقل کے ذریعہ سوائے اللہ کے اور ان لوگوں کے جو علم میں راسخ ہیں اور صاحب مشاہدہ ہیں چنانچہ ہر کیفیت کیلئے قرآن نے تفکر کا ایک طریقہ اختیار کیا ہے:۔ قُلۡ لَّا یَعۡلَمُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ الۡغَیۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ط وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ ○ (پارہ ۲۰ سورۃ ۲۷ آیت ۶۵) کہہ دیجئے۔ نہیں جانتا کوئی بیچ آسمانوں اور زمین کے غیب کو سوائے اللہ کے اور نہیں جانتے (شعور رکھتے) کس وقت اٹھائے جائینگے۔

انسان کو اپنے ہر قسم کے سامان زندگی کیلئے ایک طریقِ کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی جب تک انسان کو دنیا کے ہر معاملہ میں واقفیت حاصل نہ ہو وہ کسی شے سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس طریقِ کار اور واقفیت حاصل کرنے کے لئے ہر شے کا علم حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے اور یہی علم انسان کو اسکے ہر شعبۂ زندگی میں مددگار ہوسکتا ہے۔ اس علم کو حاصل کرنے کے خصوصی چند ذرائع ہیں۔ اول یہ کہ ہر انسان فطری طور پر اپنے ساتھ علم لیکر آتا ہے۔ جیسے بچہ اپنی ابتدائی عمر میں بغیر کسی راہنمائی کے اپنی خوراک (سامان زندگی) حاصل کر لیتا ہے وہ بغیر کسی ظاہری سبب کے ماں سے دودھ حاصل کرتا ہے۔ یہ فطری علم ہے۔ گو اس میں انسان کا حافظہ وتعقل مستقل نہیں ہوتا ہے۔ تاہم اسکے قلب و دماغ سے ہی اس علم کی تحریک ہوتی ہے۔ کہ وہ پستان منہ میں محسوس کر کے چوسنے لگ جاتا ہے۔ وہ علم جو بغیر کسی ظاہری سبب کے انسان کو حاصل ہو علم لدنی یا فطری علم کہلاتا ہے۔ یہ علم اگرچہ انتقالی بھی ہوتا ہے۔ لیکن اسکی بنیاد ابتدائی وہی ہے۔ جسے ایک خالق نے مخلوق کے سامان ربوبیت میں ازل سے ودیعت کیا ہوتا ہے۔ اسلئے اسے لدنی کہا جاتا ہے۔

دوسرے ذریعہ کیلئے ہمارے حواس خمسہ ہمارے علم کیلئے ذریعہ بنتے ہیں۔ یہ علم کچھ تو ماحول مہیا کرتا ہے اور کچھ ہمارے ابتدائی راہنما والدین یا رشتہ دار جن کے ذریعہ ہمیں اپنی

ضرورتوں کا علم اور احساس ہوتا ہے۔اور کچھ ہمارے وہ عالم جنکے پاس ہماری حدود سے باہر کا علم بھی ہوتا ہے۔جیسے ہمارے استاد۔سکول وغیرہ کی زندگی کے راہنما۔انہیں عالموں سے ہم اپنے حواس کے احاطہ میں آنے والی اشیأ کے علاوہ ماوراءادراک وحواس اشیأ سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔اس علم کی بدولت ہم دنیا کے نشیب وفراز میں اپنی واقفیت اور حصولِ سامان زندگی کی رفتار کو برابر جاری رکھ سکتے ہیں۔اسی علم میں ظاہر وغیب دونوں کیفیتیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں۔ظاہر کو ہم اپنے حواس کے ذریعہ اپنے ذہن میں لے آتے ہیں لیکن جو شے ہمارے حواس سے باہر ہو اسکا ہمیں سوائے ایک تصور کے اسکی اصلی ماہیت (شکل) کا علم نہیں ہوتا۔الغرض جب تک انسان کو کسی شے کا علم حاصل نہ ہو وہ اپنی زندگی میں ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔اسلئے انسان کے لئے علم حاصل کرنا فطری طور لازمی ہے۔

قرآن نے زندگی کے ہر مقصود کو حاصل کرنے کیلئے علم کا ہونا ضروری قرار دیا ہے اور اس علم کو کام میں لانے کیلئے بھی ایک تحریک دی ہے۔يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ط اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (پارہ۱۴ سورۃ۱۶ آیت۱۱) اگاتا ہے واسطے تمہارے ساتھ اسکے کھیتی۔زیتون۔کھجور اور انگور اور تمام میوؤں سے تحقیق اس میں نشانی ہے واسطے اس قوم کے جو تفکر کرتے ہیں۔یہاں تفکر سے مراد یہ ہے کہ ان ظاہری اشیأ میں انسان اشیأ کی بنیادی تخلیق (پیدائش) کا کھوج لگائے تاکہ اسے ایک خالص علم حاصل ہو۔اور انسان میں علم وتحقیق کا مادہ قوی ہو اور پھر علم حاصل کرنے کے لئے ہر کیفیت ہر ضرورت کیلئے ایک علیٰحدہ علیٰحدہ ذریعہ مقرر کیا ہے۔سب سے پہلے وہ ذرائع ہیں جو ہمارے اردگرد ماحول کا علم بتاتے ہیں۔جیسے۔آنکھ۔کان۔ناک۔حس۔وغیرہ (حواس خمسہ) ان کے ذریعہ ہم ہر مادی کیفیت کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ط اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ○ (پارہ۲۱ سورۃ۳۲ آیت۲۷) کیا نہیں دیکھا انہوں نے (کافروں نے) کہ ہم چلاتے ہیں پانی

طرف زمین خالی کے (بنجر زمین کے) پس نکالتے ہیں ساتھ اسکے (پانی) کھیتیاں۔ کھاتے ہیں اسی میں سے جانور اِنکے اور خود بھی کھاتے ہیں کیا پس نہیں دیکھتے؟

یہاں ان تمام اشیأ کا علم آنکھ (دیکھنا) سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر شے مادی ہے اور ہر مادی شے حواس کے احاطہ میں آسکتی ہے اسلئے اسکے علم کیلئے آنکھ کو ذریعہ بتایا ہے۔ یہاں اگر انسان آنکھ کے ذریعہ ان اشیأ کو دیکھکر ان پر تفکر کرے تو اسے ان اشیاء کی ابتدائی پیدائش اور نشوارتقاء (ترقی کرنے) کی ترکیب کا علم آسانی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

ایک اور ذریعہ علم بھی بتایا ہے۔ کہ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ○ (پارہ ۲۷ سورۃ ۵۶ آیت ۸۵) اور ہم بہت نزدیک ہیں اسکے تم سے۔ لیکن تم نہیں دیکھتے۔ یہاں ''نہیں دیکھتے''۔ سے مراد ہے کہ ہماری نزدیکی اور ہماری روحانی ہستی تم ان آنکھوں سے علم میں نہیں لا سکتے اسلئے کہ ہم ایک عظیم الشان لامحدود نور ہیں اسلئے نہ ہم ہی آنکھوں کی حد میں آسکتے ہیں نہ ہماری نزدیکی کی ترکیب ہی تمہارے علم میں آسکتی ہے۔ یہاں ماوراء ادراک کیلئے کسی اور ذریعہ کی ضرورت ہے۔ جیسے دوسری جگہ پر ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَات'' ط بَلْ اَحْيَآء'' وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۱۵۴) مت کہو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردہ بلکہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔ یہاں کیفیت ماوراُ ادراک ہے یعنی ایک شخص جو قتل ہوا اصولی طور وہ مردہ ہی کہلاتا ہے لیکن اللہ کی راہ میں مرنے والا اگرچہ تمہارے بصر (آنکھ) میں مردہ نظر آتا ہے۔ اسکا زندہ ہونا ہمارے نزدیک یقینی ہے۔ لیکن اس زندگی کو تم آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے بلکہ اسکے لئے تمہارے دماغ و قلبؔ علم حاصل کر سکتے ہیں اور جب تک تمہارا شعور (دماغ) اس قابل نہ ہو کہ وہ اسکی ماوراُ ادراک کیفیت کو پا سکے تم اس زندگی کو علم میں نہیں لا سکتے یہاں يَشْعُرُوْنَ (یعنی شعور سے سمجھنا) بتایا۔ تُبْصِرُوْنَ نہیں بتایا۔ اسی طرح ماوراُ ادراک علم یعنی علم غیب کیلئے شعور کا ذریعہ بتایا جیسے کہ۔ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ط وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ○ (پارہ ۲۰ سورۃ ۲۷

آیت ۶۵) کہد یجئے نہیں جانتا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کو سوائے اللہ کے۔ اور نہیں جانتے کہ کس وقت (مرنے کے بعد) اٹھائے جائینگے۔ یہاں بھی علم غیب کا حوالہ ہے۔ کہ انسان کے حواس سے باہر کی اشیأ اور وہ کیفیتیں جنکا کوئی وجود ظاہری نہیں شعور کے ذریعہ علم میں آسکتی ہیں۔

ایک اور ذریعہ کا اشارہ بھی ہے۔ کہ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيحَهُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ○ (پارہ ۱۵ سورۃ ۱۷ آیت ۴۴) تسبیح کرتے ہیں اسکے واسطے ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ اُن میں ہے اور نہیں کوئی چیز مگر تسبیح کرتی ہے ساتھ تعریف (پہچان) اسکی کے لیکن تم نہیں سمجھ سکتے (فقہ کر سکتے) تسبیح انکی تحقیق وہ تحمل والا بخشنے والا ہے۔

یہاں ہر شے کی تسبیح بظاہر محسوس نہیں کی جاسکتی۔ جب تک کہ ہم وہ ذریعہ پا نہ سکیں جس سے ماوراُادراک لطیف کیفیتوں کا ہمیں احساس نہ ہو یہاں تَفْقَهُوْنَ سے مراد قلب کے ذریعہ۔ کیونکہ قرآن اس ذریعہ کی خود تشریح کرتا ہے۔ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۔ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ز وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ز وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (پارہ ۹ سورۃ ۷ آیت ۱۷۹) اور البتہ تحقیق پیدا کئے ہم نے واسطے جہنم کے بہت جنوں سے اور انسانوں سے۔ واسطے انکے دل ہیں لیکن وہ دل سے نہیں سمجھتے (فقہ کرتے) اور واسطے انکے آنکھیں ہیں (لیکن) وہ آنکھوں سے نہیں دیکھتے واسطے انکے کان ہیں (لیکن) وہ کان سے نہیں سنتے۔ یہی وہ لوگ ہیں مانند حیوانوں کے۔ بلکہ ان سے بھی گمراہ یہی لوگ غافل ہیں۔ یہاں صاف طور پر دل کے ذریعہ علم حاصل کرنے کو فِقَه کہتے ہیں اور فقہ کرنا ماوراُادراک کیفیتوں کے علم کیلئے ہی ہوتا ہے۔

اسکے بعد ایک اور ذریعہ بتایا ہے۔ کہ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ۙ (پارہ ۱۴ سورۃ ۱۶ آیت ۱۲) اور مسخر کئے واسطے تمہارے رات۔ دن۔ سورج۔ چاند۔ ستارے۔ مسخر

ہیں ساتھ اسکے حکم کے۔ تحقیق بیچ انکے نشانیاں ہیں واسطے قوم عقلمند کے۔

اس آیت میں ان اشیاً کا ذکر ہے۔ جو مادی حالت میں ہمارے حواس کے احاطہ میں آتی ہیں۔ اور ان پر تفکر کرنے سے ہم انکی تخلیق اور پیدائش کا حال اور انکی ترکیب کو پا سکتے ہیں۔ اسلئے اسکا تعلق تعقل سے ہے۔ حواس خمسہ براہ راست تعقل کو آگاہ کرتے ہیں اور تعقل حواس خمسہ کے ذریعہ ہی مادی اشیاً کی کیفیت سے آگاہ ہوسکتا ہے۔ اسلئے یہاں خصوصی طور یعقلون ہی بتایا گیا۔ اسی طرح قرآن میں ہر مادی کیفیت کیلئے بصر اور تعقل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہر غیر مادی کیفیت کیلئے۔ قلب و شعور کا فقہ۔ اور شعور کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ انسان ان تمامی کیفیات کے ادراک کیلئے ہر ذریعہ حاصل کئے ہوئے ہے اور انسان ہر کیفیت کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ یہ انسان کی ذاتی خصوصیت ہے۔ کہ جو ذریعہ اسے قوی تر حاصل ہو اسی ذریعہ سے وہ آگاہی پا سکتا ہے۔ یعنی اگر بصر ہے تو ہر شے کو دیکھکر وہ احساس کرسکتا ہے کہ میرے اردگرد ماحول میں یہ کیا ہے۔ کیوں ہے۔ انکی پیدائش کیسے ہے تو یہ تمام کیفیات تعقل تک آنکھ کے ذریعہ پہنچتی ہیں۔ تو انسان کو انکے متعلق علم حاصل کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان میں اسکی ابتدائی عمر میں ذہن کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی ''کیا'' ـــــ اور ''کیوں'' کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ یا ذاتی طور پر انکی تحقیق کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ یا اپنے قریبی راہنما سے سوال کرتا ہے۔ اور اس سے علم پاتا ہے۔

علاوہ ازیں وہ کیفیات جو اسکے حواس کے احاطہ میں نہ آنے والی ہوں چونکہ اس میں ماورأادراک کے مشاہدہ کی قوت برسر عمل نہیں ہوتی وہ اپنی ذاتی قابلیت سے ان پر عبور حاصل نہیں کرسکتا اسلئے وہ کسی مستقل علم (علم الٰہی) کی راہنمائی کا محتاج ہوتا ہے۔ جسکے لئے ایک روحانی عالم (پیغمبر) ہی راہنمائی کرسکتا ہے۔ ان کیفیات میں وہ بغیر استطاعت (روحانی) کے یا امداد (روحانی) کے اپنی ذاتی تحقیق میں نامکمل رہ جاتا ہے۔ اسلئے قرآن کی اس تعلیم پر جس میں ایمان بالغیب کا مضمون ہے۔ اسوقت تک سوائے ایمان بالغیب کے کوئی بحث نہیں کرسکتا جب تک کہ

انسان کے قلب وشعور میں اسقدر وسعت نہ ہو کہ وہ اپنے مشاہدات کی تکمیل بدرجہ اتم نہ کر پائے۔ اور اس امر میں بحث کرنے سے لازمی طور بوجہ استطاعت نہ ہونے کے سوائے غلط فہمی اور گمراہی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ قرآن نے اپنے بیان میں انسانی خصوصیات کے مطابق ہی تحقیق کی تحریک دی ہے۔ کہ جن کیفیات کو تم بصر اور عقل سے حاصل کر سکتے ہو ان پر غور و تفکر کرو اور جب تم ان نشانات میں ایک خالق کی قدرت اور کاریگری کو پاؤ تو پھر ماوراء ادراک کی طرف رجوع کرو اور تم علم الٰہی کے معلم کے اس طریق کو اختیار کرو جس سے ماورا ادراک کیفیات کا مشاہدہ[1] ہوتا ہے۔ تاکہ تم علم میں راسخ ہو اور پھر تمہارے لئے ان کیفیات کا مشاہدہ بھی آسان ہو جائیگا۔ اسی لئے جن کیفیات کا تعلق قلب وشعور سے ہے متشابہات کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں۔ جسکے لئے قرآن نے علم راسخ کا ہونا لازمی قرار دیا ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنی نفس پرستی خود غرضی کی بنا پر کدر رکھتے ہیں۔ یا اپنی محدود اور نامکمل قوت تحقیق سے قرآن کے احکام پر بحث کر کے قرآن پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ قرآن سے اصل راستہ پانے میں ناکام رہتے ہیں۔

قرآن انسانی فہم کے مطابق اسے علم دیتا ہے۔ جسقدر اسکا ادراک وسیع ہوتا جائیگا اسی قدر اسے علم حاصل ہوتا رہیگا خواہ زمانہ قدیم ہو۔ یا جدید۔ خواہ ایجادات قدیم ہوں۔ یا انتہائی جدید۔ با الفاظ دیگر یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ زمانہ جو کچھ مستقبل میں اختراعات و ایجادات حاصل کریگا۔ یا وہ ماضی میں کر چکا ہے۔ وہ یا تو قرآن کے علم سے ہی حاصل شدہ ہوگا۔ یا اسکی مکمل تفصیل قرآن میں موجود ہوگی۔

انسان چونکہ سطحی نظر رکھتا ہے۔ یہ اپنے مادی قویٰ کے ذریعہ ہی اپنی ابتدأ شروع کرتا ہے۔ اسلئے اسکا ذہن دنیوی معاملات میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ قرآن ایک الٰہی کلام ہے۔ جس میں کائنات کے ہر ذرہ کی تحقیق موجود ہے۔ اسکے مطالعہ کیلئے انسان میں اعلےٰ قابلیت کا ہونا ضروری

---

[1] مشاہدہ کی تشریح آگے آئیگی

ہے۔ جہاں اس میں کائنات کی اشیاءِ مادی پر تفکر کیلئے مواد موجود ہے۔ وہاں اس میں ماورأ ادراک عالم و کیفیات کی نشانیاں بھی موجود ہیں۔ لیکن ہر کیفیت کو جب تک اِسکی ہیئت کے مطابق نہ پرکھا جائے اسوقت تک انسان اس قرآن کے علم سے پوری واقفیت حاصل نہیں کرسکتا۔ جہاں مادی اشیأ کا تعلق ہے۔ وہاں حواس و تعقل سے کام لیا جاتا ہے۔ جہاں ماورأ ادراک کیفیات کا تعلق ہے۔ اسکے لئے ضروری ہے۔ کہ انسان کے قلب و شعور میں ادراک کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ ماورأ ادراک کیفیات و واقعات پر اسوقت تک یقین نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ ان کیفیات کا مشاہدہ نہ ہو اور مشاہدہ کا تعلق انسان کے قلب و شعور سے ہے۔ قلب و شعور کی لطافت انسانی افعال و کردار پر منحصر ہے۔ اسلئے قلب و شعور کی لطافت اسی شخص کو حاصل ہوسکتی ہے۔ جو قوانین فطرت (یا قوانین الٰہی) کا پوری طرح عامل ہو۔ بصورت دیگر انسان کی ابتر اور غلیظ حالت میں قرآنی آیات کا کسی طرح مشاہدہ نہیں ہوسکتا ہے۔ اکثر انسان اپنی نامکمل قوت ادراک سے ہی قرآن کی ہر نشانی کو یعنی مادی اور روحانی کیفیات و واقعات کو احساس میں لانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ الٰہی کلام سے ہر زمانہ میں انکار کیا گیا۔ اور عمومی حیثیت سے جن چیزوں پر ایمان بالغیب کے ساتھ (یعنی بغیر دیکھے کسی کیفیت کے وجود کو مان لینا) تسلیم کرنا ہے ان احکام کے ماننے سے بھی انکار کیا۔ اس انسانی کمزوری کو پورا کرنے کیلئے لازمی طور ایک راہنما کی ضرورت تھی جسکے لئے فطرت نے پیغمبر کا تعلق ضروری قائم کیا۔ اور ہر دور میں ہر گمراہ قوم کیلئے ایک پیغمبر مخصوص کیا گیا۔ جسے اولاً تعلیم الٰہی کے ہر رموز و آثار سے آگاہی دی گئی۔ اسلئے قرآن کی تعلیم حضرت محمد رسول اللہؐ کے ذریعہ جاری کی گئی۔ اور جسقدر حقائق و آثار قرآن میں موجود ہیں۔ انسے پوری طرح حضرت محمد رسول اللہؐ کو آگاہی دی گئی۔ چنانچہ آپؐ نے بھی وہی طریق اختیار کیا جس سے آپکی جسمانی۔ روحانی قوتیں اس مقام تک پہنچیں جہاں انسان ہر ظاہری باطنی کیفیت کا ادراک کرسکتا ہے۔ ہر انسان کیلئے ایک پیغمبر کا عمل ہی نمونہ بنتا ہے۔ اسلئے ہر اس شخص کیلئے جو قرآن سے علم و حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ اسے لازم ہے۔ کہ وہ قرآن کے عامل کی طرف رجوع کرے۔ اور اُنکے بتائے ہوئے

طریق پر عمل کرے۔ چنانچہ قرآن خود اس کا اعلان کرتا ہے۔ کہ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۳۱) لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھنا چاہتے ہو یعنی اسکی تلاش چاہتے ہو تو میری (پیغمبر کی) تابعداری کرو (یعنی میرے عمل کو اپنے لئے نمونہ بناؤ) تو لازمی طور پیغمبر کی راہنمائی میں ہی۔ اللہ کے ماورأ ادراک عالم کا مشاہدہ ہو سکیگا۔ پیغمبر کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ کہ وہ تعلیم الٰہی کے ہر حکم کی پابندی کرتا ہے۔ اور اسی پابندی کا ایک نمونہ پیروان مذاہب کیلئے ایک شریعت (دین۔ راستہ) بن جاتا ہے۔ پیغمبر کی اتباع (تقلید) کے بغیر انسان کی تعلیم نامکمل رہ جاتی ہے۔ پیغمبر کے ذریعہ ہی انسان کلام الٰہی کے احکام کو سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر ایک طرف ظاہری طریقِ عمل بتاتا ہے۔ دوسری طرف وہ ماورأ ادراک کا بھی مشاہدہ کراتا ہے۔ اسی صورت میں انسان علمِ راسخ حاصل کر کے کلام الٰہی (قرآن) کے ظاہری باطنی اسرار سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ برعکس اسکے اگر انسان اپنی محدود عقل سے ہی قرآن کا مطالعہ کرنے تو سوائے نکتہ چینی اور اعتراضات کے وہ اور کچھ حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ اسکے لئے ضروری ہے۔ کہ انسان ایک مخصوص عالم کی طرف رجوع کرے۔

ابتدائے آفرینش (پیدائش) سے ہر دور میں انسانی زندگی اکثر دنیوی امور سے رابطہ رکھتی چلی آئی ہے۔ جب سے اسے سامان زندگی کے حصول کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسکا رجحان زیادہ تر اپنی اقتصادی۔ تمدنی ترقی کی طرف بھی رہا۔ اور ہر زندگی کے لئے یہ چیز لازمی ہوگئی۔ کہ وہ اپنے لئے زندگی بسر کرنے کا سامان مہیا کرے۔ لیکن ہر زمانہ میں اس حصول کے طریقے مختلف رہے۔ زمانہ میں جس قسم کا ماحول پایا گیا۔ اسی قسم کی انسان کو ضرورتیں پیش آئیں ــــ ابتدائی زمانہ میں لوگ لذتوں سے آشنا نہ تھے۔ انکی ضرورتیں کم تھیں۔ صرف گھاس پات پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ انکے لئے انکی اقتصادی تمدنی زندگی اسی قدر مختصر اور تسلی بخش تھی۔ جسقدر آج ہمارے لئے تمام ایجادات سے نفع حاصل کرنے سے تسلی نہیں ہوتی ــــ انسان کو جب سے اپنی ضرورت خود پوری کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی یعنی اسکی طلب اور لذت میں وسعت پیدا ہوئی ــــ انسان ہر

وقت اپنی ضرورت کی تلاش میں پھرتا رہا۔ اس تلاش اور تگ ودو سے یہ مراد نہ تھی کہ انسان صرف اپنی زندگی کے سامان مہیا کرنے کیلئے پیدا ہوا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ابتدائی زمانہ میں ایجاداتی زمانہ کے مقابلہ میں۔ لوگوں کے پاس پانی پینے کیلئے ایک پیالہ بھی موجود نہ تھا۔ نہ ہی انکے پاس اپنے کھانے کیلئے کوئی سامان تھا۔ لیکن باوجود ان اشیأ کی غیر موجودگی کے بھی انکے زندہ رہنے کیلئے تمام سامان موجود تھا۔ جس سے کہ وہ اپنی زندگی نہایت آرام واطمینان سے بسر کرتے رہے۔ وہ گھاس اور درختوں کے پتے۔ پھل کھا کر اور چشمہ کا پانی پی کر (خواہ مثل حیوانوں کے پیئیں یا چلوا سے پیئیں) اپنی زندگی کو مکمل صحت وعافیت سے گزارتے تھے۔ انہیں اپنے کھانے پینے کا احساس نہ تھا۔ بلکہ ''خوردن برائے زیستن'' کے ماتحت جب انہیں بھوک محسوس ہوتی کھا لیتے۔ جب پیاس محسوس ہوتی پی لیتے وہ زندہ رہنے کیلئے اپنی روزی حاصل کرنے کی فکر سے بے نیاز تھے۔ بلکہ فطری طور ہر شے کو استعمال کرتے رہتے۔ ایسی حالت میں جبکہ انہیں دنیا میں رہ کر کسی شے کی خواہش محسوس نہ ہوتی انکا تمام تر وقت بے فکری میں گزر جاتا۔ ایسی حالت میں انسانی زندگی کا یہ لازمہ ہے۔ کہ انسان کا ذہن کسی نہ کسی کام میں لگا رہے۔ ایسے انسان کیلئے جو اپنی تمام ضرورتوں سے بے نیاز ہو۔ اور اسکی تمام طاقتیں خالص اور صحت مند ہوں۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ ایسے انسان کے ذہن میں ماحول کے واقعات اور کیفیات ہی جگہ پکڑیں۔ جب انسان فطری طور اشرف المخلوقات پیدا ہوا ہو تو اسکے روحانی خواص ضرور اسے ایک تفکر و تجسس کی طرف مائل کرینگے اور روحانی قویٰ کے خالص اور پاکیزہ ہونے کے ساتھ یہی نتیجہ ہوسکتا ہے کہ انسان اپنی روحانیت میں بھی کامل ہو۔ اسکے لئے جبکہ اس میں مادی خواہشات موجود نہ ہوں سوائے فطرت کی تجلیات کے اور کیا حاصل ہوتا۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ضروریاتِ زندگی زیادہ ہوتی گئیں۔ یعنی انسان نے اپنے

ا چلّو۔ ہاتھ کی اُوک ـــ پیالی نما مٹھی جس میں پانی یا کوئی اور رقیق چیز لی جا سکے۔ (ناشر)

آپکو لذتوں کی طرف مائل کیا۔ تو انسان اپنی لذتوں کی تکمیل میں اپنی ضرورتوں میں الجھتا رہا۔ اسلئے مصروفیت بڑھتی گئی۔ اور دنیوی انہماک بھی بڑھتا گیا۔ اسکا ذہن بجائے خالص ہونے کے دنیوی حصول کے ذرائع سے بھرنے لگا۔ دنیوی حصول نے اسے فطری یکسوئی اور تزکیہ سے دور کردیا۔ اور انسان پر مادیت کا اثر بڑھنے لگا۔ انسان لذتوں کا تابع نہ ہوتا۔ تو انسان مثل قدیم کے اپنی زندگی کے قرار کے لئے اسی طرح رزق۔ صحت۔ آسودگی اور فراغت حاصل کرلیتا۔ ان حالات سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ انسانی زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے اگرچہ زیادہ اہتمام وایجادات نہ بھی ہوں۔ تب بھی انسان صحت تام سے عمر دراز اور اطمینان حاصل کرسکتا ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ دنیا داری کاروباری معاملات میں ہمہ وقت کی مصروفیت اور پریشانی وغربت گویا فطری طور پر نہیں بلکہ انسان کی خود پیدا کردہ شے ہے۔

کائنات کی جملہ اشیأ پر صرف انسان ہی استعمال کا حق رکھتا ہے۔ اور یہ چیزیں انسان نے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے نہیں بنائی ہیں۔ بلکہ انسان کی تکمیل (پیدائش) سے پیشتر بنی ہوئی ہیں۔ اور اسکے تصرف کے تعلق سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ چیزیں انسان کے لئے ہی بنی ہیں۔ یہ چیز قابل غور ہے۔ کہ اگر کائنات کی ہر شے عادتاً (خود بخود) بنتی آئی ہے۔ اس میں ضروری نہیں کہ ہر چیز سے انسان فائدہ اٹھائے۔ لیکن دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ انسان کائنات کی جس چیز کو حاصل کرتا ہے۔ وہ ضرور انسان کیلئے کارآمد ہوتی ہے۔ اور انسان بغیر کسی تردد کے انہیں اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے۔ کہ جب انسان گھاس اور درختوں کے پتوں۔ اور چشمہ کے صاف وشفاف پانی سے اپنی تندرست زندگی گزار سکتا ہے۔ تو پھر انسان نے کیوں اصل غذا کو مشینوں میں بھر کر اسکی تازگی اور فطری. طاقت اور دوامی خالصیت کو محدود کردیا۔ ایک لطیف اور جواہراتی پانی کو نلوں میں محبوس کرکے کیوں اس حالت پر پہنچایا کہ اس میں بدبو آنے لگی۔ اور اس میں ادویات ڈالنے اور محفوظ کرنے کی ضرورت پڑی؟۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انسان نے ایجاداتی دنیا میں اگر مضرت (نقصان) اور مشکلات کا سدباب کیا۔ لیکن اس کے پس منظر میں

یہ بات واضح طور عیاں ہوتی ہے۔ کہ انسان نے خود اپنی لذتوں کے باعث اس خوبصورت فضا کو جس میں جواہراتی اقل وشرب (کھانے پینے کا سامان) انسان کو آسانی سے مہیا ہو سکتا تھا۔ اس حد تک زہر یلا کر دیا۔ کہ یہی چیزیں اسکے لئے باعثِ مرض ہو گئیں۔ ایسی صورت میں ان ایجادات کو وجہِ زندگی سمجھنا ایک وہم ہے۔ بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ انہیں ایجادات کے باعث دنیا کے تمام فطری اسباب ہلاکت کا باعث ہونے لگے۔ اور اب یہ ایجادات وجہِ زندگی نہیں۔ بلکہ اپنے مرض کے دفیعہ کیلئے ایک سطحی علاج ہے۔ اور انسان اب سامان ربوبیت (زندہ رہنے کا سامان) حاصل کرنے کے اپنے مرض کے دفع کرنے کے لئے ہر نئی دوا کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ انسانی فطرت کا لازمہ تو صرف زندگی کو امن وسلامتی سے چلانے کے لئے ایک ذریعہ حاصل کرنا تھا۔ جو اسے کائنات کے ہر ذرہ ہر مقام میں بلا مشقت حاصل ہو سکتا تھا۔ سوال تو صرف زندہ رہنے کا ہی تھا۔ تو انسان کو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنی زندگی کے برقرار رکھنے کیلئے صرف غذا حاصل کرے اور وہی غذا حاصل کرے جو اسے آسانی سے مہیا ہو سکے۔ یہ غذا تو کائنات کے فطری نظام میں خالص اور بے شمار مل سکتی ہے۔ پھر ان ایجادات کی کیوں ضرورت پیدا ہوئی؟ اسکا جواب یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ایجادات سے ان چیزوں کے حاصل کرنے میں انسان کو سہولت ملی اور اسے انکے ذریعہ بھی خالص چیزیں ملنے لگیں۔ بیرونی ماحول کی اشیاً کی مضرت مشینوں کے ذریعہ صاف کر کے انسانی صحت برقرار رہنے لگی۔ جہاں ایک شخص ایک سیر اناج سے زندہ رہ سکتا ہے۔ وہاں مشینوں کے ذریعہ دوائی کی ایک گولی اتنا ہی کام دیتی ہے۔ جس سے وقت اور محنت کم ہو جاتی ہے۔ پیشتر زمانہ کے لوگوں میں بیماریاں زیادہ ہوتیں اور اکثر بغیر علاج کے مر جاتے انکے پاس علاج کے ذرائع نہ تھے۔ ایجاد نے بیماری کم اور علاج آسان کر دیا۔ لیکن۔ قبل اسکے کہ ہم مشینوں (ایجادات) کے فوائد پر نظر ڈالیں ہمیں انسان کے ابتدائی ماحول کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ کہ آیا انسان پیشتر بھی ان چیزوں کا محتاج تھا؟ ہر شے کی ضرورت انسان کی مجبوری اور احتیاج پر مبنی ہوتی ہے۔ تو انسان کی ابتدائی زندگی اور کائنات کے ابتدائی دور کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان

ایک صحت مند انسان تھا جسکے تمام قویٰ جسکی تمام خاصیتیں اسقدر قوی تھیں کہ اس پر کسی بیرونی مضرت کا اثر کارگر نہ ہوتا تھا۔ انسان کی فطری خاصیت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان میں بجائے خود ہر مقابل قوت کیلئے ایک زبردست دفاع کا مواد موجود تھا۔ مثال کے طور پر انسان جنگلوں میں رہتا تھا۔ لازمی طور اسے زخم بھی آجاتا۔ کبھی کسی زہریلے جانور سے بھی ٹکراؤ ہو جاتا۔ موسم کی گرمی کی شدت بھی اس پر اثر انداز تھی۔ سردی کی شدت بھی اس پر اثر انداز تھی۔ پھر اسکے وجود پر کوئی کپڑا بھی نہ تھا۔ سردی۔ گرمی سے بچنے کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ تو پھر ان اثرات کا اسکے پاس کیا علاج تھا۔ وہ علاج یہی تھا۔ کہ ماحول کے مطابق اسکی وجودی خاصیتیں خود بخود اسکا علاج کر دیتیں۔ اس پر کوئی زہر۔ کوئی سردی گرمی۔ کوئی زخم کوئی غلیظ و کثیف فضا غلبہ نہیں کر سکتی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کم سن غریب بچہ شدت کی سردی میں ایک قمیض میں بے فکر پھر رہا ہے۔ اس کے مقابل ایک رئیس کو معمولی ہوا لگنے سے نمونیہ ہو جاتا ہے۔ ایک غریب کے بچہ کا سر زخمی ہوتا ہے تو خود بخود زخم بھر آتا ہے۔ اور ایک امیر کا زخم بغیر دوائی درست نہیں ہوتا۔ اسی طرح کئی واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔ جنکا ایک طرف خود بخود علاج ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف بہترین علاج بھی کارآمد ثابت نہیں ہوتا۔ یہ انسانی ذاتی خاصیتوں کا اثر ہے۔ کہ کسی میں قوت دفاع قوی ہوتی ہے۔ کسی میں کم۔ یہ کمی بیشی فطری نہیں ہوتی بلکہ ماحول پیدا کرتا ہے۔ ایک ریگستان کا انسان تپتی دھوپ میں پھرتے پھرتے سیاہ ہو جاتا ہے۔ اور سرد علاقے میں رہنے والا انسان سفید ہوتا ہے۔ یہ انسانی خاصیتوں میں دفاع (حفاظت) کے ذرائع ہیں جو انسان میں فطری طور موجود ہیں۔ یہی اثر قوی طور پر ابتدائی انسان میں موجود تھا۔ اسے ایجادات یا مشینوں کی احتیاج ہی نہ تھی۔ اور اسکی ضرورتیں اسکی قوت کے عین مطابق اسے ملتی اور فائدہ پہنچاتی تھیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا آبادی بڑھتی گئی اس حالت میں بھی انسان کو صرف کھانے پینے کا ہی احساس ہونا چاہیے تھا کہ ایک جگہ ہر شخص کیلئے رزق حاصل کرنا دشوار تھا۔ اس حالت میں جسوقت انسان کو اپنے کھانے کا احساس ہوا اُسے کسی مادی شے کی تلاش کی جستجو پیدا ہوئی اسنے سمندروں کی طرف پھیلنا شروع کیا یا ایسے

مقام کی طرف رجوع کیا جہاں یہ اپنی زندگی کا سامان حاصل کرسکتا۔آبادی کی کثرت نے ہی ایک دوسرے کے مقابلہ میں جستجو کا مادہ پیدا کردیا۔جہاں جستجو پیدا ہوئی انسان نے کوشش کی ذہن کو مادی ضرورت پورا کرنے کیلئے کام میں لایا۔اور جو ضرورت اسے حاصل ہوئی وہ نئی ایجاد ہی تھی۔کیونکہ ضرورت یا خواہش نے انسان کو ایک نئی شے کی طرف مائل کردیا۔نئی شے بجائے خودنئی (قسم دیگر) تھی اسلئے اسکے حصول کے ساتھ ہی اسے ایک لذت کا احساس ہوا ـــ لذت نے اس پر دو کیفیتوں کا اثر پیدا کیا۔ایک تو زیادہ حصول کی اسکے دل پر داغ بیل پڑ گئی دوسرے اسکی قوت دفاع (ذاتی خاصیتیں) پر اثر ڈالا۔اول انسان صرف گھاس یا پتوں کو بغیر احساس بغیر خواہشں (جب بھوک لگی) کھالیتا۔پانی پی لیتا۔جب اسکی ضرورت۔وقت پر نہ ملی تو بھوک سے کھانے کی خواہش اور احساس پیدا ہوا۔اُسوقت انسان فطری طور پر چل رہا تھا۔ہر شے کا خود علاج ہوتا تھا۔اب خواہش نے حصول کی طرف مائل کردیا۔تولازمی طورا سے ایک وقت کے ساتھ دوسرے وقت کیلئے بچت کرنے کا مادہ پیدا کردیا۔جب انسان کے پاس دوسرے وقت کا سامان مہیا ہونے لگا تو قوت دفاع کم ہونے لگی۔اس میں رفتہ رفتہ تساہل کا مادہ پیدا ہونے لگا۔تساہل کا اثر یہ ہوا۔کہ اسے ہر مضر شے محسوس ہونے لگی جسمانی قوتوں میں جب کمی پیدا ہوئی تو سردی کے وقت سردی محسوس ہوئی۔گرمی کے وقت گرمی محسوس ہوئی۔اور آہستہ آہستہ ہر شے کا احساس ہونے لگا ہر شے کے احساس کے ساتھ اسے مادی (بیرونی) دفاع (حفاظت یا ضرورت کو پورا کرنے کے سامان کا خیال) کی ضرورت پڑی۔جب اسے آگ ملی تو اسکو سردی میں آرام ملا۔اسطرح یہ آگ کا عادی ہوا۔گرمی میں سایہ میں آرام ملا تو سایہ دار جگہ کی ایجاد ہوئی ان ایجادات نے اسے تن آسان کر دیا۔نتیجہ یہ ہوا۔کہ انسانی قوت دفاع کم ہونے سے انسان پر ہر بیرونی مضر اثر بیماری۔زہر۔وغیرہ اثر انداز ہونے لگا۔انسان کیلئے تو اسکا واحد علاج یہ تھا کہ فطرت کی اشیاءً سے کماحقہٗ حسب ضرورت فائدہ حاصل کرے اور اپنی قوتوں کو برقرار رکھنے کیلئے اس میں تن آسانی۔آرام طلبی اور زیادہ حصول کا مادہ زیادہ نہ پیدا ہو۔لیکن ہر ایجاد اسکے لئے ان مضرات کا باعث بنی۔جب آدمی بیمار ہوا۔علاج نہ ملا

تو خواہ مخواہ مرجانالازمی ہے۔اور جب ایک مرض حد سے تجاوز کر جائے انسان میں قوت دفاع بھی کم ہو چکی ہو تو اسکا نتیجہ لازمی موت اور بری موت ہی ہو گا اور جب اسکے علاج کیلئے دوائی ایجاد ہو تو وہ مرض کیلئے ہی ہو گی نہ کہ انسانی زندگی کے حصولِ رزق کیلئے ہو گی گویا ہر ایجاد انسان کی فطری قوتوں کے ضائع ہونے پر ہی پیدا ہوئی۔ بلکہ یوں کہئے کہ ہر ایجاد نے انسان کی فطری قوتوں کو ضائع کر کے اسے ایجاد پر ایجاد کا مائل کر دیا۔اور ہر ایجاد کو انسان کی پیدا کردہ تکالیف کا سدباب سمجھا گیا۔

ان حالات سے پتہ چلتا ہے۔کہ انسان کو جہاں فطری طور پر فطرت کی مطابقت کرنی تھی۔اسے اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے ہی فطرت کی عطا کردہ اشیأ کا استعمال کرنا چاہیے تھا۔مگر انسان نے اپنی ضروریات کو بڑھا کر اپنے آپکو لذتوں کا تابع کر کے اپنے ذہن کو دنیوی الجھنوں میں اسقدر پھنسایا۔کہ اب ایک ساعت کیلئے بھی اسے سر ہلانے اور مرض سے نجات حاصل کرنے کی مہلت نہیں۔یہ نہیں کہا جا سکتا ___ کہ ہر ماحول میں ایجادات کی ضرورت نہیں یا یہ ایجادات بے معنی ہیں۔البتہ جب انسان اپنی تن آسانی کے باعث اس مقام پر پہنچ چکا ہے۔کہ اس میں اپنی خود ضبطی اور خود کو بنانے کی طاقت ختم ہو چکی ہے۔اسکی ضرورتیں ایجادات ہی پورا کر سکتی ہیں۔لیکن یہ سمجھنا غلط ہے۔کہ انسانی زندگی میں ایجادات انسان کے لئے ہر حال میں نفع بخش ہو سکتی ہیں۔ جب تک ایجادات کے ساتھ اس بات کا خیال نہ رکھا جائے۔کہ ایک طرف انسان کی ضرورتیں پوری کی جائیں کیونکہ یہ وقتی علاج ہے۔دوسری طرف انسان انہیں اس انداز سے استعمال کرے کہ اسکی کھوئی ہوئی صفتیں۔حقیقی قوتِ دفاع اور خواہشات سے بے نیازی بھی عود کر آئیں۔اس میں ایجادات سے تن آسانی اور زیادہ حصول کی خواہش نہ رہے۔فطرت کا تقاضا تو یہ ہے۔کہ انسان کائنات کی اشیأ سے اسی قدر نفع حاصل کرے جس سے یہ اپنی زندگی آسانی۔اطمینان سے گزار سکے۔اسکا مطلب ''کم خواہش اور کم ضرورت'' جس سے انسان کا ذہن انسان کا وجود تمام الجھنوں اور زائد محنتوں سے پاک رہے۔تا کہ انسان اپنے نصب العین کی طرف بھی مائل ہو سکے وہ نصب العین یہی ہے کہ انسان اپنی اشرف المخلوقاتی قوتوں کو روبکار لا کر بہ طریق سابق ہر شے پر

غالب رہے۔ یہ کسی ضرورت کا محتاج نہ رہے۔ کسی مضرت سے متاثر نہ ہو بلکہ اسکی قوتیں لطیف ہو کر اس مقام پر آ جائیں جہاں انسان اپنی ایٹمی اور ایتھری قوتوں کے ساتھ دنیا پر آیا تھا۔

انسان دنیوی دھندوں میں پھنس کر خود غرض بن جاتا ہے۔ اور اپنی لذتوں اور تن آسانی کی وجہ سے فطرت اور نفس کو دھوکہ دینا چاہتا ہے کہ دنیا میں رہ کر اپنا اور بال بچوں کا گزارا ضروری ہے۔ چوبیس گھنٹے عبادت میں رہنا رہبانیت ہے۔ محنت کرو۔ روپیہ کماؤ۔ اور دوسروں کی مدد کرو۔ یہی شریعت ہے۔ دنیوی جاہ وجلال سے حکومت کرنا۔ مادی قوتوں سے دنیا پر غلبہ حاصل کرنا۔ انسان کا مقصد زندگی ہے۔ بیشک یہ بھی انسان کی زندگی کا لازمہ ہے۔ لیکن کیا اسطرح کی زندگی سے انسان اپنی عظمت کی کمی پوری کر سکتا ہے۔ کیا واقعی یہی انسان کی زندگی کا نصب العین ہے؟ کیا وہ اس طرح اپنی زندگی کے نصب العین سے قریب ہو سکتا ہے؟ کیا دنیوی جاہ وجلال انسان اپنی ذاتی قوتوں سے حاصل کرتا ہے۔ یا غیر طاقتوں سے! مادی طاقتوں سے! کیا اس جاہ وجلال سے وہ مطمئن رہ سکتا ہے؟ کیا اس جاہ وجلال سے وہ مخلوقِ انسانی کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ تو نہیں کر رہا؟ کیا مادی ذرائع سے قوت وغلبہ حاصل کرنے والا شخص یہ گارنٹی دے سکتا ہے۔ کہ وہ مخلوقِ انسانی کیلئے اپنی ضرورت سے زیادہ ہر شے دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے؟ کیا ایٹمی قوت حاصل کرنے والی قومیں (بظاہر اگرچہ انکا اعلان یہی ہے۔ کہ ہر شخص کو آزادی کا حق حاصل ہے) انکی طاقتیں انسانیت کیلئے تباہ کن تو نہیں۔ اگر نہیں تو پھر اسکا یہی نتیجہ ہونا چاہیے۔ کہ ہر انسان کی ذاتی قوت میں پائی جانی چاہیے اور ہر شخص اپنے حصول پر مطمئن نظر آنا چاہیے۔ اگر ہیں۔ تو پھر یہ خود غرضی ہے۔ نفس پرستی ہے۔ اور حقیقت کو دھوکہ دینا ہے۔ بھلا ریشمی کپڑے۔ مرغن غذائیں حاصل کرنا اور صرف اپنی ذات کیلئے حاصل کرنا۔ رات دن اسی گندہ ذہنی میں مصروف رہنا۔ کیا انسانی نصب العین کی تکمیل ہے؟ کیا اس سے حقیقت کی تلاش ہوتی ہے یا اپنی ذات کو نفع پہنچانے کا ایک ڈھونگ ہے؟ کیا اس صورت میں انسان مقصدِ حقیقی پاتا ہے یا مقصد سے دور ہو کر دنیوی دھندوں میں گھر کر اپنی یکسوئی کھوتا ہے۔ اگر حقیقی قانون یہی ہے۔ کہ اپنے بنائے ہوئے جال میں خود کو

پھنسا کر حقیقت سے دور جاؤ۔ تو پھر دنیوی لذت ہوس۔ نفس پرستی کس شے کا نام ہے؟ کیا انسان کو ایجادات سے سادہ زندگی چھوڑ محلات شاہی۔ باغات۔ اور مرغن غذائیں حاصل کرنے کیلئے دنیا میں آنا تھا؟ ـــــ انسان کو اگر دنیا میں صرف کھانے پینے کیلئے ہی آنا تھا۔ تو پھر اسقدر سامان زندگی کا فطری انتظام شروع سے ہی نہ ہونا چاہیے تھا۔ دراصل یہ سب سامان صرف اسلئے قبل از وقت انسان کیلئے وقف کیا گیا تھا۔ کہ انسان کا ذہن و دل تمام الجھنوں سے پاک رہے۔ اسکا وقت فضول ضائع نہ ہو۔ اسکی ذاتی خاصیتیں کسی غیر کی الجھن میں ضائع نہ ہوں۔ بلکہ اسکا ذہن اپنے نصب العین حقیقی کیلئے مصروف کار رہے۔ اسکا نصب العین (یعنی تلاش حقیقت) ہر وقت اسکے پیش نظر رہے۔ حق تو یہ ہے۔ کہ انسان کی ابتدائی زندگی میں جبکہ اسے اپنی ضروریات زندگی سے لگاؤ نہ تھا۔ اسے فطری طور تفکر و تجسس سے دلچسپی تھی۔ کیونکہ اسوقت انسان ہر ضرورت ہر الجھن سے پاک تھا۔ اور فطری غذا حاصل ہونے کی وجہ سے اسکے تمام قویٰ جسمانی اور روحانی صحت مند اور لطیف تھے۔ اسے بغیر تزکیہ و مجاہدہ کے ہر کیفیت کا مشاہدہ حاصل تھا۔ اور انسان اپنی جسمانی روحانی بناوٹ کے اعتبار سے ہر کیفیت ہر نتیجہ کو آسانی سے پاسکتا تھا۔ لیکن زمانہ گزرنے کے بعد جب اسکا ذہن دنیوی حصول کی طرف مائل ہوا۔ اور اسے خواہش۔ حصول نے تن آسان کر دیا۔ اس کے انسانی خواص میں کمزوری پیدا ہوئی۔ تو اسنے فطرت کے فطری قانون کے خلاف قدم اٹھانا شروع کیا۔ یہ انحراف۔ یہ غلط روی اسکے تنزل کا باعث بنی اور انسان فطری قانون سے بغاوت پر آمادہ ہوا۔ انسان نے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کیلئے ہر غیر فطری طریقہ اختیار کیا۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زمانہ میں تمام ماحول تمام انسانیت بگڑ گئی۔ اس سے قبل انسان کو کسی شریعت کی ضرورت نہ تھی انسان فطرت کے قانون پر فطری طور چل رہا تھا۔ یہ صرف گھاس پات پر اکتفا کرتے ہوئے۔ ایک حقیقت کا تصور اپنے دل میں رکھ رہا تھا۔ اسے نہ چوری کا علم تھا۔ نہ جھوٹ کا علم تھا۔ نہ شراب تھی۔ نہ جوا تھا۔ نہ زنا تھا نہ ایک دوسرے سے بغض و حسد تھا۔ لیکن انحراف نے اس میں ہر قسم کے مادی (تنزلی) عیوب کو ابھارا۔ جس سے اسکی لطافت و روحانیت دب گئی۔ اور دنیا میں فساد و شر کا

دروازہ کھل گیا۔ایسی حالت میں فطری طور یہ چیز لازمی تھی کہ کائنات کے فطری نظام کو دوبارہ سنوارا جائے۔تو ایک فطری عالم (راہنما) کی ضرورت پیدا ہوئی۔جسکے ذریعہ انسان کو دوبارہ فطرت کا پیغام سنا کر پھر اُسی فطری ماحول میں لایا جائے۔چنانچہ ہر زمانہ میں پیغمبر آئے انہوں نے لوگوں کی انکی بداعمالیوں کے مطابق اصلاح کی جیسے جیسے عیوب زمانہ میں پائے گئے ویسے ہی شریعتیں پیش کی گئیں ان شریعتوں کا مقصد صرف یہ تھا۔کہ انسان کی سفلی (مادی) خصلتوں کو مٹا کر اسکے لئے ایک خالص ماحول پیدا کر کے اسکی ذاتی انسانی اور اشرف المخلوقاتی خاصیتیں اسے دوبارہ حاصل ہوں۔تاکہ انسان بطریق سابق پیشتر کی طرح خواہشات اور الجھنوں سے پاک ہوکر اسکے دل میں پھر ایک خالق حقیقی کا تصور قائم ہو اور اسی کی تلاش اسکی زندگی کا مقصد رہے۔

ہر زمانہ میں قوموں کی نافرمانی۔شر و فساد۔اور حقیقت سے دوری کے وقت ایک ایک پیغمبر آتا رہا۔اور ہر پیغمبر اپنی قوم کے عیوب کے مطابق ایک شریعت پیش کرتا رہا۔یہاں تک کہ زمانہ اس مقام پر پہنچا جہاں تمام انسانیت ایک عالمگیر جہالت و انحراف میں غرق ہوگئی۔اس میں شک نہیں۔کہ ہر بار انسان حقیقت سے علیحدہ ہو کر دنیوی ایجادات میں ترقی کرتا رہا۔جسقدر دنیوی خواہشات و ایجادات میں ترقی ہوتی گئی اسی قدر انسان انحراف میں بھی شدید ہوتا گیا۔اور وہ بھی زمانہ آیا جب انسان حصول دولت اور باطل حکمرانی میں باطل قوتوں کو عروج پر لایا۔اور یہی زمانہ عالمگیر تاریکی اور انحراف کا تھا۔یہ زمانہ اپنے شر و فساد اور انحراف کے لحاظ سے آخری اور انتہائی مقام پر پہنچا ہوا تھا۔ایسے وقت پر بھی ایک ایسے پیغمبر کی ضرورت تھی جو ایک عالمگیر شریعت کا حامل ہو۔وہ شریعت قرآن کی شریعت تھی اور وہ حامل حضرت محمد رسول اللہؐ ہی تھے۔اور قرآن ہی وہ مواد پیش کرسکتا ہے۔جو عالمگیر حیثیت میں انسان کی راہنمائی کرسکتا ہے۔چنانچہ قرآن اپنے ابتدائی باب میں اسکا حوالہ پیش کرتا ہے۔الٓمّٓ ۚ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۱ تا ۳) یہ کتاب کلام الٰہی ہے۔اس کے کلام الٰہی ہونے میں شک نہیں۔یہ ہدایت کرتی ہے۔ان پرہیزگاروں کو جو اللہ

اور اسکے ماوراء ادراک ماحول پر بلا تحقیق (صرف پیغمبر کی شہادت پر) ایمان لاتے ہیں اور قائم کرتے ہیں عبادت (نماز)۔

یہ چیز ثابت ہو چکی ہے۔ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اللہ کا کلام انسانی فلاح کیلئے نازل ہوتا ہے۔ اسکی ضرورت اسوقت ہوتی ہے جب انسان اپنے نصب العین کا احساس کرے۔ اور پھر اپنے ادراک سے باہر کی ہر شے کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ کلام الٰہی کی طرف رجوع کرنے سے ہر شے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

یہ بات انسان کیلئے لازمی ہے۔ کہ وہ اپنے ہوش وحواس کے سنبھالتے ہی اپنی بناوٹ اور کائنات کی بناوٹ پر نظر ڈالے کہ اس کائنات کے بنانے کا کیا مقصد ہے۔ اور کس نے بنائی ہے۔ ابتداء میں انسان ہر شے کی حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ انسان کی ان لطیف (روحانی) قوتوں پر جو وہ اپنے ساتھ پیدائشی طور لاتا ہے۔ مادیت کا ملمع چڑھ جاتا ہے ـــــ انسان خود اشرف المخلوقات ہوتا ہے۔ اس میں اسکی پیدائش کے ساتھ ہی وہ روح بھی ہوتی ہے۔ جو ماوراٗ ادراک کیفیات کو محسوس کر سکتی ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے اسکا وجود لطیف ہوتا ہے۔ اس میں مادی قوتوں کا زیادہ اثر نہیں ہوتا ہے۔ لیکن پیدائش کے بعد اسکی نشوونما (وجود کی ترقی) مادی غذاؤں سے ہوتی ہے۔ اسلئے مادیت کا اثر زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ اپنی ابتدائی قوت کے مطابق ادراک نہیں کر سکتا۔ اس سے پیشتر بچپن کی عمر میں اسکا تعقل مستقل ہیئت میں نہیں ہوتا ہے۔ اسلئے اسکی روحانی کیفیت کا اسے اندازہ نہیں ہوتا ہے۔ انسان کو بچپن میں اگرچہ روحانی کیفیتوں کا مشاہدہ ہوتا بھی ہے۔ لیکن تعقل کی عدم صلاحیت کی وجہ سے۔ نہ یہ خود محسوس کرتا ہے۔ نہ دوسرا ہی اسکے تاثرات کا اندازہ کر سکتا ہے اور یہ تاثر۔ مشاہدات سن بلوغت تک پہنچنے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ مدہم پڑ جاتے ہیں۔ اور یہ واقعات حافظہ کی عدم تکمیل کی وجہ سے جمع نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ انسان اپنی سابقہ زندگی کے ظاہری باطنی واقعات سے بے خبر رہتا ہے۔ اور اسی عدم صلاحیت کے باعث جبکہ انسان اپنے تعقل کے ذریعہ اپنے ارادہ پر قادر نہیں ہوتا۔ وہ

کسی نیک و بد معاملہ کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جاتا۔ انسانی قوائے عقل مکمل ہونے کی معیاد ہی اسکا سن بلوغ کہلاتا ہے۔ اسکے بعد انسان ہر حالت میں اپنے ہر فعل کا ذمہ دار گردانا جاتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ بعض لوگ اپنے سنِ بلوغ پر پہنچنے کے بعد بھی فکر (سمجھ) کا مادہ نہیں رکھتے۔ اسکی وجہ اسکے پیدائشی مواد (نطفہ) کی کمزوری ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک شعور اور روح کا انسان سے تعلق ہے۔ یہ چیز ابتدأ میں ہی مستقل ہوتی ہے۔ اسلئے آئندہ مشاہدہ اور واقعات کی پرکھ انہیں قوتوں کے ذریعہ ہوتی ہے تعقل صرف ان قوأ کے ذریعہ آگاہ ہوتا ہے۔ اسلئے روحانی قوتوں کے اعتبار سے ہر انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ شعور اور روح انسانی وجود میں خصوصی قوتیں ہیں جو مادی اور غیر مادی اشیأ کا ابتدأ سے آخر تک یکساں طور پر مشاہدہ کرسکتی ہیں۔ اسی طرح جب انسان کی قوت تعقل (علم سے آگاہ ہونے کی قوت) اسکے سنِ بلوغ پر مکمل ہو جاتی ہے۔ تو اس پر فطرت کی طرف سے کائنات اور اپنی ذات پر تفکر اور نتیجہ کے طور پر تلاش حقیقت اور عرفان (پہچان) کی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔

فطرت کا یہ قانون ہے۔ کہ ہر انسان ایک ہی قانون فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اسوقت اسکا مذہب۔ اسکا دین۔ فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اسکی پیدائش کسی یہودی۔ کسی عیسائی۔ کسی پارسی۔ یا منکر دین کے گھر میں ہی کیوں نہ ہو۔ وہ فطری قانون کے مطابق۔ ایک اشرف المخلوقات انسان پیدا ہوتا ہے۔ اور تعقل کی تکمیل کے بعد انسان اپنے والدین کا دین اختیار کر لیتا ہے۔ یا اگر اسمیں فکر کا مادہ ہوتو وہ غور و تحقیق کے بعد کسی دوسرے دین کو اختیار کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک عیسائی نوزائید بچہ کو کسی بدھ مذہب کے گھرانے میں چھوڑا جائے۔ تو لازمی طور پر وہ ماحول کے اثر سے بدھ مذہب اختیار کریگا۔ اسکے بعد اسکے علم میں جسقدر وسعت ہوگی۔ وہ اپنے مذہب کی تحقیق کر کے اسی دین کی طرف رجوع کریگا جو اسکے علم میں افضل ثابت ہو۔ ان دونوں صورتوں کے علاوہ اگر وہ کسی مذہب کا قائل نہ رہے تو کسی مذہب کو تسلیم نہ کریگا۔ لیکن انسان بغیر مقصد کے رہ نہیں سکتا۔ اسلئے لازمی طور اس نے کوئی سمت (کوئی عقیدہ یا نظریہ) ضرور اختیار کرنی

ہے۔اگر وہ مذہب سے باہر رہ کر بغیر کسی مقصد کے زندگی گزار دے تو یہ طرز زندگی بھی ایک خود ساختہ مذہب کی شکل اختیار کریگی انسان اپنی ذاتی قابلیت پر بغیر کسی راہنمائی کے اپنی زندگی کو چلا نہیں سکتا۔اگر وہ بغیر علم اپنی ذہن کی آواز پر ہی چلے تو اس صورت میں بھی جو مواد اسکے ذہن سے نکلے۔وہ بھی کسی مذہب کا پیش کردہ علم ہی ہوگا۔بالفرض محال اگر انسان اپنی دانست میں اپنی خود ساختہ راہ پر ہی چلے۔تو وہ بغیر بیرونی علم کی امداد کے ایک بے معنی اور بے نتیجہ راہ ہوگی جسکا انجام بھی گمراہ کن ہوگا۔

انسان کیلئے یہ لازمۂ فطرت (ضروری) ہے۔کہ وہ کائنات کی تخلیق (پیدائش) پر تفکر کرے۔اسلئے اسکے لئے لازم ہے۔کہ وہ کسی دین سے جو اس سے پیشتر قائم ہو چکا ہو اسکی تعلیم کی طرف رجوع کرے۔کائنات کی تخلیق میں سب سے پہلے جو سوال انسانی ذہن میں پیدا ہونا چاہیے۔وہ یہی ہے۔کہ اسکا بنانے والا کون ہے۔کیونکہ کسی چیز کے موجود ہونے کی دلیل ہی یہ ہے۔کہ اسکا کوئی خالق ہو۔اور یہ چیز اپنے ابتدائی تفکر میں پا نہیں سکتا۔لازمی طور اسکا ذہن اس خیال سے خالی نہیں رہ سکتا کہ ہر شے کے وجود کے لئے اسکا ایک خالق ضرور ہے۔اسلئے رجوع کرنے سے پیشتر یہ اسکے ذاتی کردار پر منحصر ہے۔کہ وہ کسی خالق کو تسلیم کرے۔یا کائنات کو خود ساختہ اور بے معنی سمجھکر اسکے خالق سے انکار کر دے۔ان ہر دو نظریات وعقائد کے الگ الگ نتائج ہونگے۔یعنی اگر ابتداءً کسی خالق ہستی کو تسلیم کرتے ہوئے تفکر میں جستجو کرے۔تو اسکے لئے ضروری ہے۔کہ وہ کائنات خلقت کے جملہ اوصاف کے مطابق ہی اُسے (خالق کو) کائنات کے جملہ اوصاف کا بدرجہ اتم حامل سمجھکر ہی اُسے اُسکی خالقیت کے اعتبار سے تسلیم کریگا۔اس حالت میں انسان کسی افضل تعلیم سے ہی تفکر کی جستجو کریگا ـــ دوسری صورت میں کسی خالق کے تصور کے بغیر اسکے پاس مادیت سے عروج کی طرف جانے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔باوجود نیک طبیعت ہونے کے بھی اسکا عقیدہ اور نظریہ غیر فطری ہوگا۔اسکا نتیجہ لازمی یہی ہوگا۔کہ جب اسکے ذہن میں کسی روحانی قوت کا تصور ہی نہ ہو۔تو اسکا تصور مادیت سے ملوث ہوگا۔اور آخر وہ دنیا طلبی کی طرف

مائل ہو کر ایک دن نفس پرستی اور انحراف کی طرف مائل ہوگا۔ خلوص نیت سے اگر اس امر پر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ دنیا کی وہ قومیں جنہوں نے خالق کائنات کے تصور سے خالی ہو کر تفکر کیا۔ اگرچہ انہوں نے دنیوی کیفیات کی تحقیق میں تعجب خیز ایجادات اور ترقی کر کے انتہائی عروج حاصل کیا۔ لیکن انکا عروج غیر فطری ثابت ہوا۔ ایک تو وہ ہر ایجاد اور تحقیق کے انجام پر خالق کے تصور سے بہت دور ہو گئے۔ اور دوسرے انسان دنیوی جاہ وجلال حاصل کرنے میں نفس پرست۔ جاہ طلب۔ اور ہوس پرست ہو گیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہر قوم "زیادہ خواہش۔ زیادہ طلب" کی فکر میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو گئی۔ اور دنیا کی تمام خوفناک اور خونریز جنگیں اسی نظریہ اور اسی مادہ کا نتیجہ ہیں۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے۔ کہ وہ قومیں جو فی زمانہ خالق کو تسلیم کرنے والی ہیں۔ وہ بھی تو دنیا میں پست اور ذلیل ہیں۔ انکا کردار بھی انسانیت کے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس اعتراض سے پیشتر یہ اندازہ کرنا ضروری ہے۔ کہ جو قومیں خالق کو تسلیم کر رہی ہیں۔ کیا وہ فطرت کے قانون۔ یا کسی دین کی پابند ہیں؟

تو اسکی مثال سے یہ خود اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ فی الحقیقت۔ جب تک خالق کو تسلیم کرنے کے ساتھ اسکے قانون (کلام الٰہی) کی پوری پوری تعمیل نہ کی جائے انسان اپنے مقصد کو مکمل طور پر حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہر زمانہ میں پیغمبر ایک دین (کلام الٰہی) کا دعویدار ہوا۔ پیغمبر نے بڑی بڑی طاغوتی قوتوں کے مقابلہ میں ادنیٰ حیثیت سے مقابلہ کیا۔ بالآخر پیغمبر کا دین زمانہ پر غالب ہوا۔ غالب آنے سے مراد یہ نہیں کہ کائنات پر اسکی مادی قوتوں سے غالب آ کر اس پر حکومت کی جائے۔ نہیں بلکہ زمانہ سے شر وفساد دور ہو کر ایک صالح ماحول پیدا ہو۔ اور اس صالح ماحول میں ایک طرف انسان حقیقت کے نزدیک ہو جائے۔ دوسری طرف دنیا کی امارت اس انداز سے حاصل ہو کہ کائنات کی ہر شے انسان کیلئے نفع بخش ثابت ہو۔ اور ہر انسان کو اطمینان و راحت حاصل ہو۔ دین کے غالب ہونے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ انسان ایک ایسی قوت کو اپنا حاکم تصور کرتا ہے جسکی قوت ہر حال میں کائنات اور انسان پر غالب ہو۔ اس عقیدہ کا اثر انسان پر

یہ ہوتا ہے۔ کہ انسان ہر اس فعل سے جو غیر فطری ہو احتراز کرتا ہے۔ غیر فطری افعال کے ترک کرنے سے انسان میں بجائے نفس پرستی اور ناجائز حصول کے انسانیت سے ہمدردی اور حقیقت سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی اثر انسان کو مقصد حقیقی کی طرف رجوع کرنے کیلئے معاون ثابت ہوتا ہے۔ انسان جب کسی حاکم کے قانون سے احتراز کرتا ہے۔ تو اسے کسی جرم کے ارتکاب میں حاکم کی سزا کا خوف جرم کرنے میں حائل نہیں ہوتا۔ اور انسان بے خوفی سے ہر جرم کا عادی ہو جاتا ہے۔ جب کسی سزا کا ڈر دل میں محسوس نہ ہو تو انسان زیادہ تر جرائم کی طرف مائل ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کی سفلی (مادی) خاصیت کا تقاضا ہے کہ وہ اسے تنزل کی طرف مائل کر لیتی ہے۔ برعکس اسکے کسی زبردست حاکم کے قانون کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ یا کسی غالب حکمران کا قانون انسان کو جرائم سے باز رہنے کی تحریک دیتا ہے۔ یہی کیفیت دین الٰہی کے تسلیم کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کی ہر تعلیم خواہ ظاہری کیفیات سے متعلق ہو (یعنی دنیوی امور کی اصلاح ہو) یا روحانی تعلیم ہو اسکے ہر حکم میں انسانی فلاح اور عروج کا مواد موجود ہے۔ چنانچہ قرآن کے ابتدائی باب میں اسی تعلیم کا اشارہ دیا گیا ہے۔ الٓمّٓ ۚ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۱ تا ۳)۔ یہ کتاب۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طالب کو اپنے مطلوب تک پہنچاتی ہے۔ وہ طالب حقیقت وہ ہے۔ جو اللہ کو ایمان بالغیب کے ساتھ تسلیم کر کے اسے اپنا خالق و مقصود سمجھکر اسکے قانون کو تسلیم کر کے اسکے احکام کی تابعداری کرتا ہے۔

کلام الٰہی کا روئے سخن بھی اس شخص کی طرف ہوتا ہے۔ جو کسی قانون کے تحت تفکر اور تلاش حقیقت کی جستجو کرے اسلیئے قرآن کا بھی ایک مخصوص اندازِ بیان ہے۔ کہ قرآن ایک عالمگیر شریعت کا حامل ہے۔ یہ کسی خاص قوم کیلئے نہیں۔ بلکہ ہر انسان کیلئے ہے۔ صرف شرط یہ ہے۔ کہ انسان اپنے نصب العین کا احساس کرے۔ احساس کیسے ہوسکتا ہے؟ ۔۔۔ وہ اسطرح کہ انسان اپنی روزمرہ زندگی میں اپنے اعمال کا محاسبہ کرے۔ کہ آیا وہ کہاں تک فطرت کے قانون کے ساتھ

مطابقت کرتا ہے یعنی انسان اپنے ماضی و مستقبل کے انجام کا احساس کرے۔کہ میری تخلیق (پیدائش) کیوں ہے۔کس لئے ہے؟ میری زندگی کے عمل کا کیا انجام ہوگا۔وہ یہ جان لے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں۔اسکا ایک نتیجہ ضرور ہے۔اور اس نتیجہ کا اثر صرف میری ہی ذات سے وابستہ ہے۔ اگر میرا عمل قانون فطرت کے عین مطابق ہے۔تو میں اپنی زندگی (حال و مستقبل) میں راحت و اطمینان حاصل کرونگا۔ برعکس اسکے اگر میرا عمل قانون فطرت کے مطابق نہیں۔تو میرا انجام تنزل کی طرف ہوگا۔اور یہ تنزل صرف تنزل نہیں۔ بلکہ ایک وہ کیفیت ہوگی جو میرے لئے دائمی تکلیف وعذاب کا باعث ہوگی۔اگر انسان خلوص نیت اور عقلمندی سے اس بات پر غور کرے۔تو لازمی طور اُسے اپنی آئندہ مستقبل کی گھناؤنی زندگی کا احساس ہوگا تو اس احساس کے ساتھ ہی اسے اپنے انجام اور تکلیف دہ زندگی پر خوف طاری ہوگا۔یہی مطلب متقین کا ہے۔خوف طاری ہونے پر انسان ہر غیر فطری عمل سے پرہیز کریگا۔یہ پرہیز بھی تقویٰ کہلاتا ہے۔جب انسان برائی سے پرہیز کا خوگر ہو جاتا ہے۔تو اسے کسی ایسی راہ ایسے مقام کی تلاش ہوتی ہے۔جس راہ پر انسان چل کر فطرت کے قانون کا پابند ہو جاتا ہے۔یہ قانون ایک الٰہی دین ہوتا ہے۔الٰہی دین ایک طرف انسان کے اعمال کی اصلاح کرتا ہے۔دوسری طرف اس راہ کی سمت حقیقت کی طرف ہوتی ہے۔ تو انسان حقیقت (مقام) سے نزدیک ہوتا جاتا ہے۔یعنی اسی خوف کے ذریعہ انسان دراصل اپنے نصب العین کی طرف رجوع کرتا ہے۔اور یہی خوف اسے اپنے مطلب اور مقصد حقیقی تک پہنچنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔اسلئے قرآن نے بغیر کسی قومی تخصیص کے ہر انسان (خواہ وہ کسی سابقہ دین سے تعلق رکھتا ہو یا بذات خود فطرت کا باغی ہو) کیلئے اپنی ہدایت کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ ھـــدیٰ کے معنی طالب کو اپنے مطلب (مقصد حقیقی) تک پہنچانا ہے۔ایسا شخص جب خوف کے ذریعہ۔پرہیز کرے اور قرآن کے علم کی طرف رجوع کرے تو اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے مقصد کو پالیگا۔اور کلام الٰہی میں وہ تمام مواد موجود ہے۔جس سے ایک مفکر۔اپنے مقصد تک پہنچ سکتا ہے۔البتہ خوف کی شرائط پوری کی جائیں۔وہ شرائط کیا ہیں؟ وہ یہ کہ اس کائنات کے نظام کو بے

معنی نہ سمجھے۔ بلکہ کسی خالق کی تخلیق ہی سمجھے۔ کسی خالق کی تخلیق بے معنی نہ ہوگی بلکہ اسکا ضرور کچھ مطلب ہے وہ یہ کہ اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ○ (پارہ ۱۸ سورۃ ۲۳ آیت ۱۱۵) کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تمہاری پیدائش بے معنی ہے۔ (یعنی ہم نے تمہیں بے معنی بغیر مطلب کے پیدا کیا؟) اور تم نے میری طرف رجوع نہیں کرنا ہے؟ نہیں بلکہ تمہاری زندگی کا ایک مقصد ہے۔ وہ کائنات اور اپنی ذات پر تفکر کر کے مجھ تک پہنچنا ہے! اسلئے ضروری ہے۔ کہ جب تک تمہیں مشاہدہ کی قوت حاصل نہ ہو تم اسے اور اسکے قانون کو بغیر مشاہدہ تسلیم کرو خوف کے بعد اسکی حکمرانی کا احساس کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ کائنات کی تحقیق و تفکر کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اسے کائنات کی جملہ صفات کا بدرجہ اتم علت سمجھا جائے۔ اور وہ بدرجہ اتم علت۔ ایک لامحدود ہیئت کے تصور میں پائی جائیگی۔ لامحدود علت کا ہونا ہی اسکے خالق و حکمران ہونے کی دلیل ہوسکتی ہے۔ اسلئے خوف کے ساتھ اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ ضروری شرط ہے۔ اس آیت کے تسلیم کے تحت پھر ایک حکمران کے حکم (کلام الٰہی۔ قانون خداوندی کی مطابقت یعنی شریعت الٰہی) کی پابندی وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ عبادت کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے یہی وہ قانون الٰہی ہے۔ جو ایک خالق نے قرآن کے ذریعہ انسان کی فلاح و سعادت اور مقصد زندگی حاصل کرنے کا ذریعہ بتایا ہے۔

قرآن کا وہ مکمل قانون جس سے انسان اپنی شرافت کو حاصل کرسکتا ہے۔ الصلوٰۃ میں ہی پایا جاتا ہے۔ قرآن کا قانون جسے دین الٰہی یا دین اسلام کہا جاتا ہے۔ اَلصَّلٰوۃ ہی ہے۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ قف (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ۱۹) یعنی اللہ کے نزدیک دین۔ فرمانبرداری ہے۔ اسلام کے معنی فرمانبرداری۔ عاجزی۔ محکومی۔ غلامی ہے۔ انہیں صفات کا حامل۔ عبد کہلاتا ہے جو شخص۔ اپنی زندگی کے انجام کا احساس کرتے ہوئے۔ حقیقت کی طرف رجوع کرے۔ اسکے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ وہ ایک صحیح راہ حاصل کرنے کیلئے عبد (بندہ) کہلائے۔ جسکا اظہار الصَّلٰوۃ سے کیا جاتا ہے۔ الصلوٰۃ کوئی رسمی عقیدہ نہیں بلکہ ایک عالمگیر اصلاحی عمل ہے۔ جو ایک صالح ماحول۔ انسانی امراض کا دفیعہ۔ تزکیہ۔ اور عرفان الٰہی کا ذریعہ ہے۔

علت لامحدود سے لیکر مادّہ کی اسفل ترین (کمتر) قوت ایک ماحول کی صورت میں قائم ہے۔ ہر ماحول میں مختلف قسم کی زندگیاں پائی جاتی ہیں۔ جہاں پر لطیف قوتوں کا تعلق ہے۔ وہاں روحانی زندگیاں واقع ہیں۔ جہاں مادی ماحول واقع ہے۔ وہاں پر مادی زندگیاں پائی جاتی ہیں۔ ہر زندگی اپنے ماحول میں اپنی ہیئت کے مطابق قوی غلبہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ دلدل کے زہریلے جراثیم میں جب کوئی بیرونی جرثومہ داخل ہوتا ہے۔ تو وہ دلدل کے جراثیم سے متاثر ہوکر انہیں دلدلی جراثیم کی ہیئت میں جذب ہو جاتا ہے۔ یہ بیرونی جرثومہ اس ماحول اور اسکے جراثیم کے غلبہ کی تاب نہ لاکر فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک ذرہ سورج کے ذرات میں داخل ہو جائے۔ تو شمسی ذرات اس پر حملہ آور ہوکر ہلاک کرڈالتے ہیں۔ اور یہ بیرونی ذرہ اپنی ہیئت کھوکر شمسی ذرات میں جذب ہو جاتا ہے۔ مٹی کے ذرات میں جب انسانی یا کسی دوسری مخلوق کو دفن کیا جاتا ہے۔ تو یہ جماداتی (مٹی کے) ذرات ان کے تمام اجزاء (ذرات) کو اپنے میں جذب کردیتے ہیں۔ اسی طرح اس مادی دنیا سے بالاتر قوت (نورانی ماحول) میں اگر کسی لطیف زندگی کی لطافت اسے اس ماحول تک پہنچا سکے۔ تو یہ لطیف زندگی اگر کمتر حالت میں ہو تو ماحول اسے اپنی کیفیت میں جذب کرڈالیگا اور ہر شے کسی غالب ماحول میں داخل ہوکر اپنی ہیئت کھوکر ماحول کی کیفیت میں جذب ہو جائیگا۔ گویا یہ ایک فطری نظام ہے کہ ہر غالب قوت کا اثر کمتر مخلوق پر طاری ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری اقتصادی۔ تمدنی۔ زندگی میں بھی یہ طریق جاری ہے کہ جہاں ایک نظریہ کے لوگوں پر کسی غالب قوت کا غلبہ ہو جائے۔ تو غالب قوت کا نظریہ کمتر قوت کے لوگوں میں اثر کر جاتا ہے مثال کے طور پر اگر کسی ملک پر کسی جابر حکومت کا غلبہ ہو۔ تو حکمران طبقہ کا نظریہ اکثر عوام قبول کر لیتے ہیں۔ ہندوستان میں مغلوں کے عہد میں اسلامی نظریہ (خواہ وہ کسی قسم کا تھا) ہندو اقوام پر غالب آ گیا۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت بڑھتی گئی۔ اسوقت تک مسلمانوں میں دینی تعلیم کا اثر رہا۔ اسوقت مسلمانوں کے عقیدہ میں دینی تعلیم قرآن وحدیث کا درس لازمی سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ اسوقت دوسری تعلیم کا کوئی اثر نہ تھا اسلئے کوئی مسلمان ہندی وغیرہ

کی تعلیم پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ ہندو۔ پنڈت بھی اس زمانہ میں عربی۔ فارسی کے عالم ہوتے تھے۔ ہندومت کے زمانہ میں سنسکرت وغیرہ حکمران طبقہ کی تعلیمات میں شامل تھی۔ ہر شخص پر اسی تعلیم کا اثر تھا۔ لیکن بدھ کے زمانہ میں۔ بدھ چونکہ سنسکرت کا مخالف تھا اسلیئے بدھ نے اپنے اقتدار پر پالی زبان میں اپنے ایجاد کردہ عقائد اور نظریات کو جاری کر دیا۔

ہندوستان میں مغلوں کے بعد انگریز کا غلبہ ہوا ___ تو انہوں نے سب سے پہلا قدم ہندوستانی ماحول بگاڑنے پر اٹھایا اور انگریزی تعلیم کو جاری کر کے ہندو مسلمانوں کی تہذیب کو فنا کر دیا۔ اسی غلبہ کا یہ اثر ہے۔ کہ ہندو اور مسلمان کا آج اپنی مذہبی تعلیمات پر عقیدہ جمتا ہی نہیں۔ یہ تو ایک مادی ذریعہ ہے۔ جس میں حکمران قوت کو کام میں لایا جاتا ہے۔ یہ عقائد صحیح ہوں یا غلط پھر بھی ایک غالب طاقت کا اثر کمتر قوموں پر پڑتا ہے۔ لیکن جب دنیا پر غلط عقائد کا تسلط ہو۔ تو اسکے لئے ایک ایسے اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اپنے ساتھ خالص اور حقیقی عقائد و نظریات لانے والا ہو۔ خالص اور حقیقی عقائد ہر حال میں باطل کے مقابلہ میں قوی ہوتے ہیں۔ اسلیئے ہر زمانہ میں پیغمبر اور کلام الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ جس سے دنیا میں غلط عقائد و نظریات ختم ہو جاتے ہیں۔

کسی پیغمبر کے آنے پر اقوام کے نظریات و عقائد بگڑے ہوتے ہیں۔ تعلیم الٰہی مفقود ہونے پر اصل ماحول بگڑ کر لادینی ماحول (بوجہ نفس پرستی و انحراف کے) قائم ہو جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہی ہوتی ہے۔ کہ ہر شخص کے مریض جراثیم غلبہ پا کر ہر جراثیم کو اپنے میں جذب کر کے غلبہ حاصل کر لیتے ہیں اور ہر طرف مرض (انحراف و غلط روی) پھیل جاتا ہے۔ یہ سب تنزلی سفلی جراثیم ہوتے ہیں۔ انکی ہلاکت کیلیئے پیغمبر کی روحانی قوت ہی غلبہ پا سکتی ہے۔ بارود اگرچہ مقدار میں زیادہ ہو۔ لیکن آگ کی چنگاری کا ایک ذرہ بارود کی ہیئت تبدیل کر دیتا ہے۔

پیغمبر کا پہلا قدم ماحول تبدیل کرنے کا ہوتا ہے۔ پیغمبر ڈاکٹر کی حیثیت سے دوائی ایجاد کرتا ہے۔ جس سے انسانی امراض کا علاج ہوتا ہے۔ جسے اپنے مرض سے ہلاکت کا احساس ہو وہ ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے۔ (هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ) دوائی انسان کے اندرونی ماحول کو بدلنے والی

ہوتی ہے۔اگر بیمار مرض دق وسل کا مریض ہوتو ڈاکٹر اسکے مدقوق جراثیم کیلئے کیلشیم (چونے) وغیرہ کے جراثیم داخل کرتا ہے۔جن سے انسان کے ذاتی دفاعی جراثیم میں قوت پیدا ہوتی ہے۔اور وہ مریض جراثیم پر آہستہ آہستہ دفاعی صورت میں غلبہ پا کر انہیں جذب کر لیتے ہیں۔اور بیمار صحت مند ہو جاتا ہے۔لیکن بیمار کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے۔کہ اول ڈاکٹر کو تسلیم کرے۔اسکی طرف رجوع کرے۔اسکی دوا استعمال کرے اور سب سے اہم چیز۔ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق اسکے ہر حکم کی تعمیل کرے۔تا کہ کلی صحت حاصل ہو سکے۔ڈاکٹر کا حکم ہوتا ہے۔کہ جن اشیأ سے مدقوق جراثیم کو قوت وغلبہ حاصل ہوا۔انہیں ترک کیا جائے۔تا کہ انمیں غلبہ نہ ہونے پائے۔ڈاکٹر۔دوائی۔پرہیز یہ تینوں کسی شے کی ہیئت تبدیل کرنے میں خصوصی درجہ رکھتے ہیں۔

یہی تعریف۔پیغمبر۔کلام الٰہی۔اور تسلیم کی ہے۔پیغمبر ایک کلام الٰہی (قانون۔شریعت) انسان کی اصلاح اور صالح ماحول پیدا کرنے کیلئے پیش کرتا ہے۔تا کہ سفلی قوت ختم ہو کر ایک روحانی ماحول کا تسلط ہو جائے۔ہمیشہ دیکھنے میں آیا ہے۔کہ پیغمبر ایک ادنیٰ سی حیثیت میں آتا ہے۔چونکہ اس میں نورانیت غالب ہوتی ہے۔اسلئے اسکی ابتدائی تبلیغ پر شیطانی قوتوں میں اپنی ہلاکت کے احساس پر ہیجان بپا ہو جاتا ہے۔اور وہ بھی اپنے دفاع کیلئے پیغمبر کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔مگر نتیجہ یہی ہوتا ہے۔کہ پیغمبر کا ماحول ایک سے دو۔دو سے چار۔لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں جاری ہو جاتا ہے۔

اسلام کا سب سے بڑا انجکشن ماحول کے مطابق ہے۔کہ دنیا میں ہر طرف انحراف۔ظلم فساد کے باعث خالقِ حقیقی سے بے خوفی۔جزا و سزا سے بے خوفی ــــ کسی قانون کی سزا کا ڈر نہیں ہوتا ہے۔انسان بے خوف ہو کر ہر قسم کی برائی کا شکار ہوتا ہے۔اور ایک خدا کا سرے سے باغی ہو کر فطرت کے قانون کی خلاف ورزی کرنے لگ جاتا ہے۔اسلئے اسلام کا پہلا حربہ جراثیم کش۔نہایت وسیع اور واضح ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نہیں کوئی معبود مگر ایک اللہ ضرور ہے۔کائنات خلقت میں کوئی خالق نظر نہیں آتا۔مگر اسکی ایک ابتدائی علت لازمی ہے۔وہی علت! خالق ہو سکتی ہے۔اسلئے علتِ

لامحدود ہونے کی حیثیت سے وہ معبود کہلانے کا مستحق ہے۔انسان غلط روی پر ہے۔اسلئے اسکی تباہی پر فلاح کی طرف رجوع کرنے کیلئے مُحَمَّد" رَسُوْلُ اللّٰهِ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی طرف سے بھیجا ہے۔اور جو قانون محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس ہے۔وہ انسانی فلاح وسعادت کا ضامن ہے۔

قرآن نے انسانی فلاح وبہتری کیلئے ایک ابتدائی قدم اٹھایا ہے۔کہ انسان کے امراض کا سدباب کیا جائے۔جن امراض سے اس نے اپنے آپ کو خود ہلاکت میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَاهُوَ شِفَآ ءٌ" وَّ رَحْمَةٌ" لِّلْمُؤْمِنِيْنَ لا وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝ (پارہ ۱۵ سورۃ ۱۷ آیت ۸۲) اور قرآن میں ہم نے شفاءِ امراضِ ظاہری باطنی اور نعمتِ بے شمار ان لوگوں کیلئے عطا کی جو اپنے مقصد حقیقی کیطرف رجوع کرنے کیلئے۔ایک اللہ اور پیغمبر کے حکم پر تسلیم وتعمیل پر آمادہ ہوتے ہیں (مومنین)۔ظالموں کیلئے جو اپنی نفس پرستی خود غرضی کی بناء پر حقیقت سے انکار کر کے اپنے خود ساختہ طریق کو ہی بہتر سمجھتے ہیں۔وہ ہر حال میں نقصان میں رہینگے (اگرچہ انہیں دنیا کی دولت اور امارت بھی حاصل ہو)۔

قرآن نے اپنی شریعت میں انسانی اصلاح کیلئے چند خصوصی عقائد پیش کئے ہیں۔یہ عقائد انسانی زندگی کے عین مطابق ہیں۔اور زمانہ کی غلط روی۔انحراف اور ظلم وفساد کے دور میں۔یہ عقائد ابتدائی طور پر انسانی کردار کی اصلاح کیلئے کیمیا کا درجہ رکھتے ہیں۔انسان کے اخلاق و عادات اور کردار بدلنے کیلئے سب سے پہلے عقائد کی اصلاح ضروری ہے۔ان عقائد کو تسلیم کرنے سے انسان ہر حال میں ایک روحانی سپرٹ کا حامل ہوگا۔وہ عقائد ابتدائی پانچ ہیں:۔

(۱) خالق کائنات اللہ کو تسلیم کرنا۔(ایمان بالغیب کے ساتھ) اللہ کی ہستی ماورأ ادراک ہے اسلئے اسکے تسلیم کیلئے قبل از وقت تحقیق ناممکن ہے۔

(۲) مادیت کی مسلسل علتوں (Maters) کو جہاں وہ علتیں اپنی قوی تابانی (روشن۔نورانی) ماحول اور پیکروں (جسموں) میں پائی جاتی ہیں جنہیں ملٰئِکہ فرشتے کہا جاتا ہیں۔تسلیم اللہ کے ساتھ اسکے ماحول نورانی جسمیں کیفیت نوری اور مخلوق نوری واقع ہے۔لازمی طور یقین کرنا پڑتا

ہے۔ورنہ تسلیم اللہ ادھورارہ جاتا ہے۔

(۳) مادہ سے لیکر علت در علت۔علت لامحدود (اللّٰــــہ) تک تحقیق کے ساتھ پہنچنے کیلئے ایک علم حاصل کرنے کا ارادہ علم الٰہی کی طرف رجوع کرنا (قرآن) کلام الٰہی۔اللہ کا تسلیم۔اور اسکے ماحول کے تسلیم کے بعد ضروری ہے کہ اسکے عرفان کا ارادہ کیا جائے تو اسکے لئے ایک علم کو تسلیم کرنا لازمی ہے۔ورنہ مندرجہ بالا دونوں صورتیں ادھوری رہینگی۔

(۴) اس ہستی کو جو تمام مذاہب کے حقیقی ہونے کے لئے بجائے خود ایک دلیل ہوتی ہے۔جس کی صداقت پر۔اللہ۔ملائکہ۔قرآن۔یعنی دین کے سچے ہونے کا دارومدار ہوتا ہے (رسول) پیغمبر پر ایمان لانا۔

(۵) اپنے ہر فعل کے نیک و بد۔اچھے برے انجام پر ایک نتیجہ کا احساس کرنا۔اور ہر فعل کی پاداش کو جزاوسزا کی صورت میں پانے کے وقت کا احساس کرنا۔جس سے انسان میں قوانین فطرت کی مطابقت کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔اس کیفیت کو قیامت کے نام سے تعبیر دیا گیا ہے۔یہ عقیدہ سب سے مقدم ہے۔یہی عقیدہ انسان کو حقیقت کی طرف رجوع کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ اگر یہ تحریک انسان میں پیدا نہ کی جائے تو اسکی اصلاح کا کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا ہے۔ایسی صورت میں انسان۔نہ خدا کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتا۔نہ ہی پیغمبر کی طرف رجوع کرتا ہے۔نہ قرآن و شریعت کی پابندی اپنے اوپر عائد کرتا ہے۔

یہی وہ اصول ہیں جو انسان اپنے ابتدائی اقدام میں قبول کرنے سے ایک شریعت ایک راہ کا پابند ہوسکتا ہے۔ان اصولوں میں جو Terms شرائط رکھی گئی ہیں۔ان پر کلی طور عمل پیرا ہونے کے بغیر کسی طرح بھی انسان۔نہ حقیقت کو پاسکتا ہے۔نہ ہی وہ بہتر زندگی حاصل کرسکتا ہے۔اسلئے لازمی ہے۔کہ انہیں بنیادوں پر اپنے تحقیق کی عمارت کھڑی کی جائے۔اگر ان اصولوں کے ماسوائے۔کسی بھی طریق کو اختیار کیا گیا۔تو اُن بنیادوں کی عمارت نامکمل رہ جائیگی۔ اور ایسی عمارت کو کسی وقت تباہ ہونے کا احتمال رہیگا۔کیونکہ حقیقی قانون ہر حال میں قائم رہ سکتا

ہے۔اور خودساختہ قانون ماحول کے ساتھ اپنی خامیوں کے باعث بدلتا رہتا ہے۔

خشتِ اول گر نہند معمار کج تا ثریا میرود دیوار کج

اب ہم ان پانچ عقائد پر تفصیلی بحث کرینگے تا کہ ان اصولوں کے ذہن نشین کرنے میں کوئی خامی یا کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی جائے۔

یہ دلائل اگرچہ قرآنی ہیں لیکن یہ استدلال قوانین فطرت (کائنات) کے ساتھ مطابقت کرتے ہیں:۔

(۱) اللہ: اللہ کا تسلیم۔دورِ جدید کی چند صدیاں گزری ہیں۔کہ یورپ کی قدیم قوموں میں سے محققین پیدا ہونے لگے۔جنہوں نے سائنس کے ذریعہ کائنات کی اشیأ کا مشینی آلات کی مدد سے تجزیہ کرنا شروع کیا۔یہ تحقیق کسی رنگ میں ہی ہو۔انکے مشاہدات قابل تسلیم ہیں۔کیونکہ انکے مشاہدات اپنے ساتھ ایک ظاہری دلیل پیش کرتے ہیں۔مثال کے طور پر ''آنکھ کا دیکھنا'' ــــ لوگ کہتے ہیں۔آنکھ دیکھتی ہے! مگر اسکے دیکھنے کی ترکیب معلوم نہیں۔محقق آنکھ اور آنکھ کے ملحقہ معاون کا کھوج لگا کر ایک منظم ترکیب کا اظہار کرتا ہے۔کہ فضا میں ایسے ذرات موجود ہیں۔جو کسی شے کی ماہیت کو آنکھ کے بیرونی حصہ (Eye Ball) پتلی تک پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ان ذرات کا دوربینی آلات کے ذریعہ مشاہدہ کیا جا چکا ہے۔جس کا یقینی ہونا سو فیصدی ہو چکا ہے۔ اسکے ساتھ آنکھ کی ہر رگ وریشہ کے تار پود بکھیر کر ہر جز سے آگاہی کر چکے ہیں۔اور اسکے ملحقہ معاون (Retina)[۱] اور دماغ کا وہ حصہ ــــ (Area Of Sight)[۲] حصہ بصارت جو بالآخر آنکھ کی دیکھی چیز کا وجودی صورت میں مکمل عکس حاصل کرتا ہے۔تحقیق میں ثابت کئے گئے ہیں۔گویا یہ بصارت آنکھ کی کوئی اندرونی شے نہیں بلکہ فضائی ذرات اور انسان کے اندرونی

---

[۱] یہ اعصاب انسان کی آنکھ کے پیچھے ایک پردہ کی شکل میں ہوتا ہے۔جس پر بیرونی شے کا عکس دونوں آنکھوں کے راستہ الٹا پڑتا ہے۔[۲] یہ دماغ کا ایک حصہ ہے۔جو سر کے پچھلی طرف گردن کے ساتھ ہوتا ہے۔اس پر Retina۔ سے سیدھا عکس پڑتا ہے۔

اعصاب (بصری نظام) ملکر ایک شے کی ہیئت کو پا لیتے ہیں۔ لہذا محقق کی اس تحقیق سے کسی کو انکار یا عدم تسلیم نہیں ہوسکتا ہے۔

دوسرا تجربہ۔ ایک پودا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ خدا کی قدرت سے پیدا ہوا۔ مگر اسکی ترکیب سے محض نا آشنا ہیں۔ محقق اس پودے کا تجزیہ کر کے بتاتا ہے۔ کہ اس پودے کی ابتداً۔ زمینی ذرات کے وجود سے ہوتی ہے۔ یعنی جب ایک دانہ زمین میں داخل ہوتا ہے۔ تو زمین کی حرارت سے پھٹ کر ایک کونپل کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اسکی جڑ کا حصہ زمین کے اندر اپنی نشو ونما کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اور اسکی طرف ایک قطار کی مانند ذرات[1] آ جاتے ہیں۔ اور انکا سلسلہ لگاتار چلا جاتا ہے۔ جوں جوں یہ ذرات پودے کی جڑوں کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ سخت ہو کر جڑ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور جو مواد ان ذرات میں ہوتا ہے۔ وہی مواد پودے کی غذا بن جاتا ہے۔ یہ تمام کیفیت اٹکل پچو نہیں۔ بلکہ ایک حقیقت ہے۔ جو مشاہدہ میں لائی جا چکی ہے ایسے مشاہدات سے انکار تو نہیں ہوسکتا۔ اب اس کیفیت میں بظاہر خدا کی قدرت یا خدا کے ہاتھ کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ اور یہ حقیقت ہے۔ کہ ایسے مقام پر خدا کا ہاتھ نظر آنا ناممکن ہے۔ جب تک کہ اسکی بنیادی تخلیق تک نہ کھوج لگایا جائے۔ اسلئے عام نظریہ کے مقابلہ میں ایک محقق کا نظریہ عینی

---

[1] اسکا خاکہ اسطرح ہے:

ابتدائی کیفیت

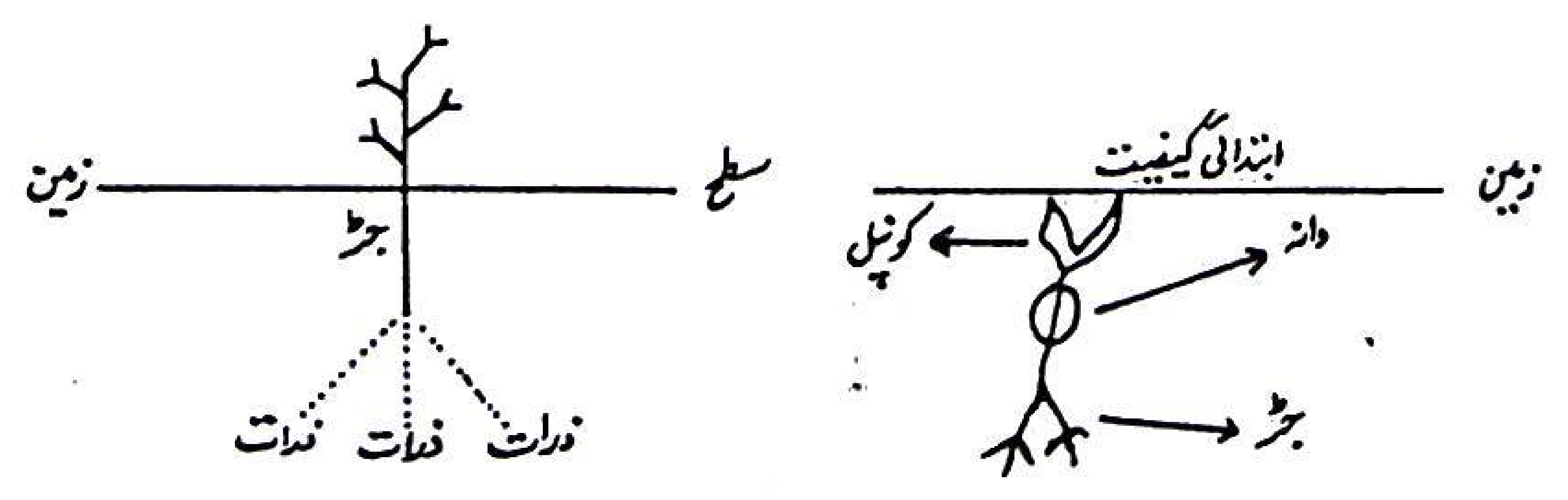

یہ ذرات دراصل زمین میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ زمین کی جماداتی قوت ہے۔ جو ابتداءً ذرات کی شکل میں ہوتے ہیں انہیں ذرات سے درخت مرکب ہوتا ہے۔

مشاہدہ کی بنأ پر پختہ ہے۔ان حالات میں محققین کا یہ عقیدہ ہے۔کہ جب تک کسی شے کو صحیح مشاہدہ میں نہ لایا جائے اسکے وجود کی ترکیب پر کسی غیر مرئی یا کسی نادیدہ قوت کا تسلیم کرنا عبث ہے۔

محققین نے اپنے تجربات کو یہاں تک پہنچایا کہ انہوں نے (اَلْاَرْض) زمین کی تقریباً تمام اشیأ کا مشاہدہ مادی حیثیت میں مکمل کرلیا ہے۔اور عینی صورت میں لایا ہے۔جو انکی سمع و بصر اور دور بینی آلات کی قید میں آچکا ہے۔اسکے علاوہ تجربات کی دوسری نوع (طریقہ) علم الابجد (حساب) کے ذریعہ ہے۔جس پر انہیں محققین نے اپنے سائنسی تجربات کے ساتھ ساتھ عمل کیا۔علم الحساب کی صورت ان اشیأ کی ہے جو اپنی اصلی حالت میں قائم نہیں (یعنی تخلیق آدم سے قبل یا بعد)۔یہ وہ کیفیات ہیں جنکے نقوش انہیں ملے ہیں۔جیسے گزشتہ زمانہ کے کھنڈرات قدیم زمانوں کی تخلیق کے بدلے ہوئے نشانات جسکا اندازہ بجز ابجد کے نہیں ہوسکتا۔جیسے زمین کی کھدائی میں۔کوئلہ۔لوہا۔تانبا۔طویل القامت پنجر (جانوروں۔انسانوں کے ڈھانچے وغیرہ) یہ ایسی چیزیں ہیں جنکی اصلی ہیئت فنا ہو چکی ہے۔لیکن انکی تبدیل شدہ ہیئت انہیں مختلف قسم کی اجزا اور دھاتوں میں پائی جاتی ہے۔اور یہی مبدل ہیئت اپنی اصل کی طرف تحقیق کو تحریک دے رہی ہے۔

یہ وہ نقوش ہیں جنکی اصل سمع و بصر کی قید سے فرار ہو چکی ہیں۔صرف انکے نشان راہ ''دو'' اور ''دو''۔''چار'' کی صورت اپنی اصل کا پتہ دیتے ہیں۔یہ علم بھی ایک حقیقت رکھتا ہے۔ لیکن انکی اصل پہچاننے میں بعض حالات میں دھوکہ بھی لگ سکتا ہے کیونکہ آخر فیصلہ پر انکی اصل ادراک میں نہیں آتی ہے۔اسلئے انکی اصلی ہیئت کے نظریہ میں اختلاف کا احتمال ہوسکتا ہے۔اسی علم سے زمین (اَلْاَرْض) کی ابتدائی تخلیق اور مخلوق کائنات کی ابتدأ اور ترکیب کا تجزیہ کیا گیا ہے۔یہاں تک کہ زمین کی ابتدائی کیفیت اور اس مادّہ کے وجود کا علم جس سے زمین کا وجود ہوا ہے۔علم میں لایا جا چکا ہے۔

علم الابجد کی ایک اور کڑی قیاس ہے۔یعنی جسطرح سائنس (کے تجربات) ہر جز کا ساتھ ساتھ مشاہدہ کراتی ہے۔اسطرح علم الابجد میں متعلقہ اجزا و سلاسل کا مشاہدہ نہیں ہوتا ہے

کیونکہ ہر مبدل نشان کا ابتدائی وجود مستقل نہیں ہوتا ہے۔اسلئے اسکی اساس قیاس پر ہی ہوتی ہے۔ یہ قیاس ایک وجدانی کیفیت ہوتا ہے۔ جو ایک موہوم تصور کی صورت میں ان نقوش کی سابقہ ہیئتوں کا ایک وہمی یا تخیلی مشاہدہ کراتا ہے۔ وہمی۔ اور تخیلی مشاہدہ کا انحصار انسان کے ذہن سے تعلق رکھتا ہے اور یہ ممکن ہے۔ کہ بعض تصورات میں انسان اپنی مادی قوت کے لحاظ سے غلط نقوش وہم اور تخیل میں پیش کرتا ہے۔ اور اسطرح ایک محقق ایک شے کی اصل کیفیت میں مبالغہ کر جاتا ہے۔ یہ علم الابجد کا طریق بہت قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ جس سے۔ منطق اور فلسفہ کی بنیاد پڑی ہے۔ اور اسی منطق اور فلسفہ کو قدیم زمانہ کے مشہور محققین فلاسفہ نے اپنایا ہے۔ جیسے قدیم یونانی اور مغربی فیلسوف نے اپنے وجدانی تصورات کی بناء پر تحقیق کر کے کائنات کا تجزیہ کر کے عقائد پیش کیے ہیں اور مختلف زمانوں کے فلاسفروں اور محققین نے کائنات کے تجزیہ میں جو عقائد پیش کیے ہیں۔ ان میں ہر زمانہ میں اختلاف پایا گیا۔ یہ اختلاف صرف اسلئے ہوا ہے۔ کہ ہر محقق نے اپنی ذہنی قوت اور وجدان کے مطابق ہی ایک موہوم تصور پایا ہے۔ چونکہ ذہنی قوتوں میں کمی بیشی لازمی واقع ہوتی ہے۔ اسلئے انکے وہمی مشاہدات میں بھی اپنی قوت ذہنی کے مطابق اختلاف پایا جانا ضروری تھا۔ البتہ جہاں زمانہ جدید کی سائنسی دنیا کا تعلق ہے۔ ان محققین نے وہمی وجدان کے ساتھ ساتھ عینی مشاہدات کو داخل کر دیا۔ اسلئے انکے تصورات کسی حد تک مستقل صورت اختیار کیے ہوئے ہیں انکی انتہا بھی اسی وہمی وجدان پر منحصر ہے۔ اسلئے انکے بعض مشاہدات میں بھی مبالغہ کا احتمال ہونا یقینی ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے۔ کہ جہاں تک مادی دنیا کا تعلق ہے۔ یہ ان کیفیات کے حاصل کرنے میں حد درجہ کامیاب ہیں۔ اور جہاں ماوراء ادراک کیفیات کیلئے انکے مشاہدات ہیں وہ انکے مادی تجزیہ کے اعتبار سے۔ بوجہ ذہن کی نارسائی کے نامکمل ہو سکتے ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کہ ان محققین کے اکثر مشاہدات مبنی بر صداقت ہیں۔ البتہ جن کیفیات و واقعات میں قیاس کا تعلق ہے۔ انکے مشاہدات کی نوعیت بھی ایمان بالغیب کی سی ہوتی ہے۔ چونکہ محقق کا عقیدہ ایمان بالغیب پر نہیں جمتا اسلئے اسکے موہوم مشاہدات ''ہاں بھی اور نہیں بھی'' کی صورت میں ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ علم الا بجد کی رو سے جہاں ایک شے ایک علت Mater کی محتاج ہے۔وہاں سمع و بصر کی قید سے باہر کی قوتوں کیلئے بھی ایک علت کا ہونا یقینی ہے۔علت و معلول کی نسبت کی رو سے انکے موہوم کیفیت کا وجود بھی یقینی ہو جاتا ہے۔اس وجود کی ایک طرف قیاس اور وہم پر بنیاد ہے۔اسکے ساتھ ہی انکے عینی مشاہدات کا بھی اس سے تعلق ہے۔اور یہ سلسلہ لگا تار چلا ہی جارہا ہے۔تسلسل کی وجہ سے انکا عمل اور تحقیق غیر معقول نہیں۔البتہ ایمان بالغیب کی صورت میں جبکہ انمیں ماورأادراک کیفیات محسوس کرنے کا شعور مکمل نہیں۔اسلئے انکے فیصلہ کن مشاہدات مبالغہ آمیز اور نا قابل تسلیم ہیں جب تک کہ یہ مشاہدات ماورأادراک علم کے ساتھ مطابقت نہ کریں۔

جہاں تک انسانی تحقیقات کا تعلق ہے۔اسمیں کائنات یا کسی مخلوق کا تجزیہ یا مشاہدہ ہو۔ان تمام واقعات کا ماحصل صرف ایک خالق کا ہی پتہ لگانا ہے۔کیونکہ ایک مٹے ہوئے اصل کے نقوش بھی اصل کی تلاش کی تحریک دیتے ہیں اسلئے ہر وجود کی تحقیق اسکی اصل و علت کی ہی تحریک دیتی ہے۔اس نظریہ سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔کہ زمین سے انسان بنا۔اور انسان عورت مرد کے اختلاط سے پیدا ہوتا ہے۔زمین سے بنتا ہے۔زمین سے زندگی حاصل کرتا ہے۔ زمین میں پیوست ہوتا ہے۔غرضیکہ ہر مخلوق کی پیدائش کا یہی تصور ہے۔ایسی حالت میں جب ہم ہر شے کے بنیادی اور ابتدائی علت کا تصور کریں۔تو اللہ اور اسکی خالقیت کا تصور ہماری سمع و بصر کی قید میں آ ہی نہیں سکتا۔البتہ جہاں سائنس۔علم الابجد۔قیاس کی حدیں: ''ہاں یا نہیں'' کی حدوں سے بھی بالاتر ہو جاتی ہیں۔وہاں پر ہی وہ ماورأادراک کی حامل ہستی (پیغمبر) کا مقام ہوتا ہے۔جو قیاس کو ایمان بالغیب کی صورت میں یقینی کر دیتی ہے۔جسکے لئے سوائے کلام الٰہی۔کسی علم۔کسی ابجد۔کسی قیاس کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔کیونکہ انسان ہر لحاظ سے اس مقام پر اپنی پرواز میں عاجز ہوتا ہے۔عاجز اسلئے کہ انسان ابھی تک اپنی مادی طاقتوں سے کسی بھی انتہائی مقام کا پتہ کرنے کیلئے کوئی خاص اور واحد ذریعہ نہ پا سکا۔جب ہی تو قیاس کا دخل ہوتا ہے ــــ اگر انتہا کی تکمیل ہو جائے۔تو اٹل فیصلہ ہو جاتا۔

جہاں سے تخلیق کی ابتدا ہوتی ہے۔ جہاں سے سمع (کان) بصر (آنکھ) اور تعقل کی ابتدا ہے۔ اللہ کے تسلیم کا تعلق بھی اسی ابتدا سے وابستہ ہے۔ جہاں مخلوق کا وجود ہو۔ وہاں سے ہی خالق کے ہونے کا ابتدائی نظریہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ نظریہ خصوصی طور پر انسان سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ ابتدائی تخلیق میں انسان اپنی تخلیق اشرف المخلوقاتی میں لازمی طور مکمل تھا۔ یہ بات غلط ہے۔ کہ انسانی علم تحقیق شدہ نہ تھا۔ انسان پیدائش میں اپنے مقصد حیات کی رو سے اپنے اصل منبع سے بالکل قریب تھا۔ کیونکہ اسکے قویٰ مکمل تھے۔ صحت مند تھا۔ طویل العمر تھا۔ اسے ہر وہ چیز مہیا تھی۔ جو اسکی ضرورت کیلئے ہونی چاہیے تھی۔ اسے کھانے کیلئے فطری اور جواہراتی غذا میسر تھی۔ جسوجہ سے۔ بیماری نہ تھی۔ کھلی فضا۔ تازہ ہوا۔ صاف وشفاف پانی۔ ہر شے خالص میسر تھی۔ تو پھر اسے کسی شے کی تحقیق وایجاد کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کیونکہ اسکا مقصد زندگی تصورِ حقیقی اسے حاصل تھا۔ ان حالات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جہاں تک انسان کا ذہن دنیوی کاوشوں سے خالی ہو۔ اسے خود بخود فطرت کے ساتھ مطابقت کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اسے کسی ایجاد۔ کسی تحقیق کی ضرورت رہتی ہے۔ نہ احتیاج ہی رہتی ہے۔ اور فطرت خود اسے ایک خالق کا احساس اور تصور دیتی رہی۔ جوں جوں انسان لذتوں کا تابع ہوتا گیا۔ ہوس۔ آرام طلبی۔ ظلم وفساد نے اسے ایک خالق کے تخیل سے دور کر کے اسے انحراف پر آمادہ کر دیا۔

تواریخ عالم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ کے تصور کا عقیدہ ابتدا سے چلا آیا ہے۔ اور ہر زمانہ میں انسانی کردار کے یعنی فطرت کی مطابقت اور عدم مطابقت کے مطابق ہی اللہ کے تصور میں اختلاف پیدا ہوا۔ یعنی ابتدائی انسان کو جب اسکی ضرورتیں آسانی سے فراہم تھیں۔ اسے ایک خالق کا تصور بھی حاصل تھا۔ اسکے ساتھ ہی زمانہ میں فساداتِ انسانی۔ اور فساداتِ زمین میں بناؤ اور بگاڑ کے غیر معروف۔ دہشت ناک مظاہر واقع ہوئے۔ انسان کے ذہن میں ان واقعات نے جگہ کر لی۔ یہ چیزیں انسان کے حافظہ میں سما گئیں۔ اور کسی وقت بھی جب انسان پر اپنے سامان زندگی میں لذتوں کی وجہ سے عاجزی اور مجبوری پیدا ہوگئی۔ تو انسان نے ان ہولنا کیوں

سے متاثر ہو کر انہیں اپنے سے بالاتر قوت سمجھنا شروع کیا اور اپنی کمزوری پر انہیں خدا تسلیم کرنا شروع کیا۔ گویا یہ خدا انسان کے شر و فساد اور کمزوری کے بنائے ہوئے خدا تھے درا صل وہ خالق حقیقی کو اپنی کمزوریوں کے باعث بھول چکے تھے۔ حالانکہ وہ خالق بھی انکے ذہن میں بسا ہوا تھا۔

اسی طرح ہر زمانہ میں انسان اپنی مجبوری پر زمانہ کی ہولنا کیوں سے متاثر ہو کر انسے مرعوب ہوتے رہے اور اپنی دانست میں صرف اپنی پناہ کے لئے ان ہولنا کیوں کو مجسم شکل دیکر انکے آگے جھکنے لگے۔ یہاں تک کہ زمانہ میں کفر و انحراف کی وجہ سے قوانین فطرت کی مخالفت ہونے لگی۔ کفر و انحراف کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ کہ انسان اپنی ہر ضرورت میں عاجز ہوا۔ اسکی دنیا تنگ ہونے لگی۔ ہر قسم کی پریشانیاں اس پر مسلط ہوئیں۔ سب سے بڑی کمزوری! انسان میں حقیقت کی پہچان کا مادّہ یکسر ختم ہو گیا اور انسان میں اپنے حقیقی معبود کو پہچاننے کی روحانی قوت ختم ہو گئی۔ اِس دور میں قوموں میں ملک گیری اور دنیا طلبی کی زیادہ ہوس پیدا ہوئی۔ لوگوں نے ایک دوسرے کو غلام بنا کر اپنا اقتدار قائم کرنا شروع کیا۔ جسوجہ سے فساد و خونریزی کا دور دورہ ہوا ایک طرف جابر قوموں کا ظلم و ستم۔ دوسری طرف سامانِ زندگی کی تنگی۔ یہی دو چیزیں تھیں کہ انسان نے ایک ایسی طاقت کی طرف جھکنا شروع کیا۔ جو طاقت انسان کی دانست میں بظاہر ایک بالاتر قوت سمجھی جاتی تھی۔ ورنہ حقیقتاً ایک حقیقی خدا کا احساس ہر انسان میں موجود تھا۔ چنانچہ ہر دور میں جب دنیا پر ظلم و فساد اور حقیقت سے دوری پیدا ہوئی۔ تو قوانین فطرت کے مطابق انسانی اصلاح کیلئے ایک پیغمبر کا ظہور ہوتا رہا۔ پیغمبر نے زمانے میں فساد کے بنیادی اسباب کی اصلاح کی کہ ایک واحد خدائے حقیقی کا احساس اولاً دلایا۔ اور اسی ابتدائی عقیدہ سے لوگوں کی اصلاح کی۔ گویا ہر زمانہ میں پیغمبر نے باوجود غیر حقیقی خداؤں کے عقیدے کے ایک حقیقی خدا کا بھی انسان کو احساس دلایا۔

انسان کی اس فطری عادت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خواہ انسان مغلوب و مرعوب ہو کر کسی غیر حقیقی شے کو خدا بنا لے۔ یا انسان کی لاعلمی کے باعث باطل خداؤں کو پوجا گیا۔ تاہم ہر انسان (خواہ وہ کسی بھی حالت میں تھا) ایک خدائے حقیقی کا ضرور قائل تھا۔ اور انسانی تخیل میں

ایک خدائے حقیقی کا تصور ازلی طور بسا ہوا تھا۔اس سے ثابت ہوتا ہے۔کہ خدا کا تصور انسانی کمزوری پر نہیں۔ بلکہ ازلی اور فطری ہے۔اگر خدا نہ ہوتا تو پھر انسان میں پناہ لینے کیلئے کسی خدا کا تصور قطعی طور پر نہ آتا۔

دنیا میں کئی جابر حکمران ہوئے۔جنہوں نے خدا کا انکار کیا۔لیکن خود کو خدا ٹھہرایا۔اگر خدا کا تصور فطری نہ ہوتا تو پھر انہیں خدا بننے کا خیال ہی نہ آتا۔انکے مقابل ان جابر حکمرانوں کی سرکوبی کیلئے ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوئیں جنہوں نے ان کے مقابلہ میں اُسی ایک خالق حقیقی کا تصور پیش کیا۔تو ثابت ہوا کہ ان دونوں فریق کے درمیان ایک خدا ہی کا نظریہ تھا۔جس پر انکا مقابلہ ہوتا رہا۔اگر خدا کا وجود نہ ہوتا۔تو پھر خدا کی ہستی پر آپس کے مقابلہ کی ضرورت نہ ہونی چاہیے تھی۔

نمرود ایک جابر حکمران نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ باطل خداؤں کی پرستش کرتے تھے۔نمرود کو عظیم الشان اقتدار حاصل ہوا تو اس نے باوجود مصنوعی خداؤں کے ہوتے ہوئے بھی اپنی بالاتر خدائی کا دعویٰ کیا۔لیکن حضرت ابراہیمؑ پیغمبر نے اسکی اور باقی باطل خداؤں کی مخالفت کی اور انکے مقابلہ میں ایک خدائے حقیقی کا تصور بتایا۔جسوقت نمرود اور حضرت ابراہیمؑ کا (نمرود کے دربار میں) مقابلہ ہوا۔تو نمرود نے حضرت ابراہیمؑ سے سوال کیا۔کہ تمہارا خدا کیا کرتا ہے؟ — حضرت ابرہیمؑ نے جواب دیا — کہ وہی ہر انسان کا پالنے والا ہے۔وہی رزق دیتا ہے۔وہی زندہ کرتا ہے۔وہی مارتا ہے — نمرود نے کہا — میں بھی لوگوں کو رزق دیتا ہوں۔(ایک قیدی کو قتل کرتا ہے) گویا مارنے کی صفت کا مظاہرہ کیا اور (ایک قیدی جسے موت کی سزا دی گئی تھی آزاد کر دیا) گویا مردہ کو زندہ کرنے کی صفت کا مظاہرہ کیا۔لیکن حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے غرور کو ختم کرنے کے لئے ایسا سوال کیا جس سے نمرود عاجز تھا۔حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ اللہ مشرق سے سورج نکالتا ہے۔تو مغرب سے نکال۔اس بات پر نمرود عاجز تھا۔اسکی عاجزی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ خود خدا نہیں اور یہی احساس کمتری اس بات کی دلیل تھی۔کہ نمرود کو بھی ایک خدا کے وجود کا احساس تھا۔لیکن وہ اپنے جبر و استبداد کی لذت میں محصور تھا۔

اسلئے اپنی عظمت ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ جانے بوجھے خدا کا انکار کر رہا تھا اسی طرح اکثر پیغمبروں کا ذکر تواریخ دہرا چکی ہے۔ جنہوں نے باطل خداؤں کے مقابلہ میں ایک خدا کا تصور دلایا۔ پیغمبروں کا نزول دنیا کی تاریخ میں ایک خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ جن واقعات نے ایک عالمگیر ہیئت اختیار کی۔ ایسے واقعات میں اگر واحد مقصد خدا کا تصور ہی بتایا۔ تو لازمی طور خدا کا ہونا اصولی طور۔ یقینی ہو سکتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں دیگر مذاہب کے پیروان میں یہ رسم مشہور تھی۔ جو صرف پیروان مذاہب کی ایجاد کردہ رسم تھی۔ کہ ہر شخص اپنی فصلوں کے تین حصے کرتا۔ ایک حصہ خدائے واحد کا۔ ایک حصہ باطل خداؤں کا (یہ حصہ پیروان مذاہب کا تھا)۔ ایک حصہ اپنا (یعنی مالک کا)۔ ان تینوں حصوں میں سے اگر باطل خداؤں کے حصہ میں سے (تقسیم کے وقت) خدائے حقیقی کے حصہ میں چلا جاتا۔ تو دو چند واپس لیا جاتا کہ خدا کھاتا نہیں اسلئے اسے چنداں پرواہ نہیں۔ اگر کوئی حصہ باطل خداؤں کے ڈھیر میں چلا جاتا تو اسے واپس نہ لیا جاتا۔ اس کیفیت سے اس عقیدہ کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔ کہ ایک طرف ایک خدائے حقیقی کا وجود بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف پیروان مذاہب نے انسان کے باطل خداؤں کا پورا تسلط جمایا ہوا تھا۔ یہ باطل خدا دراصل کچھ تو عوام کی ذاتی کمزوری اور کچھ زبردست قوتوں کے خوف سے پیدا ہوئے تھے۔

الغرض ابتدائے آفرینش سے ماضی۔ حال۔ مستقبل میں جب خدا کے وجود کا چرچا جاری ہو۔ اور یہ چیز انسانی فطرت کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔ تو قیاس کی صورت میں۔ گزشتہ واقعات کی بنا پر بغیر مشاہدۂ غیبی ایمان بالغیب کے ساتھ ہی اللہ کا تصور قائم ہوا۔ اور یہی صورت ہر زمانہ میں رہی۔ اسی طرح جب انسان اپنے نصب العین کا احساس کرے تو اسے سوائے اسکے چارہ نہیں۔ کہ وہ کائنات میں (سب سے بالاتر قوت جو مخلوق ہونے سے پاک ہو) اپنے لئے ایک فطری نکتہ نظر ''خالقِ کائنات'' کا تصور کرے۔ اگر اس زندگی میں انسان کا کوئی مطمح نظر نہیں تو حیوان اور انسان میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں کوئی فوق و برتری نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ایمان

بالغیب کے ساتھ اللہ کا تصور۔شریعت کا ایک بنیادی اصول Term ہے۔

الـــلّٰـــہ: اللہ کا تصور ابتدا میں انسان نے کیسے پایا؟۔اس چیز کیلئے ابتدائی زمانہ کے حالات کے ساتھ انکے عقائد ونظریات کا جائزہ لینا ضروری ہے تا کہ معلوم ہو کہ ان میں اللہ کے وجود کا احساس کس طرح اور کس ہیئت میں ہوا؟۔وہ لوگ جو مادی قوتوں کے تجربہ سے اللہ کو اپنے اپنے احساس میں لانا چاہتے ہیں۔انکا نظریہ اللہ کے بارے میں یہی ہے۔گزشتہ زمانوں میں انسان نے اپنی ضرورتوں سے عاجز ہوکر باطل خداؤں کی اختراع کی اسی طرح اس خدائے حقیقی کا تصور بھی وہمی ہے۔جسوقت انسان اپنی ضروریات پوری طرح حاصل کر لیگا۔تو باطل خداؤں کا وجود بھی ختم ہو جائیگا۔اسی طرح انسان جب موت وحیات پر قادر ہوگا تو اس وہمی خدا کا تصور بھی ختم ہو جائیگا۔یہ حقیقت ہے کہ ان باطل خداؤں کا وجود ضرورت اور عاجزی نے پیدا کیا۔لیکن اسکے ساتھ ہی تصویر کے دونوں پہلو نہیں دیکھے جاتے۔بلکہ واقعات کا سطحی طور پر جائزہ لیا جاتا ہے۔اور کسی واقعہ کے بنیادی اصول پر توجہ نہیں کی جاتی ہے۔تا کہ انسان کو بنیادی اور ابتدائی حالات کا علم ہو۔کہ واقعات کیسے بگڑتے ہیں۔

اللہ کی ہستی کے نظریہ میں مختلف قسم کے عقائد پائے جاتے ہیں۔ایک جماعت کا نظریہ ہے۔کہ ماورأ ادراک ایک بالاتر ہستی ہے۔وہ سب کائنات کی خالق ہے۔وہ احساسات سے دور ہے۔اسکا دیکھنا۔پہچاننا مادی نظروں سے نہیں ہوسکتا۔گو وہ ہمارے احساسات سے دور ہے۔لیکن ہے ضرور۔

دوسری جماعت کا نظریہ ہے۔کہ وہ مختلف قسم کی مخلوق کو بھی خدا کہتے ہیں۔جیسے ۔سورج۔آگ۔سمندر۔گرج (بجلی) وغیرہ۔اورانہی قوتوں سے اپنی ضرورتیں مانگتے ہیں۔لیکن اسکے ساتھ ہی انکا یہ بھی نظریہ ہے۔کہ ایک نامعلوم خدا ہے جس تک ہماری رسائی نہیں ہوسکتی ہے۔نہ اس سے براہ راست کوئی شے مانگی جاسکتی ہے۔

تیسرا گروہ محققین کا ہے۔انکا نظریہ ہے۔کہ جو چیز محسوس نہ کی جائے۔اس پر یقین کرنا

یا اسکے وجود کا اقرار کرنا بے معنی ہے۔ گویا جو چیز ادراک سے باہر کہی جاتی ہے۔ وہ دراصل کچھ بھی نہیں۔ اسلئے جو چیز انسانی ادراک میں نہ آنے والی ہو۔ وہ صرف وہم وظن ہے۔ اسکا وجود حقیقی نہیں۔ انکے علت ومعلول Mater کی حدیں انکے حواس تک ہی محدود ہیں۔ یعنی یہ کہتے ہیں کہ ہر شے میں علت ومعلول کا نظام ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ انکا اصول ہے۔ کہ ہر علت حواس کے احاطہ میں آسکتی ہے۔ اور جب تک ایک معلول کی علت محسوس نہ کی جائے اسکا یقین کرنا عبث ہے۔

اسکے علاوہ عام مذاہب میں بھی خدا کا نظریہ قائم ہے۔ لیکن یہ لوگ مختلف ہیئتوں میں خدا کا تصور کرتے ہیں کسی کا نظریہ ہے۔ کہ یہ ساری مخلوق دراصل خدا ہی ہے۔ کسی کا نظریہ ہے کہ سب پیغمبر خدا کا ہی دوسرا روپ ہے کسی کا نظریہ ہے۔ کہ دنیا کی بالاتر قوتیں۔ سورج۔ آگ۔ بجلی وغیرہ یہ سب خدا کی ہی تمثیلی شکلیں ہیں وغیرہ۔

الغرض جتنے بھی نظریات خدا کے بارے میں پائے جاتے ہیں۔ کچھ تو ابتدائی زمانہ کے تصورات کا خاکہ ہے کچھ وسطی زمانہ کے محققین کے نظریات ہیں۔ کچھ مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے غلط تصورات کا خاکہ ہے۔ دراصل ان تمام عقائد میں قوانین فطرت کے مطابق حقیقت کی صحیح جھلک نہیں پائی جاتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ ان سب عقائد میں ابتدائی انسان کے تصور کو عملی طور پر خدا کے وجود کیلئے دلیل میں لایا جاتا ہے۔ کہ انسان نے اپنی ضرورت اور مجبوری پر ہی خدا کا وجود اختراع کیا۔

پیدائش کی ابتدا میں انسان کو مجبور محض اور عقل وشعور سے نابلد سمجھا جاتا ہے۔ اسکی وجہ؟ دنیا میں مادی قوتوں (حواس وتعقل) کے ذریعہ۔ دنیوی حصولِ سامان زندگی۔ اور مادی ایجادات کی ترقی وعروج کو ہی۔ انسانی ترقی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن انسانی فطری تخلیق یعنی اشرف المخلوقاتی بناوٹ پر انسان کی نظر نہیں پڑتی۔ کہ انسان۔ حقیقتاً۔ ایک عظیم الشان قوت لیکر پیدا ہوا ہے۔ اسمیں ایک طرف حواس وتعقل کی قوی قوت موجود ہی تھی دوسری طرف یہ روحانی عظمتوں کا بھی حامل تھا۔ اسکے ساتھ ہی اسکی زندگی کا اصلی مقصد ان دونوں (مادی اور روحانی) قوتوں سے دنیا پر بادشاہت

کرنا تھا۔اسے اسکی ابتداً کے ساتھ ہی یہ تمام عظمتیں حاصل تھیں۔ورنہ انسان کا انسان کی حیثیت سے بغیر عقل وشعور کی قوت کے پیدا ہونا۔انسانیت پر ایک دھبہ لگانا ہے۔لوگوں کا نظریہ ہے۔کہ زمانہ ماضی کے مقابلہ میں انسان حال و مستقبل میں بے حد ترقی کر رہا ہے۔یہ ترقی ماضی میں انسان کو حاصل نہ تھی اسلئے ماضی میں انسان اپنی قوتوں میں نامکمل تھا۔لیکن مقصد زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ دنیوی ترقی ؤ ایجاد ہی انسان کا مقصد زندگی تھا۔جس میں ماضی کا انسان بالکل نابلد تھا۔یہ نظریہ قوانین فطرت کے سراسر خلاف ہے۔اسکے لئے ضرورت ہے۔کہ ابتداءً انسان کی ابتدائی زندگی کا تجزیہ کیا جائے۔کہ کیا انسان اپنی پیدائش کے ساتھ ہی عاجز ومجبور پیدا ہوا۔اگر یہ درست ہے۔تو پھر انسان اور حیوان کی زندگی مساوی سمجھی جائیگی۔تو پھر انسان کو کسی حالت میں کائنات ارضی پر انسان ہونے کی حیثیت میں تفوق و برتری نہیں ہونی چاہیے۔اسی نظریہ نے ڈارون کی تھیوری کی تائید کی۔اور دیگر محققین کے نظریات بھی اسی تھیوری کی تائید کرتے ہیں کہ ابتداءً انسان بندر (حیوان) تھا رفتہ رفتہ ترقی کرتے انسان کی ہیئت اختیار کی۔لیکن یہ سوچنے کا مقام ہے۔کہ کیا انسان کے سوا کوئی اور مخلوق بھی ایسی ہے۔جو کائنات کی تمام قوتوں پر غالب آسکتی ہے۔کہ انسان کے دوسرے درجہ پر کوئی اور مخلوق بھی ہے۔جسکا انسان کے بعد کائنات کی مخلوق پر غلبہ حاصل ہے؟۔اگر ایسا ہی ہے۔تو پھر وہ کونسی مخلوق ہے جس نے یہاں تک اقتدار حاصل کیا کہ جس سے انسان بنا۔اگر بندر ہی ہے۔تو پھر وہ مخلوق انسان کے دوسرے درجہ پر موجود کیوں نہیں۔یہ مبالغہ ہے۔کہ صرف ایک ہی بندر ایسا پیدا ہو۔جو بالآخر ایک انسان بنا۔حالانکہ محققین نے زمانہ قدیم کی کھدائی میں کئی مقامات پر ایسے ڈھانچے تحقیق کئے ہیں۔جن پر انکا گمان ہے یہ ڈھانچے بندروں کے تھے اور انہوں نے ہی انسانی شکل اختیار کی۔زمانہ کی طوالت اور پیدائش کے تسلسل سے اس امر کا اندازہ ہوسکتا ہے۔کہ مخلوق نے کثیر تعداد اختیار کی تو پھر یہ تعداد کیوں موجود نہیں۔اگر یہ باور کیا جائے۔کہ زمانہ کی طوالت نے گزشتہ قوموں کو نابود کر دیا۔تو پھر یہ سلسلہ ارتقاءً انسان میں بدستور جاری رہنا چاہیے تھا۔کہ ہر زمانہ میں انسانی ہیئتیں تبدیل ہو کر

گزشتہ نابود ہوتی جائیں اور آئندہ قومیں نئی صورت میں پیدا ہوں۔لیکن انسانی تواریخ یہ ظاہر کرتی ہے۔کہ انسان اِس موجودہ ہیئت میں کروڑ ہا سال سے چلا آ رہا ہے۔اور اسکا سلسلہ تناسل ایک مستقل ہیئت وترکیب سے ایک ہی صورت میں چلا آرہا ہے۔اوران ہیئتوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔اور جوڑھانچے زمین کی تحقیق میں پائے گئے ہیں وہ دراصل بندروں کے تھے۔جو اپنی ہیئت کے اعتبار سے انسان کے ہم مشابہ تھے۔اور یہ کثیر تعداد میں تھے۔جو پیدا ہوئے اور نابود ہو گئے۔اسکے ساتھ ہی اس دور میں کسی انسان کا سالم ڈھانچہ نہ پایا گیا اسلئے انکے گمان نے حقیقت کا رنگ اختیار کیا۔اس یقین کی وجہ یہ ہے۔کہ انسان تمام کائناتی قوتوں کا مرکب ہے۔اور یہ فطری طریق پیدائش ہے۔جسکی دلیل ہم زمانہ کے انسان کی قوت و برتری سے دیتے ہیں کہ زمین کی تمام مخلوق اسکے مواد سے پیدا ہوئی۔اور یہ زمین کی مختلف جگہوں سے پیدا ہوتے رہے۔ لیکن زمین کا تمام قوی مواد اسکے نشیب (گہری جگہ) میں جب جمع ہوا تو اس مواد میں تمام کائناتی قوتیں پائی جاتی تھیں۔اسوقت زمین کی ہیئت آج سے کچھ علیحدہ تھی۔یعنی یہ ایک ہموار سطح میں تھی۔جو اپنی تیزی اور قوت میں آج کی زمین سے زیادہ طاقتور تھی۔یہی طاقت زمین کے نشیب میں جمع ہوگئی جو دلدل کی صورت میں تھی اسی دلدل میں وہ قوی ذرہ موجود تھا جو تمام کائنات کی مخلوق سے زیادہ قوی تھا۔جسنے واحد انسان کی ہیئت اختیار کی۔البتہ یہ باور کیا جاسکتا ہے۔کہ اس ذرہ نے انسان کی ہیئت میں پہنچنے تک مختلف شکلیں بدلیں جن میں ایک ہیئت بندر کے مشابہ بھی تھی۔لیکن یہ ہیئت واحد انسان کی تھی اور ہر زمانہ ہر دور میں انسان واحد رہا۔یہی وجہ ہے۔کہ کسی دور میں بندروں کے مقابلہ میں انسانی ڈھانچہ نہ پایا گیا۔اور محققین کے گمان کو یقین کا راستہ ملا اسکے علاوہ۔ دنیا میں ابتداً سے انتہا تک انسان کی ہی حکومت واقتدار اور برتری رہی اسکی برتری ایک طرف اسکے قوی مرکب کے اعتبار سے تھی دوسری طرف اسکے نصب العین اسکے مقصد زندگی کے اعتبار سے اسمیں ایک روحانی قوت بھی موجود تھی جس نے اس کو اس مقام عالی تک پہنچایا۔اور یہ چیز اس امر کی دلیل ہے۔کہ انسان ہی اپنے عقل وشعور سے دنیا پر ترقی کرتا جارہا ہے۔البتہ سوچنا یہ ہے

کہ انسان کو صرف مادی ترقی کیلئے پیدا کیا گیا۔ یا اس میں اور بھی کوئی قوت موجود ہے۔ تو اسکا مقابلہ کائنات کی تخلیق کے ساتھ کیا جائے کہ دنیا میں ہر شے مادی نہیں بلکہ اس میں ایسی بھی قوتیں موجود ہیں جو انسانی تعقل کیلئے ماورأ ادراک ہیں۔ لہذا یہ امر قابل یقین ہے۔ کہ ماورأ ادراک کی حد نہیں لہذا اس بے حد ماحول کے لئے جہاں تعقل لطیف اشیأ کا ادراک کرنے پر قادر ہو چکا ہے۔ ایک ماورأ ادراک قوت کیلئے انسان میں وہ روحانی قوت بھی پائی جانی چاہیے۔ جو عین روح ہو اور ہر قوت سے برتر قوت ہو۔

اس ترکیب کا اندازہ لگانے سے یہ امر ثابت ہوتا ہے۔ کہ انسان اپنی ابتدائی پیدائش میں ایک عظیم الشان قوتِ ادراک کا مالک تھا۔ یہی وہ انسان ہے۔ جس نے اپنی عظمت کے ساتھ دنیا پر قدم رکھا۔ تو اسکی قوت کی تازگی کے اعتبار سے انسان کسی طرح بھی اپنی قوتوں میں عاجز نہ تھا۔ ایسی قوت اپنی تمام انسانی تکمیل میں مکمل تھی۔ اور یہ کسی ایجاد۔ کسی ضرورت۔ کسی بیچارگی کا محتاج نہ تھا۔ بلکہ ہر احتیاج سے پاک۔ اپنے مقصد زندگی میں کامل تھا۔ اور اسکا مقصد زندگی اسکی عظمت کے ساتھ پوری طرح تکمیل پذیر ہو رہا تھا۔ اور اسکی ہر ضرورتیں کائنات میں خود بخود مہیا تھیں۔ اور یہ انہیں پر اکتفا کیے ہوئے مطمئن تھا۔

ہاں! دیکھنا یہ ہے۔ کہ پیدائش کی ابتداء میں جب انسان کو ضرورت نہ تھی۔ نہ تجربہ کا خیال تھا۔ تو کیا اسے بھی اللہ کے وجود کا احساس تھا؟ کیا اسکے لئے بھی شریعت کی ضرورت تھی؟ جس میں ابتداءً اللہ کا اقرار بنیادی طور پر قائم کیا جانا چاہیے تھا؟ ـــــ اسکا جواب یہی ہو سکتا ہے۔ کہ ابتدائی انسان۔ اپنی شرافت وعظمت میں کامل تھا۔ یہ ضرورتوں۔ اور خواہشات سے پاک تھا۔ اسے زیادہ حصول کی خواہش نہ تھی۔ اسلئے اسے ایجادات کی جستجو کی طرف مائل ہونے کا موقع نہ ملا۔ کائنات میں اسے حصولِ سامانِ زندگی کی کوئی فکر نہ تھی۔ تو لازمی طور اسے زیادہ حصول کی ہوس میں فساد کا موقع نہ ملا۔ انسان میں جب کسی شے کی خواہش ہی نہ ہو۔ تو اسکا ذہن بھی ایسی الجھنوں سے خالی رہیگا جب اسمیں فساد کا مادّہ نہ ہو۔ تو پھر اسکی لطافت بھی قائم رہیگی۔ اسلئے ابتدأ میں

انسان کو کمتری اور تنزل کا موقع ہی نہ ملا۔ جب کائنات میں کوئی فساد واقع نہ ہو۔ تو پھر اصلاح کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب انسان کو کسی مجبوری کا احساس نہ تھا تو اسے خداؤں کی ضرورت نہ تھی۔ ایسی حالت میں جب انسانی قویٰ مکمل ہوں۔ اسکی پاکیزگی سالم ہو۔ اسکا ذہن خالی ہو تو کائنات میں اسکے ذہن میں سوائے اسکے کیا چیز پیدا ہوتی؟ کہ یہ دنیا کیا ہے۔ اور کس نے بنائی۔ جب اسکا قلب پاکیزہ تھا۔ تو لازمی طور اسے ایک خالق کا ہی تصور آنا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے۔ کہ اسکا بھی یہی تصور ہو۔ کہ یہ کائنات خود بخود بنی۔ جبکہ اسے کسی اللہ کا علم نہ دیا گیا ہو۔ اور نہ اسکے احساس میں اللہ کا تصور آیا ہو۔ تو پھر اسکے لئے اللہ کا تصور سرے سے غائب تھا۔ لیکن انسان کی ترکیب اور بناوٹ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ کہ کیا وہ انسان بھی اسی قسم کا انسان تھا۔ جو شر و فساد اور قوانین فطرت کی خلاف ورزی کے باعث اپنی روحانی قوتیں زائل کر چکا ہو؟ اللہ کے تصور کیلئے وہی انسان مجبور ہوگا جو اپنی روحانی قوتیں زائل کر چکا ہو۔

انسان اور اسکی بناوٹ کا بہ نظر عمیق غور کیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ انسان میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ اسکی بنیادی تخلیق میں قبل از وقت موجود ہوتی ہیں۔ کوئی اپنی خوبیوں کو کام میں لاتا ہے۔ کوئی کام میں نہیں لاتا۔ یہ خوبیاں فطری ہوتی ہیں۔ ضرورت اور ماحول ہی ان خوبیوں کو ابھارتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمانوں میں محققین۔ یا موجدوں (ایجاد کرنے والوں) میں خوبیاں پائی گئی ہیں۔ وہ ابتدائی انسان میں بھی ہونی چاہیں۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ ابتدائی انسان کو ان خوبیوں کے ابھارنے کی ضرورت نہ پڑی کہ وہ کسی ایجاد یا اختراع یا تحقیق کی طرف اپنے ذہن کو مائل کرتا۔ برعکس اسکے جب انسان ضرورتوں سے عاجز ہوا۔ یا اسے ضرورتوں سے سابقہ پڑا۔ تو ان خوبیوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔ خود غرضی اور ہٹ دھرمی سے علیحدہ ہو کر ان محققین سے پوچھو جنہوں نے صرف فلسفی صورت میں قیاس کی اساس پر بغیر مشاہدہ کائنات کے ذرات کا تجزیہ کیا۔ تو اِنکی بناوٹ بھی انکے لئے باعث حیرت و تعجب رہی۔ اور انسان جو تمام کائنات کے جواہراتی اجزا کا مرکب ہے۔ کوئی معمولی ہستی نہیں ہو سکتی۔ کیا اس میں۔ ایٹمی۔ ایتھری قوتیں

موجود نہیں۔؟ اگر ہیں۔تو کیا اسکے احساسات میں نزاکت و لطافت نہیں؟۔ اگر ہے۔تو کیا اسے لطیف قوتوں کا احساس حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر اسکا جواب اثبات میں ہے۔تو کیا اسے خالقِ کائنات کا احساس نہ ہوگا؟ اگر ہوگا۔تو کیا انسان اپنی خالص ہیئت کی بناءٔ پر قوانین فطرت اور کائنات پر (Atuomatically) خود بخود تفکر کا عادی ہو کر اس نتیجہ کو پالیگا۔ کہ یہ جو کچھ میرے پیش نظر ماحول ہے۔اسکا کوئی بنانے والا ہے۔بس یہی احساس اللہ کے تصور اور اثر کیلئے کافی ہو سکتا ہے! ــــــ ہر زمانہ میں محققین۔فلاسفر۔اور موجد پائے گئے ہیں۔جنہوں نے کائنات کی تخلیق پر غور و تفکر کر کے دنیا کو اتنا مواد فراہم کیا کہ آج انسان ہر شے کی کیفیت۔زمین اور زمین سے قبل کی کیفیت۔انسان کی وجودی کیفیت سے سابقہ علم کی بنیادوں پر آگاہی حاصل کر رہا ہے۔ یہی نہیں۔ بلکہ یہ تحقیق جاری ہے۔نہیں معلوم مستقبل میں کیا اسرار فاش ہوں!۔اور ابھی اس تحقیق کا سلسلہ لگاتار جاری ہے۔کیا یہ تحقیقاتی مواد (خاصیت) ہمیں ہمارے اجداد سے ورثہ میں نہیں ملی ہے؟ کیا یہ تفکر و تحقیق کا مواد انسان میں پیشتر سے موجود نہیں تھا۔اگر ہے!۔تو پھر یہ ماننا پڑیگا۔ کہ مستقبل کے مقابلہ میں ماضی میں یہ مواد قوی تھا۔ جبکہ انسان اور اسکے وجود کے تمام قوائے جسمانی ہمارے مقابلہ میں قوی اور پاکیزہ تھے۔ایسی صورت میں اسکے لئے تفکر و تجسس ایک فطری چیز تھی۔رہا یہ سوال کہ ہم کیوں مادی عروج پر نازاں ہیں۔اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ ماضی کے انسان کی قوت صرف تفکر میں صرف ہوتی تھی۔اور ہماری قوت صرف مادہ کے حصول میں خرچ ہو رہی ہے انکی نظر میں مقصد زندگی صرف انسان کے ذاتی نصب العین کیلئے جستجو تھی۔اور ہم اس مقصد سے علیحدہ ہو کر صرف مادی ترقی کو ہی اپنا نصب العین قرار دے رہے ہیں۔ مانا کہ مادی ترقی میں انسان کو عروج اور اقتدار حاصل ہوتا ہے۔لیکن کیا یہ دائمی اقتدار ہوتا ہے؟ اگر نہیں تو انسان کو سوائے وقتی مفاد کے اس اقتدار سے کیا مستقل فائدہ ہوتا ہے؟ اگر دوسروں کے لئے اسکا عمل فائدہ مند ہے۔تو دنیا کے ترقی یافتہ دور کا مطالعہ کیا جائے۔کیا مجموعی حیثیت میں انسان مساوی حیثیت سے اس اقتدار سے فائدہ حاصل کر سکا؟ کیا اس عروج میں انسان مساوی حیثیت سے امن و

سلامتی۔ اوراطمینان حاصل کر سکا۔ کیا وہ لوگ جنکے ہاتھ میں اقتدار ہے۔ وہ بھی فساد و شر سے محفوظ پائے گئے۔ تواریخ شاہد ہے۔ کہ کسی اقتدار میں انسان من کل الوجود مطمئن نہ رہ سکا۔ تو یہ فائدہ وقتی اور بے بنیاد ہے۔ جب تک کہ انسان دائمی راحت نہ حاصل کر سکتا ہو۔

انسانی مخلوق کا اولین انسان۔ آدم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیا کوئی تواریخ ایسی ہے۔ جو آدم کے وقت سے لکھی گئی ہو؟ جس میں آدم کا ذکر ہو۔ کیا کوئی دلیل ایسی ہے۔ جو یہ ثابت کرے کہ ایک انسان سے یہ تمام مخلوق بنتی آئی ہے؟ چند صدیاں ہوئیں کہ لوگوں کے تجرباتی عقیدے میں پختگی آنے لگی۔ کہ تمام مخلوق ایک انسان سے وجود میں آئی۔ تو پھر اس قسم کی تحقیق کس بنیاد پر قائم ہے؟ جبکہ انسان اپنی ابتدا سے بے خبر ہو۔ جبکہ اسکے نظریہ کی اساس۔ ذاتی مشاہدہ پر نہیں صرف قیاس [1] پر ہی ہے۔ اگر یہ تحقیق صحیح ہے۔ تو کن بنیادوں پر؟۔ آدم کا نام کہاں سے آیا؟ گزشتہ مخلوق اور پیغمبروں کے نام کیسے معلوم ہوئے؟ یقیناً اسکا کوئی جواب حقیقی نہیں ہوسکتا ہے۔ سوائے اسکے کہ یہ ایک فطری تقاضا ہے۔ کہ انسان بغیر قیل وقال۔ بغیر حیل وحجت اس شے کا نام دہراتا ہے۔ جسکے وجود سے خود بیخبر ہو۔ یا جسکے وجود کا خود بھی قائل نہ ہو! اسکا سبب یہی ہے۔ کہ زمانہ اپنے واقعات کو مٹنے نہیں دیتا۔ بلکہ ہر واقعات کے نقوش انسانی حافظہ محفوظ کر لیتا ہے۔ اور فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ یہ نقوش مسلسل نسل انسانی میں انتقال کرتے جاتے ہیں۔ اور جب زمانہ اپنی نوعیت بدلتا رہیگا۔ کہیں آنکھوں میں۔ کہیں ذہنوں میں۔ کہیں پتھروں میں۔ کہیں چمڑے میں۔ اور کہیں کاغذوں میں یہ واقعات ابھرتے رہینگے۔ اسی طرح ابتدا میں تواریخی واقعات ذہنوں میں محفوظ کیئے گئے۔ اگر اس بات کے قائل نہ ہوں۔ تو پھر کوئی شخص گزشتہ زمانہ اور مخلوق کے وجود کی صحیح دلیل دے ہی نہیں سکتا۔ تواریخ اور تجربہ یہ طے کر چکا ہے۔ کہ آدم تھا۔ اور اشرف المخلوقات

---

[1] اگر یہ نظریہ قبول کیا جائے کہ جب تک Mater کا وجود مشاہدہ میں نہ آئے تب تک اسکے وجود کا یقین بے معنی ہے۔ تو پھر آدم اور اسکے زمانہ کی Mater کے مشاہدہ کیلئے سوائے ایک وہمی تصور کے اور کیا ثبوت پیش کیا گیا ہے؟۔ اگر مشاہدہ نہیں تو پھر انسان کی تخلیق کیلئے جو مواد پیش کیا جاتا ہے۔ ناقابل تسلیم اور بے معنی (بقول محقق کے) ہے۔

تھا۔ اسکے لئے لطیف ذرہ کو دیکھنا اپنی لطافت کے اعتبار سے آسان تھا اسلئے اسے فطرت کی ہر ادا پر درک تھا۔ یعنی یہ کائنات کی تخلیق کی ہر رمز سے واقف تھا۔ یہ تو تجرباتی تجزیہ ہے! یعنی جہاں زمانوں میں پیغمبروں کے ظہور کا ذکر ہے۔ وہاں ایک اللہ کے تصور کا ضرور ذکر ہے۔ اور یہ ذکر یہ تصور کلام الٰہی سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اسلئے زمانہ کی پست حالی کے بعد جب زمانہ کو اصلاح کی ضرورت ہوئی تو اللہ کے تصور کی ایجاد پیغمبروں کے ذریعہ ہی ہوئی۔

ایک پیغمبر جملہ اوصافِ انسانی کا حامل ہوتا ہے۔ جب ہی وہ ماوراُ ادراک قوتوں کے مشاہدہ کا دعویدار ہوتا ہے۔ اور کلام الٰہی بھی اسی روحانی قوت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ پیغمبر کا وجود کوئی علیحدہ شے نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ انسانوں میں سے ایک منتخب انسان ہوتا ہے۔ پیغمبر میں خصوصیت صرف یہ ہوتی ہے۔ کہ اسکی انسانی (اشرف المخلوقاتی) خاصیتیں سالم اپنی اصلی حالت میں برقرار رہتی ہیں۔ اسی طرح جب انسان کی نوعیت ہی یہ ہو کہ وہ ہر حال میں (ابتدأ سے ہی) ماوراُ ادراک کا احساس کرنے والا ہو تو اسکے لئے مثل پیغمبر کے ادراک کرنا مشکل [1] نہیں۔ اسلئے وہ ابتدائی انسان جو اپنی ابتدائی تخلیق میں زمین کی انتہائی قوتوں سے مرکب ہوا ہو۔ اور اپنی تخلیق میں خالص اور مکمل ہو۔ اسے اللہ کی طرف سے ''وحی'' [2] حاصل ہونا مشکل نہیں۔ گویا اللہ کا تصور ابتدأ میں آدم کو ہی حاصل تھا۔ اور یہی تصور نسلاً بعد نسلاً اسکی اولاد میں چلا آیا۔ جب تک انسان اپنی اصلی شرافت پر قائم رہا اسے اللہ کا تصور فطری طور حاصل تھا۔ اور جب اولادِ آدم میں فساد شروع ہوا یہ تصور حافظہ میں دیگر تخیلات کے دباؤ میں کھو گیا۔

بہر حال کائنات اور انسانی تواریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ کا تصور۔ زمانہ

---

[1] پیغمبر اور عام انسان میں فرق اتنا ضروری ہوتا ہے۔ کہ پیغمبر مخصوص اور منتخب ہوتا ہے۔ اور اسکی فطری قوتوں کو محفوظ کیا جاتا ہے اور پیغمبر کو کلام الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ عام انسانوں کو کلام الٰہی حاصل نہیں ہوتا۔ پیغمبر میں تبلیغی کام کی صلاحیتیں ہوتی ہیں اور عام انسانوں میں پیغمبر کے مقابلہ میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی۔ البتہ عرفان الٰہی ہر انسان پیغمبر ہو یا عام سب کو حاصل ہوتا ہے۔ [2] یہاں وحی سے مراد اللہ کی اطلاع۔

اور انسان ابتداً سے ہی اپنے ساتھ لایا۔ اور اسی فطری عادت کی تحریک سے ہم خدا کے نام سے آشنا ہوتے رہے۔ ورنہ اسکے علاوہ اور کوئی دلیل اللہ کے تصور کیلئے زمانہ میں نہیں ملتی ہے۔ اسکے علاوہ اللہ کے تصور کے مٹنے پر پیغمبر ہی اسکی تجدید کرتے رہے۔

گزشتہ مذاہب کی تعلیمات اگرچہ مسخ ہو چکی ہیں۔ لیکن اس حقیقت کا اعتراف ہر حال میں کیا جا چکا ہے۔ کہ ہر مذہب میں ایک اللہ کا تصور کیا جاتا رہا۔ مذاہب میں اگرچہ بت پرستی اور باطل خداؤں کا دور دورہ بھی رہا لیکن ایک حقیقی خدا کا نظریہ بھی ان میں پایا گیا۔ اب اگر مذاہب میں اللہ کے تصور میں اسکے حقیقی تصور میں اختلاف رہا وہ خود پیغمبروں کا نہیں۔ بلکہ پیروان مذاہب اور محققین کے قیاسی تصور کا اختلاف رہا جنہوں نے بغیر مشاہدہ خدا کا تصور حاصل کرنا چاہا اور ایک خدا کی مختلف شکلیں پیدا کیں۔ گزشتہ مذاہب میں خدا کے صحیح تصور کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ اگر ہے بھی تو یہ تصور قوانین فطرت کی مطابقت نہیں کرتا۔ اور سب سے آخری مذہب اسلام ہی ہے جو کائنات اور اللہ کے تصور کا ایک حقیقی نظریہ پیش کرتا ہے۔

وَاِذْقَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط۔ جب ہم نے (اللہ) ملائکوں[1] (فرشتوں) سے کہا[2] کہ میں زمین پر[3] اپنا خلیفہ[4] بنانے والا ہوں ـــــ

---

[1] ملائکوں کی تشریح آگے (اسلام کی دوسری جز میں) آئیگی۔

[2] قَالَ (کہا) اتنا ضروری ہے۔ کہ تخلیق نوری میں ابتداءً خلیفہ کا ہی ارادۂ ازلی میں تصور تھا صرف ملائکوں سے اسلئے اظہار کیا کہ گو خلیفہ کثیف حالت میں ہوگا۔ لیکن اسکا مقصد اسکی روحانی عظمت ان ملائکوں سے بلند ہوگی۔ یہ صرف اظہار کرنا تھا۔

[3] گویا انسانی آبادی کا صرف اَلْاَرض (زمین) پر ہی بنانا مقصود تھا۔ اور باقی سیاروں میں انسانی وجود نہیں کیونکہ آدم زمین کی ہی مخلوق تھا۔ اسلئے اگر کسی سیارہ میں کسی آبادی کا وجود پایا بھی جائے وہ انسان نہیں کہلا سکتا۔ بناوٹ میں اپنے ماحول کے مطابق زمین کے مقابلہ میں Superior (افضل) اور شرافت میں کمتر ہوگا جیسے ناری مخلوق ''جن'' وغیرہ۔

[4] خلیفہ سے مراد جس میں وہ تمام صفات پائی جائیں جن صفات سے اللہ کی ذات کی دلیل قوی قائم ہو سکتی ہے۔

ملائکوں کا اَلْاَرض کیلئے اسکی بناوٹ کے لحاظ سے۔ جائزہ درست تھا۔ کہ زمین ایک ایسی کیفیت ہے۔ جو تخلیق کی آخری منزل ہے۔ اور یہ منزل نور کے مقابلہ میں کثیف ہوگی۔ اور اسکی مخلوق بھی اسی ہیئت کی ہوگی۔ تو اللہ کا قائم مقام (خلیفہ) اس سرشت سے بننا غیر معقول بات ہے۔ کیونکہ اللہ نے خلیفہ کا مقام بتایا۔ تو خلیفہ کا مطلب فرشتوں کے خیال میں ایک عالی مقام۔ عالی سرشت ہستی کا نام تھا۔ یہاں فرشتوں نے اندازہ کیا کہ زمین تو شر و فساد کی جگہ ہے۔ اور وہاں کی مخلوق تو شر و فساد ہی کریگی۔ وہ خلیفہ کی سی عبادت کیسے کرینگے۔ تو فرشتوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ج کیا تو زمین میں اسے پیدا کریگا جسکی سرشت (بناوٹ) میں خونریزی اور فساد ہے اگر اللہ کا مقصد بندگی ہی ہے۔ تو اسکے مقابلہ میں وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ط ہم تیرے لئے مجسم عبادت ہیں۔ کیا ہم سے تیری تسبیح اور تقدیس کا مقصد پورا نہیں ہوتا؟۔ تو اللہ نے کہا ــــ قَالَ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ○ جو کچھ اس معاملہ میں میں جانتا ہوں۔ وہ ابھی تک تمہارے علم میں نہیں آیا ہے ــــ بس یہاں ملائکہ نے خاموشی[1] اختیار کی اور بحث ختم ہوگئی۔ اسکے بعد ازلی تخلیق نوری کا سلسلہ لگاتار چلتا رہا۔ اسکے بعد قرآن نے ایک ماحول کا ذکر کیا ہے۔ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ اور آدم کو اپنے اسرار و آثار تمام سے آگاہ کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب آدم کا وجود تمام تخلیقی مراحل سے نکل کر ایک مکمل اور اشرف المخلوقات انسان کے مقام پر کھڑا تھا۔ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ پھر اس مکمل حالت میں انہیں فرشتوں کے مقابلہ میں کھڑا کیا اور کہا۔ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ پس اللہ نے کہا بتاؤ! تم میرے علم سے اپنی تخلیقِ نوری کے اعتبار سے کیا جانتے ہو۔ اللہ نے پوچھا کہ کیا تم اپنے ماحول سے علاوہ میری ذات کو پہچان چکے ہو؟ لیکن ہر فرشتہ ایک مخصوص مقام پر صرف تسبیح و

---

[1] یہاں پر یہ بحث تخلیق آدم سے پیشتر ہوئی یعنی اِنِّيْ جَاعِلٌ "میں بنانے والا ہوں" اسکے بعد کا مضمون آدم کی پیدائش ظاہر کررہا ہے۔ جسکے لئے آدم کی پیدائش کے ساتھ زمین کا بننا اور آدم کا بننا ضروری ہے۔ اور یہ وقت مابعد کا ہے۔ جبکہ آدم اپنی مکمل شرافت تک پہنچا۔

تقدیس میں ہی مصروف تھا کیونکہ یہ مخلوق صفات کا ایک نشان تھے۔ انہیں پہچان سے کوئی غرض نہ تھی۔ اسلئے وہ زیادہ علم بتانے سے عاجز تھے۔ اپنی اس محدود علمیت پر انہوں نے کہا قَالُوا سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ○ انہوں نے کہا۔ بیشک تو پاک ہے بھول سے تیرا اندازہ کسی بھی حالت میں غلط نہیں ہوسکتا۔ دراصل ہم اس بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں علم دیا۔ حقیقتاً تو کامل جاننے والا ہے۔ اور تو لامحدود اسرار و آثار کا مالک ہے۔ اسکے بعد فرشتوں پر آدم کی عظمت ظاہر کرنے کیلئے آدم کو اسکی خاکی ہیئت میں فرشتوں کے سامنے کہا اے آدم قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ تم انکے تمام اسرار اور جملہ اسرار کے نشان بتاؤ۔ پھر آدم نے تمام اسرار الٰہی کا ذکر کیا۔ تو اللہ نے اپنے جلال میں فرمایا۔ اے فرشتو قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ○ کیا میں نہ کہتا تھا! کہ میں آسمانوں کے اور زمین کے غیب سے واقف ہوں۔ اور اس سے بھی واقف ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو (یعنی تمہارے ظاہر و باطن کو جانتا ہوں) اب دیکھا! کہ میں نے آدم میں صرف خونریزی کا مادہ ہی نہیں رکھا بلکہ اس میں ماوراُادراک تمام اسرار آسمانی (جو انسانی تعقل و حواس میں نہیں آسکتے) سے آگاہ ہونے کی قوت[1] بھی دی ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابتدائی انسان اپنی بناوٹ کے لحاظ سے شرافت اور روحانی قوت کے کافی علم حاصل کر چکا تھا جس میں اسے خصوصیت کے ساتھ اللہ کا حقیقی تصور بھی حاصل تھا۔ گویا انسان کی تخلیقی خصوصیت میں یہی ایک چیز وجہِ خصوصیت ہے۔ کہ اسے اپنی پیدائش کے ساتھ اللہ کا حقیقی تصور حاصل تھا۔ بلکہ انسانی بناوٹ (پوزیشن) کا تقاضا ہی یہ ہے۔ کہ وہ اپنی

---

[1] قرآن کے اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسکی تخلیق اور شرافت میں یہ اہلیت تھی کہ اللہ نے تمام اسرار و نشانات سے اسے آگاہ کیا۔

شرافت کے اعتبار سے کائنات اور علت لامحدود (اللہ) کے اسرار و کیفیات سے آگاہی حاصل کئے ہوئے ہو۔ اور دنیا میں اسکی ڈیوٹی یہی ہے کہ وہ اپنی اس عظمت پر مادی قوتوں کا دباؤ نہ آنے دے۔ اور جب لذتوں اور ضرورتوں کی الجھن سے انسان کا آئینۂ دل سیاہ ہو گیا۔ تو اسے اسرار الٰہی کا عکس حاصل نہ ہوسکا۔ اور وہ دنیوی لذتوں میں کھو کر اپنے ماضی کو بھول گیا۔ جسکا نتیجہ لازمی یہی تھا کہ انسان اپنی دی ہوئی عظمت کو کھو کر صرف مادّہ کا مادّہ ہی رہا جسکا اثر شر و فساد تھا اور انسان اپنی اس کمتر حالت میں اپنی اصلی حیثیت کو نہ پہچان سکا۔ نہ ہی اسے اپنی خصوصیت کو اپنی اصلی ہیئت میں دیکھنے کا موقع ملا۔ جس سے انسان کو معلوم ہوتا۔ کہ انسان خود کس حیثیت کا مالک رہا اور اسکے علم میں اسے کیا کچھ حاصل رہا۔ لیکن اللہ کا ارادہ ازلی چونکہ ایک خلیفہ اور ایک مکمل انسان کا قیام دنیا پر جاری رکھنا تھا۔ اسلئے اس شر و فساد کے زمانہ میں ایک شریعت کے ذریعہ پھر انسانی مقصد کی تجدید کی گئی یہ واقعات اس امر کی بین دلیل ہے۔ کہ انسانی علم میں سب سے اول ہی اللہ کا تصور قائم تھا۔ جو فطری طور پر قلب و حافظہ میں مستور رہا اور اسی حافظہ کی شہ پر ہر زمانہ میں حقیقی اور باطل خداؤں کے وجودوں کا تخیل پیدا ہوتا رہا۔

زمانہ ہر دور میں یکساں حالت میں نہیں رہا۔ کثرت آبادی اور پھیلاؤ نے انسان کو ہوس اور لذت کی طرف مائل کر دیا۔ تو مادیت کا ملمع انسان پر چڑھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حقیقی علم کی حافظہ میں ترتیب نہ رہی۔ انسان کے حافظہ میں ضرورت سے زیادہ دنیوی ضروریات کا ہجوم ہوا۔ حافظہ (upset) بے ترتیب ہوا۔ انسانی روحانیت مدھم پڑنے لگی۔ انسانی مادی خاصیتوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔ اور انسان سرے سے ہی اپنی خالص قوتوں کو کھو کر اپنے مطمح نظر کو بھول گیا دنیوی لذات اور خواہش نے اسے زیادہ حصول کی طرف مائل کر دیا۔ انسان ہوس پرست۔ خودغرض بن کر فساد و خونریزی پر آمادہ ہوا۔ زمانہ میں جب قوانین فطرت کی مجموعی حیثیت میں خلاف ورزی ہونے لگی تو نظام کائنات میں خلل واقع ہونے لگا۔ یہ فطری قانون ہی ہے۔ کہ ایسے موقع پر خود بخود انقلابات پیدا ہوتے ہیں۔ اور اچانک تباہیاں آنے لگیں۔ انسانی کمزوری کی وجہ سے لوگوں میں بیماریاں

پیدا ہونے لگیں۔ جنکے لئے کوئی علاج مہیا نہ تھا۔ کچھ فطری طور پہاڑوں کا پھٹنا۔ زمین کا پھٹ جانا۔ زلزلے۔ بجلی کی کڑک۔ بادلوں کی گرج۔ بارشیں وغیرہ یہ سب واقعات انسان کیلئے مرعوب کن اور غیر معروف تھے۔ ان کا اثر دل ہلا دینے والا تھا۔ اس سے پیشتر انسان کو اگر چہ ان واقعات سے سابقہ پڑا ہو۔ تو یہ چیزیں اسکی خالص قوت کے لحاظ سے اسے متاثر نہیں کر سکتی تھیں۔ اگر چہ یہ واقعات انسان کیلئے نئے بھی تھے۔ اور ممکن ہے اسے خوف بھی پیدا ہوتا ہو۔ لیکن اسوقت انسانی خواص روحانی تھے۔ تو انسان اپنے خوف میں اسی حقیقی خالق سے پناہ چاہتا تھا (جسکا تصور اسکے قلب میں موجود تھا) اور یہی تصور ایک کمزور انسان کے حافظہ میں بھی منتقل ہوا۔ لیکن اسکی مادیت کی وجہ سے یہ تصور حافظہ میں کھو گیا۔ اور جب انسان دوبارہ ان واقعات سے متاثر ہوا۔ تو یہی خالق حقیقی کا تصور ابھرا۔ لیکن وہم نے انہیں گڑگڑاہٹوں۔ پہاڑوں۔ سورج اور ایسی مہیب قسم کی صورتوں کا وہمی نقشہ قائم کر کے انہیں کے آگے عاجزی اختیار کی۔ دراصل یہ خالق حقیقی کے تصور کا پسِ منظر تھا۔ کہ انسان نے اپنی کمزوری کے باعث حقیقت کو باطل کے ساتھ ملا کر اصل خدا کو وہمی خداؤں کے تصور میں منتقل کر دیا سوچنے کا مقام ہے۔ کہ انسانی ذہن میں ایک شے کا مادّہ نہ ہو۔ تو اسکا وجود کسی صورت میں بھی قائم نہیں ہوسکتا ہے۔ اسکے برعکس اگر انسانی ذہن میں کسی شے کا وجود (خواہ وہ فطری ہو یا واقعاتی) موجود ہو تو (Automatically) یہ تصور انسان کے سامنے آجاتا ہے۔ اس طرح اگر انسان کو خوف پیدا ہوا یہ فطری اثر تھا تو اسکے ساتھ خوف کے وقت کسی قوت کی پناہ حاصل کرنا انسانی ذہن میں کیسے آتا ہے۔ یا کس علم سے آتا ہے۔ جب تک کہ پناہ حاصل کرنا اسکی فطرت میں نہ پایا جائے۔ ''فطرت کا بن جانا''۔ اسکے اجداد سے ایک اثر کا وراثتاً منتقل ہونے کو کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بچہ کا حافظہ اور ارادہ نامکمل ہوتا ہے۔ وہ آگ اور اسکی مضرت سے آگاہ نہیں ہوتا ہے۔ اگر اسکے سامنے کوئی گرم شے رکھی جائے تو بچہ بلا ارادہ اس پر ہاتھ رکھیگا۔ گرمی کی شدت سے اسکا ہاتھ جل جائیگا۔ اس واقعہ کے بعد لازمی طور یہ اثر اسکے حافظہ میں محفوظ ہو جانا چاہیے۔ لیکن حافظہ کی عدم صلاحیت کی وجہ سے یہ اثر حافظہ سے زائل ہو جائیگا۔ اور بچہ بار بار

گرم چیز پر ہاتھ رکھیگا (بلاارادہ) اور جلتا رہیگا۔اسکا مطلب یہ ہے۔کہ جب تک بچہ میں حافظہ اور ارادہ کی صلاحیت مکمل نہ ہو وہ ان تاثرات کو قبول نہیں کریگا۔حافظہ اور ارادہ کی تکمیل پر ایک بار ہی ایساواقع ہونے سے دوبارہ وہ آگ پر ہاتھ نہیں رکھیگا کیونکہ اسدفعہ ایک طرف اسکا حافظہ واقعہ کو محفوظ کر چکا ہے اب وہ اپنا ارادہ بھی مستقل رکھتا ہے۔اسلئے وہ آگ پر ہاتھ رکھنے کا ارادہ نہ کریگا۔اس سے پیشتر اسکی حرکت غیر ارادی طور پر ہوتی تھی یہ واقعات وراثتاً انتقال نہیں کرتے۔ کیونکہ اس میں انسانی ارادہ کا بھی تعلق ہوتا ہے۔اسکے برعکس بچہ کے منہ میں جب پہلی بار ماں کا پستان دیا جاتا ہے۔یا انگلی دی جاتی ہے۔تو بچہ اپنی بھوک (جسکا اسے احساس نہیں ہوتا ہے بلکہ بھوک کی کیفیت اس پر اثر انداز ہوتی ہے) کے وقت بلا ارادہ چوسنا شروع کرتا ہے۔(کیونکہ وہ چوسنے کے عمل سے بھی واقف نہیں ہوتا ہے) یہ چیز بھی اسکے حافظہ میں محفوظ نہیں ہوتی ہے۔لیکن بچہ پھر بھی چوسنا شروع کرتا ہے۔ایک واقعہ کا حافظہ میں نہ ہونا۔پھر اس واقعہ کو دہرانا۔فطری کہلاتا ہے چونکہ اس سے قبل اسکے اجداد میں ابتدائے آدم سے یہ واقعہ مسلسل چلا آیا ہے۔کہ قوانین فطرت کے مطابق ہر شے اپنی زندگی کا سامان ہر حال میں حاصل کرے۔یہ واقعہ انسان کی (غیر ارادی طور پر) عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔لیکن یہ چیز جب حافظہ میں نہیں تو پھر انسان کیسے اسکا اثر قبول کر لیتا ہے۔اسے فطری وجدان کہا جاتا ہے۔اسکا تعلق انسان کے لطیف قویٰ سے ہوتا ہے جو انسان میں ابتدأ سے انتہا تک مستقل حالت میں پائے جاتے ہیں۔جسے شعور کہا جاتا ہے۔گویا اجداد کے یہ عادات شعور سے وابستہ ہوتے ہیں۔اور یہی روحانی وجدان ہی اسکی تحریک دیتا ہے۔اسکے مخزن قلب کی لطیف حالت اور شعور ہی ہوتے ہیں چونکہ قلب بھی مثل حافظہ کے اپنے میں خواہشات و واقعات محفوظ رکھنے کا عادی ہوتا ہے اسلئے ایسے واقعات اسی جگہ سے پیدا ہوتے ہیں۔اسی کیفیت کو حافظہ میں گزشتہ واقعات کا جمع رہنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔کیونکہ یہ کیفیت لطیف ہوتی ہے اور عمومی حیثیت میں اس کیفیت کو پایا نہیں جاتا اسلئے اسے حافظہ سے ہی وابستہ کیا جاتا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے۔کہ انسان سے ابتداءً ہوئے واقعات محفوظ ہونے کی مختلف

نوعتیں ہیں۔ایک وہ واقعات جو ہرانسان سے اپنے حافظہ وارادہ کی عدم تکمیل میں سرزد ہوتے ہیں انکا تعلق قلب وشعور سے ہوتا ہے انہیں (قطعی) فطری کہا جاتا ہے دوسرے وہ جوانسان کے حافظہ وارادہ کے مکمل ہونے پرشدت کے ساتھ اثر انداز ہوں۔انکی شدت کا اثر ہر حافظہ میں مستور رہتا ہے۔ان واقعات میں بچہ کا دودھ پینا غیر ارادی حرکات کا صدور ہونا پایا جاتا ہے۔اور ہر انسان انہیں اپنے حافظہ وارادہ کے مکمل ہونے پر ہی اخذ کرتا ہے۔یہ واقعات بھی انسان کی عادت ثانیہ بن کر فطری ہیئت اختیار کر لیتے ہیں یہی وہ فطری عادت ہے۔جوانسانوں میں وراثتاً منتقل ہوتے ہیں جن میں اللہ کا یا باطل خداؤں کا تصور پایا جاتا ہے تیسرے وہ واقعات جوانسان کے ساتھ اسکے تعقل و حافظہ کی تکمیل پر پیش آتے ہیں۔چونکہ یہ حالات بدلنے والے ہوتے ہیں۔ اسلئے یہ انسان کے فنا ہونے کے ساتھ ہی ضائع ہوتے ہیں انکا انتقال نہیں ہوتا۔

الغرض انہیں تاثرات کی بنا پرانسان نے اپنے اسلاف کے تصورات کا اثر حاصل کیا۔ چنانچہ ابتدا میں انسان نے ایک طرف فطری (قطعی) طور پر اپنی اشرف المخلوقاتی ہیئت کے مطابق اپنے قلب وشعور سے ایک خدا کا تصور حافظہ میں محفوظ کرلیا دوسری طرف واقعاتِ زمانہ کی شدت نے اسے اپنی کمزوری پر باطل خداؤں کا تصور دیا۔اورآئندہ انسان نے انہیں تاثرات کی بنا پر دونوں تاثرات کا مادّہ حاصل کیا۔یہی وجہ ہے کہ ہر انسان نے اپنے خوف کے وقت ایک خدا کی پناہ تلاش کی لیکن آدمی کی کمزور حالت نے اسے باطل خداؤں کی طرف مائل کر دیا۔اور ہر زمانہ میں انسان نے مخلوق قوتوں کی شدت سے متاثر ہو کر انہیں اپنا خدا بنالیا۔اوراپنی مجبوری پر انہیں خداؤں سے اپنی ضرورتوں کو وابستہ کر دیا۔گویا ان خداؤں کی خداوندی وجہ مجبوری تھی۔ان کا پیدا ہونا۔ انسانی (روحانی) کمزوری۔حقیقت سے دوری۔اور مادیت کے غلبہ کے اثر کی وجہ سے تھا۔ورنہ حقیقتاً ان خداؤں کے ماسوا انسان میں ایک ایسا بھی حقیقی تصور موجود تھا جو ازل سے وراثتاً چلا آتا تھا۔اوراس خدا کا تصور وجہ مجبوری نہیں تھا۔ بلکہ حقیقی اور فطری تھا۔

اللہ کیلئے انسانی ابتدائی تصور صرف محبت اوراسکی روحانی جمالی عظمتوں کے ساتھ تھا۔

لیکن جوں جوں انحراف بڑھتا گیا۔محبت دبتی گئی۔ بغاوت اور عدم توجہی نے اللہ اور اسکی محبت کو دل سے محو کر دیا۔ جب مسلسل بناؤ اور بگاڑ کی زمانہ میں صورتیں پیش آئیں! اسوقت انسانی کمزوری اور روگردانی کے باعث ہر محبوب ادا بھی قہر کی صورت میں محسوس ہونے لگی۔اسوقت انسان کا تسلیم باطل قہرمانیوں سے ملوث تھا۔جب انسانیت انہی خداؤں کے تصورات میں کھوگئی۔تو یہ چیز خلاف فطرت تھی۔اسکی اصلاح ضروری تھی اور ہر اصلاح کیلئے ایک پیغمبر کا ہونا ضروری تھا۔پیغمبر نے سوائے اسکے اور کوئی چیز ابتداءً پیش نہیں کی۔ بلکہ ایک ابتدائی تصور کی یاددہانی کرائی۔ایک اللہ خالق حقیقی کے تصور کی تجدید کی اور انحراف سے نکلنے کیلئے ایک شریعت پیش کی جسکا بنیادی نقطہ ایک اللہ کا تصور تھا۔کہ انسان باطل خداؤں کے رعب سے نکلکر ایک محبوب۔رحمٰن۔رحیم۔غفور۔خدا کی طرف آئے۔ایک ہیبت زدہ انسان کیلئے یہ بہتر طریقہ ہوسکتا ہے۔کہ اسے محبت ونرمی سے اپنی طرف متوجہ کیا جائے۔تاکہ انسان وہمی ابتلا سے نجات حاصل کرے۔اور وہمی خداؤں کی قہرمانیوں کے مقابلہ ایک محبوب خدا کا تصور انسانی قلب میں جاگزیں ہو جائے۔یہ طریق پیغمبرانہ اللہ کے تصور کیلئے علی الاعلان اظہار تھا۔تاکہ اللہ کے تصور کیلئے کسی میں خامی نہ رہ جائے۔

زمانہ میں کسی طرح بھی خداؤں کا تصور کیا گیا ہو۔لیکن ہر زمانہ میں ہر بشر ہر قوم۔ہر مذہب میں ایک حقیقی اللہ کا تصور ضرور رہا ہے۔زمانہ کے حالات نے اصل خدا کا تصور لوگوں کے دلوں سے محو کر ڈالا۔مگر پیغمبروں نے از سرِ نو اللہ کے تصور کی دوبارہ داغ بیل ڈالدی۔یہ عکس قلب و شعور اور حافظہ میں شدت سے رہا۔انسانوں نے اپنے خداؤں کو مادی حس سے تصور میں لایا تھا۔اسکے برعکس پیغمبر نے اللہ کے تصور کے لئے ایک مخصوص طریق پیش کیا۔وہ یہ کہ انسان خود ماوراء ادراک قوتوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے اللہ کا عرفان (پہچان) حاصل کرے۔جسکے لئے انسان کو دوبارہ اپنا ابتدائی روحانی وجود حاصل کرنا تھا۔سو جنہوں نے اپنی کثیف حالت سے لطیف جسم کی طرف ترقی کی انہوں نے بالمشاہدہ ماوراء ادراک خدا کو پالیا۔اور جنہوں نے پیغمبر کو اسکی روحانی عظمت کے ساتھ تسلیم کیا۔اور اپنی جدوجہد جاری رکھی ان میں جو ماوراء ادراک میں جس مقام تک

پہنچا اسنے اسی حالت میں مشاہدہ کیا۔اور جو اپنی جد وجہد میں پورے نہ اتر سکے لیکن اپنی زندگی تک اپنی کوششیں جاری رکھیں۔انکا تصور خود بخود ایمان بالغیب کی صورت میں قائم رہا۔انکے ایمان بالغیب کی بنیاد صرف پیغمبر کی پیغمبرانہ قوت اور اسکے کردار پر ہی قائم ہوئی۔کہ وہ ایک ہستی ہے۔جو ادراک ظاہری سے ماوراٗ ایک ایسی ہستی ہے۔جسکے وجود کیلئے مادی حس سے سوچنے میں انسان حیرت و درماندگی میں پڑ جاتا ہے۔

پیغمبروں کا ظہور بھی تقریباً ابتدائی دنیا سے ہی شروع ہوا۔اسوقت سے حال تک جتنی بھی قومیں ہوئیں اُنکی زبانوں میں ایک ایسی ہستی کا نام ضرور آتا ہے۔جسے اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔پیغمبروں کے بعد زمانہ ہر بار کروٹ بدلتا رہا۔اور ہر قوم میں نفس پرست پیرو بھی پیدا ہوتے رہے اور لوگ ہوس اور انحراف کی طرف مائل ہوتے رہے۔پھر اللہ کا تصور حقیقی مٹتا رہا اور باطل خداؤں کا تصور آتا۔لیکن باطل خداؤں کے ساتھ پھر بھی ایک حقیقی خالق کا تصور لوگوں کے ذہنوں میں موجود رہا۔چنانچہ پیغمبروں کے ظہور کے بعد انسانی تصور کی یہ کیفیت رہی کہ ایک طرف وہ اپنی ضرورتوں کے لئے اپنے بناوٹی خداؤں کی طرف رجوع کرتے رہے۔دوسری طرف ایک نادیدہ ماوراٗ ادراک اللہ کے بھی قائل رہے۔اور یہ چرچا ہر زمانہ۔ہر قوم۔ہر فرد میں رہا۔حافظہ کے اسی بنیادی تخیل پر ہر محقق ایک ایک کیفیت کا نقشہ کھینچتا رہا۔چنانچہ زمانہ میں قوموں نے جتنے بھی مذہبی رنگ اختیار کئے سب نے اپنی اصطلاحی زبانوں میں اللہ کا ایک ہی تصور بتلایا۔کہ وہ ایک ماوراٗ ادراک اللہ ہے اور اسی تخیل پر اللہ کو الٰہیات۔ولہ۔الہ وغیرہ۔عبرانی۔سریانی۔کلدانی۔حمیری اور دیگر زبانوں میں پکارا گیا عربی بھی چونکہ ابتدائی زبان ہے۔اسمیں اس ماوراٗ ادراک ہستی کا تصور اللّٰـہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔چنانچہ عربی اصطلاح میں بھی اللہ اس ہستی کیلئے بولا جاتا ہے۔جسکی ذات کیلئے اگر مادی حس سے تصور کیا جائے۔تو اسکے ماوراٗ ادراک لاانتہا وجود کی کُنہ پانے میں انسانی تعقل (حافظہ) تھک کر حیرت و درماندگی میں پڑ جاتا ہے۔یہی تعریف اللہ نے اپنے کلام (قرآن) میں انسانی تصور کے مطابق پیش کی۔اور اسلامی شریعت میں سب سے پہلی

(Term) شرط اللہ کے تسلیم کی اسلئے رکھی گئی کہ انسانی تفکر کیلئے انحراف کے گرداب سے نکلنے کیلئے اسی تصور کو قائم کرنے سے۔ انسان اپنی ابتدائی لطیف حالت پر آنے کیلئے راستہ ہموار پا سکتا ہے۔

اللہ اپنے علم الٰہی میں بعد از تسلیم (ایمان بالغیب) اکثر مقامات پر ایک حقیقی تصور بتا تا ہے۔ تاکہ انسان کو باطل خداؤں کے مقابلہ میں ایک ایسا احساس پیدا ہو۔ جو احساس انہیں ان باطل خداؤں کے وہمی تصور سے علیحدہ کر کے ایک ایسی راہ پر لگائے جو راہ ایک صحیح نصب العین ایک حقیقی منزل مقصود تک پہنچاتی ہو اور اللہ کی عظمت و محبت کا سکہ انسان کے قلب پر جم جائے۔

پارسی: (زرتشت کی قوم) نے اللہ کا تصور لیا تو کہا۔ ''زرتشت کہ وہ جہانِ تیرتا سے آیا ہے''۔ یعنی زرتشت دراصل خدا ہی ہے۔

یہودی: (قوم بنی اسرائیل) نے کہا۔ ''یعقوب۔ داؤد۔ عزیر۔ ان میں سے ہر ایک خدا کا بیٹا ہے''۔ گویا خدا باوجود لامحدود اور مادیت سے پاک ہونے کے بھی بیوی رکھتا ہے۔ اور بیٹے جنتا ہے۔

عیسائی: کہتے ہیں۔ کہ ''عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے'' یا حضرت مریم۔ عیسیٰ اور خدا ایک ہی چیز ہیں۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ ''۳۲ اوتاروں کی نسبت'' کہ پرمیشر نے خود ہی مادی جسم اختیار کر کے اوتاروں کی شکل بنا کر آیا۔ مہا بھارت کا بیان ہے۔ کرشن مہاراج حقیقتاً خدا ہی تھے۔

بدھوں کا اعتقاد ہے کہ مہاتما بدھ کہ ''وہ ''ارہم'' خود خدا انسانی شکل میں ہے''۔

سناتن دھرمیوں کا عقیدہ ہے۔ کہ پانچ پانڈو۔ سورج کے بیٹے ہیں۔ اور خدا اوتار کی شکل بن کر دنیا میں آتا ہے۔

قرآن اللہ کے تصور کیلئے ایک ایسی ترتیب کا اعلان کرتا ہے۔ جو فی الحقیقت قوانین فطرت سے مطابقت کرتا ہے:-

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ج لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ط لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ

مَا فِی الْاَرْضِ ط مَنْ ذَالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ج وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ج وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا ج وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ○ (پارہ ۳ سورۃ ۲ آیت ۲۵۵) اللہ ایسا ہے۔ کہ نہیں کوئی معبود سوائے اسکے۔ کہ وہ ہمیشہ سے زندہ ہے۔ نہ اسکو اُونگھ آتی ہے۔ نہ نیند آتی ہے۔ واسطے اسی کے ہے (یعنی اسی سے بنا ہے) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ ایسا کون شخص (خدا) ہے جو اسکے آگے سفارش[1] کر سکے۔ بغیر اسکی اجازت کے۔ وہ جانتا ہے۔ جو کچھ انکے آگے ہے۔ اور انکے پیچھے۔ نہیں کر سکتا کوئی احاطہ کسی چیز پر اپنے علم سے۔ مگر جسقدر وہ چاہے کسی کو علم کرانا۔ اسکی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اپنے میں سما لیا ہے اور نہیں تھکاتی نگہبانی ان دونوں کی اور وہ عالیشان اور عظیم الشان خدا ہے۔

اس نشان سے اور بھی مختصر اور موثر پیرایہ میں ایک مکمل تصور پیش کیا ہے:۔

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ○ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ○ لَمْ یَلِدْ ۵ وَلَمْ یُوْلَدْ ○ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ○ (پارہ ۳۰ سورۃ ۱۱۲ آیت ۱ تا ۴) ان لوگوں سے کہہ دیجئے (یارسول اللہ ﷺ) کہ اللہ اپنی ذات وصفات میں ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے (کسی چیز کا محتاج نہیں) نہ اسکی اولاد ہوئی۔ نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ نہ اسکا ہمسر کوئی (خدا) ہے۔

ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ج عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ج ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ○ ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ج اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ط سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ○ ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ط یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَھُوَ

---

[1] کافروں کا عقیدہ یہ تھا کہ ایک اللہ ہے جس سے کچھ براہ راست نہیں مانگا جاتا۔ باطل خدا سفارش کرتے ہیں اور وہی اللہ سے لیکر ہمیں دیتے ہیں۔

الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ O (پارہ ۲۸ سورۃ ۵۹ آیت ۲۲ تا ۲۴) وہ اللہ ہے۔ نہیں کوئی معبود سوائے اسکے۔ جاننے والا ہے علم غیب اور ظاہر کا وہ وہی مہربان رحم والا ہے۔ وہ ایسا اللہ ہے۔ نہیں کوئی معبود سوائے اسکے وہ بادشاہ ہے۔ (عیبوں سے) پاک ہے سالم ہے امن دینے والا ہے۔ نگہبانی کرنے والا ہے۔ زبردست خرابی کا دور کرنے والا ہے۔ بڑی عظمت والا ہے۔ وہ پاک ہے ان باتوں سے جن کو اسکے ساتھ شریک کیا جاتا ہے۔ وہ وہی اللہ ہے۔ پیدا کرنے والا۔ ٹھیک بنانے والا۔ صورت (خوبصورت) بنانے والا۔ واسطے اسی کے ہیں اچھے نام (یعنی یہ کائنات کی تمام خوبصورتی) سب چیزیں اسی کی تسبیح کرتی ہیں۔ جو آسمانوں اور زمین میں ہے (یہ تصور نہایت وضاحت سے باطل خداؤں اور باطل عقیدوں کی رد کرتا ہے)۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ O لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ج وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر" Oهُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ج وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْم" O (پارہ ۲۷ سورۃ ۵۷ آیت ۱ تا ۳) پاکی بیان کرتا ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور وہ غالب حکمت والا ہے۔ واسطے اسی کے ہے۔ بادشاہی آسمانوں کی اور زمین کی۔ زندہ کرتا ہے۔ اور مارتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ ہے (سب سے) پہلے۔ اور (سب سے) آخر۔ ظاہر اور چھپا ہوا۔ اور وہ ہر چیز سے علم رکھتا ہے۔

قرآن کریم کے نازل ہونے کے وقت تقریباً ہر اطراف کے لوگ اور قوم و مذہب کے لوگ مکہ میں موجود تھے۔ ہر مذہب کے عقیدے میں خدا کیلئے مختلف نظریات پیدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ قرآن نے بھی اسی نوعیت سے ان اعتقادات کی تردید میں قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت کرنے والے ایک حقیقی نظریہ کا تصور پیش کیا۔ سب سے خصوصی تصور اللّٰہ کا ہے۔ اللہ کا نام تمام مذاہب میں اس ہستی کے متعلق کہا جاتا ہے۔ جس کا تصور قدیمی چلا آتا تھا۔ اور ماوراء ادراک ایک ایسے مقام پر ہو جہاں تک انسان کے تعقل کی رسائی نہیں ہو سکتی کسی مذہب کسی فرد کا یہ عقیدہ مثال کے طور پر بھی پیش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کہ اللہ کا وجود سرے سے ہی مفقود ہو۔ کیونکہ اللہ کے متعلق

عقیدہ ایک تو مسلسل تواریخی چلا آیا ہے۔ دوسرے انسانی فطری نقوش بھی اس تواتر کو قائم کرتے رہے۔ اسلئے قرآن بھی عام فہم کے مطابق اللّٰـہ کا لفظ خصوصی طور استعمال کر کے بتاتا ہے۔ کہ اللہ کے تصور کیلئے یہ احساس کیا جائے۔ کہ وہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ کوئی ایسی ہستی نہیں جسے اپنا معبود تصور کیا جائے۔ یعنی سوائے حقیقی اللہ کے کوئی ایسی ہستی نہیں جس سے انسان اپنی ضروریات کی مجبوری کو وابستہ کرے۔ ایک اللہ ہی ہے جو خالق ہونے کی حیثیت سے پروردگار (پالنے والا رب) کہلانے کا مستحق ہے۔ ربوبیت کا یہ نظریہ حقیقی ہے۔ اور ضرورتوں کے پورا ہونے پر مٹ نہیں سکتا۔ کیونکہ انسان ہر حال میں اپنا سامان زندگی حاصل کر رہا ہے۔ یہ سامان زندگی اسکی پیدائش کے ساتھ ہی خالق نے پیدا کیا ہے۔ اسلئے اس اللہ کا وجود ازل سے ہی قائم ہے۔ اور جب تک انسان کائنات کی اشیأ سے فائدہ حاصل کر رہا ہے۔ تب تک اللہ کا وجود بھی قائم رہیگا۔ انسان کا سانس لینا ہوا سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ہوا قدرت نے پیدا کی ہے۔ سوتا ہے۔ کھاتا ہے۔ پیتا ہے غرض جن ضرورتوں میں انسان اپنی زندگی گزارنے میں آسانی حاصل کر رہا ہے یہ سب ربوبیت میں شمار ہیں۔ انسان ان ضرورتوں کیلئے ہر حال میں مجبور ہے۔ اسلئے حقیقی اللہ کا تعلق ہمیشہ ہی انسان سے رہیگا۔ بصورت دیگر اگر انسان اپنی تمام ضرورتوں سے بے نیاز ہو جائے۔ یعنی وہ اپنی نیند۔ اپنی ہوا۔ کھانے۔ پینے۔ چلنے پھرنے اور زندگی اور موت پر بھی قادر ہو جائے۔ تب بھی جس قوت سے وہ اپنی ہر ضرورت پر قادر ہوگا۔ وہ قوت بھی اللہ کی پیدا کی ہوئی ہوگی اس حالت میں بھی انسان اسی کی دی ہوئی قوت کا محتاج ہوگا۔ کیونکہ ہر قوت کا وہی خالق ہے۔ اس حالت میں بھی انسان اور اللہ کا تعلق مٹ نہیں سکتا۔ پھر بھی اللہ کا وجود غائب نہیں ہو سکتا۔

انسان کا اپنی ضرورتوں سے بے نیاز ہو جانا۔ کچھ معنی رکھتا ہے۔ انسان کے بے نیاز ہونے کا یہ مطلب ہے۔ کہ انسان۔ کائنات کی تمام قوتوں سے بالاتر ہو کر ایک ایسی قوت کا حامل ہو جو تمام کائناتی قوتوں سے قوی ہو۔ جب ہی وہ کسی شے کا حاجتمند نہ رہیگا۔ اور مجموعی حیثیت سے انسان اتنی قوت حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر انسان کا یہ خیال ہے۔ کہ میں کائنات کی برقی قوت سے

ایک ایسی ایجاد پر قادر ہو جاؤں جو موت و زندگی پر غالب ہو جائے ــــ یہ خیال قابل یقین ہو سکتا ہے۔ ''مگر محدود اور چند ے'' یہ خیال عالمگیر حیثیت حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس قوت کا وجود بھی مادی (البتہ نیم لطیف ہو سکتا ہے) ہو گا کیونکہ یہ قوت بھی مخلوق کی گئی ہو گی۔ اس میں ہمیشہ قائم رہنے کا مادہ نہ ہو گا دوسرے بہت کم۔ اور قلیل وقت کیلئے ہو گی ہر انسان بجائے خود یہ قوت حاصل نہ کر سکیگا بلکہ کسی موجد کا محتاج ہی ہو گا۔ اسکا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ اول موت پر قابو پانے سے نظام زندگی میں خلل واقع ہو گا۔ دوسرے ایک ہی انسان کی محتاجی از سر نو فرعونیت کے وجود کو قائم کر دیگی۔ انسان ایک ہی انسان کی محتاجی کیلئے اسی کا غلام بن جائیگا۔ مادی قوت سے حاصل کیا ہوا اقتدار انسان کو ایک دن جبکہ وہ اپنے برے انجام سے لاپروا ہو جائے مادی خصلت اسے فرعون بننے پر اکسائیگی۔ اور دنیا پر وہی کیفیت طاری ہو جائیگی۔ جو زمانہ میں کسی جابر حکمران کی حکومت میں پیدا ہوتی ہے۔ اسطرح انسان اگر ایک خدا کا تصور ختم کریگا لیکن اسکے ساتھ ہی وہ ایک ادنیٰ انسان کا محتاج ہو گا اس حالت میں بھی انسان خدا کے تصور سے بچ نہ سکیگا۔ بلکہ اسکا تصور باطل خداؤں کے تصور سے زیادہ ناقص ہو جائیگا اور نظام کائنات میں عام بغاوت ہو جائیگی اور انسان حد درجہ ذلیل ہو جائیگا۔ اور پھر کسی پیغمبر کے وجود کی ضرورت پیدا ہو جائیگی۔ یہ امر قابل غور ہے۔ کہ انسان نے اگر اپنی ایجادات میں اسدرجہ ترقی حاصل کر لی تو لازمی طور دنیا پر ایک خطرناک حکومت قائم ہو جائیگی۔ جس حکومت کا وجود فطرت برداشت نہیں کریگی اور زمانہ میں قوانین فطرت کے مطابق ایک انقلاب پیدا ہو جائیگا اور یہ تمام مادی قوتیں خود بخود دفنا ہو جائینگی۔ اور انسان پھر اپنے پہلے قدم پر واپس لوٹیگا۔

الغرض انسان کسی حالت میں بھی ایک خدا کا تعلق منقطع کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک فطری قانون ہے البتہ جہاں کائنات میں یہ قوتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ قوتیں اپنی لطیف حالت میں واقع ہیں۔ ایتھر۔ ایٹم۔ برقی قوت یہ سب لطیف قوتیں ہیں انہیں قوتوں کے پانے سے انسان کو موت و زندگی پر قادر ہونے کی سوجھی ہے۔ اور جہاں پر ان قوتوں کی (Mater) علت واقع ہو گی وہ ان قوتوں سے بالاتر قوت کی حامل ہو گی۔ انہیں قوتوں کا پیغمبر حامل (ماوراُ ادراک

میں) ہوتا ہے۔ یہ قوتیں کلام الٰہی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں یہ قوتیں شریعت کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہیں۔ اسلئے جب تک شریعت پر انسان کاربند نہ ہو۔ وہ اپنی موت و زندگی پر صحیح معنوں میں قادر نہ ہوسکیگا۔ شریعت کے تحت ہر انسان مساوی حیثیت سے اس قوت کا حامل ہوگا اور یہ قوت عالمگیر حیثیت حاصل کریگی۔ لیکن اس صورت میں انسان ایک حقیقی اللہ کے عقیدہ پر اور زیادہ پختہ ہوگا اور نظام کائنات میں خلل بھی واقع نہ ہوگا کیونکہ فطرت کا مقصد ہی یہی ہے۔ کہ انسان اپنی روحانی قوت سے وہ طاقت حاصل کرے جو دائمی زندگی عطا کرنے والی ہو۔ وہ زندگی عرفان الٰہی (یعنی فنافی اللہ) سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اللہ الحی القیوم ہے۔ جب انسان اپنے آپکو اس تک نہ پہنچائے حی و قیوم ہونہیں سکتا۔ یہ سب قوتیں اسی اللہ سے بطور رب (پالنے والا) حاصل ہوسکتی ہیں اس حالت میں بھی انسان ایک خدا کو بھول نہیں سکتا۔

بہرحال اس طویل بحث سے مراد یہی ہے۔ کہ انسان کسی حالت میں بھی ایک اللہ کا نظریہ ختم نہیں کرسکتا۔ اسلئے ہر حالت میں اپنی ہر قسم کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے اس اللہ کے آگے جھکنا ضرور ہے۔ بلکہ انسان اسکے آگے جھکنے پر مجبور و پابند ہے اور انسان ایک اللہ سے انحراف کرنے میں خودغرضی اور جہالت سے کام لے رہا ہے۔ وہی معبود ہے۔ اسی کے نظام میں انسان لامحالہ پابند ہے۔ کیونکہ وہ ابد سے زندہ ہے۔ اسی سے زندگی کا وجود ہے الحی القیوم۔ جسقدر بھی نظام کائنات کی ترتیب ہے۔ سب اسی اللہ سے وابستہ ہے۔ اور باوجود طویل زمانہ گزرنیکے بھی یہ نظام اسکے قدرت کے ہاتھ میں صحیح و سالم رہیگا۔ وہ ذات اتنی وسیع اور قدیر ہے۔ کہ اس میں مادیت کا اثر نہیں کہ وہ تھک جائے۔ یا اسے نیند کا غلبہ ہو۔ نیند صرف مادّہ کیلئے ہے۔ نور ہونے کی حیثیت سے وہ اونگھ اور نیند سے پاک ہے۔ ''لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ'' وَّلَا نَوْمٌ'' ۔ علت و معلول (Mater) کی نسبت کی ترتیب یہ ہے کہ ایک شے دوسری شے کے وجود سے بنتی ہے۔ اور کائنات کی ہر شے میں یہی ترتیب پائی جاتی ہے کائنات کے بعد ماوراُادراک ماحول و کیفیات جن میں آسمان اور آسمان کی علتیں: یہ تمام علتیں ایک لامحدود علت سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسلئے تمام

کائنات السموات و الارض اسی خالق سے بنے ہیں لَـہٗ مَـا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اور جب وہی اللہ ہر شے کا خالق ہے۔تو ہر مخلوق کی پرورش کا ذمہ بھی اسی اللہ پر ہے۔پھر ضرورتوں کا پورا کرنا بھی اسی کے ذمہ ہے جب یہ کام اسی کے ذمہ ہے۔تو پھر کونسی ایسی چیز ہے۔ جسے خدا بنا کر اُس سے مانگا جائے۔جب اسنے انسان کی پیدائش کے ساتھ انسان کیلئے اسکا سامان زندگی بھی پیدا کیا۔اور وہ خود براہ راست دے سکتا ہے۔تو پھر کسی سفارش کرنے والے کی ضرورت ہی کیا؟ مَنْ ذَالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ۔البتہ اللہ اپنی مرضی سے جسکو اجازت دے جسے اختیار دے کہ وہ سفارش کرے۔یا انسان کی بہتری کیلئے وسیلہ بنے تو وہ سوائے پیغمبر کے اور کوئی نہیں ہو سکتا جو دین الٰہی کا دعویدار ہوتا ہے۔اور انسانی بہتری اسکے سامان زندگی کے حصول کیلئے نہیں۔رزق دینے کیلئے نہیں۔بلکہ ایک گم کردہ راہ انسان کی اصلاح کرنے کیلئے اور اسے حقیقت کی راہ تک پہنچانے کیلئے پیغمبر ہی اللہ کی طرف سے منتخب کردہ ہوتا ہے۔اور یہی اسکی اجازت ہے کہ پیغمبر انسان کی اصلاح کرے۔اس مندرجہ بالا حقیقت کی دلیل کیلئے۔وہ اللہ حوالہ دیتا ہے۔کہ وہ انسان کے ماضی سے بخوبی واقف ہے۔کیونکہ تمہارا ماضی بھی اسی سے بنا ہے۔اسی نے بنایا ــــ اور تم اس سے بیخبر ہو۔اور تمہارا مستقبل بھی جانتا ہے ــــ اول سے آخر تک کی مخلوق اور واقعاتِ زمانہ تمام کچھ اسکے علم میں ہے۔یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ۔اور جو لوگ اپنے علم کو مادی نظروں سے درجۂ کمال تک پہنچانا چاہتے ہیں۔وہ کسی صورت میں اسکے آثار و اسرار کا احاطہ نہیں کر سکتے (جو اللہ کے علم میں ماضی و مستقبل کے واقعات موجود ہیں) اور وہ لوگ اپنے علم سے کچھ (کائنات کے واقعات کو) نہیں جان سکتے وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖ ۔سوائے اس شخص کے جسکو وہ علم دینا چاہے۔اِلَّا بِمَا شَآءَ ۔اور اسکے نور (وجود نوری) کی ترتیب اسطرح ہے ۔کہ اس نے زمین و آسمان کو اپنے وجود میں سما لیا ہے[1] (جسطرح انڈے کی زردی چھلکے اور سفیدی

---

[1] وسع۔وسع کے معنی پیٹ میں سما لینا یا احاطہ کرنا۔وسعتِ طول و عرض کے لحاظ سے ہر (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے درمیان ہوتی ہے)وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اوراس طرح سنبھالنے میں قدرت کوکوئی تھکاوٹ پیدانہیں ہوسکتی وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُہُمَا کیونکہ وہ ان تمام کمزوریوں کے مقابلہ میں اپنی ہیئت لامحدود کے اعتبار سے بہت بڑااورعظیم الشان ہے۔وَہُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ○۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) جہت (طرف) سے گھیر لینا۔اس ترتیب کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے۔کہ تخلیقِ کائنات میں زمین کے ان کروں پرنظرڈالی جائے۔جنہوں نے زمین کوگھیراہے۔مثلاً کرۂ آبی۔کرۂ ہوائی۔کرۂ آتشی۔اسکے بعد ماحول آتشی کے اختتام پرفضابالکل لطیف ہوجاتی ہے۔جو ہیئت نورانی میں واقع ہے۔کیونکہ زمین سے ملحقہ کُرے یکے بعد دیگرلطیف حالت اختیارکرتے ہیں۔جیسے آب سے لطیف ہوا۔ہواسے لطیف آتش۔نقشہ ملاحظہ ہو۔

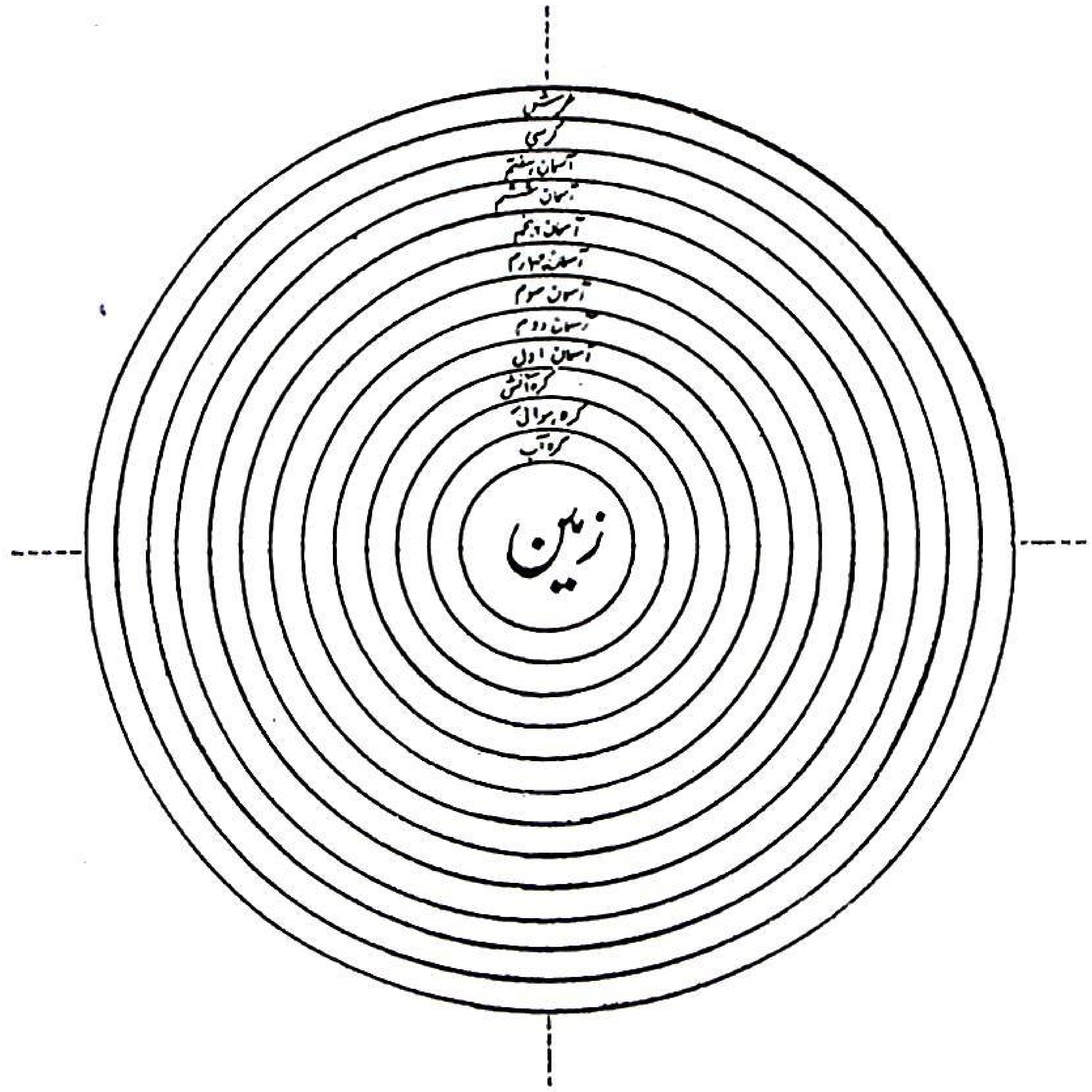

نقشہ سے معلوم ہوتاہے۔کہ آسمانِ اول میں ۔تمام سیارے اور ستارے(بمعہ زمین کے)اسطرح واقع ہیں۔جسطرح انار کے چھلکے میں دانے۔آسمانِ اول ان تمام سیاروں پر چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ علاوہ ازیں تمام سیاروں میں صرف زمین ہی ایسے مقام پرواقع ہے کہ یہ دیگرسیاروں کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۲)قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ کہہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے نہ اسے کسی نے جنا۔ نہ اس سے کوئی جنا۔ نہ اسکا کوئی ہمسر ہے۔ یعنی جو لوگ خدا کے تصور میں مختلف قسم کے وہمی خداؤں کے چکر میں پھنس کر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) مقابلہ میں اپنی تمازت +(گرمی اور روشنی) ختم کر کے خاکی (مادی) ہیئت میں آچکی ہے۔ اسکی ابتدائی تمازت عدم نہیں ہوئی بلکہ اس قوت نے منتشر ہو کر کروں (آبی۔ ہوائی) کی ہیئت اختیار کی ہے۔ یہ کرے زمین کے چاروں طرف گھیرا کئے ہوئے ہیں۔ اسکے مقابل باقی سیارے کرۂ آتشی میں واقع ہیں۔ ان کروں کی تمازت (گرمی اور روشنی) ابھی موجود ہے۔ اسلئے ان میں کرۂ آب اور کرۂ ہوا پیدا نہیں ہوا۔ گویا تمام سیاروں کی گرمی سے ہی کرۂ آتش بنا ہوا ہے۔ اور یہی کرہ ان تمام سیاروں پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ سیارے اور کرۂ آتشی ایک معمولی (دنیوی) آتش کی مانند نہیں ہو سکتی بلکہ اسکی قوت اتنی تیز ہے۔ جو ان تمام سیاروں کی گرمی اور روشنی پر غالب اور قوی ہے۔ اور یہ کرہ اتنا وسیع ہے کہ تمام کائنات کے سیارے اس کرۂ آتشی میں سمائے ہوئے ہیں ہر سیارہ ایک دوسرے سے ہزاروں لاکھوں میل کے اندازہ پر دور ہیں۔ اسطرح اس کرۂ آتشی کی وسعت کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔

تمام کائناتِ ارض وسماوات میں ایک زمین ہی ہے۔ جسکے ارد گرد آبی اور ہوائی کرہ ہے۔ اور اپنی مادیت کے لحاظ سے زمین ہی ایسا مقام ہے۔ جسکی مادی زندگی پائی جاتی ہے۔ باقی ستارے ابھی بدستور اپنی تمازت میں قائم ہیں اسلئے ان میں مادی مخلوق کی طرح زندگی نہیں پائی جا سکتی ہے۔ مادی حیثیت سے زمین۔ کرۂ آب۔ کرۂ ہوا۔ کرۂ آتشی کا ایک مسلسل اور مترتب نظام پایا جاتا ہے۔ باقی سیاروں میں یہ نظام نہیں پایا جاتا۔ البتہ انکی ترکیب صرف یہ ہے۔ کہ یہ سیارے زمین کے ساتھ ہی کرۂ آتشی اور آسمان اول کے ماحول میں اپنی کشش کے ساتھ تیر رہے ہیں۔ ہمارے قریب کے سیارے جو ہماری نظر کی حد میں آتے ہیں۔ جن میں سورج۔ چاند۔ اور کئی ستارے واقع ہیں۔ یہ سب سیارے ایک دوسرے کی کشش کے ساتھ معلق ہیں۔ ان میں زمین (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

__حاشیہ در حاشیہ__ +زمین کی تمازت کم ہونا اس امر کی دلیل ہے۔ کہ زمین تمام عالم امکانی اور غیر امکانی (یعنی موجود اور غیر موجود) میں سب سے آخری (بعید یعنی دور) درجہ پر ہے۔ اور زمین اس تمام عالم (علت لامحدود سے لیکر آسمان اول کے احاطہ میں آئی ہوئی مخلوق) کا مرکز ہے۔ اسلئے زمین علت لامحدود کے وجود کا بھی دائرہ کی صورت میں مرکز ہے۔ ⊙

رہ گئے ہیں۔اے پیغمبر انہیں اللہ کا اصل تصور بتاؤ۔کہ اللّٰہ ایک ہی اللہ ہے۔اَللّٰہُ اَحَد''۔یعنی اللہ اپنی لامحدودیت کے اعتبار سے۔اپنی لامحدود ہیئت میں ایک ہے۔(گنتی کا ایک نہیں) وہ تو خود ایک معبود ہے۔اسکے مقابل کوئی ایسی دوسری شے نہیں جو''۲'' کا درجہ رکھتی ہے۔یہاں تعداد ''۱'' اور اَحَــد'' میں فرق ہے۔تعدادی''۲'' کے وجود میں تو دو''۱'' پائے جاتے ہیں اور ہزار میں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) بھی اسی کشش میں آویزاں ہے۔کرۂ آتش کی وسعت کا اندازہ کرنے کے بعد یہ امر یقینی ہو سکتا ہے۔کہ ان (حواس کی حدوں میں آنے والے) سیاروں کے علاوہ بھی بے شمار سیارے واقع ہو سکتے ہیں۔جو ان سیاروں کی وسعت قوت اور کشش میں ان سے زیادہ قوی ہوں۔لیکن ابھی تک یہ (مخلوق) ہمارے حواس کے احاطہ میں نہیں آئے ہیں۔اور ممکن ہے کہ ان کے ساتھ بھی ہمارے چاند۔سورج اور دیگر سیاروں کی کشش کا الحاق ہو۔اسکی مثال مندرجہ ذیل نقشہ میں دی جاتی ہے۔

یعنی اس کرۂ آتش میں کئی ایسے سیارے ہیں جو اس سورج سے لاکھوں گنا قوت و وسعت میں بڑے ہیں جو ہمارے حواس کے احاطہ میں ابھی تک نہیں آ سکے کیونکہ کرۂ آتش اس قدر وسیع ہے۔جس کی وسعت ہمارے حواس کے احاطہ میں نہیں آسکتی۔

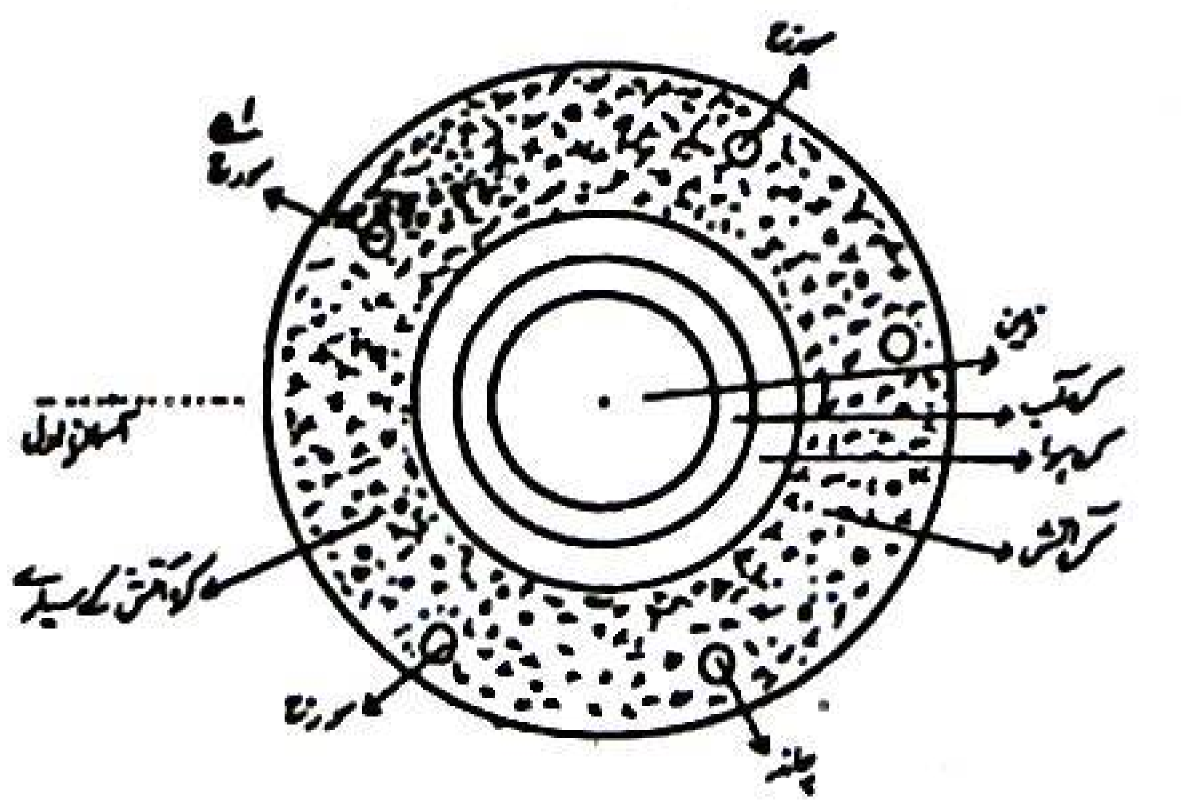

زمین ایک مرکز کی صورت میں واقع ہے۔مرکز۔زمین ہی اپنے احاطہ کئے ہوئے دائرے سے دور ہو سکتی ہے۔اسکی دلیل اسکی مادی ہیئت سے ہی مل سکتی ہے۔اسکے بعد کرۂ آبی۔اسکے بعد کرۂ ہوائی۔اسکے بعد کرۂ آتشی۔کرۂ آتشی میں تمام سیارے زمین کے چاروں طرف واقع ہیں۔یہ سیارے کرۂ ہوائی سے باہر کی فضا میں آسمان اول تک پھیلے ہوئے ہیں۔کیونکہ کرۂ آتشی بھی کرۂ ہوائی سے لیکر آسمان اول تک وسیع ہے۔اور اس کی ہیئت جوں جوں کرۂ آبی کے قریب ہوتا جاتا ہے ویسے ہی اسکی تمازت میں کمی ہو جاتی ہے۔اور جوں جوں یہ آسمان اول کے قریب ہوتا جاتا ہے۔اسکی تمازت لطیف ہوتی جاتی ہے۔اور یہی کیفیت جب اپنی لطافت میں خالص نورانی ہو جاتی ہے آسمان اول کہلاتی ہے گو کرۂ آتشی ایک طرف کرۂ ہوائی کے ساتھ Vanish (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہزار ''ا'' کا وجود پایا جاتا ہے۔لیکن اَحَد'' کے ''ا'' کے بعد کوئی عدد نہیں پایا جا سکتا۔یہاں ''۲'' اور ہزار ـــــ ارب تمامی اعداد ایک میں سمائے ہوئے ہیں۔جہاں تک تعداد کا وجود ہے۔ایک سے اوپر نہیں بلکہ ان تمامی اعداد کا مجموعہ صرف ''ا'' اَحَد'' بنتا ہے(بلکہ یہ کثرت احد کی جز ہے) وہاں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)(ملا ہوا) ہو جاتا ہے۔دوسری طرف یہی کرۂ آتشی آسمان اول کے ساتھ Vanish ہو جاتا ہے۔جیسے سرد علاقہ سے نکلتے وقت جب ہم گرم علاقہ میں آجاتے ہیں تو رفتہ رفتہ سردی گرمی میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح ان کروں اور آسمانوں میں کوئی ایسا مقام واقع نہیں جہاں ایک دوسرے کی نمایاں حد واقع ہو۔

ہر کیفیت میں ایک زندگی پائی جاتی ہے۔زمین میں زندگی کے ظاہری آثار کو مادہ نے آنکھوں کی اور حواس کی حد میں قید کر دیا ہے۔اسکے ماسوے دیگر سیاروں یا باقی ماحول میں بھی زندگی موجود ہے۔لیکن یہ اپنی لطیف قوت کے اعتبار سے لطیف+ ہے۔گویا جو تمازت (گرمی اور روشنی) ان سیاروں میں واقع ہے۔یہ بھی لطیف ذرّات (زندگی) کا مجموعہ ہے۔دراصل یہ ذرات مجسم زندگی ہیں جو کہ لطیف ہیئت میں واقع ہیں۔اور جوں جوں یہ ماحول آسمانوں سے قریب اور آسمانوں کی ہیئت میں ہوتا جاتا ہے۔انکی زندگیاں لطیف سے لطیف تر ہوتی جاتی ہیں۔آسمانِ ++ اول کوئی ٹھوس شے نہیں بلکہ کرۂ آتشی کے مانند ایک خالص لطیف کیفیت ہے۔جس میں لطیف ماحول (نورانی) اور لطیف زندگی موجود ہے۔اسی طرح ہر آسمان اپنے اعلےٰ مقام کے اعتبار سے لطیف سے لطیف تر ہوتا جاتا ہے۔اس لطیف ہیئت کا اندازہ مادی تعقل سے نہیں ہو سکتا ہے۔جبکہ ہم ابھی اس سے کم تر ہیئت کرۂ آتشی کی انتہا کو نہیں پا سکے ہیں۔چونکہ زمین سے علے الترتیب ایک قوی ماحول (آبی۔ہوا۔آتشی لطیف) کا سلسلہ چلا جا رہا ہے۔اسلئے اس ماحول کے بعد کا تسلسل بھی اسی ترتیب کے ساتھ جاری رہنا لازمی ہے۔یہی ترتیب آسمان اول سے ہفتم آسمان۔کرسی۔وعرش اور عرش کے بعد تا علت لا محدود ماحول واقع ہے۔(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حاشیہ در حاشیہ+ ہم دیکھتے ہیں سورج چاند۔ستاروں کی روشنی ہم تک پہنچتی ہے اور یہ روشنی زمین کی کثیف فضا سے گزر کر ہمارے حواس تک پہنچتی ہے۔لیکن اس حالت میں بھی ہم سوائے ایک ''روشنی'' کے اس روشنی کے ذرات (زندگی) کو نہیں دیکھ سکتے جب تک کہ ہم کسی دور بینی یا خورد بینی آلہ سے اسے نہ دیکھیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے۔کہ یہ ذرات اپنی لطافت کی وجہ سے ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔

++ آسمان (السماء) عربی میں اسکی کیفیت کا نام ہے۔

کثرت میں بے شمار وحدتیں پائی جاتی ہیں۔ یہاں وحدت میں تمام کثرتیں سمائی ہوئی ہیں۔ جہاں تک علت لامحدود کا تعلق ہے اسکے ساتھ "۲" کا نشان عدم ہے۔ جہاں دو کا وجود پایا جائے۔ وہاں لامحدود کے وجود میں ایک حد قائم ہو جاتی ہے۔ لامحدود کیلئے باوجود کثرت کے بھی ایک (احد) ہونا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کرسی ان تمام کروں اور آسمانوں سے (تمازت اور روشنی میں) قوی اور غالب ہے۔ جسطرح باقی کرے زمین پر احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح کرسی بھی تمام زمین۔ سیاروں اور آسمانوں پر مجملہ احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہی مقصد وَسِعَ کُرۡسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ سے ہے۔ اور اسکے احاطہ سے مراد۔ "اسکی کرسی" یعنی اللہ کی کرسی۔ اور اللہ کی کرسی سے مراد۔ خود اللہ کی ذات کا احاطہ۔ کیونکہ ان تمام عالموں کی تخلیق علت در علت واقع ہے۔ یعنی جب عَرۡشَ تھا تو اس میں کرسی کا مواد جمع تھا۔ عرش سے عرش کا ماحول+ اور کرسی بنا۔ پھر کرسی سے کرسی کی کیفیت (ماحول) اور سات آسمانوں کا مواد (یکجا) پھر سات آسمانوں کے ماحول سے آسمانِ ہفتم (اسکا ماحول) اور آسمان ششم۔ آسمان ششم سے اسکا ماحول اور آسمان پنجم اسی طرح آسمان پنجم سے اسکا ماحول اور آسمان چہارم آسمان چہارم سے اسکا ماحول اور آسمان سوئم۔ آسمان سوئم سے اسکا ماحول اور آسمان دوئم۔ آسمان دوئم سے اسکا ماحول اور آسمان اول۔ آسمان اول سے اسکا ماحول اور تمام سیاروں کا ایک واحد وجود۔ اور یہ وجود منتشر ہو کر سیاروں++ کی ہیئت میں آ گیا۔ چنانچہ اسکی شہادت ہمیں قرآن سے ملتی ہے۔ اَوَلَمۡ يَرَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝ (پارہ ۱۷ سورۃ ۲۱ آیت ۳۰) (ترجمہ) کیا نہیں دیکھتے یہ لوگ جو خدا اور اُس کے قانون کا انکار کرتے ہیں کَفَرُوۡٓا کہ زمین اور آسمان ملے ہوئے تھے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حاشیہ در حاشیہ+ ماحول سے مراد ہر آسمان کی ذاتی کیفیت یہ آسمان ایک نورانی کیفیت (وجود) رکھتے ہیں اور اس میں ان کی زندگیاں ملائکہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ++ ایک ہی کیفیت سے تمام سیاروں۔ سورج۔ چاند۔ زمین کا علیحدہ ہو جانا اس دلیل سے ثابت ہے۔ کہ ہر سیارہ خواہ سورج۔ ہو یا چاند۔ زمین ہو یا مریخ۔ مشتری سب کی وجودی ہیئت ایک ہی ہے۔ صرف زمانہ کی طوالت اور قرب و بعد (دوری۔ نزدیکی) کی وجہ سے ان میں مادی اور لطیف ہیئتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ نوٹ: ہو سکتا ہے زمین سورج سے نکلی ہو اور چاند زمین سے نکلا ہو۔ بہر حال محققین نے جو بھی قیاسی شکل پیش کی ہے وہ سب اس ترکیب میں شمار ہوتی ہے۔

ضروری ہے۔یعنی جو کچھ بھی کثرت کی صورت میں پایا جاتا ہے۔وہ سب تمثیلی اور تنزلی ہے۔اور اس تمام کثرت کا مواد ایک سے ہی ہے۔دیکھنے میں کثرت کو محسوس کیا جاتا ہے۔حقیقتاً یہ سب احد کے دائرے میں خود ہی احد کا مواد ہے۔اگر کثرت کو وحدت سے الگ سمجھا جائے۔تو یہ لامحدودیت

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کَانَتَا رَتْقًا + پھر ہم نے اس لطیف فضا کے ٹکڑے کر دیئے اور انہیں ایک نظام کشش میں پابند کر کے ایک دوسرے سے جدا کیا فَفَتَقْنٰهُمَا ++ اور یہ تمام فضائی کرے (سیارے) سورج۔چاند۔ستارے اسی ہیولائے اولیٰ (آسمان اور زمین کے ملے ہوئے وجود) سے بنے ہیں۔اور کیا پانی سے تمام چیزوں کو زندہ۔یہ کیفیت ابتدائی زمین کی ہے۔کہ اس سے قبل زمین بھی مثل دیگر سیاروں کے ایک للتہب نار کے ٹکڑے کی مانند تھی اور اسکی کیفیت بھی مثل سورج اور دیگر سیاروں کے تھی اور اسکے اردگرد بھی صرف کرۂ آتشی تھا۔لیکن اسکے مقام کے مطابق اس میں تنزل کی کیفیت پیدا ہوئی اس پر کرۂ ہوائی اور آبی کا احاطہ ہوا۔جس سے پانی کا وجود پیدا ہوا۔اور یہی پانی ظاہری زندگی کا سبب بنا یہ چیز تو علم الابجد سے بھی حاصل ہوسکتی ہے۔اگر تفکر کرو۔تو پھر تم قرآنی استشہاد (دلیل) کے بعد بھی خالق کائنات کے علمِ حقیقی سے انکار کرتے ہو؟

الغرض یہی ترکیب آسمانوں۔سیاروں اور زمین کی ابتدا میں ہوئی۔اور کرسی اسی ترتیب کے مطابق تمام کیفیتوں پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔کرسی کے بعد یہ نظام ختم نہیں ہوتا۔بلکہ اسکا تسلسل (علت و معلول Mater کے اصول کے تحت) اسی ترکیب سے اسکی ابتدا کی طرف جاتا ہے۔جس میں ایک کیفیت کا نام عرش ہے اور عرش کے بعد ہر علت کی ایک علت کا سلسلہ چلتے ہوئے اسکی ابتدائی علت۔علت لامحدود پر ختم ہوتی ہے۔علتِ لامحدود اسی ترکیب کے ساتھ ان تمام کیفیتوں (قوتوں) پر احاطہ کئے ہوئے ہے اور علت لامحدود کی وسعت اسقدر وسیع ہے جسکے بعد اور کسی علت کا وجود قائم ہی نہیں ہوتا یہاں کرسی کے احاطہ (وَسِعَ كُرْسِيُّهُ) کا حوالہ دینا اس غرض سے ہے۔کہ کرسی ایک ایسی کیفیت ہے۔جو اپنی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حاشیہ در حاشیہ + یہاں كَانَتَا صیغہ تثنیہ ہے یعنی یہ دو (آسمان اور زمین) گویا اسکا اشارہ ایک تو آسمان ہفتم کے مقام پر السمٰوٰت کے مقام کا حوالہ ہے جس میں تمام آسمان اور زمین بھی تھی اسکے بعد كَانَتَا آسمان اول کی طرف اشارہ ہے جس میں آسمان اور زمین کی طرف اشارہ ہے۔++ فَفَتَقْنٰهُمَا کا لفظ اپنے میں تمام ترکیبی وسعتیں رکھتا ہے اس میں اس ترکیب کی پوری تفصیل مضمر ہے۔جس ترکیب سے زمین اور دیگر سیارے آسمان اول سے جدا ہو کر منتشر ہوئے۔

کے خلاف ہوگا لہذا اللہ اَحَــد" ہونے کی صورت میں ہر حال میں احد و لامحدود ہے۔ جسکی تشریح وَسِــعَ (حاشیہ) میں کی گئی ہے۔ کہ اللہ لامحدود میں کثرت مرکز کی حیثیت میں ہے۔ اور اللہ کی کثرت پر احاطہ کی حیثیت میں کوئی حد قائم نہیں ہوتی۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) لطافت اور قوت میں بیحد غالب ہے۔ اور یہ قوت اللّٰــہ کے ذاتی انوار کا ابتدائی زینہ ہے یہاں سے خالصتاً اللہ کے حقیقی انوار کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ گویا کــرسی کا احاطہ کرنا بجائے خود اللّٰہ کا احاطہ کرنا تصور کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اِنَّ اللّٰـهَ وَاسِع" عَلِيْم" (اللہ تمام مخلوق پر احاطہ کئے ہوئے ہے) چنانچہ محقق صادق حضرت محمد رسول اللہؐ نے بھی اس ترکیب کا اشارہ ایک مجمل (حدیث) بیان میں کیا ہے۔ حدیث۔ وَالَّذِیْ نَـفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ اَنَّكُمْ دَلَّيْتُمْ بِحَبْلٍ اِلَى الْاَرْضِ السُّفْلٰى لَهَبَطَ عَلَى اللّٰهِ انسان جس طرف سے بھی مشرق۔ مغرب۔ شمال۔ جنوب اوپر نیچے (جیسا کہ ابتدائی نقشہ میں دکھایا گیا ہے) زمین سے ایک ڈول لٹکا کر ڈالے تو وہ اللہ پر گریگا۔ یہ ایک استعارہ۔ یا تشبیہ ہے۔ اسکا مطلب ہے۔ کہ اللہ اور اسکے روحانی ماحول زمین کو چاروں طرف گھیرے ہوئے ہے۔ یعنی آسمان صرف ہمارے سروں پر ہی نہیں۔ کرسی۔ عرش صرف ہمارے سروں کے اوپر ہی نہیں بلکہ ہمارے دائیں۔ بائیں اوپر اور نیچے بھی ہے۔ لازمی طور جسطرف سے اللہ کی طرف جایا جائے اسی طرف اللہ کا وجود احاطہ کئے ہوئے ہے۔

ہماری تحقیقاتی دنیا آج یہ ثابت کر چکی ہے۔ کہ زمین کشش میں معلق ہے اور زمین سے باہر اسکے چاروں طرف آبی۔ ہوائی اور آتشی کرہ زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہی تحقیق ہماری اس چودہ سو سالہ پیشتر کے بیان کی خود دلیل پیش کرتی ہے۔ ایسی صورت میں زمین اگرچہ ایک تنزلی کیفیت میں۔ اللہ کی ذات سے ایک دوسری کیفیت حاصل کئے ہے۔ مگر اسکی کیفیت کی بنیاد اللہ سے ہی ہے اور اس ترکیب سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ زمین اللہ کے احاطہ میں ایک مرکز کی حیثیت میں ہے اور اللہ کا وجود دائرہ کی شکل میں بلا حد ــــ اور لاانتہا ہیئت میں واقع ہے۔ اس کیفیت سے اگرچہ ہر کیفیت میں اگر تبدیلی یا فنا واقع ہوتی ہے۔ لیکن ہر کیفیت کی یہ تبدیلی یا فنا عدم نہیں ہوتی بلکہ ہر شے کا وجود قائم ہے۔ اور ہر شے نہ خود اللہ ہے۔ نہ ہی وہ اللہ کے وجود سے باہر ہے۔ نہ دو کی شکل میں واقع ہوتی ہے۔ بلکہ ہر شے ایک اپنی ترکیب میں ہے۔ اور اللہ کے وجود سے متعلق ہے۔ ایسی حالت میں اللہ میں نہ کمی ہوسکتی ہے۔ نہ زیادتی ــــ بلکہ اسکی واحد پوزیشن بھی برقرار اسکی لامحدودیت بھی برقرار رہتی ہے۔ اور وہی ہر شے پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِع" عَلِيْم"۔

احد خود قاب قوسین ارنبودے میم احمدؐرا وجودِ مرکزِ پرکارِ عالم کے شدے ثابت

قرآن انسانی تصور کیلئے اسکی قریبی (دنیا) مخلوق سے ابتدأ کر کے انتہا تک مسلسل تصور کی ایک کڑی (زنجیر) پیدا کرتا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا۔ اللہ کا تصور کرنے کیلئے ہر معلول کی فطرۃ (خاصیت) کو (مثل میوے کے بیج کے) علتِ لامحدود سے متعلق کر دو۔ تو جو کچھ تمام مخلوقات (اور خصوصاً انسان) میں پایا جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اللہ میں علتِ اول ہونے کی حیثیت میں اُسی سے نکلا ہے۔ اور وہ کائنات کی تمام خاصیتوں کا بدرجہ اتم حامل ہے۔ لہذا وہی زندگیوں کا حقیقی منبع ہے۔ اللہ اپنی لامحدود قوتوں کے لحاظ سے کسی شے کا محتاج نہیں۔ کیونکہ ہر شے اسی سے بنی ہے۔ اور وہ مالک ہے۔ اسلئے وہ ضرورتوں اور کمزوریوں سے پاک ہے۔ وہ اپنی ضرورتوں سے بے نیاز ہے اَللّٰهُ الصَّمَدُ۔

اَحَد" کی تعریف یہی ہے۔ کہ وہ اپنی لامحدودیت کے اعتبار سے۔ لاانتہا وسیع۔ ایک عظیم الشان نور۔ مادہ سے خالی ہستی ہے۔ اسلئے اسکے لئے لازم ہے۔ کہ وہ کسی دوسری شے سے نہیں بنا۔ وہ نور ہے۔ اسلئے وہ جننے اور جنانے سے پاک ہے اس نے کائنات کے بنانے میں ایک خوبصورت نظام (ترتیب) پیدا کیا ہے۔ اسلئے سوائے مادی جاندار کے (جو اللہ نے اسکی پیدائش کے لئے ایک ترکیب پیدائش بنائی ہے) ایک علت و معلول کی ترکیب میں پیدائش کی ترکیب بنائی ہے۔ اور یہ ترکیب بھی مادّہ کے لئے ہے۔ جہاں نورانی ماحول ہے۔ وہاں جب مادیت ہی نہ ہو تو ایک دوسرے کے جننے کا سامان ہی نہیں۔ ایسی صورت میں اللہ کے لئے جن لوگوں کا یہ تصور ہے۔ کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یا اللہ بیٹے بھی رکھتا ہے۔ یہ تصور غلط ہے بلکہ لَمْ یَلِدْ ۥ وَلَمْ یُوْلَدْ وہ نہ جنتا ہے۔ نہ جنا گیا ہے۔ بلکہ ہر مادی خاصیت سے پاک ہے۔

یہ بات ضروری ہے۔ کہ جب اللہ خود ہی کثرت میں بھی واقع ہے۔ تو پھر ہر شے کو اللہ ہی تصور کیا جائے؟ کیونکہ جب ہر حال میں اللہ ہی اللہ ہے۔ تو ہر شے کا نام اللہ ہی ہونا چاہیے؟ لیکن اللہ کا دعوےٰ ہے۔ کہ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَد" ۔ اسکی ذات و صفات میں اس جیسا کوئی

نہیں۔تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔کہ اسکا ہمسر پایا جائے؟ کوئی ایسا اَحَــد'' نہیں پایا جاسکتا جو کل کی حیثیت میں علتِ لامحدود کے مقابلہ میں اَحَــد'' کی خاصیت کے ساتھ ہوسکتا ہو اور جو کچھ بھی اللہ سے ماسوا ہے۔وہ اسکی ذات کے مقابلہ میں شئے دیگر محسوس کیجاتی ہے۔کیونکہ یہ تمام اشیا جز اور مخلوق کی حالت میں ہیں۔احد کی پوری قوت کے ساتھ نہیں پائی جاتی ہیں بلکہ تنزلی کیفیت میں ہیں ـــ جیسے ایک ''ا'' کا وجود کثرت میں ہزاروں ایک پیدا کرتا ہے۔مگر ایک جیسی ہیئت نہیں بلکہ کمتر ہیئت میں (-ا) ایسی صورت میں جب کوئی شے خالص ''ا'' بن نہیں سکتی اسے ''ا'' نام دینا یا اللہ کے نام سے پکارنا مبالغہ ہوگا۔اگر ہم ہر شے کیلئے ایک اللہ کا نام دینگے۔تو درخت بھی خدا۔سورج بھی خدا۔گدھا بھی خدا۔دریا بھی خدا۔پہاڑ بھی خدا۔اور انسان بھی خدا۔تو پھر خدا کی احدیت یکسر ختم ہو جاتی ہے جبکہ ہر شے اپنا تمثیلی نام حاصل کیئے ہوئے ہے۔یہ اسکا جزوی نام ہے۔کل کی کیفیت اس میں نہیں۔تو پھر ہر شے اللہ کے نام سے منسوب نہیں کی جاسکتی۔ایک شخص کا نام عبداللہ ہے۔تو پھر عبداللہ کی انگلی کو انگلی نہ کہا جائے۔سر کو سر نہ کہا جائے ناک کو ناک نہ کہا جائے۔ہاتھ کو ہاتھ نہ کہا جائے۔لیکن ہر عضو اپنی شکل کے مطابق اپنا نام حاصل کئے ہے۔اور ان تمام اعضٰے کا مجموعہ عبداللہ کہلاتا ہے۔اسکے مقابلہ میں اللہ کی احدیت اس سے بھی بالاتر ہے۔کہ کسی شے کو اسکا نام دیا جائے۔یہ تمام مخلوق جو کثرت میں پائی جاتی ہے۔صرف ایک مرکز کی صورت میں ایک نقطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔اور تمام مخلوق کا مجموعہ صرف ایک نقطہ ہے جو مرکز میں ہے۔باقی اسکی ذات اس مجموعہ سے لا اِنتہا وسیع ہے۔اسلئے کسی بھی حالت میں اللہ کا کوئی ہمسر نہیں ہوسکتا۔اس تصور کا اشارہ ان لوگوں کی طرف کیا گیا ہے۔جو باطل خداؤں کی طرف رجوع کر کے اللہ کی صفات کو انسے متصف کرتے ہیں اور اس اشارہ میں تخلیق کائنات اور اللہ کی لامحدودیت اور خالقیت کا ایک مجمل سبق ہے۔کہ اللہ ایک ذات واحد ولامحدود ہے۔اور ہر شے اس سے بنی ہے اور اسکی ترکیب یہ ہے۔کہ ہر شے ایک اصل سے تنزل کی طرف آکر اپنے مقام پر ایک ہیئت اختیار کر لیتی ہے۔اور سلسلہ وار ہر شے علت ومعلول کی حالت میں بنتی اور تنزل کی طرف جاتی

ہے۔ ہر شے کا اپنے مقام پر اسکی ہیئت کے مطابق نام ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مادہ کی آخری ہیئت دنیا (زمین اور زمین کی مخلوق) کی شکل میں نمایاں ہوئی ہے۔ جسقدر اللہ سے قریبی اشیأ کا تعلق ہے۔ وہ سب نوری ہیں (ماوراُادراک ہیں) اور جسقدر اشیأ مادی ہیں وہ سب بُعد کا درجہ رکھتی ہیں الغرض ہر شے خالق حقیقی کے مقابلہ میں کمتر ہیں وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَد"۔

(۳) هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ج هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ○ (ترجمہ) وہ اللہ وہ ہستی ہے۔ کہ نہیں کوئی معبود سوائے اسکے۔ کہ وہ جاننے والا ہے۔ اپنے تمام پوشیدہ اسرار کو (جو لوگوں کے مشاہدہ میں نہیں) اور ان چیزوں کا علم بھی رکھتا ہے جو ظاہر ہو چکی ہیں (اور لوگوں کے علم میں آچکی ہیں) عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ۔ یہ سب چیزیں اسکی ملکیت میں پیشتر ہی موجود ہیں اور یہ سب چیزیں صرف انسان کیلئے وقف کر رکھی ہیں۔ کہ انسان جس چیز کو حاصل کرنا چاہے کر سکتا ہے هُوَ الرَّحْمٰنُ۔ اسکے ساتھ ہی ظاہری باطنی خزانوں (نعمتوں) کو حاصل کرنے کیلئے تمام سامان بھی دیئے ہیں۔ تاکہ انسان کسی نعمت کے حاصل کرنے سے محروم نہ رہے۔ یہ سب نعمتیں انسان کو بلا معاوضہ عطا کی گئی ہیں۔ الرَّحِیْمُ۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ط سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ○ وہ اللہ وہ ہستی ہے کہ نہیں کوئی معبود سوائے اسکے۔ کہ وہ جاننے والا ہر ظاہر و باطن کا تمام کائنات کے خزانوں کا واحد مالک۔ یہی مالکِ ارض و سماوات اَلْمَلِکُ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بظاہر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان خود پیدا کیا گیا اس سے پیشتر یہ چیزیں بنائی گئیں انسان نے خود نہیں بنائیں۔ اسلئے وہی مالکِ کل ہو سکتا ہے۔

انسان کی بادشاہت کا تصور ظاہری شکل میں یہی ہوتا ہے۔ کہ ایک شخص مختلف ذرائع سے عام مخلوق پر تسلط جماتا ہے۔ اور ہر مخلوق کو اپنے اقتدار میں پابند کرتا ہے۔ انسانی تسلط جمانے کے دو طریقے ہیں۔ یا وہ اپنی تدبیر سے عام مخلوق کو اپنا محکوم بناتا ہے۔ یعنی وہ چند اشخاص کو اپنی حمایت میں لیکر ایک جماعت قائم کرتا ہے۔ جن کی مدد سے وہ تمام مخلوق کے مفاد پر اپنے مفاد کو

مقدم کر لیتا ہے۔ جسے جبر و استبداد کہتے ہیں۔ یا انسان اپنی اصلاحی خوبیوں سے ہر شخص کی حمایت حاصل کرتا ہے۔ ایسا شخص قوم کا راہنما یا لیڈر کہلاتا ہے۔ یہی لیڈر بادشاہانہ حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی بادشاہ چند اصلاحی طریقوں کو اخذ کر کے ایک قانون کی شکل دیکر انسانی مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ اس دونوں صورتوں میں انسان کی پوزیشن محکوم کی سی ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ ایک خدائی بادشاہت ہوتی ہے۔ جس میں ہر انسانی مفاد کو الٰہی قانون کے ذریعے محفوظ کیا جاتا ہے۔ اس میں خود ساختہ قانون نہیں ہوتا ہے۔ نہ کسی شخص کو بادشاہ یا حکمران بننے کا حق ہوتا ہے۔ نہ ہی کوئی شخص کسی کا محکوم سمجھا جا سکتا ہے۔ اس قانون کا لیڈر یا امیر صرف پیغمبر ہوتا ہے۔ لیکن پیغمبر کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی ذات سے کوئی قانون اختراع کرے یا کسی شخص پر حکومت کرے۔ بلکہ پیغمبر اس صورت میں عام انسانوں کی طرح قانون الٰہی کی پابندی کرنے میں مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے قرآن خود ایک پیغمبر کی پوزیشن کا اظہار کرتا ہے۔ کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَر" مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ (پارہ ۱۶ سورۃ ۱۸ آیت ۱۱۰)۔ ان لوگوں سے کہدو کہ قانونِ الٰہی کی پابندی میں۔ میں بھی ایک بشر (انسان) کی حیثیت سے تعمیل کرتا ہوں۔ البتہ تم میں اور مجھ میں فرق یہ ہے۔ کہ یہ قانونِ الٰہی پہلے مجھے حاصل ہوتا ہے۔ اس قانون کی ہر ظاہری باطنی کیفیت مجھ پر واضح کی جاتی ہے۔ اسلئے قانون کی پابندی کا طریق سیکھنے کیلئے میرے عمل کی تقلید و اتباع کیا جائے اس صورت میں پیغمبر بادشاہ نہیں بلکہ ایک معلم (استاذ) یا قانونِ الٰہی کا جاری کرنے والا ہوتا ہے۔ اور تعمیل کرنے میں ہر شخص کی ایک ہی پوزیشن (نوعیت) ہوتی ہے۔ گویا یہاں پر قانون ساز حکمران خود اللہ ہی ہوتا ہے۔

بادشاہ سوائے اپنی ذات کے کسی کو محکوم بنانے کا حق نہیں رکھتا۔ جبکہ ہر انسان کی پیدائش ایک ہی طرح کی ہے کسی کو کسی پر فوقیت و برتری حاصل نہیں۔ ایسی صورت میں انسان یا تو جبر و استبداد سے مخلوق کو محکوم بناتا ہے یا کسی خود ساختہ آئین کے تحت لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ پہلی صورت حکمرانانہ ہوتی ہے۔ اور دوسری صورت خادمانہ ہوتی ہے۔ لیکن اس دوسری صورت میں بھی بادشاہ خود ہر شے کا مالک قرار دیا جاتا ہے اور اسی کا قانون عوام پر مسلط ہوتا ہے۔ ایسی

صورت میں اگر کوئی شخص بادشاہ کے خودساختہ قانون سے انحراف کرے تو بادشاہ اُسے اپنے اختیار سے قتل کرتا یا سزا دیتا ہے۔اس سے مراد یہ ہوتی ہے۔ کہ بادشاہ اس تمام حکومت کا خود مالک ومختار سمجھا جاتا ہے۔لیکن پیغمبر کے دین اور قانون میں نہ تو حکومت اور قانون پیغمبر کا ہوتا ہے۔نہ ہی پیغمبر اپنے اختیار سے کوئی سزا دیتا ہے۔ بلکہ پیغمبر کی نوعیت سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُ هُمْ یعنی قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے۔اور قانون اور ملک صرف اللہ کا سمجھا جاتا ہے۔اسلئے دین اسلام کی حکومت کا تسلط اَلْمَلِکُ سے ہی ہوتا ہے۔یہ تسلط فطری آئین کے مطابق ہے۔کہ ہر شے مخلوق کا وہ خود بنانے والا ہے۔بنانے والا ہی اپنی ہر مخلوق کا واحد مالک ہوسکتا ہے۔اور اللہ کے وَاسِعَ ہونے کی بناء پر ہر شے خود بخود اسکے نظام اور احاطہ میں پابند رہتی ہے اُسے جبر یا حمایت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ انسان پر یہ لازم ہوتا ہے۔کہ وہ پیغمبر کی تابعداری میں خود قانون الٰہی کو اپنے اوپر مسلط کر کے محفوظ ہونے کا سامان حاصل کرلے۔اس تسلط کو فطری عبدیت کہتے ہیں اور عبدیت کا طریق یہی ہے۔کہ اللہ کو ہی بادشاہ تسلیم کر کے ایک غلام کی حیثیت سے اسکے قانون کی پابندی کی جائے۔جس میں ہر فرد کے مفاد وحقوق کی خود بخود حفاظت ہو جاتی ہے۔کیونکہ اس قانون میں کسی شخص کو کسی کے حقوق پر تسلط جمانے کا حق نہیں رہتا۔اور قوانین فطرت کے اصول خود اس امر کی شہادت ہیں۔کہ دنیا میں کوئی ایسی ہستی نہیں پائی جاتی جو من کل الوجود اس کائنات کی مالک تصور کی جائے۔عام نظریات کے مطابق بھی۔یا تو خالق کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔اور اس کا نتیجہ یہی پایا جاتا ہے۔کہ انسانی جبر واستبداد سے انسانوں کو محکوم بنا کر انکے حقوق پائمال کیئے جاتے ہیں۔اور دنیا میں خونریز جنگیں ہوتی رہتی ہیں۔برعکس اسکے ایک اللہ کی حکومت میں ہر شخص اپنے آپکو محکوم سمجھے تو پھر کسی کو کسی کے حقوق پر غاصبانہ تسلط جمانے کا موقع نہیں ملتا۔عبد (محکوم) ہونے کی صورت میں قوانین فطرت کے تحت اگر تجزیہ کیا جائے تو اسکے لئے ایک علتِ لامحدود ہی ہوسکتی ہے جو تمام موجودات کی خالق ومالک ہوسکتی ہے یہی تعریف اَلْمَلِکُ کی ہے۔

بادشاہ ہونے کے ساتھ اسے بادشاہ تسلیم کرنے کیلئے یہ دلیل ہے۔کہ وہ مادی حیثیت

میں نہیں کہ زبردستی حکومت حاصل کرے بلکہ وہ مادی انسانی کمزوریوں سے پاک ہے۔اسکا قانون اٹل ہے۔ٹھوس ہے۔ہر حالت میں نفع بخش ہے۔بادشاہ ہونے کی صورت میں وہ غصہ ہونے پر کسی کو قتل نہیں کرتا۔خوش ہونے پر کسی کو عنایت نہیں کرتا۔بلکہ وَلَکُمْ مَا کَسَبْتُمْ۔بلکہ اسکا منضبط نظام (قانون) ایسا ہے۔جسکے لئے ہر قانون کا ایک لازمی نتیجہ قائم کیا گیا ہے یعنی جو کچھ قانون کی پابندی میں جسطرح بھی عمل کرو اسکا بدلہ اسکا نتیجہ اسی عمل کے مطابق خود بخود پیدا ہوگا۔ اسطرح اللہ کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔نہ ہی اسکے قانون میں کسی قسم کی خامی ہے۔یہ قانون خودساختہ قانون کے مقابلہ میں ایک ایسی ہستی کا قانون ہے۔جو اپنی خوبیوں میں بدرجہ اتم کامل ہے۔اس سے غلطی یا کمزوری واقع نہیں ہوسکتی اسلئے وہ تمام کمزوریوں سے پاک ہے اَلْقُدُّوْسُ۔قدوس سے مراد وہ ہستی جو اپنی نورانیت ولطافت میں قوی وغالب ہو اس پر کوئی بغاوت اثر انداز نہیں ہوسکتی بلکہ وہ ہر حال میں ہر شے پر مالکانہ اقتدار حاصل کئے ہوئے ہے۔اسکے قانون کے مطابق کوئی شخص بغاوت کرکے اسے کمزور نہیں کرسکتا بلکہ اپنے انحراف وخلاف ورزی قانون کی کرنے پر خود تباہی مول لیگا۔اور یہ ذلت خود بخود اس پر مسلط ہوگی اس صورت میں بھی خدا کی بادشاہت اس پر طاری رہیگی۔

اللہ کی حکومت اور اسکا قانون۔دنیوی خودساختہ دین کی طرح نہیں۔بلکہ اسکی قوی و غالب حکمت کے ذریعہ بنا ہے۔یہ قانون ہر زمانہ میں اپنا اثر یکساں رکھتا ہے۔زمانہ کے بدلنے پر یا پیغمبر کے نہ ہونے پر یہ قانون مٹ نہیں سکتا ہے کیونکہ اس ساری کائنات کا نظام بھی ایک قانون کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔اسلئے اسکی لامحدودیت کے اعتبار سے اسکا قانون ہر حال میں نفع بخش اور سلامتی کا ضامن ہے اَلسَّلَامُ۔

کائنات کا نظام اور خود اللہ کا دین (اللہ کی حکومت) اس نوعیت کا ہے۔کہ جو شخص اس دین کو اختیار کرتا ہے وہ اگر کسی بادشاہ کو اپنے نزدیک حفاظت کیلئے نہیں پاتا۔لیکن پھر بھی اس قانون کی ہیئت اس انداز کی ہوجاتی ہے۔کہ دنیا پر ایک مکمل دین الٰہی کی حکومت قائم ہوجاتی ہے اور یہی دین اسلام ہر شخص کی نگہبانی کا ذمہ دار ہوجاتا ہے۔اور یہ سب طریق نگہبانی اسی اللہ

اَلْمُهَيْمِنُ سے وابستہ ہے۔ جولوگ اسلام پر نکتہ چینی کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے؟ انکے لئے اَلْـمُهَيْـمِـنُ کی تفسیر کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ کہ اسلام سلامتی ونگہبانی کا ضامن ہے۔ وہ انسان کو باطل قوتوں کے جبر واستبداد اور ناجائز غلامی وتسلط سے آزاد کر کے انسانی زندگی کو محفوظ کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسے انتہائی عروج پر پہنچاتا ہے۔ اسکی تلوار چلتی ہے۔ تو ظلم واستبداد کے خلاف۔ باطل حکمرانوں قانون سازوں کے خلاف چلتی ہے۔ کیونکہ قوانین فطرت کا یہ تقاضا ہے۔ کہ انسانی حیثیت میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی انسان کا حق ظلم۔ جبر اور ناجائز اقتدار سے غصب کرے۔ یہ قوانین فطرت کی ضد ہے کہ ایک قانون کے ہوتے ہوئے کسی کمزور مخلوق۔ نااہل مخلوق۔ ظالم مخلوق۔ کا قانون کائنات پر جاری ہو سکے۔ پھر اسلام کی تلوار ایسی قوتوں کے ختم کرنے کیلئے حق بجانب ہے۔ وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ج (پارہ ۹ سورۃ ۸ آیت ۳۹)۔ اور قتل کرو ان باطل خداؤں (حکمرانوں) کو اور انکے قانون کو مٹا دو یہاں تک کہ انکا جبر واستبداد۔ اور انسانوں پر انکی ناجائز حکومت کا فتنہ ختم ہو کر صرف ایک اللہ کی بادشاہت تسلیم نہ کی جائے۔ تاکہ کائنات فطرت کی مطابقت ہو جائے۔ اسلئے اللہ اپنے قانون کے نفاذ کیلئے اتنی قوت رکھتا ہے کہ وہ اپنی نورانی قوت سے ہر قوت پر غالب آسکتا ہے اَلْعَزِيْزُ۔ وہ اپنی قوت میں غالب ہے۔ اور اسکا قانون اٹل ہے۔ اسلئے کسی ظالم کو مٹانے کیلئے وہ مجبور نہیں وہ اَلـرَّحْـمٰـنُ (مہربان) ہے تو انسانیت کیلئے۔ لیکن ایسی قوتیں جو دنیا میں ایک انچ زمین کیلئے اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کریں۔ وہ ان پر ضرور تلوار چلاتا ہے۔ اَلْجَبَّارُ کیونکہ وہ خود مالک کل ہے وہ خود حکومت کرنی جانتا ہے۔ اس میں کسی خوبی کی کمی نہیں وہ انسانی کمزوریوں کے مقابلہ میں بے لاگ۔ بے داغ ہے وہ محکوم نہیں۔ بلکہ مالک ہے۔ اپنی ملکیت میں کسی کی دخل اندازی کو وہ برداشت نہیں کرتا کیونکہ وہ فخر وتکبر (بڑائی) کا حامل اَلْـمُتَـكَبِّـرُ ہے۔ یعنی اس میں کسی خوبی کی کمی نہیں بلکہ ہر خوبی اسی سے ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وہ ان تو ہمی تصورات سے۔ جولوگ اُس سے متعلق کرتے ہیں پاک ہے۔ وہ وہی اللہ ہے۔ جو ایک مترتب نظام کے تحت بنانے والا تمام موجودات کا منبعِ حقیقی خالق ہے۔ کائنات کی تخلیق میں منضبط نظام ترتیب پایا جاتا ہے۔ اس میں ایک خالق کا قانون پایا جاتا ہے اَلْبَارِئُ۔ اسی نے ہر مخلوق کو اسکی ہیئت کے مطابق ایک خوبصورت انداز میں پیدا کیا ہے۔ یہ تمام رنگینی۔ خوبصورتی۔ اور ایک مستقل نظام اسی اَلْمُصَوِّرُ کا بنایا ہوا ہے۔ اگر وہ خالق و مصور نہ ہوتا۔ تو خود بخود پیدا ہونے میں اتنی خوبصورتی نہ ہوتی ایک چڑیا بچہ پیدا کر کے چھوڑ جاتی اور بچوں کی پرورش کا ایسا انتظام نہ ہوتا۔ ماں بچے کو جن کراتنی محبت نہ کرتی۔ بچہ اپنی پرورش کیلئے محتاج رہ جاتا۔ یہ اَلْـمُـصَـوِّرُ کی ہی صفت ہے۔ کہ ہر شے اپنے انداز میں اپنے لئے ہر قسم کا سامان پاتی ہے۔ اس کائنات کے نظام پر غور کی نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب کائنات کا خوبصورت اور منظم نظام بغیر خالق والباریٔ والمصور کے نہیں ہوسکتا۔ اور اس اللہ کا تعلق اس (خود بخود) بنتی کائنات میں کیسے ہے وہ اسی طرح کہ ہر شے کی وجودی خاصیت اسکی علت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ سب خوبصورتی کی صفات اِسی واحد خوبصورت نور خداوندی سے علت لامحدود ہونے کی حیثیت سے واقع ہیں لَـهُ الْاَسْـمَـآءُ الْحُسْنٰى۔ اگر منکرین خدا کو اس پر یقین نہیں۔ تو کائناتِ سـمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی تخلیق کا تجزیہ کر کے دیکھیں۔ تو یقیناً انہیں کائنات کی تمام اشیأ میں ایک اللہ کی ہی پکار سنائی دیگی۔ ہر شے اللہ کی پہچان اور تعریف میں ہی مصروف نظر آئیگی۔ ہر شے ایک قانون کی پابند نظر آئیگی یہ قانون اللہ کی قدرت۔ طاقت اور احاطہ ہے۔ يُسَبِّحُ لَـهُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ کائنات کی کوئی شے بے مقصد نہیں۔ آوارہ نہیں اپنے محور (احاطہ) میں چار و نا چار پابند ہے۔ یہ محور اللہ کی غالب قوت کا احاطہ ہے۔ اَلْعَـزِيْـزُ۔ انسان اپنی عقل و دانش پر نازاں ہے کہ وہ آسمانی قوتوں پر غالب آرہا ہے نئ سے نئ قوتیں ایجاد کر رہا ہے۔ اور اس قوت کے بل بوتے پر وہ حقیقت سے انکار کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ آخر اسکی عقل و دانش۔ قوت و غلبہ کس علت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر یہ تمام کائنات کسی علت سے

متعلق ہے تو پھر اس علت کا اندازہ اسی کائنات کے نظام سے کرنا آسان ہوگا کہ وہ بدرجہ اتم حکمت والا (عقل و دانش کا پیدا کرنے والا) اَلْحَکِیْمُ ہے۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ (پارہ ۷ سورۃ ۶ آیت ۱۰۰ تا ۱۰۳) ترجمہ۔ اور بناتے ہیں اللہ کے لئے شریک جنوں کو (حالانکہ) پیدا کیا ہے۔ انکو! اور باندھ لیتے ہیں اسکے واسطے اور بیٹے بیٹیاں بغیر علم (جاننے) کے وہ تو ان باتوں سے پاک ہے۔ اور بلند ہے۔ اس چیز سے جو صفت تم اسکی بیان کرتے ہو وہ پیدا کرنے والا ا ہے۔ آسمانوں کا اور زمین کا ___ کیونکر ہوسکتی ہے اسکے واسطے اولاد۔ نہ تھی اسکی بیوی اور بنایا ہر چیز کو اور وہ ہر چیز کا جاننے والا

ا بدیع: سے مراد تخلیق کی ابتدا ایسی حالت میں کرنا جبکہ تخلیق کیلئے نہ کوئی اور مواد ہو اور نہ کوئی دوسرا مقام ہو۔

قرآن تخلیق کی ابتدا کی طرف اکثر مقامات پر غور کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ کہ کائنات کی اشیا پر تحقیق کی جائے تا کہ انسان کو معلوم ہو کہ اس موجودات کی ابتدا کیسے اور کہاں سے ہوئی ہے اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ قُلْ سِيْرُوْا فِى + الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ (پارہ ۲۰ سورۃ ۲۹ آیت ۱۹۔۲۰) کیا نہیں دیکھا ان کافروں نے کہ مخلوق کی کیسے ابتدا کی گئی ہے۔ پھر اس مخلوق کا مختلف شکلوں میں اعادہ کیا گیا۔ (بار بار (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حاشیہ در حاشیہ + گزشتہ مذاہب کی الہامی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ انمیں سوائے شرعی احکام امر و نہی (حکم۔منع) کے کہیں بھی ایسا تحقیقاتی مواد نہیں مل سکیگا۔ یہ تعریف قرآن ہی کی ہے۔ کہ اس میں کائنات کی ہر باریک سے باریک قوت کی تحقیق اور اسکا علم موجود ہے۔

ہے۔ یہی ہے اللہ پروردگار (پالنے والا) تمہارا۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ جو بنانے والا ہے تمام چیزوں کا۔ پس اسی کی عبادت کرو۔ اور وہ ہر چیز پر وکیل ہے۔ نہیں پا سکتی ہیں اسکو آنکھیں۔ اور وہ پاتا ہے سب نظروں کو اور وہ لطیف اور خبیر (خبر دینے والا) ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت مذاہب میں مختلف قسم کے اعتقادات پائے جاتے تھے اور یہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) پیدا کیا گیا)۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ یہ سب کچھ اللہ نے کیا اور اسی سے+ ہوا ہے۔ اور یہ سب کچھ اللہ کیلئے مشکل نہیں بلکہ بالکل آسان ہے۔ کہو (یا محمدؐ) تم لوگ سیر کرو (تحقیقات کرو) زمین کی (کھدائی اور گزشتہ نشانات کی تحقیقات کرو) اور دیکھو کیسے ابتدا کی گئی ہے اس پیدائش کی۔ (یعنی اس پیدائش کی ابتدائی ترکیب کیا ہے؟) پھر اللہ ہی بناتا ہے (اور بنائیگا) پہلی مخلوق ختم کر کے دوسری (آخر اور آخری) مخلوق۔ اسی بدع کے متعلق دوسرے مقام پر مخلوق کی ابتدا کا پورا حوالہ دیا گیا ہے:۔ وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ (پارہ ۲۱ سورۃ ۳۰ آیت ۲۷) وہی ہے جس نے مخلوق کی پیدائش کی ابتدا کی پھر اسکو بار بار (مختلف طریقوں پر) پیدا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا تخلیق کائنات اور جملہ مخلوق کی ابتدائی پیدائش کا حوالہ دینے سے مراد یہ نہیں۔ کہ صرف اسکی بناوٹ کا علم حاصل کیا جائے۔ نہیں!۔ بلکہ ابتدا سے اس بنیادی وجود (منبع حقیقی) کا علم ہوگا جس میں اس تمام مخلوق کا ہونا اسکی لامحدودیت میں پایا جائے۔ دوسرے ہر معلول کی علت کا ایک غیر منقطع اور لامتناہی سلسلہ قائم ہو کر ایک ایسی علت کا پتہ چل جائیگا جو اپنی لامحدودیت کے اعتبار سے ہر مخلوق کی مُبْتَدِءَ (ابتدا کرنے والی) اور منبع حقیقی ہوگی تیسرے اس تخلیق کے پسِ پردہ ایک ایسا نظام پایا جائیگا جسکی ترتیب سے ایک خالق (اللّٰہ) کا ہونا یقینی ہو جائیگا۔ اور اس نظریہ کی صاف طور پر تردید ہو جائیگی کہ یہ کائنات اور یہ مخلوق بغیر کسی خالق کے خود بخود بنی ہے۔ نیز اس ترتیب سے ماوراٗ ادراک قوتوں کی ترکیب و ہیئت کا بھی اندازہ ہو جائیگا۔ کہ ہر شے ایک اللہ سے مخلوق ہوئی ہے۔ ایک منظم نظام کے تحت۔ پھر ان عقائد کی بھی تردید ہو جائیگی جو پیروان مذاہب نے من گھڑت افسانوں کی صورت میں اختراع کئے ہیں۔ جہاں تک مادی احساسات کام کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ کائنات کی اکثر اشیاٗ کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں۔ تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ کسی شے کے بنانے میں سوائے اسکی قریبی علت کے اور کوئی خالق نظر نہیں آتا۔ لیکن سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ اور کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حاشیہ در حاشیہ + اس کی تشریح وسیع میں بھی کی گئی ہے ص ۳۰۲ حاشیہ پر۔

سب پیروان مذاہب کے من گھڑت عقیدے اختراع کئے گئے تھے۔جن میں سورج پرستی۔بت پرستی۔پیغمبر پرستی وغیرہ قسم کے عقائد تھے۔یہ لوگ توہمات میں گرفتار تھے۔اور ہر غیر معمولی شے کو خدا بنالیتے تھے۔چنانچہ جنوں کو بھی خدا کی صفات میں شریک کرتے تھے انکی پرستش کرتے تھے۔ اوراللہ کے بیٹے۔بیٹیاں بناتے۔انہیں توہمات کی رد میں اللہ نے اپنے تصور کا ایک فطری تصور بتایا۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اس بات کی تحریک دیتا ہے۔کہ جب تک تم ایک معلول کی علت کو اسکی ابتدأ میں نہ پاؤ تمہارے سامنے ایک اور علت پیدا ہوگی اور جب تم اس مقام پر پہنچ جاؤ کہ تمہارے تصور (علم الابجد۔وجدان۔تصور خیالی) میں ایک ہی علت لامحدود قائم رہ جائے تو یہ تمام علت و معلول کی ترتیب خود بخود اسی علت لامحدود خالق سے متعلق کردی جائیگی لہذا بدع سے خود اللہ کا وجود قائم ہوجائیگا۔نیز تم اس اَلنَّشْاَۃَ الْاٰخِرَۃَ کا اشارہ دیکھو کہ قرآن تمہیں اپنی دلیل کیلئے ایک ایسے وقت ایک ایسے مقام کا پتہ دیتا ہے۔جسکا تمہیں کسی کتاب کسی علم نے نہیں دیا تھا (اور آج چودہ سو سال کے بعد۔زمین میں آبی و خشکی کی مخلوق اپنی تحقیق میں ظاہر کررہی ہے) وہ بھی زمین کی ابتدأ ہے۔ثُمَّ یُعِیْدُہٗ یعنی زمین ناری تھی پھراس میں زندگی کے ابتدائی آثار پیدا ہوئے وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ پانی برسا اور زمین کا ناری مواد کیڑے مکوڑوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ یہ ابتدائی تخلیق کا اشارہ ہے پھر وَ جَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا یہ نشاۃ آخر کی طرف رجوع ہے۔پھر کائنات کی ہر شے کا مطالعہ کرنے پر خود بخود معلوم ہوتا ہے۔کہ اعادہ۔اور نشاۃ آخر کی ترکیب کس طرح ہر شے میں کارفرما ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔کہ اگر ایک شے کی فطرت میں خود بخود بننا لازمی ہے۔تو اسکی ترکیبِ نشاۃ ہمیشہ کیلئے ایک ہی اندازہ پر مسلسل چلی آنی چاہیے۔لیکن بار بار پیدا کرنا اور ہر پیدائش کا نئی طرز نئی ہیئت و صورت اس امر کی دلیل ہے کہ اس فطرت کی تبدیلی کسی خالق کی خالقیت کا سبب ہے جسکے متعلق قرآن ایک اور حوالہ دیتا ہے۔اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَہٗ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰہُ وَ نَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ ط قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ ○ (پارہ ۲۱ سورۃ ۳۲ آیت ۷ تا ۹) وہی ہے جس نے پیدائش میں ایک خوبصورت نظام پیدا کیا۔ورنہ خود بخود بننے سے نظام کی اتنی خوبصورتی قائم نہیں رہ سکتی۔ذرا انسان کی ابتدأ پر ہی نظر کرو۔کہ یہ بات ہر شخص کے علم میں ہے (خواہ وہ صرف عقیدتاً ہو یا کسی علم کی رو سے یقینی صورت میں آچکی ہو) کہ انسان کی ابتدأ پانی اور لیسدار کیچڑ اور ٹھیکری کی مانند بجتی ہوئی مٹی سے کی ہے۔اگر یہ ترکیب فطری طور ایسی ہوئی ہے۔(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ یہ لوگ جنوں کو میرا شریک ٹھہراتے ہیں وَ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ الْجِنَّ حالانکہ جن ناری ماحول کی مخلوق ہے! اور بہت ادنیٰ درجہ کی مخلوق ـــ ان میں ناری قوت ہونے کی وجہ سے انسان سے معمولی درجہ کی اولیٰ خاصیت ہے۔ یہ مادہ سے کسی قدر لطیف اور قوی ہے۔ اسلئے انکی یہ صفت غیر معمولی سمجھکر اِنکو پوجا جاتا ہے۔ یہ تو انسان کی کوئی حاجت اس حالت میں پوری کرنے کے قابل

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) تو پھر ہر شے کیلئے یہ ترکیب (خود بخود بننے کیلئے) ہمیشہ کیلئے قائم رہنی چاہیے تھی۔ لیکن یہ ترکیب صرف ابتداً کیلئے ہی واقع ہوتی ہے۔ اور ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ کی ترکیب اس خود بخود بننے کی ترکیب کو ختم کر کے ایک نئی ترکیب پیدا کرتی ہے اور پیدائش کیلئے ایک نئی خوبصورت طرز پیدا ہوتی ہے۔ کہ مادہ (عورت) کے پیٹ میں اسکا وجود ایک کمتر پانی کے قطرے سے شروع ہوتا ہے ـــ یہ کیوں؟ ـــ اسلئے کہ ہر انسان کو اسکی پیدائش کے مطابق۔ جبکہ آبادی کی کثرت ہوتی ـــ اور ماحول میں بھی ردوبدل ہوتا۔ اسکی ربوبیت (پرورش) کا سامان آسانی سے نہ مل سکتا۔ اور اکثر انسانی آبادی اس کسمپرسی اور افراط وتفریط کی حالت میں خود بخود ہلاک ہوجاتی۔ اسطرح قوانین فطرۃ کے مطابق جو پوزیشن انسان کی تھی قائم نہ رہتی انسان بے موت ذلت کی حالت میں مرتا۔ اندازہ کیا جائے۔ اکثر حیوانوں کے متعلق دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ جب تک انہیں ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں انہیں پرورش کے طریقے سکھاتی ہے۔ اور جب یہ بالغ ہوجاتے ہیں۔ تو ماں خود بخود بچوں کو چھوڑ دیتی ہے۔ اسکے بعد انمیں آپس کا لگاؤ نہیں رہتا ہے۔ تو یہ پیدائش اپنی زندگی کیلئے خود کفیل ہوتے ہیں اور اپنی خوراک حاصل کرنے کیلئے ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر یہ نظام بجائے خود کیڑے مکوڑوں (نشاۃ اول) کی طرح ہوتا تو کوئی شے ایک دوسرے کی زد سے محفوظ نہ رہ سکتی اور یہ نظام ہی درہم برہم ہوجاتا۔ برعکس اسکے پیدائش کے نئے نظام میں ہلاکت کا اثر ختم ہوجاتا ہے۔ یہ محبت یہ لگاؤ۔ یہ ایک دوسرے کی ہمدردی و امداد تو ایک وجدانی کیفیت ہے!۔ ایسی کیفیت کے خود بخود پیدا ہونے کی شاید ہی کوئی دلیل ہوسکتی ہے۔ اسلئے ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ کی فطری ترکیب خود خالق کی طرف سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو (بلکہ ہر شے کو) اپنی پرورش اور حفاظت کے تمام سامان آسانی سے مل رہے ہیں۔ گویا کائنات کا یہ منضبط نظام خود خالق کے صناع ہونے کی دلیل ہے۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ خصوصی طور پر انسانی پیدائش کی طرف اشارہ ہے۔ اور انسان خود اچھی طرح اس ترکیب کے اثرات کا اندازہ کرسکتا ہے۔ کہ ماں کے پیٹ میں زندگی کی ابتداٗ ہونے سے کائنات کے نظام میں کسقدر ہم آہنگی اور خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی ماں کے پیٹ میں آنے سے اسکی زندگی کا بوجھ اسکی ماں پر آ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نہیں۔اور پھر غیر مادی قوتوں۔اور گزشتہ پیغمبروں کو خدا کے بیٹے اور فرشتوں کو بیٹیاں بناتے ہیں۔ اس عقیدے کی تصدیق کیلئے انکے پاس کوئی علم نہیں۔اور بغیر علم کے ہی انہوں نے یہ عقیدہ قائم کیا ہے۔مگر یہ سب عقائد ایک بُہتان ہے۔وہ اللہ اس قسم کی صفتوں سے پاک ہے!ــــ بلکہ اسکی شانِ خالقیت ان صفات سے بہت بلند ہے۔سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوۡنَ اسکے تصور کیلئے صحیح نظریہ تو

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) جاتا ہے۔جہاں اسکی دوسری نشاۃ شروع ہوتی ہے۔ماں ایک مہلک اور دردناک عذاب کے باوجود ایک انسان کی نشاۃ کی متمنی اسقدر رہتی ہے۔کہ اگر اُسے اس پیدائش کی امید جاتی رہے تو دنیا کی ہر نعمت ہر راحت اسکے لئے حرام ہو جاتی ہے۔پھر ماں کے خون سے جو غذا اسے حاصل ہوتی ہے۔وہ نشاۃ اول بَدَاَ میں اسے کبھی حاصل نہ ہوسکتی۔یہاں پر اسے اپنی غذا۔خالص کر کے اور حسب ضرورت مہیا ہوتی ہے۔جسقدر اسکی ارتقا ہوتی ہے۔اسی انداز سے اِسکے سامان ربوبیت میں تبدیلی آتی جاتی ہے۔(حالانکہ یہاں بھی اسے وہی ماحول حاصل ہوتا ہے جو نشاۃ اول میں موجود تھا) پھر اسکے پیدا ہونے پر ہر شخص میں اسکے پیدا ہونے کی خوشی اور بے انتہا محبت پیدا ہوتی ہے۔یہ کیفیت خود بخود نہیں آسکتی بلکہ ایک وجدان کی صورت میں انسان کو ودیعت کی جاتی ہے۔ورنہ خود بخود بننے کا تقاضا تو یہی تھا کہ ماں جن کر علیحدہ ہو جائے اور بچہ کیلئے خود بخود سامان حاصل کرنے کی ضرورت ہوــــ وہ ماں جو بچہ کی پیدائش سے موت کے منہ میں ایک مہلک دور سے دو چار ہو جاتی ہے۔بچہ کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے رگ رگ میں بچہ کی محبت ابھر آتی ہے۔اور اپنے سینے سے لگاتی ہے! خالق کی نشاۃ آخر کا تقاضا ہی تو ہے۔کہ محبت بھرے سینہ میں ہی اسکی زندگی کا سامان مہیا ہوتا ہے۔گویا فطرت (خالق) نے محبت (نگہداشت) اور غذا (سامان ربوبیت) دونوں کو ایک دوسرے سے لازم وملزوم کر دیا۔پھر انسان کے ہر دور میں جَعَلَ نَسۡلَهٗ کے تحت ہر شخص کی نگہداشت۔محبت اور اسکی ارتقاً کیلئے تمام ضروریات کا مہیا کرنا۔خالق کی ترتیبِ تخلیق کے ماتحت ہی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح باقی مخلوق کا بھی اندازہ ہے۔کہ ہر شے زمین سے بَدَاَ ہوئی نشاۃ آخر میں ہر شے نسل کی صورت میں قائم ہوئی۔نباتات۔جمادات۔وحوش وطیور۔غرض کائنات کی ہر شے نشاۃ آخر نسل کی صورت میں قائم ہوئی۔

دوسری جگہ اسی نشاۃ آخر کی ایک اور ترکیب بیان کی جاتی ہے۔کہ ایک دور میں مخلوق ہوتی ہے۔انکے لئے موت لازمی رکھی گئی۔اور اسکے لئے ایک مقرر طریقہ رکھا گیا۔جو نہ بدلنے والا نہ ٹلنے والا ہے۔یہاں انسان کی پیدائش کے تمام طریقے نشاۃ اول میں شمار ہوتے ہیں اور موت کے بعد کی زندگی نشاۃ آخر میں شمار ہوتی ہے۔اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ قَادِرٌ" عَلٰٓى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ ہے! ــــ کہ وہ جنتا نہیں۔ بلکہ ہر مخلوق کی خود ابتداً (پیدا کرنے والا) کرنے والا ہے۔ ہے آسمانوں اور زمین کا بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۔ایسی صورت میں جبکہ وہ مادیت سے خالی نورِ مجسم ہو اسکے لئے بیوی یا اولاد کا ہونا ایک بے معنی بات ہے۔اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہٗ وَلَد'' وَّلَمۡ تَکُنۡ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ'' اور بدیع ہونے کی حیثیت میں ہر شے کا بنانے والا ہے وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ ۔وہ اپنی تخلیق کی تمام کیفیتوں کا علم رکھتا ہے وَھُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡم'' انسان کی ہر ضرورت۔ ہر مجبوری اسی سے وابستہ ہے۔کیونکہ کائنات کی ہر شے ایک نظام کے تحت بنی ہوئی ہے۔اور یہ سب اشیأ صرف انسان کیلئے بنی ہیں۔ جہاں انسان کو ہوا کی ضرورت ہے۔اسی اندازہ سے ہوا (ہر جگہ)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) وَجَعَلَ لَھُمۡ اَجَلًا لَّا رَیۡبَ فِیۡہِ ط (پارہ ۱۵ سورۃ ۱۷ آیت ۹۹) کیا نہیں دیکھا انہوں نے یہ کہ اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو وہ قادر ہے اس بات پر کہ پیدا کرے انکے مثل (دوبارہ) اور بنایا واسطے انکے ایک مقررہ وقت (موت) کہ اس کے واقع ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا!۔

اِذَا جَآءَ اَجَلُھُمۡ فَلَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ○ (پارہ ۱۱ سورۃ ۱۰ آیت ۴۹) ترجمہ۔جب آتی ہے موت اِنکے پاس نہیں تاخیر کرتی (جان لینے میں) اور نہ ٹھہر کر آتی ہے (بلکہ ایک وقت مقرر پر آکر رہتی ہے)۔

کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ ط (پارہ ۴ سورۃ ۳ آیت ۱۸۵) ہر جان نے موت کا مزا چکھنا ہے۔

وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَل'' ج فَاِذَا جَآءَ اَجَلُھُمۡ لَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ○ (پارہ ۸ سورۃ ۷ آیت ۳۴) ہر جماعت (ہر مخلوق) کیلئے موت لازمی رکھی گئی ہے۔پس جب موت انکی آتی ہے تو پھر اسکے آنے میں نہ تاخیر ہوتی ہے۔نہ پہل ہوتی ہے۔اِن آیات سے واضح ہوتا ہے۔کہ ہر دور میں موت کے ذریعہ ایک نشاۃ کے ختم ہونے پر دوسری نشاۃ کا قیام ہوتا ہے۔کوئی شے موت سے بھاگ نہیں سکتی۔موت کیلئے انسان کی مجبوری اس بات کی بیّن دلیل + ہے۔کہ ایک خالق کے ارادہ کے تحت ہر شے کی محکومی۔اور پابندی اللہ کے قانون میں پابند کئے ہوئے ہے۔اسلئے ہر شے کی مقررہ وقت کی موت بھی اللہ کے خالق ہونے کی ایک کھلی دلیل ہے۔

حاشیہ در حاشیہ + اسکی مفصل تشریح دین ص ۶۳ پر کی گئی ہے۔

میسر ہے۔انسان کو اونچے سے اونچے پہاڑ کے ٹیلے پر پانی کی ضرورت ہے۔بارش کے ذریعہ وہیں پانی پہنچاتا ہے۔چشموں کے ذریعہ میٹھے اور شفاف پانی مہیا کئے ہیں۔جہاں انسان کو خوراک کی ضرورت ہے۔انسان کے ایک ہل چلانے کے ساتھ۔سورج۔بارش۔شبنم۔گائے۔بیل۔کھاد[1] اور زمین کی ہموار اور نرم سطح مہیا کر دی ہے۔سردی گرمی میں محفوظ رہنے کا سامان۔ماں کے پیٹ میں انسان کی بناوٹ اور خوراک حاصل کرنے کا انتظام۔ہوا۔پانی۔کھانا سب کچھ ماں کے رحم میں مہیا کر دیا جاتا ہے۔پیدا ہونے کے بعد بغیر تعقل کے فطری شعور!۔ماں کی چھاتیوں سے لپٹے ہوئے بچہ کی غذا حسب ضرورت مہیا کر دی جاتی ہے۔اور جوان ہونے کی صورت میں بھی ہر قسم کی نعمتوں کا مہیا ہونا۔یہ تو کائنات کی ہر شے میں فطرتاً انسان کیلئے سامانِ ربوبیت ایک منظم طریقہ پر ودیعت کئے گئے ہیں۔لیکن یہ چیزیں تو بلا مشقت حاصل ہیں! ـــــ صرف انسانی زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے! ـــــ جہاں انسانیت کا نصب العین صرف ایک حقیقت کی تلاش کرنا۔اپنی اشرف المخلوقاتی شرافت کو برقرار رکھنا۔تنزل اور گمراہی سے محفوظ رہنا لازمی ہے وہاں انسان کے ساتھ اسکی راہنمائی اور مطلب تک پہنچنے کیلئے ـــــ ماوراء ادراک قوتوں سے مفاد حاصل کرنے کیلئے ایک جوہر اعلےٰ (روح)۔اور ایک مکمل راہنما۔حکیم (پیغمبر) اور اپنا علم بھی مہیا کر دیا۔تاکہ انسان ان قوتوں سے مدد لیکر اپنا درجہ اسقدر بلند کرے۔کہ وہ کائنات (مخلوقِ ارض و سمٰوٰت) پر اپنی بادشاہی چلائے اور ان تمام قوتوں سے بالاتر قوت کا حامل ہو جائے۔الغرض!۔جس نوعیت کی پرورش کی ہر زندگی کو ضرورت ہے۔اسی نوعیت کی ضرورتیں ہر شے کو میسر ہیں۔گویا۔انسان کی تمام

---

[1] کھاد ڈالنے سے دراصل زمین سے قریباً ڈیڑھ (۱/۱/۲) فٹ گہری مٹی کیڑوں کے ذریعہ زمین کی سطح پر آجاتی ہے۔زمین سے ڈیڑھ فٹ نیچے ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہے۔یہ گوبر کی کھاد کی وجہ سے سطح پر آجاتا ہے۔اور اپنے ساتھ نیچے کی مٹی لاتا ہے۔یہ ایک فطری نظام ترکیب ہے۔اگر یہ ۱/۱/۲ فٹ گہری کھاد زمین کی سطح پر نہ ہو تو فصل نہیں اگ سکتی۔لیکن یہ کھاد انسان خود لا نہیں سکتا۔اسلئے کھاد ہی اس مٹی کو سطح پر لانے کا ایک عجیب ذریعہ ہے یہ بھی فطرت کی تنظیم کا ایک کرشمہ ہے۔

ضرورتیں خواہ وہ ضرورتیں براہ راست اللہ سے وابستہ کی جائیں ـــ یا نہ کی جائیں۔ ہر حال میں (موجد ہونے کی حیثیت سے) وہی پالنے والا ہے۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ۔ ایسی صورت میں سوائے اسکے کوئی ایسی ہستی نہیں۔ جسکے سامنے اپنی حاجتوں کیلئے انسان کو جھکنا چاہیے۔ اسکی بے معاوضہ اور بے شمار نعمتوں کے عوض میں اسکا شکریہ لازمی ہے۔ پھر اسکے آگے حاجتمند ہونا۔ پھر اسی کے نظام میں پابند ہونا۔ اور اسی کی ملکیت ہونا۔ اس امر کی دلیل ہے۔ کہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ یعنی اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور نہ ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ اس (خود بخود) کائنات میں کسی اور خالق کا نشان پایا جائے۔ جب کسی خالق کا اقرار ہر حال میں ہے ہی نہیں۔ تو کائنات کا نظام اس امر کی بھی خود دلیل ہے۔ کہ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ۔ پس اسکی خالقیت۔ اسکی بادشاہت کا تقاضا یہی ہے۔ کہ اسکے آگے چارو نا چار اپنی عبدیت (غلامی)۔ فرمانبرداری کا اظہار فَاعۡبُدُوۡہُ کے ذریعہ کیا جائے۔ بن دیکھے خدا۔ اور اسکی خالقیت اور قدرت کا احساس رسمی نہیں۔ بلکہ ایک معنی رکھتا ہے! کہ وہ اپنی لامحدود اور عظیم الشان ہیئت کے اعتبار سے۔ ہر شے پر ہمہ وقت احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس نے ہر شے کو ایک پابند نظام میں جکڑ رکھا ہے۔ ایسی ہستی ارادہ کرنے سے یا کوئی فعل کرنے سے مجبور نہیں !۔ بلکہ اسکا ارادہ و علم اسقدر کائنات پر محیط ہے!۔ کہ اگر چاہے۔ تو روزی کیلئے تمام ذرائع بند کر سکتا ہے۔ وہ اپنے ساختہ (بنائے ہوئے) نظام کا (مالک ہونے کی حیثیت سے) پابند نہیں۔ بلکہ نظام کو بگاڑ سکتا ہے! انسان کی نافرمانی (قوانین فطرت کی خلاف ورزی) پر چاہے تو تباہ کر دے۔ چاہے تو تباہی سے بچا سکتا ہے!۔ چاہے تو لوگوں میں فساد و خونریزی کو ختم نہ کرے اور لوگ ہر وقت ظلم و ستم کا شکار بنے رہیں۔ اور انسان ہر وقت پریشانی میں رہ کر زندگی سے تنگ آ جائے۔ چاہے تو بے وقت بیماریاں پیدا کر دے جن کا کوئی علاج نہ ہو سکے۔ چاہے تو تمام نظام میں خلل ڈالکر انسان کو سکون کا موقع نہ دے۔ چاہے تو مار ڈالے۔ چاہے تو زندہ کر دے! وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡل"O۔

اللہ کی ان صفات کا اندازہ کرنے کیلئے اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا سوائے اسکے کہ

کائنات کی تخلیق پر خلوص نیت سے غور کیا جائے۔اور اللہ کو اسکی لامحدودیت کے مطابق سمجھا جائے۔تو پھر اسکی قدرت۔اسکا خالق ہونا۔اسکا رب ہونا۔اور بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ہونا۔ایمان بالغیب کے ساتھ اندازہ ہوسکتا ہے۔اسکی اصل حقیقت کا اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے۔جب انسان اپنی روحانی قوتوں سے حقیقت کا مشاہدہ کرسکے ورنہ اسکی حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انسان اسکی ذات کو دیکھ کر ہی اندازہ کرنا چاہتا ہے تو لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ ہاں انسان اس حالت میں اسکی قدرت اور اسکے احاطہ سے بزعم خود غافل نہ رہے وہ ہر حال میں ہر شے پر احاطہ کئے ہوئے ہے اور ہر شے کا علم رکھتا ہے۔وَ ھُوَ یُدۡرِکُ الۡاَبۡصَارَ وہ تو ہر نظر (باریک سے باریک ذریعہ) کے ماضی حال و مستقبل سے ہر وقت آگاہ ہے کیونکہ وہ اپنی لامحدودیت کے اعتبار سے لطیف نورانیت اور تابانی میں لامحدود وسعت کا حامل ہے وَھُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ۔ان صفات کی رو سے اللہ کے تصور کے آگے کسی وہمی خدا کا تصور آنا ناممکن ہے اور جب اسکا تصور اسکی لطیف و خبیر۔خالق۔بدیع وغیرہ قوت کے مطابق کیا جائے تو خدا کسی صورت میں غائب نہیں ہوسکتا۔

قرآن نے علے الاعلان اللہ کے تصور کے لئے دعویٰ کیا ہے۔کہ تم کائنات خلقت پر غور و تفکر کرو تو لازمی طور ایک اللہ خالقِ کُل کا وجود ضرور قائم ہو جائیگا۔اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوۡرَ ۬ؕ (پارہ ۷ سورۃ ۶ آیت اول) سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔اور روشنی اور اندھیرے کو بنایا۔یہاں۔حمد۔خلق۔النور۔ظلمات۔کا خصوصی حوالہ دیا گیا ہے۔یعنی اللہ کی پہچان اور اسکی خالقیت کی تعریف۔آسمان اور زمین میں۔روشنی اور نور میں تحقیق سے مل سکتی ہے۔

الحمد (تعریف) عجمی (غیر عربی) زبان میں اس حالت میں آتا ہے۔جب کسی شخص کی کوئی خوبی ظاہر ہو مثلاً ایک شخص اچھا گاتا ہے۔تو ہم اسکے گانے کی خوبی سے متاثر ہو کر اپنے احساسات کا اظہار ''واہ۔واہ'' میں کرتے ہیں۔یا کسی شخص نے ایک خوبصورت عمارت بنائی تو اسکی کاریگری کی داد دیتے ہوئے اسکے فن سے متاثر ہو کر اپنے احساسات کا اظہار ''خوب''.

سے کرتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں اَلْحَمْدُ دو حرف ہیں اَلْ۔ اور حَمْدُ۔ اَلْ سے مراد تمام۔ حَمْدُ سے مراد۔ خوبیاں۔ اور پہچانی گئی کیفیتیں۔ یا پہچاننے کی کیفیتیں۔ کسی شے کے اصلی نشان اصلی ہیئت سے آگاہ ہونا۔ گویا اَلْحَمْدُ سے مراد یہ ہے۔ کہ تمام کائنات میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ تمام خوبیاں دراصل اللہ ہی کی نشان دہی کر رہی ہیں۔ ان تمام خوبیوں کیلئے وہی اللہ (واہ واہ۔ خوب کے تاثرات بیخودی کے ساتھ) قابل تعریف ہے۔ پھر ہر شے کی تحقیق و تفکر میں اس شے کی کوئی ذات خاص مستقل نہیں۔ بلکہ ایک اللہ کی علت کی پہچان کے نشانات ہیں۔ ہر معلول بجائے خود کوئی وجود نہیں بلکہ اسکا وجود علت سے ہی قائم ہے۔ ہر علت جب تک اپنی لامحدودیت میں قائم نہ ہو۔ معلول کی حیثیت رکھتی ہے۔ علتِ لامحدود ہی اللہ ہے۔ جس کے وجود سے تمام غیر مستقل علتیں پیدا ہوئی ہیں۔ اور ہر علت بجائے خود علتِ لامحدود کی تنزلی جز ہے۔ اسلئے ہر خوبی۔ ہر شے۔ میں ایک اللہ کی نورانی ہیئت ہی مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے اسکی دلیل یہ ہے کہ یہ آسمان وزمین بھی ایک تخلیق ہے۔ اسکی تخلیق اللہ کی پہچان کی دلیل ہے۔ کیونکہ قرآن خود اسکے ثبوت فراہم کرنے کیلئے ایک دلیل ایک راہ بتاتا ہے۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اٰیٰت'' لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ زمین وآسمان کی تخلیق میں اللہ کے پہچاننے کیلئے بہت سے نشان موجود ہیں۔ اور خصوصاً انسان کی پیدائش اور اسکی وجودی ترکیب میں بھی ایک خالق کے نشان موجود ہیں کیا تم ان نشانات پر غور کی نظر نہیں کرتے؟ کیا تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں۔ کہ کائنات کی تخلیق میں کیوں اسقدر محکم اور منضبط نظام ہے۔ اس نظام میں کیوں اسقدر تنظیم پائی جاتی ہے؟ ذرا انسان کے وجود پر نظر ڈالو دیکھو کیا اسکے وجود کا کوئی حصہ بھی ایسا ہے۔ جس میں بہترین کاریگری اور بہترین تنظیم نہ پائی جاتی ہو۔ کیا تحقیق کیلئے انسانی وجود باعثِ حیرت نہیں؟ ان تعجب خیز کیفیات کو دیکھکر تم یہ نہیں اندازہ کرسکتے کہ اللہ کیا ہے؟ کیسے خالق ہے؟ یہ تو قرآن کی ایک دلیل ہے۔ کہ تم کائنات اور انسان کے وجود کی تحقیق کرو اور تمہارے مادی احساس بھی اسکی خالقیت کو تسلیم کرینگے۔ اسکی سمجھ کیلئے بھی اللہ نے ایک آسان طریقہ سمجھا دیا۔ کہ

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۔یعنی مخلوق کی بناوٹ جہاں اپنی انتہا کو پہنچتی ہے۔اور جو صفات ہر مخلوق (خصوصاً انسان) میں پائی جاتی ہیں۔منبع حقیقی ہونے کی حیثیت سے یہ سب اسی کی صفات ہیں اور وہ تمہاری صفتوں کا بدرجہ اتم حامل ہے۔مخلوق کی تمام صفات (فطرۃ۔بناوٹ) کے (Collection) مجموعہ کے بعد۔جو تصور ایک خالق کیلئے اسکی لامحدودیت کے اعتبار سے ہونا چاہیے۔وہی تصور اسکی ذات کی پہچان ہے۔سو اسکی پہچان تخلیق سمٰوٰت وَالْاَرْض میں آسانی سے مل سکتی ہے۔اور تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ تمام چیزیں اسکی مخلوق نہیں؟ ذرا اس روشنی اور اندھیرے کی کیفیت کا ہی تجزیہ کرو؟ اور بتاؤ کہ اس دنیا کے پیدا ہونے سے پہلے کہیں اندھیرا بھی تھا؟ یا اس دنیا کی ابتدأ میں جب یہ اپنی تابانی (روشن) قوت میں موجود تھی کہیں اندھیرا بھی تھا؟ انسان کی پیدائش پر یہ کیا ضروری تھا۔کہ اس دنیا پر جو چاروں طرف سے روشن ستاروں سے گھری ہوئی ہے اندھیرا ہو۔خود بخود یا خالق کی بناوٹ پر بھی یہ کیا ضروری تھا کہ اس پر اندھیرا ہو۔جبکہ نور کے ہوتے ہوئے اندھیرا ہو ہی نہیں سکتا۔کیوں؟ ـــــ کائنات کی تمام کیفیتوں کی ابتدأ نور (روشنی) سے ہوئی ہے۔اور روشنی ہونے کی صورت میں اندھیرا ہونا ممکن نہیں ہوسکتا۔اور اللہ کے احد ولامحدود ہونے کی خاصیت یہی ہے۔کہ اسکا نور ہر جگہ اپنی اصلی حالت میں موجود ہو۔پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔کہ اسکی روشنی ہوتے ہوئے بھی اندھیرا ہو؟۔کیا تم نے اس روشنی اور اندھیرے کا تجزیہ کیا۔کہ ایک ہیئت کی بیک وقت دو کیفیتیں (متضاد) پائی جاتی ہیں؟ کیا خود بخود ہونے میں یہ ترکیب آسکتی ہے؟ ہرگز نہیں!۔

معترض یہ کہہ سکتا ہے! کہ زمین اپنی روشنی ختم کر چکی ہے۔اب یہ مادی حالت میں ہے ۔جہاں پر روشنی کا ہونا ممکن نہیں۔اور اسکی روشنی اندھیرے کی سیاہی میں تبدیل ہو چکی ہے۔اب اسکی روشنی کا انحصار اسکے ملحقہ سیاروں پر ہی ہے۔اسلئے اسکا اندھیرا اسکی فطری (خود بخود) خاصیت ہے۔اسلئے اب یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔کہ روشنی کے ہوتے ہوئے اندھیرا کیسے پیدا ہوا؟ ـــــ ہاں ـــــ یہ دلیل قطعی درست ہے! اور اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کائناتِ خلقت میں صرف

ایک زمین ہی ہے جو مرکزی نقطہ کی حیثیت حاصل کئے ہوئے ہے۔ اسکا مقام تمام نورانی کیفیات میں سب سے دور ہے۔ جہاں اس نے مادہ کی ہیئت اختیار کی ـــــ اسکے علاوہ باقی سیارے ایسے مقام پر واقع ہیں جہاں ان میں مادیت یا مادی پیدائش کے آثار قطعی پیدا نہیں ہو سکتے ہیں۔ تو پھر انسان بھی اسی زمین کی فطری پیدائش ہے ـــــ گویا اندھیرا اور انسان (یا مخلوق) دو لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ جہاں انسان نہیں وہاں اندھیرا نہیں۔ جہاں اندھیرا نہیں وہاں انسان نہیں۔ تو پھر انسان کے ہونے سے اس آیت کی دلیل قوی ہو جاتی ہے۔ کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ" فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً گویا اس زمین کو کسی خالق کے ارادے سے ہی یہ مقام ملا ہے۔ جہاں اس میں تخلیق کے آثار پائے گئے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس مخصوص زمین (اَلْاَرْض) میں اندھیرے اور انسان کا آپس کا کیا تعلق ہے؟ کائنات کی اشیاً کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسانی زندگی کیلئے اندھیرا (رات) ایک اہم چیز ہے۔ انسان کی فطرۃ میں یہ ابتداً سے آچکا ہے۔ کہ وہ دن کو کام کرے۔ یا نہ کرے۔ پھر بھی وہ رات کے اندھیرے میں سکون حاصل کرتا ہے۔ انسان کی فطرۃ میں نیند ایک خصوصی کیفیت ہے۔ جسکے لئے انسان سونے پر مجبور ہے۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے۔ کہ انسان کے سونے کیلئے ضروری نہیں کہ رات ہی مقرر کی جائے وہ دن کو بھی اپنی نیند سو سکتا ہے۔ پھر نیند کیلئے رات کا ہونا ضروری نہیں۔ انسان اس بات پر مختار ہے۔ کہ وہ دن کو سوئے رات کو نہ سوئے۔ لیکن ابتدائے تخلیق سے انسانی فطرۃ اس عادت پر عادی ہو چکی ہے۔ کہ وہ رات کو ہی اکثر سکون کی نیند سوتا ہے۔ گویا یہ بھی انسان کی فطرۃ ثانیہ ہو چکی ہے۔ اب انسان رات نہ ہونے پر سکون کی زندگی حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اسکی عادۃ ثانیہ کا مستقل ہونا بھی رات کے پیدا ہونے کی وجہ سے ہی ہے۔ کہ رات ہر حال میں سکون اور آرام کیلئے بنی ہے۔ اس امر سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ باوجود نور کی کثرت کے زمین کو اسی روشنی سے ہی اندھیرا حاصل ہے۔ اور اسکی خصوصیت صرف انسان کی وجہ سے ہے۔ اور انسان ایک ارادہ کے مطابق ہی بنا ہے۔ اور زمین ایک ارادہ کے مطابق ہی ایسے مقام پر پیدا کی گئی ہے۔ جہاں۔ انسان۔ رات اور تمام انسانی لوازمات پیدا ہو

سکتے ہوں۔اگرانسان نہ بنتا تو اسکی تمام آسائشیں بھی پیدا نہ ہوتیں۔اور اندھیرا تو نور کی ایک جزوی کیفیت ہے۔جو فطرۃ کی صفات کی ایک صفت ہے۔اسکا ہونا بھی اسی ارادہ ازلی میں شمار ہے۔جو آفرینش (پیدائش) سے قبل ارادہ الٰہی میں شامل تھی۔اگر ارادہ الٰہی میں یہ چیز نہ ہوتی تو اندھیرا نہ ہوتا۔اور اندھیرا نہ ہونے پر انسان سکون کی زندگی حاصل نہ کرسکتا۔یہی اشارہ اس آیت وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ کہ نور ہوتے اندھیرا ناممکن ہے۔اور اندھیرا اگر فطری خاصیت زمین کی ہے تو پھر روشنی ہونا بھی ناممکن ہونا چاہیے۔اس آیت میں نور اور روشنی کی پیدائشی ترکیب کا تجزیہ کرنے کی تحریک ہے کہ ایک وقت میں دو کیفیتوں کا پیدا ہونا۔اور پھر ان کیفیتوں میں کیا کیا مرکبات ہیں یہ ایک تحیر کن کیفیات ہیں جن سے ایک خالق کی صناعی ضرور معلوم ہوتی ہے۔اور پھر انسانی زندگی سے ان دونوں کیفیتوں کے تعلق پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا۔کہ کسی خالق نے ہی یہ نظام پیدا کیا۔تاکہ اس زمین کا انسان دن کی روشنی میں مصروفیت میں پھنس کر ایک ایسی کیفیت کی ضرورت محسوس کرے۔جس میں اسے چار و ناچار۔مجبوراً۔(یا زبردستی) کام سے علیحدہ ہونا پڑے اندھیری کیفیت میں انسان دن کے مانند کام کرنے سے مجبور ہوتا ہے۔تاکہ اگر انسان خود بھی نہ چاہے تو بھی رات ہونے پر اسے ایک خاموش اور پرسکون ماحول میسر ہو تاکہ رات کو یہ اپنے دنیوی دھندوں سے فارغ ہوکر اپنی فطری خاصیت (نیند) کے دباؤ سے خود بخود سو کر اپنے تفکرات سے نجات حاصل کرے چنانچہ خالق اس بات کی تصدیق کیلئے خود اطلاع دیتا ہے۔وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۠ (پارہ ۳۰ سورۃ ۷۸ آیت ۹ تا ۱۱) اور نیند کو تمہارے لئے باعث آرام بنایا۔رات کو مانند لباس کے بنایا یعنی یہ انسان کو ڈھانپتی ہے۔اور دن کو اسکے مقابلہ میں کاروبار کیلئے مقرر کیا۔نیند (نوم) رات (لیل) دن (النہار) یہ تینوں چیزیں اگر مادی زمین کی خاصیتیں ہیں۔لیکن انکے وجود کا مقصد صرف انسان کی خاطر ہے بھلا ان چیزوں کی تخلیق کا اندازہ تو کرو۔پھر ان کیفیتوں کو اپنی زندگی کی وابستگیوں سے متعلق کرکے فیصلہ کرو۔کہ کیا خالقِ کائنات کے سوا بھی ایسی کیفیتیں پیدا ہوسکتی ہیں جو انسان کی زندگی کے

سکون وراحت کے لئے اشد ضروری ہیں۔کیا یہ تمام نشانیاں خود زبان حال سے نہیں پکار۔رہی ہیں۔کہ اللہ کے سوا ہمارے وجود کا ہونا ناممکن ہے۔اور ان کیفیات کا وجود خود اللہ کی ذات (علت لامحدود) سے ہی ہے۔

الٓمّٓ ۚ﴿﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ؕ﴿﴾ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۙ﴿﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ (پارہ ۳ سورۃ ۳ آیت ا تا ۳) ا۔ل۔م: اللہ ہے۔نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔وہ زندہ ہے۔ اور ہمیشہ قائم ہے۔اتاری تم پر کتاب ساتھ حق کے تصدیق کرنے والی اس چیز کی جو تمہارے ہاتھوں میں (کتاب) ہے اور اس نے اتاری تورات۔اور انجیل اس (قرآن) سے پہلے۔ایک ہدایت لوگوں کیلئے۔اور اتارا قرآن ایک معجزہ کی صورت میں۔

ال م۔یہ حروف بغیر حرکت (زیروزبر) کے ہیں۔اسلئے یہ اپنی مستقل ہیئتوں میں ہی قائم ہیں۔اعراب (حرکت) نہ ہونے کیوجہ سے ان سے کوئی لفظ ایسا نہیں بنتا جسکے عربی لغت کے تحت کچھ معنی ہوسکیں۔بالفاظ دیگر یہ حروف مُقَطَّعَات Short Hand Letters جیسے "A.L.M." قرآن میں جسکے لئے کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ ہے۔کوئی ایسا حرف یا لفظ نہیں پایا جاتا جو بے معنی و بے مقصد ہو ا۔ل۔م یہ تینوں حروف اسی ہیئت میں حضور محمد رسول اللہؐ پر بذریعہ وحی نازل ہوئے ہیں۔پیغمبر چونکہ خود وحی کو سمجھتا ہے۔ایسے حروف جب وحی میں آئیں تو پیغمبران حروف کے معنی سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔اسلئے پیغمبر جب تک خود اسکے معنی نہ بتائے۔تب تک کوئی شخص ایسے حروف کے مطلب سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔قرآن کا ہر حرف انسان کی ہدایت کیلئے اترا ہے اسلئے ضروری ہے۔کہ انسان (پیروان پیغمبر) بھی ان Short Hand حروف سے آگاہ ہو۔جیسے قرآن کا دعویٰ ہے کہ حٰمٓ ۚ﴿﴾ تَنْزِیْلٌ "مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۚ﴿﴾ كِتٰبٌ" فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۙ﴿﴾ (پارہ ۲۴ سورۃ ۴۱ آیت ا تا ۳) ح م۔اتاری ہوئی ہے (یہ کتاب) بخشنے والے۔مہربان کی طرف سے۔کہ جدا کی گئی ہیں (یعنی وضاحت سے بیان کی گئی

ہیں) اسکی آیتیں۔قرآن عربی (میں) ہے۔اس قوم کے واسطے جوعلم[1] رکھنے والی ہیں۔دوسری جگہ عربی زبان وعلم کا صریحاً بیان ہے۔حٰمٓ ﴿ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿ (پارہ ۲۵ سورۃ ۴۳ آیت ۱تا۳) حم قسم ہے کتاب بیان کرنے والی کی تحقیق کیا ہے ہم نے اسکو قرآن۔عربی میں تا کہ تم اپنے تعقل کے ذریعہ بھی سمجھ سکو۔

اس قرآن کی ہر آیت ہر لفظ ہر حرف میں ایک تفصیل موجود ہے۔صرف اسلئے کہ انسان کسی طرح بھی! یہ سمجھ سکے کہ اس کائنات کی وسعت اتنی عظیم الشان ہے۔کہ انسان اسکی اتھاہ تک صرف مادی تعقل کے ذریعہ نہیں پہنچ سکتا۔ایسی صورت میں لازمی ہے۔کہ انسان کچھ اس مادی نظام کو دیکھکر کچھ اپنی عقل کی نارسائی پر اللہ کے خالق ہونے سے انکار نہ کردے قرآن نے اسی نقص کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ اس انداز سے نشانیاں (آیتیں) بتادیں۔کہ انسان ہر حال میں اللہ کے ہونے کا چارو نا چار اقرار کرے۔یہ ضروری ہے۔کہ قرآن کا ہر لفظ اگر وہ مفصل ہو تو اسکے نشان قوانین فطرت (کائناتِ عالم) میں ظاہر طور موجود پائے جائینگے۔اور اگر مجمل ہو تو اسکا تعلق تعقل سے باہر (ماورأ ادراک سے) ہوگا اور ایسی آیات بھی اپنے میں وسیع معانی رکھتی ہونگی۔اسی طرح یہ حروف مقطعات بھی مجمل صورت میں ہیں اور وضاحت طلب ہیں اپنے میں معنی رکھتے ہیں۔اور یہ حروف بھی انسانی ہدایت کیلئے بھیجے گئے ہیں۔لیکن ظاہر ہے۔کہ قرآن میں ظاہر طور اسکے معنی نہیں پائے جاتے ہیں۔اور ہر مترجم۔ہر مفسر ان الفاظ کو بغیر معنے انکی اپنی ہیئت میں ہی تحریر میں لاتا ہے۔اسکی وجہ یہ ہے۔کہ پیغمبر ماورأ ادراک کے علم سے آگاہ ہوتا ہے۔خصوصاً قرآن کے ہر لفظ کے معانی سے آگاہ ہوتا ہے۔اگر ان الفاظ کے معانی پیغمبر نے نہیں بتائے۔تو اسکا مطلب یہ ہے۔کہ اسکے معانی ماورأ ادراک (باطن) سے تعلق رکھتے ہیں۔انکا تعلق پیغمبر کی اُس خصوصیت

---

[1] یہاں علم سے مراد ایک عربی علم اور دوسرے وہ علم جو ہر مخفی (پوشیدہ) کیفیت کا علم ہو۔ظاہر طور عربی علم بھی اور خاصکر قرآنِ عربی اپنے میں عظیم الشان وسعت رکھتا ہے۔پھر ایک محقق کو عام انسانوں کے مقابلہ میں ظاہری علم زیادہ ہوتا ہے۔

سے ہے۔ جس میں ماورأ ادراک علم و مشاہدہ کی آگاہی کرانا ہے۔ لہذا ان حروف کے معانی جبکہ ظاہری طور بیان نہیں کئے گئے اور پھر یہ حروف بھی انسانی ہدایت کیلئے نازل ہوئے ہیں۔ پیغمبر ہر شخص کو ماورأ ادراک میں مشاہدہ کراتا ہے۔ گویا ان حروف کا تعلق ماورأ ادراک کیفیات سے ہی ہے۔ اسلئے انکے معانی مشاہدہ سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ باالفاظ دیگر۔ یہ حروف بہ باطن روحانی کیفیات و آیات ہی کے نام ہیں۔ جنکا تعلق روحانیت سے ہی ہے اور ایسے حروف بیان کرنے کی وجہ صرف پیغمبر کے منجانب اللہ۔ اور ماورأ ادراک عالم ہونیکے لئے ایک دلیل پیش کرنا ہے یہ حروف کلام الٰہی ہونے کی بھی دلیل ہے۔ اور اسی نظریہ کے تحت انسان کیلئے ایک اشارہ ہے۔ کہ انسان کے پسِ پردہ اور بھی قوتیں موجود ہیں جنکا اسے ادراک نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ وہ پیغمبر اور اللہ کے تسلیم و علم سے مدد حاصل نہ کرے چنانچہ یہاں بھی اللہ کے تصور کیلئے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ لا الْـحَیُّ الْـقَیُّـوْمُ بتایا گیا۔ کہ اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیگا۔ اور ابد سے قائم ہے۔ وہی اللہ ہے۔ جس نے کتاب (کلام الٰہی) پیغمبر پر نازل کی ہے۔ اور یہ کلام بے معنی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اسکی آیات۔ قوانین فطرت کے ساتھ مطابقت کرتی ہیں۔ اسکا اور پیغمبر کا مقصد صرف حکومت کرنا نہیں۔ بلکہ انسان کو معراج تک پہنچا کر اسکے نصب العین سے ہمکنار کرنا ہے۔ ہر زمانہ میں پیغمبر آتے رہے ہیں۔ سب نے ایک خالق کا تصور بتایا۔ اور خالق کی ہی حکومت تسلیم کرائی۔ قرآن بھی وہی بات بتاتا ہے۔ جو سابقہ پیغمبروں نے بتائی ہے۔ اور قرآن کسی مذہب کی حقیقت کی مخالفت نہیں کرتا۔ بلکہ سب کی تائید و تصدیق کرتا ہے۔ تواریخ کے مقابلہ میں قرآن ہی گزشتہ پیغمبروں اور انکے واقعات کو صحیح طور پر بیان کرتا ہے۔ اور ان سب کتابوں کی بھی خبر دیتا ہے۔ جن پر باقی پیروان مذاہب یقین رکھتے ہیں۔ نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَابَیْنَ یَدَیْهِ ۔ مسلمان اور باقی مذاہب کے پیروؤں کا تو مشترک عقیدہ ہے۔ کہ تورات۔ انجیل۔ کلام الٰہی ہیں تو پھر قرآن پر کیوں یقین نہیں کیا جاتا۔ جبکہ یہ بھی اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۙ مِنْ قَبْلُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ۗ۔ قرآن نے کوئی ایسی بات

نہیں کہی جو خلاف فطرت ہو۔ کسی غیر اللہ کا تصور نہیں دلایا کوئی شخصی حکومت قائم نہیں کی۔ اسکا ہر ہر حکم انسان کیلئے فائدہ مند ہے۔ تو پھر اسکے کلام الٰہی ہونے میں کیا شبہ ہے؟ ذرا غور تو کرو۔ کہ یہ تمام نظام۔ قانون۔ جب قرآن سے مطابقت کرتا ہے تو پھر اللہ کو خالق تصور کرنے کی کیوں مخالفت کی جاتی ہے۔ کیا قرآنی آیات۔ گزشتہ پیغمبروں کی کتابیں۔ اور خود نظام کائنات اس بات کی شہادت نہیں دیتا؟ ___ کہ ایک خالق اللہ ضرور ہے؟

ملٰئِکہ: اللہ اپنے تصور میں بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ کا ہر دلیل میں ذکر کرتا ہے۔ گویا اسکی تخلیق میں دو خصوصی مقام ہیں۔ ایک آسمان۔ اور دوسری زمین۔ اسکی تخلیق میں اسکی خالقیت کا اظہار انہیں دو کیفیتوں سے ہوتا ہے۔ خالق ہونے کیلئے۔ بـدع پر مطالعہ کرنا ہے۔ کہ کائنات کی ابتداً کیسے ہوئی؟ اور کس سے ہوئی؟ تو اسکے لئے اپنے تفکر میں اَلۡاَرۡضَ سے مطالعہ کرتے ہوئے "بـــدع" ابتدائی علت کا کھوج لگایا جاسکتا ہے۔ جس سے لازمی طور تفکر کا تسلسل آسمانوں سے ملیگا۔

اَلۡاَرۡض کی تخلیق میں بے شک، کسی خالق کے ہاتھ کو محسوس نہیں کیا جاتا ہے۔ اسکا مطلب یہ نہیں کہ اس منظم نظام میں کوئی خالق نہیں ہوسکتا۔ انسان کے پاس کسی شے کی حقیقت کو پانے کیلئے صرف مادی حس ہیں۔ لیکن مادی حس تو مادہ (زمین) سے باہر ادراک کر ہی نہیں سکتے۔ حالانکہ زمین سے ماسوا۔ کائنات عالم میں اور بھی مخلوق ہے۔ جسکا انسان کو علم ہی نہیں ہوا نہ ہی اسکے حواس ان اشیأ کا احاطہ کرسکتے ہیں۔ تو پھر ان احساسات سے اپنی عدم تکمیل اور نامکمل تحقیقات پر کوئی آخری فیصلہ تو نہیں دیا جاسکتا۔ کہ انسان نے ابتدأ سے انتہا تک تحقیق کے بعد طے کرلیا ہو۔ کہ اس کائنات کا کوئی خالق موجود نہیں۔ اسلئے جب تک انسان ماورأ ادراک کیفیات و اشیأ کی کلی طور تحقیق میں تکمیل نہ کرے وہ کسی خالق کو نہ پانے کے باوجود بھی اس سے انکار کرنے میں حق بجانب نہیں ہوسکتا۔

یہ امر طے شدہ ہے۔ کہ ہر Mater (معلول) کی علت اپنے معلول سے قوی اور

غالب ہوتی ہے۔ ہر علت میں اپنے معلول کے مقابل لطافت زیادہ ہوتی ہے۔اسی طرح جب زمین کی تمام اشیأ کا اسکی علت سے مقابلہ کیا جائے۔تو لازمی طور یہ علت زمین کی مادیت سے اپنی لطافت میں قوی ہوگی ــــ مادہ سے قوی نار (آتش) ہوتی ہے۔لہذا یہ ضروری ہے۔کہ ان تمام مادی اشیأ کا وجود (بــدع) اپنی تخلیق سے قبل ایک آتشی مادہ سے ہوا ہے۔اور زمین کے ساتھ باقی کائنات کے سیاروں ستاروں کا وجود جب یکجا (جمع) کیا جائے تو باقی کواکب (ستاروں) کی ہیئت کے مطابق انکی علت بھی انسے قوی آتشی ہیئت میں موجود ہوگی۔آتش (نار) بھی خود کوئی مستقل وجود (Mater کی رو سے) نہیں رکھتی اسکی بھی علت ہونی ضروری ہے۔تو یہ علت نار سے بھی انتہائی روشن اور تمازت میں (نور کی ہیئت میں) ہوگی۔

زمین کی ہر شے میں ایک مستقل زندگی پائی جاتی ہے۔جس سے انکی نشوو ارتقا (ترقی) ہوتی رہتی ہے اور ہر شے کی زندگی ایک لطیف قوت (جوہر) سے ہوتی ہے۔اسلئے لازمی ہے۔کہ جہاں مادہ نہ ہو۔اور ہر کیفیت ایک لطیف کیفیت میں ہو۔تو اس ماحول کی ہر شے مادہ سے خالی ایک مجسم زندگی ہوگی۔گویا جو شے مادی نہیں اسے کسی شے سے زندگی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔بلکہ وہ خود ایک مستقل زندگی رکھتی ہیں بہ الفاظ دیگر مادہ لطیف جوہر (نور) سے ہی زندگی حاصل کرنے کیلئے محتاج ہے۔اور لطیف جوہر (نور) خود کسی سے زندگی حاصل کرنے کا محتاج نہیں۔بلکہ مجسم زندگی ہے۔

کائنات کی اشیأ پر غور وتفکر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔کہ یہ مادی ماحول اور اسکی مخلوق کی زندگی کا دارومدار ایک لطیف ماحول سے وابستہ ہے۔یہ لطیف ماحول مادی حس سے باہر ہے۔لیکن ہم اسکے ادراک کے بغیر بھی اسکا وجود تسلیم کر لیتے ہیں۔یعنی اس زمین کی تخلیق بغیر کسی (بدع) ابتدأ کے نہیں ہوسکتی بلکہ ایک نوری ماحول سے ضرور وابستہ ہے۔اور جب اس لطیف ماحول کا تصور کیا جائے تو اسکی مخلوق کا تصور بھی ایک نوری پیکر کی ہیئت میں کرنا ہوگا۔یہی نوری مخلوق ملٰئکہ کے تمثیلی نام سے موسوم کی جاتی ہے۔یہ تصور اور تسلیم اِنکے وجود کے ہونے کیلئے نہیں

ہوگا۔ بلکہ اس تسلیم و تصور سے مقصد یہ ہوگا۔ کہ اس کائنات کی تخلیق ایک معلول کی صورت میں ہے۔ اور اسکا تسلسل اس نوری ماحول سے ملتا ہے جسے آسمان و ملائکہ کہتے ہیں جب ہمارے تصور کیلئے ایک ماحول و کیفیات کی کڑی (دلیلاً) قائم ہوگئی۔ تو پھر یہ شے خود اس امر کی دلیل ہو جاتی ہے۔ کہ یہ کڑی اسی طرح علت در علت تیزی اور تابانی میں لگاتار چلی جاتی ہے۔ اور اس تسلسل کی کڑی وہاں ختم ہوگی جہاں اس ماحول میں لامحدودیت قائم ہو جائیگی۔ اور اسی لامحدود ماحول کیفیت کو خالق کے تصور کیلئے قائم کیا جائیگا۔ اسلئے لازمی طور غور و تفکر یہ نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ کہ زمین الارض کے وجود ہونے سے آسمانوں کا وجود لازمی ہو جاتا ہے جہاں کی مخلوق ملائکہ (نوری پیکر) ہیں اور انہی نوری پیکروں کا تسلیم اللہ کے خالق ہونے اور اسے تسلیم کرنے کا Automatically ایک ذریعہ ہے۔ جو قوانین فطرت کے عین مطابق ہے۔ گویا اللہ کے تصور و تسلیم کیلئے۔ ملائکہ کا وجود تسلیم کرنا اللہ کے تصور کو مستحکم اور مکمل کر لیتا ہے۔

ملائکہ کا تصور جب اِنکی نوری ہیئتوں میں کیا جائے تو اس سے ان واقعات کو تسلیم کرنے میں بھی آسانی پیدا ہوتی ہے جو پیغمبر مافوق الفطرت مشاہدات میں اللہ کو تسلیم کرنے کیلئے پیش کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن بھی اس نظریہ کیلئے ایک شہادت دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے:- وَ اِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۙ صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ ۧ (پارہ ۲۵ سورۃ ۴۲ آیت ۵۲-۵۳) تحقیق تو البتہ ہدایت کرتا ہے۔ سیدھی راہ کی طرف۔ (اللہ کی راہ کی طرف) اللہ کی راہ وہی ہے۔ (جو) واسطے اسکے ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ خبردار ہو (یعنی آگاہ ہو) سب کام اللہ کی طرف پھیرے جاتے ہیں۔ (یعنی ہر شے کو اللہ کے نور سے مناسبت ہے)۔

اس آیت میں ہدایت تَھْدِیْ صِرَاطٍ راستہ اور صِرَاطِ اللّٰہِ کا خصوصی ذکر ہے۔ ان اشارات سے واضح ہو جاتا ہے۔ کہ اللہ تک پہنچنے کیلئے ایک سیدھا راستہ ہے۔ یہی راستہ صِرَاطِ اللّٰہِ کہلاتا ہے۔ اور یہ راستہ زمین سے لیکر آسمانوں سے ہوتا ہوا اس (اللہ) تک پہنچتا ہے۔ لَہٗ مَا

فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ سے مراد یہ ہے۔ کہ جو کچھ تمہارے احساسات اور وجدان میں زمین و آسمان کی تخلیق کے تصورات قائم ہوتے ہیں یہ سب اللہ کے نور سے ہی بنے ہیں (اسکی ترکیب وہی (Mater) علت و معلول کی ہے) چونکہ زمین انسانی احساسات میں آتی ہے۔ اسکی مخلوق پر غور کرنے سے انسانی تفکر کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ برابر آسمانوں سے جا ملتا ہے۔ اور آسمانوں کا سلسلہ اللہ کی ذات تک پہنچ جاتا ہے۔ اسلئے صراط کے ساتھ اشارۂ لَـهٗ مَا فِـی السَّـمٰوٰتِ وَ مَـا فِـی الْاَرْضِ کا بیان کیا گیا ہے۔ تا کہ انسان کو اللہ کے عرفان کیلئے ایک صِـرَاطِ مُّسْتَقِيْم سیدھی راہ کا نشان ملے۔ چنانچہ قرآن تفکر کیلئے بھی یہی ترکیب بتاتا ہے کہ اِنَّ فِیْ خَـلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اٰیٰت" لِّـلْـمُوْقِنِیْنَ ۙ وَفِـیْٓ اَنْـفُسِکُمْ ط اَفَلَا تُبْـصِـرُوْنَ ○ یعنی اللہ کے خالق ہونے کے زمین و آسمان میں بہت سے نشان پائے جاتے ہیں اور انسان چونکہ موجودات کے جواہر کا مرکب ہے۔ اسلئے اگر انسان اپنی پیدائش پر ہی نظر ڈالے تو اسے تمام جہان کی تخلیق کا راز ملیگا اور اسکی ذات (انسان) کا تسلسل بھی بالآخر آسمانوں کی تخلیق سے جا ملیگا۔ گو خالق کے عرفان کی راہ اگر حاصل کرنی ہے تو اسکے صراط اللّٰہ کی ابتداً انسان سے ہی ہوتی ہے۔ یہ ایک عقیدہ ہی نہیں بلکہ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کہکر آنکھوں سے دیکھکر تحقیق کرنے کی دعوت دی ہے۔ گویا جوں جوں انسان آنکھوں (حواس) سے دیکھکر اللہ کے عرفان کی طرف رجوع کریگا اسے خود صـراط الـمستقیم "صِـرَاطَ اللّٰہ" پر آگاہی حاصل ہوگی لیکن شرط یہ ہے۔ کہ انسان لِـلْـمو قنین کے زمرہ میں آئے یعنی ابتداءً وہ کسی خالق کا ہونا تسلیم کرے پھر اسکی تحقیق کرے۔ کہ آیا اس زمین و آسمان کی پیدائش میں کوئی خالق ہے کہ نہیں؟ اسلئے قرآن بتاتا ہے کہ زمین کی مادی اشیأ تو تمہارے حواس کے احاطہ میں آسکتی ہیں انہیں دیکھو اور ساتھ ساتھ یقین رکھو کہ اللہ ہے۔ خالق ہے۔ اور آسمان اور جو کچھ اسمیں ہے (یعنی نوری کیفیات جن میں ملائکہ خصوصی کیفیات ہیں) اسی سے بنے ہیں۔ یہی ترکیب ارض و سـمٰوٰت اللہ کے راہ اور اس تک پہنچنے کیلئے ایک ذریعہ بنائے گئے ہیں۔ اسلئے قبل از تحقیق زمین کی مخلوق کی تحقیق کے بعد

آسمان اور آسمانوں کی مخلوق ملائکہ کا عقیدہ رکھنا لازمی ہے۔

تیسرا عقیدہ۔ کتاب۔ یعنی قرآن۔ انسان جب تفکر پر آمادہ ہو۔ تو اصولی طور (جہاں تک اسکے حواس خمسہ کے احاطہ کا تعلق ہے) اسے ایمان بالغیب کے ساتھ پہلے اللہ کے خالق ہونے کا ایک خصوصی نکتہ ضرور قائم کرنا ہے۔ جب اللہ کو تسلیم کیا گیا۔ تو اسے ارض وسمٰوات کی بناوٹ کے لحاظ سے ہی اللہ کا تصور قائم کرنا ہوگا اسلئے اسکی بناوٹ میں تخلیق ارضی کے ساتھ ملائکہ کا بھی تصور قائم کرنا ہے۔ اسکے بعد جب وہ ان دو چیزوں پر آمادہ ہو۔ تو اسے تفکر کیلئے ایک ٹھوس علم کی ضرورت ہوگی تو ضروری ہے کہ وہ اللہ کی کلام (یعنی کتاب) کی طرف رجوع کریگا۔ تو کتاب کا مطالعہ کریگا جب کتاب کا مطالعہ کیا گیا تو اس میں دیکھنا ہے۔ کہ اس علم میں کہاں تک حقیقت پائی جاتی ہے۔ سو کتاب کو کتاب الٰہی سمجھکر اسکا مطالعہ کیا جائے۔ ورنہ اگر دو چیزوں پر آمادہ ہوکر کتاب قرآن کو بغیر تحقیق کے جھٹلائے تو انسان پھر بھی حقیقت کو اپنی قوت کے زور پر نہ پہچان سکیگا۔ اسلئے کتاب کو کلام الٰہی ماننا ضروری ہے۔ اور اسکی حقیقت کو اپنی تحقیق کی تکمیل پر ہی صحیح یا غلط قرار دیتا ہے۔ بشرطیکہ انسانی تحقیق مبنی بر صداقت ہو سو دیکھنا ہے۔ کہ قرآن اپنی صداقت کی کیا دلیل دیتا ہے۔ قرآن کی پہلی دلیل۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ص (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۲۳) یعنی اگر تمہیں اس قرآن کے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہونے میں شک ہے۔ یا کلام الٰہی ہونے میں شک ہے۔ کہ اسکا علم حقیقت سے خالی اپنے میں راہنمائی کا مواد نہیں رکھتا؟ تو پھر تم سب ملکر ایسی کوئی کتاب ایسا کوئی قانون پیش کرو۔ جو عام مشاہدہ اور پرکھ میں قرآن کے مقابلہ میں بہتر علم بتا سکتا ہو۔ پھر قرآن خود ہی اپنی صداقت اور باطل کی کمزوری کی دلیل دیتا ہے۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا یعنی ہمارا دعویٰ ہے کہ تم کسی طرح بھی اس قرآن کے مقابلہ میں کوئی حقیقی علم یا قرآن کی تردید میں کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے ہو۔ یہ دلیل اور یہ دعویٰ قرآن کی صداقت کیلئے اسکے حال و مستقبل کیلئے دائمی دعویٰ ہے۔ مگر آج تک کوئی قوم کوئی بشر مخالف سے مخالف۔ عالم سے عالم بھی اس دعویٰ کو رد نہ کر سکا۔ کہ کوئی شخص بھی قرآن کے مقابلہ میں ایک آیت

پیش کر سکے۔ پھر جو اصول اسلامی اس قرآن میں پیش کئے گئے ہیں۔ حقیقی نظروں سے دیکھا جائے۔ اسکے عملدرآمد سے تمام بنی نوع انسان۔ کیا۔ ہر مخلوق۔ خواہ نباتاتی ہو یا جماداتی ہو یا حیوانی۔ ہر شے اسکے علم سے مستفید ہوتی رہی۔ اور جتنے بھی آجتک ذرائع حاصل کئے گئے ہیں۔ سب کی تفصیل قرآن میں پائی جاتی ہے۔ گزشتہ تمام کتابوں تمام قانونوں کا مطالعہ کیا جائے تو کسی کتاب میں اسقدر تفصیلی موادنہیں مل سکیگا جتنا قرآن پیش کرتا ہے۔ اور پھر اس بیان کی صداقت کیلئے قرآن ہی کا دعویٰ ہے کہ اگر ایسا نہیں۔ تو پھر کوئی ایسا ہے۔ جو بالدّلیل ہمارے دعویٰ کی تردید کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں وَلَنْ تَفْعَلُوْا کوئی بشر نہ قرآن کے مقابلہ میں اپنا علم اسقدر ٹھوس پیش کر سکتا ہے۔ کہ اس علم سے تمام مخلوق کی صحیح معنوں میں ظاہر و باطن کی حفاظت اور راہنمائی حاصل ہو! لیکن قرآن کے دعویٰ کی ہمیں دنیا میں ہزاروں مثالیں مل سکتی ہیں۔ کہ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ کہ اس میں کسی طرح کا شک نہیں کہ یہ اپنے ماننے والوں (تسلیم کرنے والوں) کیلئے وہ مواد پیش کرتی ہے۔ جس پر عمل و تسلیم کرنے سے انسان نے ایک طرف قیصر و کسریٰ کے ظلم و استبداد کو تباہ کیا۔ دوسری طرف امن و سلامتی کا دور دورہ کیا۔ تو اریخ گواہ ہے۔ کہ اس زمانہ میں جبکہ انسانیت کرب و اضطراب کے عالم میں باطل کی غلام ہو چکی تھی۔ اسلام ایک نحیف آواز میں اٹھا۔ اور تمام عالم کی باطل قوتوں کو تہ و بالا کر دیا۔ جو لوگ اس اصولی دنیا میں۔ ہر شے کو ظاہری اصول پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ کیا اُنکے لئے یہ بعید از عقل نہیں۔ بعید از فطرۃ نہیں؟ کہ ایک تنِ واحد جن کے پاس کوئی دنیوی قوت موجود نہ تھی۔ دنیا کو ایک نحیف آواز میں امن و سلامتی کی طرف۔ صداقت کی طرف پکارا۔ پھر یہ مبالغہ اور ناممکن معلوم نہیں ہوتا؟ کہ ایسی کمزور قوت کبھی ایسی باجبروت قوتوں سے مقابلہ کر کے کامیاب ہو سکتی ہے؟ تو پھر کون سی قوت تھی جس نے ان باجبروت عظیم الشان سلطنتوں کو یکسر خاک میں ملا دیا۔ یہ قرآنی دعویٰ ہی تھا! جس نے ایک باغی قوم۔ عیوب سے بھری قوم کو اس مقام پر لا یا۔ کہ ہر شخص اپنے جرم کا خود اقبال کرنے لگا۔ وہ شخص جو اپنی لڑکی کو زندہ دفن کرنا فخر سمجھتا تھا۔ بلا وجہ ایک چیونٹی کی تکلیف کو بھی محسوس کرتا تھا۔ وہ غلام جو مادرزاد غلام پیدا ہوا۔

اُسے قیصر وکسریٰ کے طلائی کنگن حاصل ہوئے! وہ شخص جو رات دن شراب۔ جوئے اور ڈاکہ زنی میں صرف کرتا تھا۔ وہی شخص فلاح انسانی کیلئے اپنی جان تک قربان کرتا۔ دنیا میں مادی عروج کو ہی وجہ ترقی سمجھا جاتا ہے۔ تو اسی قرآن نے مفلسوں فاقہ کشوں کی حکومت شام۔ دمشق۔ مصر۔ بغداد۔ چین تک قائم کر کے دولت کی اسقدر فراوانی کر دی کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔ لیکن اسلام ایک روحانی مذہب ہے۔ اسکی سب سے بڑی خصوصیت روحانیت ہے۔ گزشتہ قوموں کے عالم راہب جب اپنے اقتدار کو پہنچے انسے سوائے نفس پرستی کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ لیکن کوئی قوم اویسؓ۔ بلال حبشیؓ۔ عمر فاروقؓ۔ ابوبکرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ۔ خالد بن ولیدؓ۔ امام حسنؓ۔ امام حسینؓ۔ حسن بصریؒ۔ ابراہیم ادھمؒ۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔ علاؤالدین علی احمد صابرؒ۔ معین الدین چشتیؒ۔ امام غزالیؒ۔ امام رازیؒ۔ امام ابوحنیفہؒ۔ سلطان صلاح الدین ایوبی۔ طارق بن زیاد۔ محمود غزنوی۔ بابر۔ شاہجہان۔ اورنگ زیب۔ ٹیپو سلطان۔ جیسی ایک ہستی بھی پیش نہیں کر سکتی۔ یہ قرآن اور اسکے قانون ہی کی پیداوار ہیں۔ جن کی مثال رہتی دنیا تک کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی حالانکہ ان سب ہستیوں کے زمانہ میں ہر قسم کی مغربی مشرقی قومیں موجود تھیں۔ کوئی یہ اعتراض کر سکتا ہے۔ کہ مغربی اقوام یا دیگر اقوام میں بھی محققین۔ مصلح۔ موجود تھے۔ اور فی زمانہ مغربی اقوام جیسی ترقی اسلام میں نہیں پائی جاتی! لیکن سوال یہ ہے۔ کہ اگر قوموں میں ایسی مصلح ہستیاں (راہنما) موجود تھیں تو فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ کسی قوم کے مصلح کی کوئی ایسی ہدایت پیش کرو جو اسلام کے مقابلہ میں کارآمد یا کامیاب یا دائمی نفع بخش ثابت ہوئی ہو؟۔ اور اگر انہوں نے کوئی ایسا نظریہ قائم کیا ہو۔ جو مبنی بر صداقت ہو۔ تو اسلام کے مقابلہ میں اس نظریہ کا وجود بھی ہمیشہ کیلئے قائم رہنا چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں۔ بلکہ ایک محقق نے دوسرے محقق کے نظریہ کی ہمیشہ تکذیب و تردید ہی کی اور کوئی نظریہ کوئی اصول اپنی اصلی حالت میں ہمیشہ قائم نہ رہ سکا۔ اور فی زمانہ مغربی ترقی تو اسلام کے چودہ سو سال بعد واقع ہوئی۔ یہی قومیں اسلام کے دور میں بھی تھیں انکے پاس اپنا علم بھی تھا۔ پھر اس سے قبل عیسائیت یا یہودیت میں انہیں یہ ترقی کیوں حاصل نہ ہوئی؟ حالانکہ آج بھی یہ اپنے ہی دین پر قائم ہیں؟۔ اسکے مقابل آج

بھی تحقیق کی جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے۔ کہ انہیں محققین کے پاس سب سے زیادہ اسلامی علم کا ذخیرہ موجود ہے۔ جن کی بنیادوں پر انکی تحقیق و عروج کی دیواریں قائم ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ غیر مذاہب نے دنیوی عروج کیلئے اپنے ذہن کو کام میں لایا اور دنیا پر صرف حکومت کی۔ لیکن اسلام اور مسلمان کا یہ عقیدہ ابتدأ سے نہ تھا۔ انکا عقیدہ صرف خالق کو تسلیم کرنا۔ اسکا عرفان حاصل کرنا۔ اور دنیا میں امن وسلامتی کا نظام قائم کرنا تھا۔ اور اسی نظریہ کا نتیجہ تھا۔ کہ ایک طرف اسلام نے روحانیت کو عروج دیا۔ دوسری طرف قانون خداوندی کو دنیا پر امن وسلامتی کے لئے پھیلایا۔ جسکا نتیجہ دنیوی عروج بھی ہوا یہ عروج مقصود نہ تھا۔ بلکہ مقصود کی تکمیل کا ایک جزوی نتیجہ تھا۔ اور برعکس اسکے اہل مغرب ان دونوں صورتوں سے محروم ہیں اگر انہیں دنیوی عروج حاصل ہے۔ لیکن امن وسلامتی سے محروم ہیں اور روحانیت سے تو انکا دور کا واسطہ بھی نہیں۔ تو روحانیت سے انکا انکار ہی رہا۔ الغرض یہ نتائج اسی دعوے کے ہیں جو قرآن نے علی الاعلان تمام قوموں کیلئے پیش کیا۔ اور حقیقتاً اگر دنیا کی قومیں اپنے علم کو کمال تک پہنچانے میں فخر کرتی ہیں۔ لیکن یہ تمام کمال اس قرآنی دعوے کی دلیل میں شمار نہیں ہوسکتے ہیں۔

اسلام نے اپنے علم کو ایک قانون کی صورت میں پیش کیا۔ اور اس پر انسان کو عمل کرایا۔ چنانچہ اسلام نے شریعت کا ایک ایسا نظام پیش کیا جسکی ایک مد بھی اس قابل نہیں کہ اس میں کسی زمانہ میں ردوبدل کی ضرورت پڑے دنیا میں مختلف قوموں کا وجود ہوا جب بھی کسی قوم نے قانون الٰہی سے ہٹ کر کوئی خودساختہ قانون (انسانی اصلاح کیلئے) بنایا۔ چندعرصہ بعد انکا قانون خود بھی ایک مرض کی صورت اختیار کر گیا۔ اور اس نقص کو دور کرنے کیلئے دوسرے قانون کی اختراع کی گئی۔ مگر اسلام کا قانون ابتدأ سے انتہا تک اپنی اصلی حالت میں ہمیشہ قائم رہا۔ دنیا کی خودساختہ حکومتوں اور قوموں کے خودساختہ قوانین جو قوانین فطرت کی خلاف ورزی (یعنی جرائم اور برے افعال) کو روکنے کیلئے اختراع کئے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ آجتک جتنی بھی حکومتیں برسر اقتدار آئیں۔ بالآخر انکا انجام جنگ اور تباہی پر ہی ہوا ان میں کوئی ایسا قانون نہیں

پایا جاتا جو مستقل ہیئت اختیار کئے ہوئے ہو یا کلی طور انسانی اصلاح کیلئے کارآمد ثابت ہو۔ بلکہ آج کا ایک اختراع کیا ہوا قانون کل کئی نقائص کا سبب بن جاتا ہے۔ اور جوں جوں قومیں برسراقتدار ہوتی گئیں ان میں بے شمار نقائص پیدا ہوتے رہے۔ اور آخر سب سے بڑا نقص قانون فطرت کی خلاف ورزی میں خودغرضی نفس پرستی۔ اور دنیا کی تمام نعمتوں پر خود قابض ہونیکا مادّہ پیدا ہوا۔ جسکا نتیجہ جنگ اور عظیم جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔ اور لاکھوں کروڑوں جانیں اسی ہوس پرستی کا شکار ہوتی رہیں۔ باوجود مختلف قوانین کے اختراع کرنے کے بھی یہ قومیں اس آخری فساد وخونریزی کے مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔

اسلام (قرآن) نے انہیں مضر نتائج کے سدباب کیلئے وہ عام اصول پیش کئے کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو دنیا میں کبھی فساد وخونریزی۔ ہوس پرستی۔ خودغرضی پیدا نہ ہو۔ بلکہ یہی دنیوی معاملات۔ جو دنیوی زندگی کے معاملات میں عمومی حیثیت سے برتے جاتے ہیں قرآنی حکم کے مطابق استعمال کئے جائیں۔ تو انسانی زندگی کو ایک ایسے مقام پر پہنچا سکتے ہیں جو اسکی روحانی زندگی میں ایک خصوصی مقام ہے۔ اسلام نے ایسے اصولوں کو بنیادی طور پر شائع کیا ہے۔ جیسے جھوٹ نہ بولنا۔ کم نہ تولنا۔ جوا۔ شراب۔ دھوکہ وغیرہ قسم کے ممانعات ہیں۔ یقینی طور پر اگر انسان اپنی روزمرہ زندگی کے معاملات میں ان احکام کی پابندی کرے۔ تو انسان میں نفس پرستی۔ ہوس رانی۔ خودغرضی اور ناجائز حصول کا مادّہ یکسر ختم ہو جائے۔ اور جب انسان میں یہ نقائص نہ ہوں تو اسے کبھی قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ ایسی صورت میں یقینی طور دنیا میں اعتدال اور امن وراحت کا دور دورہ ہوگا۔ اور جب انسان اپنی مختصر ضرورت پر اکتفا کریگا۔ تو اسے فطرت کی اشیاء پر غور وتفکر کا کافی موقع ملیگا۔ اسکے لئے عبادت یعنی تلاش حقیقت کے سوا اور کوئی کام نہ رہیگا۔ اور انسان ایک وقت اپنے اصلی مقام پر پہنچکر حق شناس ہو جائیگا۔

کون نہیں جانتا۔ کہ جسوقت حضرت محمد رسول اللہ کا وجود مقدس دنیا پر ظاہر ہوا۔ دنیا کے کونہ کونہ میں فساد وخونریزی۔ جہالت وغیر اطمینانی کا دور دورہ تھا۔ مگر آپکی شریعت نے دنیا کے

تین چوتھائی۔ بلکہ پوری دنیا پر امن وراحت کا دور دورہ کیا۔ اور جب تک (قرآن) شریعت محمدیؐ کی صحیح معنوں میں اشاعت رہی اور اس پر عمل رہا انسانیت اس دین کے سایہ میں ہر جگہ مطمئن رہی۔ اس دین میں مسلمان نام ہونا شرط نہیں۔ بلکہ یہ دین ہر انسان کیلئے انسانی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ جو اس دین پر پوری طرح عامل ہو وہی مسلمان (مومن) کہلاتا ہے۔ اسے اسکے مقاصد میں پوری راہنمائی حاصل ہوتی رہیگی۔ اور عمومی حیثیت سے جو شخص جس قدر اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہے۔ انسانی حیثیت سے اسے بھی اپنے عمل کے مطابق فائدہ حاصل ہوگا۔ خواہ وہ کسی دین سے تعلق رکھتا ہو۔ البتہ جب تک انسان قرآن کے بتائے ہوئے عقائد واحکام پر پورا پورا عقیدہ عمل نہ رکھتا ہو وہ کلی طور پر انسانی نصب العین کو حاصل کرنے سے محروم رہیگا۔

شریعت: یعنی کسی قانون کو جاری کرنے کیلئے لازم ہے۔ کہ مخلوق میں ماحول سازگار بنایا جائے۔ یعنی وہ اصول پیش کئے جائیں۔ جو عام طور پر فلاح انسانی کیلئے مفید اور کارآمد ثابت ہوں۔ تاکہ ہر شخص اِن اصولوں کو خوشی سے قبول کر کے ایک عالمگیر خالص ماحول کی کیفیت پیدا کر کے مقصد انسانی کیلئے راستہ صاف کرے۔ وہ اصول ایسے ہوں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر انسانی نفس کی اصلاح ہو۔ تاکہ اسے حقیقت کی طرف رجوع ہو اور ایسی صورت میں ہر شخص قوانین فطرت کے دائرہ کے اندر رہے۔ چنانچہ قرآن نے اپنی شریعت میں ایسے پانچ خصوصی اصول ابتدائی بتائے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر ایک انسان صحیح معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ اور انسان اپنے مقصد کی تکمیل کر سکتا ہے۔ وہ اصول اول ''کلمہ'' ہے۔ دوسرا ''نماز''۔ تیسرا ''روزہ''۔ چوتھا ''زکوٰۃ'' اور پانچواں ''حج'' ہے یہی وہ احکام ہیں جن میں۔ انسان کی روحانی۔ دنیوی۔ اقتصادی۔ تمدنی۔ معاشرتی ترقی کے تمام مواد جمع ہیں ان میں کلمہ۔ نماز۔ روزہ: انسان کی روحانیت یعنی انسانی جسمانی روحانی ترقی۔ تزکیہ نفس اور اشرف المخلوقات قوت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ ہر شخص ان پر عمل پیرا ہوسکتا ہے۔ باقی زکوٰۃ۔ حج انسان کے دنیوی معاملات میں ایک صحیح نظام کا احاطہ کرتے ہیں جس سے ایک طرف دنیوی امور میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ دوسری

طرف یہ احکام بھی انسانی روحانیت کیلئے ایک راہ ہموار کر دیتے ہیں۔

کلمہ: کلمہ سے مراد۔ ایک معنی رکھنے والی بات۔ وہ یہ ہے۔ کہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۔ یعنی یہ حقیقت ہے۔ کہ تمام کائناتِ ارض وسماوات میں ضرور ایک خالق کا وجود ہے۔ اور وہی معبود ہے۔ اسی کو پہچاننا ہے۔ اللہ نے اپنے خالق ومعبود ہونے اور اسکو پہچاننے کا تمام علم قرآن کے ذریعہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بتایا سو اللہ کو معبود تسلیم کرنے اور اسکے عرفان حاصل کرنے کیلئے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع وتسلیم کرو۔ اس حکم کا تعلق اسلام کے پہلے عقیدہ اللہ کے تسلیم سے ہے۔ یعنی تفکر سے قبل یہ ضروری ہے۔ کہ اللہ کو ایک خالق و معبود ایمان بالغیب کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔ نیز یہ احکام اسلام کے عقائد خمسہ (اللہ۔ ملائکہ۔ کتاب۔ رسول۔ قیامت) پر تسلیم کرنے کے بعد پیش کئے جاتے ہیں۔ اس صورت میں کلمہ اور تسلیم اللہ ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر عقیدہ و اصول کی ابتداً اسی خصوصی نظریہ پر قائم ہوتی ہے۔ کلمہ کی تشریح عقیدۂ اللّٰہ میں ہو چکی ہے۔ اسکے بعد دوسرا حکم (اصول) ''نماز'' ہے۔ شریعت میں یہ حکم الصلوٰۃ کے لفظ سے تعبیر ہے۔ الصلوٰۃ سے جملہ قسم کی تمام عبادت مراد ہے۔ عبادت سے مراد۔ اظہارِ عبدیت (بندگی) ہے۔ بندگی (عبدیت) سے مراد۔ غلامی۔ فرمانبرداری۔ محکومی۔ اور انسان کا چارو ناچار قوانین فطرت کا محکوم و پابند ہونا ہے۔ شریعت نے الصلوٰۃ کو ایک خصوصی انداز سے ادا کرنے کا ایک طریق پیش کیا جسے نماز (الصلوٰۃ) کہتے ہیں۔ نماز الصلوٰۃ کا سب سے بڑا جز ہے نماز کے ادا کرنے سے ہی الصلوٰۃ کا صحیح مقصد پورا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں عبودیت کے وہ تمام آثار پائے جاتے ہیں جن سے الصلوٰۃ کی تعمیل کا اظہار کیا جاتا ہے۔ الصلوٰۃ میں وہی عقائد۔ اور وہی عمل موجود ہے۔ جس سے غلامی۔ فرمانبرداری کا احساس عیاں ہوتا ہے جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے۔ انسان کو بظاہر خدا کا فرمانبردار ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جبکہ کائنات میں اسکی نشوارتقا کے تمام سامان مہیا ہیں۔ لیکن یہ فرمانبرداری صرف اسلئے ہے۔ کہ انسان اپنی دائمی راحت واطمینان (جو اسے میسر ہے) اور فلاح وسعادت۔ اور خصوصی نصب العین

(جو اس کائنات کے ظاہری نظام سے ماسوا نظر آتا ہے) کی تکمیل اس الصلوٰۃ کے ذریعے حاصل کرے جس میں خدا کا کوئی ذاتی فائدہ نہیں۔ بلکہ خود انسانیت کیلئے فائدہ موجود ہے۔ کہ انسان بجائے تنزل کے۔ امن وسلامتی سے عروج وسربلندی اور دائمی راحت حاصل کرے۔ اللہ کی مرضی صرف اتنی ہی ہے۔ کہ اسکے بنائے ہوئے قانون کی (جو قانون خود انسان کے فائدہ کیلئے بنایا گیا) ایک خالق و مالک ہوتے ہوئے خلاف ورزی نہ کی جائے۔ اور اسکے ارادۂ ازلی کے منصوبے میں جو اسی فطری قانون (کائنات) کی صورت میں واقع ہے۔ کوئی شخص اس میں خلل ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ اللہ کے ارادہ ازلی میں یہی ایک منصوبہ تھا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ'' فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کہ میں دنیا (زمین) پر ایک اپنا قائم مقام بنانا چاہتا ہوں۔ جسکا کام اپنی عبدیت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ تو یہ لازمی بات ہے۔ کہ ایک مالک حقیقی کے ارادے میں خلل ڈالنا سب سے بڑا جرم ہے۔ وہ خلل کیا ہے۔ وہ قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے۔ اسی خلاف ورزی کے مقابل دوبارہ اسکے بھیجے ہوئے قانون سے خلافت کی تجدید کی جاتی ہے۔ تاکہ ارادہ ازلی اپنی اصلی ہیئت میں قائم رہے اس ابتدائی ارادہ اور آئندہ قانون کی متابعت کو عبدیت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسی عبدیت کا الصلوٰۃ کے ذریعہ اظہار کیا جاتا ہے۔ یہی الصلوٰۃ انسان کو اپنی شرافت سے گرنے کے بعد دوبارہ اس خلافت کے مقام پر لاتی ہے۔ یہی الصلوٰۃ۔ انسان کو قوانین فطرت کی خلاف ورزی سے نجات دلا کر پھر اپنی شرافت پر پہنچا کر حقیقت کے قریب کر دیتی ہے۔ اسلئے ایک طالب حقیقت انسان کیلئے۔ یہ ضروری ہے۔ کہ وہ تلاش حقیقت میں سب سے پہلا قدم الصلوٰۃ سے ہی اٹھائے۔ قرآن اس الصلوٰۃ کی صداقت کیلئے خود دلیل پیش کرتا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط (پارہ ۲۱ سورۃ ۲۹ آیت ۴۵) حقیقتاً (عبادتوں میں خصوصی عبادت) نماز بری عادتوں فحش اور انکار (انحراف) سے باز رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس نماز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ''یعنی قائم نماز کرو'' اَقِیْمُوْا سے مراد قیام کے ہیں یعنی کھڑے ہو نماز کیلئے۔ اسکے

کھڑے ہونے کی ترکیب سوائے۔ وَارْکَعُوْا۔ وَاسْجُدُوْا کے اگرچہ قرآن میں اور کوئی ترکیب نہیں۔ لیکن یہ بیان چونکہ حضور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی بتایا گیا ہے۔ اسلئے اسکی ترکیب وہی ہوسکتی ہے جو آپ نے اپنی قیام میں بتائی یعنی جب آپ نے نماز پڑھی تو پہلے کھڑے ہوئے۔ رکوع کیا۔ سجدہ کیا اور تحیت میں بیٹھکر نماز ختم کی۔ یہی طریق آپکے پیروؤں کے لئے مسنون ہے۔ اس سے قبل گزشتہ انبیاً اور پیروان مذاہب کو بھی الصلوٰۃ کا حکم ہوا۔ لیکن انکی ترکیبیں مختلف تھیں۔ یہودی بیت اللہ کے سامنے تالیاں بجاتے اور کچھ پڑھتے۔ اور سورج نکلنے کے وقت اور غروب ہوتے وقت سورج کی طرف منہ کرکے کچھ پڑھتے۔ اسی طرح آتش پرست (زرتشتی) بھی سورج کے طلوع وغروب کے وقت کچھ پڑھتے اور آگ کا الاؤ روشن کرکے اسکے آگے سجدہ کرتے۔ عیسائی بھی چوبیس گھنٹے میں ایک بار معبد (گرجہ) میں بیٹھکر مراقبہ کرتے اور حضرت مریم وعیسیٰؑ کا بت بنا کر اسکے آگے جھکتے۔ مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جب نماز کا حکم ہوا تو آپنے نماز پانچوقت جیسا کہ قرآن میں حکم ہے۔ کھڑے ہوکر رکوع وسجود اور تحیت سے ادا کی۔

کھڑے ہوکر نماز کو ادا کرنا۔ یہ ترکیب اللہ کے سامنے ایک بندے کی عبدیت کا مظاہرہ کرنے کیلئے بہترین نمونہ ہے۔ ایک بندہ اپنے خالق کے سامنے انتہائی عجز وانکساری سے پیش ہوتا ہے۔ اور اُسکی تعریف[1] بیان کرتا ہے۔ پھر رکوع میں اس سے زیادہ عجز ومحبت کا مظاہرہ

---

[1] کھڑے ہوکر جو کچھ زبان سے کہا جاتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ تمام تعریف تمام خوبیاں اللہ کے لئے ہی ہیں۔ جو تمام کائنات کا پرورش کرنے والا ہے الرَّحْمٰنِ وہ لاانتہا نعمتوں کا مالک ہے الرَّحِيْمِ اور یہ سب نعمتیں انسان کو بلا معاوضہ عنایت کردی ہیں۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اسنے تمام مخلوق کی دینوی زندگی کے اعمال کے تولنے اور جزا دینے کا ایک دن مقرر کیا ہے۔ یعنی قیامت کا مالک ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۔ اے ہمارے معبود ہم بندے کی حیثیت سے کھڑے ہوکر کسی غیر خدا کا تصور نہیں کرتے بلکہ تیرا ہی تصور چاہتے ہیں۔ اور اب تو ہمارا عجز قبول کر۔ اور اپنے قرب میں لینے کیلئے ہماری مدد کر۔ ہمارے لئے اپنے راستے آسان کر دے۔ ہمارا رجوع خود اپنی طرف کرا۔ ہم تجھ تک پہنچنے کیلئے تجھ ہی سے امداد طلب کرتے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہوتا ہے۔جوں جوں عجز و محبت کا اثر انسان پر طاری ہوتا جاتا ہے۔انسان اپنے جذبات میں زیادہ سے زیادہ ڈوب کر جھکتا جاتا ہے۔اس حالت میں قیام سے زیادہ جذبات میں لطافت آجاتی ہے ۔رکوع کی حالت میں جب اسکی خوبیوں کا تصور کیا جاتا ہے۔تو یہ تاثرات اور بھی تیزتر ہو جاتے

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ہیں۔کہ تو قادر ہے اس بات پر کہ تو چاہے۔تو ہم تیرے قریب پہنچنے کیلئے ہر طرح کی امداد پا سکتے ہیں۔اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ اب تو ہمیں اپنی خالقیت اور تخلیق کے راز دکھاتے ہوئے زمین سے (وَ اِنَّکَ لَتَهْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ ط تحقیق تو پہنچاتا ہے سیدھے راستہ پر۔زمین و آسمان میں جو کچھ ہے یہی راستہ اللہ کا ہے۔) آسمانوں کیطرف لے جاکر اپنے اسرار کا مشاہدہ کرا۔مبادا ہم اپنی طرف سے چلنے پر کسی غلط طریق پر نہ جالگیں۔صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۵ اُن لوگوں کا رستہ ہمیں دکھا جنکو تو نے اشرف المخلوقاتی شرافت اور اپنی طرف سے ظاہری باطنی سربلندی اور اپنا قرب (نزدیکی) عطا کیا۔ہم چاہتے ہیں۔کہ ہم بھی تیرے ان بندوں میں شامل ہوں۔جو صحیح معنوں میں بندہ ہونے کی صورت میں اپنی بندگی کا اظہار کرتے ہیں اور تجھے ہی خالق و معبود تسلیم کرتے ہیں۔اور انکی زندگی کامیاب ہے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝ ہم اس طریق انحراف سے پناہ چاہتے ہیں۔جس طریق نے گزشتہ قوموں کو دنیوی عذاب میں مبتلا کر کے تباہ و برباد کر دیا۔اور آئندہ زندگی میں جب یوم دین (قیامت) میں انکا محاسبہ ہوگا تو وہ ایک سخت دردناک عذاب میں ہمیشہ مبتلا رہینگے۔اُف۔یہ وقت نہایت ہولناک اور دردناک ہوگا! ہم ان لوگوں کا طریق پسند نہیں کرتے جن پر تو نے انکی نافرمانی کے باعث غضب ڈالا۔

اے معبود ہم تجھے اور تیرے قانون کو تسلیم کرتے ہیں! تو ہمیں اپنے منزل مقصود تک پہنچا! اے معبود ہم تیرے علم سے ہی تجھے پہچاننا چاہتے ہیں!۔تیرا قرآن حق ہے! جو کچھ تو نے اپنے کلام میں کہا حقیقت ہے! قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ ع ۔بیشک تو ایک ہے۔اپنی خالقیت میں۔اور ہر کمزوری سے پاک و بے نیاز ہے۔اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ ع ۔لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔جو کچھ زمین و آسمان میں ہے قوانین فطرت کے مطابق تیرا محکوم۔تیرا فرمانبردار اور تیری قدرت میں پابند ہے۔لَمْ یَلِدْ ۵ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝ ۔تو کسی سے پیدا نہیں ہوا۔نہ تو نے کسی کو جنا۔بلکہ تو خود لاانتہا ہے۔اور تیرے ہی نور سے یہ سب کچھ تیری مرضی سے بنا ہے۔وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝ ع ۔تیرے سوا کوئی غیر ایسا نہیں جسکی پرستش کی جائے۔

ان تاثرات میں بندہ بے پناہ محبت اور خوف کے جذبات میں ڈوب جاتا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہیں اور اسی تاثر میں انسان بار بار سجدہ کرتا ہے۔ یہ رکوع و سجود خداوبندے کے درمیان۔ ناز و نیاز کا انتہائی مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی اس نادیدہ خدا کو اپنے تصور میں لاتے ہوئے اسکے قرب کا تصور دوزانو ہوکر باندھتے ہیں۔ اس حالت میں جو کچھ کہا جاتا ہے اسکے مطلب سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان اپنے انتہائی جذبات میں ڈوب کر اپنے خالق و مالک سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اسلئے نماز کے قیام۔ رکوع۔ سجود۔ تحیت کی ترکیب انتہائی بندگی کا مظاہر ہے۔ اس سے بڑھ کر انسانی دنیا میں اور کوئی بہتر ترکیب نہ ہوسکتی ہے۔ نہ دیکھنے میں آتی ہے۔

نماز میں حکم ہے۔ کہ نہ کسی طرف دیکھا جائے۔ نہ کسی سے بات کی جائے۔ نہ کوئی فالتو حرکت کی جائے۔ اس سے مراد۔ پابندی۔ ضبط۔ یکسوئی۔ دنیا کی ہر شے سے لاتعلقی ہے۔ سب سے بڑی چیز یکسوئی ہے۔ کہ جب انسان اللہ کے تصور میں نماز ادا کرنے لگ جاتا ہے۔ تو اسے تصور حقیقی کیلئے یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ حافظہ سے کچھ دیر کیلئے دنیوی الجھنوں کے نقوش کی ترسیل بند ہوکر انسانی قلب سے روحانی تاثرات ابھر کر حافظہ وشعور سے متعلق ہوجائیں۔ جس سے انسان میں دنیوی لذت۔ نفس پرستی اور مادیت کا مادہ بڑھنے نہیں پاتا۔ انسان دن بھر دنیا کے کاروبار میں الجھا رہتا ہے۔ اسے ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کی فکر رہتی ہے۔ اگر انسان ہمہ وقت انہیں امور میں منہمک رہے۔ تو لازمی نتیجہ ہوگا۔ کہ انسان کے لطیف خواص کو ترقی کرنے کا موقع

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ہے۔ اور بیخودی میں رکوع میں جھک جاتا ہے۔ اور کہتا ہے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ تو پاک ہے۔ ہر کمزوری سے۔ تو ہی ہر مخلوق کو پیدا کر کے اسکے ظاہری باطنی رکھوالی۔ نشو و نما۔ کا عظیم ترین رَبّ ہے۔ یہاں پھر انسان پر جذبات میں لطافت و ذوق طاری ہوتا ہے۔ اور سجدہ میں جھک جاتا ہے اور کہتا ہے کہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی بار بار کہتا ہے۔ کہ تو ہمارا خالق۔ پالنے والا ہے۔ ہمارے لئے ہر حال میں بہتری چاہنے والا۔ ہر شے کو اسکی ہیئت کے مطابق اتنی عظیم الشان کائنات میں حسب ضرورت سامان مہیا کرنے والا! ان جذبات کی انتہا یہاں تک یکسوئی و استغراق پیدا کرتی ہے کہ انسان دنیا و مافیہا کو بھول جاتا ہے۔ اُسے محسوس ہوتا ہے کہ میں حقیقتاً اللہ کے سامنے ہوں اس احساس کے آتے ہی وہ کہتا ہے اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ ط اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِاللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ۔

ہی نہ ملیگا۔اور انسان مادیت سے ملوث ہو کر۔اپنے نصب العین سے ہٹ کر دنیوی جاہ طلبی حاصل کرنے کا زیادہ تر عادی ہوگا۔مادیت کے غلبہ پانے سے انسان۔زیادہ خواہش کا خوگر ہو کر ہرنا جائز ذریعہ۔اپنی حصول کیلئے استعمال کرنا شروع کریگا۔اور انسان نفس پرست خودغرض ہو کر ہر مذموم افعال کا مرتکب ہوگا اسلئے اسلام نے دن میں پانچ وقت نماز مقرر کر دیئے۔یہ اوقات ایسے مناسب موقعوں میں پائے جاتے ہیں۔جن میں انسان پر مادی دباؤ زیادہ ہوتا ہے۔نماز کے اوقات۔علے الصبح۔بعد دوپہر۔عصر دن ڈھلنے پر۔مغرب غروب آفتاب دن کے اختتام پر۔عشا رات کے اندھیرے میں واقع ہیں۔

صبح کا وقت رات کے اندھیرے کے قریب خاتمہ اور سورج نکلنے سے قبل ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں انسان کی خواہش یہی ہوتی ہے۔کہ ابھی کچھ دیر اور آرام کروں۔ایسے وقت میں جبکہ نفس آرام کی طرف مائل ہو۔ایک حکم کے ماتحت عبادت کیلئے اٹھکر۔پانی سے وضو کر کے نماز پڑھنا اپنی خواہشات نفسانی کے خلاف عبادت کیلئے ارادہ کرنا پڑتا ہے۔اور ہر روز بار بار اپنی خواہش کے خلاف عمل کرنے سے انسان اپنی من مانی کرنے کا پابند نہیں رہتا۔بلکہ ایک حکم کی تابعداری کرنے کیلئے ارادے کو تبدیل کر دیتا ہے۔بار بار کی یہ عادت انسان میں ایک مستقل قوت ارادی پیدا کر دیتی ہے۔اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔کہ انسان میں ضبط۔نظام کی عادت پیدا ہوتی ہے۔دوسرے انسان ہر برے فعل پر جبکہ وہ اسکا عادی ہو اور اس فعل کو برا سمجھکر چھٹکارا نہ پاسکتا ہو صبح کی نماز کا حکم کے تحت عادی ہو کر وہ اس بات پر قادر ہو جاتا ہے۔کہ کسی فعل کو اپنے نفس کی خواہش کے مطابق قائم رکھے یا ترک کر دے۔اسطرح انسان برے افعال سے بچکر نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔اور انسان میں قوت ارادی پختہ ہو جاتی ہے۔اور انسان دنیوی معاملات میں بھی ہر مشکل سے مشکل وقت پر صبر واستقلال کے ساتھ اپنی سعی کو جاری رکھ سکتا ہے۔اور قوت ارادی سے انسان کے قلب میں ایک لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔جو لطافت انسانی کردار میں ایک اہم خصوصیت ہوتی ہے۔

اسی طرح دوپہر "ظہر" یعنی دن کے وسط میں انسان دنیوی مصروفیات میں زیادہ گھرا

رہتا ہے۔اسوقت بھی انسان اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق زیادہ حصول اور بعض اوقات زیادہ حصول کی خواہش میں ہر صحیح وغلط قدم اٹھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔اگر صبح کی نماز اس میں ارادہ کی قوت پیدا کرے تو اس وقت بھی انسان اپنی قوت ارادی سے کام لیکر غلط روی سے پرہیز کرتا ہے۔ اور ظہر کی نماز کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔تو یہ نماز اسے اسکے ارادے میں۔یکسوئی اور حقیقی تصور سے پختگی پیدا کرتی ہے۔اس وقت انسان چند ساعت کیلئے دنیوی دھندوں کو بھول جاتا ہے۔اور اسکے قلب وحافظہ میں دنیوی تخیلات کی ترسیل بند ہو کر ایک حقیقی تصور جاگ اٹھتا ہے۔جس سے اسکے قلب وارادہ میں۔ایک ضبط اور پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ایسی صورت میں انسان اپنے دنیوی کاروبار میں بھی ایک قانون کی پابندی۔سچائی۔ایمانداری۔اعتدال۔پورے لین دین وغیرہ کا احساس کرتا ہے۔اورانسان ایک حقیقی قانون کی پابندی میں اپنے دنیوی معاملات کو بھی برتتا ہے۔ جس سے ایک تو فطرت کے قانون کی مطابقت ہو جاتی ہے۔کہ انسان زیادہ خواہش۔نفس پرستی۔ خودغرضی وغیرہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔دوسری طرف اسکا دنیوی کاروبار بھی ایک عبادت میں شامل ہو جاتا ہے۔''دوپہر'' انسان کے دنیوی معاملات میں الجھنے کا انتہائی شدید وقت ہوتا ہے۔اگر ایسے وقت میں انسان فطرت کے قانون کا پابند رہ کر اعتدال سے کام لے تو پھر اسکی زندگی میں اور کوئی ایسا وقت یا ایسا ماحول نہیں ہو سکتا جو انسان کو مادیت وانحراف کی طرف مائل کر سکے سو دوپہر کی نماز انسان کی لطیف قوتوں میں جلا پیدا کرتی ہے۔اور مادی خصائل کو پابند کر دیتی ہے۔

اسی طرح دن ڈھلنے پر ''عصر'' کی نماز ــــ ایسے وقت میں انسان اپنے دنیوی معاملات میں گھرا ہوا تھک کر چور ہو جاتا ہے انسان کو تھکاوٹ اور اضطراری حالت میں سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔انسان اپنے تعقل سے ایسی اضطراری حالت میں کام نہیں لے سکتا۔بعض اوقات انسان اپنے نیک وبد۔نفع ونقصان سوچنے سے بھی عاجز ہوتا ہے۔ایسے وقت میں نماز ہی اسے سکون حاصل کراتی ہے۔انسان اپنے تعقل یعنی دماغی کاوشوں کو ایک طرف چھوڑ کر ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں جاگتے ہوئے (نیند کے بغیر) تعقل کو سکون ملتا ہے۔یعنی انسان اپنے شعور

میں حقیقی تصورات کو جگاتا ہے۔اور اسی انہاک میں وہ ہر خیال ظاہر۔سوچ بچار۔اضطراب سے بے خبر ہو کر یکسوئی پیدا کرتا ہے۔یکسوئی کے ساتھ ہی اسکے تمام اعضاً و جوارع کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔انہیں بھی سکون ملتا ہے۔نماز کی ظاہری ترکیب (Dril) بھی اسکے اعضاء میں ایک طرف سکون اور دوسری طرف چستی پیدا کر دیتی ہے۔اور تھوڑی سی دیر میں انسان۔پریشانی اور تھکاوٹ سے نجات حاصل کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔عصر کا وقت بالکل تھوڑا ہوتا ہے۔یہ اسلئے کہ دوپہر کی نسبت انسان اس وقت دنیوی دھندوں کو اختتام پر پہنچا چکا ہوتا ہے۔اسے اس وقت صرف دماغی سکون ہی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انسان اپنے دن کے معاملات میں جائز و ناجائز نفع ونقصان کا جائزہ لے۔اور اسکی دن کی تھکاوٹ رفع ہو اتنے وقت میں یہ چیز آسانی سے نماز میں حاصل ہو جاتی ہے۔

دن کے کاروبار شام کی سیاہی ڈھانپ کر انسان کو اپنے دنیوی دھندوں سے علیحدہ کر دیتی ہے۔اب انسان تمام الجھنوں سے فارغ ہو جاتا ہے۔اور اس پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔اور جب انسان اپنے دھندوں سے فارغ ہو کر تنہائی۔اور خاموشی میں آ جاتا ہے۔تو پھر اس پر دن کے آثار دوبارہ طاری ہو جاتے ہیں۔اگر دن بھر کے معاملات دوبارہ انسان پر طاری ہو جائیں تو اسکے دن اور رات میں کچھ فرق نہیں رہتا۔اور انسان دن کی طرح رات کو بھی پریشانی اور الجھنوں میں گھر کر زیادہ تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔بلکہ دن کے مقابلہ میں ذہنی کوفت سے انسان زیادہ مضمحل اور خستہ حال ہو جاتا ہے۔اس خاموشی اور تنہائی کیلئے ضروری ہے۔کہ انسان ایک ایسے کام میں مصروف ہو جائے جس سے اسکا خاموش ماحول اور سکون بحال رہے۔اور دن کے دنیوی دھندوں کو یکسر بھول جائے۔ایسے وقت میں انسان اسی ماحول کو برقرار رکھنے کیلئے اکثر سیر وتفریح کیلئے نکلتا ہے۔سیر وتفریح سے مراد یہی ہوتی ہے۔کہ آہستہ آہستہ چلنے سے انسان کے اعضاء و پٹھے ہلکی حرکت پانے سے تھکاوٹ چھوڑ بیٹھتے ہیں۔اور بیرونی مختلف مناظر دیکھکر حافظہ کو دن کے واقعات دوبارہ دہرانے کا موقع نہیں دیتے۔لیکن اس حالت میں انسان پر پھر چلنے سے اسکی تگ و دو باقی رہ جاتی

ہے۔اور مختلف مناظر بھی تخیلات کا ایک ہجوم حافظہ میں جمع کر دیتے ہیں۔جسوجہ سے حافظہ بدستور "کچھ" جمع کرنے میں رہتا ہے۔ساکن نہیں رہ سکتا۔اور زیادہ ہجوم بھی حافظہ کے نظام ترتیب میں (Up Setting) برہمی پیدا کرتا ہے۔برعکس اسکے نماز۔انسانی ذہن کو ہر جہت سے تخیلات سے محفوظ کر دیتی ہے۔اب حافظہ بھاری بھرکم اور مادی تخیلات کی بجائے یکسوئی کرتا ہے۔اپنے دن کے تخیلات کو (set) ترتیب دیکر ایک جگہ جمع کر کے انکو اپنے احاطہ میں لاتا ہے۔احاطہ میں آنے سے حافظہ خود بخود پرسکون ہو جاتا ہے۔اور ذہن کو دنیوی تخیلات کے عکس سے نجات مل جاتی ہے۔ایسے وقت میں حافظہ و تعقل کے لئے پھر بھی کچھ نہ کچھ ترسیل ہونی چاہیے۔وہ ترسیل تنہائی اور خاموشی میں جہاں حواس بیرونی واقعات لانے سے عاجز ہیں۔انسان قلبی وجدان سے لطیف تصورات پیدا کرتا ہے۔جنکا تعلق بجائے تعقل کے شعور سے ہوتا ہے۔اسطرح انسانی ذہن ایک طرف نیند کی مانند پرسکون ہو جاتا ہے۔دوسری طرف لطیف تصورات سے اسکے حافظہ میں ایک سرور پیدا ہوتا ہے۔جس سے انسانی ذہن۔جسم کے اعضئے ہر شے مسرور ہو کر بیخودی کی حالت میں دنیا کے ہر اضطراری معاملہ سے نجات حاصل کر کے جاگتے ہوئے بھی پرسکون ماحول میں گھر کر مطمئن ہو جاتا ہے یہ کیفیت سوائے نماز (مغرب) کے کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ انسان جب تنہائی اور خاموشی میں ہوتا ہے۔تو لازمی طور انسان کسی سوچ بچار میں پڑ جاتا ہے ۔یہ سوچ گزشتہ واقعات کے نقوش یا آئندہ خواہشاتِ دلی کے نقوش ہوتے ہیں۔ایسے وقت میں ذہن کے سکون کیلئے نماز ہی ایک بہتر ذریعہ ہے۔جس سے انسان دن بھر کی تھکاوٹ رکوع و سجود سے ہٹاتا ہے۔اور جذباتِ محبت کے تاثرات سے اپنے پر بیخودی طاری کر کے اپنے وجود میں لطافت پیدا کرتا ہے۔تاکہ دنیا کے معاملات انسان پر مادی اثرات نہ طاری کر سکیں۔صبح کا جاگا ہوا۔ سالم انسان دن بھر دنیا کی آلائشوں میں گھر کر شام کو پھر اپنی اصلی حالت میں قائم رہتا ہے۔

اور اب رات کا دور شروع ہوتا ہے۔انسان پر نیند طاری ہو جاتی ہے۔نیند انسان پر غیر ارادی۔غیر اختیاری حالت طاری کر دیتی ہے۔جب تک انسان جاگتا ہے۔یہ نماز سے۔اپنی

قوت ارادی سے۔اپنے ذہن کوسکون کی حالت میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔انسان انہیں ذرائع سے دنیوی الجھنوں کے دباؤ سے اپنے ذہن کومحفوظ کر لیتا ہے۔لیکن روزمرہ معاملات کے نقوش پھر بھی حافظہ میں جمع رہتے ہیں۔گویا جاگتی حالت میں ان تخیلات کوارادہ سے بجبر قید کردیا جاتا ہے۔لیکن نیند کی حالت میں انسان غیر اختیاری حالت میں ہو جاتا ہے۔اسوقت یہ نقوش پھراُبھر سکتے ہیں۔اور رات بھر انسان کوانہیں معاملات میں غرق کر دیتے ہیں۔اسطرح انسان کی تمام رات غیرارادی طور پر پھرا لجھنوں میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ایسے وقت میں ضرورت ہے۔کہ غیر ارادی حالت میں بھی انسان ان الجھنوں سے محفوظ ہو جائے سو نیند سے قبل ''عشا'' (رات کی نماز) اسکے لئے اکسیر اثر رکھتی ہے۔عشاً کی نماز باقی نمازوں کے مقابلہ میں طویل ہوتی ہے۔ اسلئے اتنے وقت میں اپنی اصلاح کیلئے زیادہ وقت میسر ہوتا ہے۔حالانکہ رات کے وقت دوپہر کے مقابلہ میں کوئی دنیوی الجھن نہیں ہوتی ہے۔رات کی سیاہی۔دن کی رونق۔بازاروں کا شورو، شغب۔آمدورفت۔لین دین کے جھگڑے سب بند کر دیتی ہے۔ہر شخص بازار چھوڑ کر۔بازار کو سنسان اور گھر کومحفل بناتا ہے۔اگر بازار کے شور سے حافظہ کوفرصت ملتی ہے۔تو گھر کے معاملات پھراسے حاصل ہوتے ہیں۔تاہم انسان مغرب کے بعد ایک ایسی خاموش فضا میں آجاتا ہے۔ جس میں انسانی حافظہ محفوظ ہو جاتا ہے۔اوراس وقت انسان آسانی سے اپنے حافظہ پر زور دیکر اسے خیالات کی Setting (ترتیب) پرآمادہ کرتا ہے۔خاموشی اور تنہائی کی یہ خاصیت ہے۔کہ انسان کے لطیف خواص کو قوت پکڑنے کا موقع ملتا ہے۔اور انسان دن کی نسبت رات کے اندھیرے میں اپنے ارادہ کو کام میں لانے کیلئے آسانی سے قوت پاتا ہے عشاً کے وقت جب انسان حقیقی تصورات کولیکر یکسوئی وانہماک پیدا کرتا ہے۔تو اسکے قلب کی لطافت اسقدر زور پکڑتی ہے۔کہ اسکا اثر دیر تک باقی رہتا ہے۔اس حالت میں انسان کے قلب پر جو اثر پڑتا ہے۔اس سے روحانی کیفیات وتاثرات کا ایک مستقل تسلسل حافظہ سے مربوط (تعلق) ہو جاتا ہے۔اور یہی سلسلہ حافظہ میں لطیف نقوش کا رابطہ قائم کر دیتا ہے چونکہ یہ اثر روحانی ہوتا ہے۔اسلئے یہ اپنی

نوعیت کے اعتبار سے انسانی ارادہ کی قید میں نہیں رہتا۔ بلکہ خود بخود یہ اثر قلب پر آ کر حافظہ سے منسلک ہو جاتا ہے۔ نیند کی حالت میں انسان کا تعقل سو جاتا ہے۔ تو شعور حافظہ کے تاثرات کو قبول کرتا ہے۔ یہ تاثرات جب تک قلب میں لطافت ہو بدستور قائم رہتے ہیں۔ نماز عشأ اسی قلبی لطافت کو اجاگر کرنے کیلئے ہوتی ہے۔ تا کہ لطیف خواہشات۔ اور بیرونی لطیف ماحول کی کیفیات قلب تک آ سکیں۔ اور جبکہ ظاہری حواس کے ذریعہ کوئی شے نہیں آ سکتی حافظہ کو خالی نہ رہنے دیا جائے۔ بلکہ قلب کے ذریعہ اسے لطیف خواہشات میں الجھایا جائے۔ دن کی چار وقت نمازوں کا اثر اور رات کی تنہائی میں سوائے اسکے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ کہ انسان کے پاس جبکہ کیفیات کے لئے اور کوئی ذریعہ حصول نہ ہو یا تو لطیف ماحول کے اثرات۔ یا خود قلب کی لطیف خواہشات ہی حافظہ کو مشغول رکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ عشأ کی نماز طویل ہے۔ تا کہ انسان اتنے وقت میں قلب میں حقیقی تصورات سے لطیف خواہشات آسانی سے پیدا کر سکے اور ایک طویل رات کیلئے اس لطافت سے انسانی ذہن کو بجائے پریشانی کے پر رونق بنا دے۔ اسی عمل پر انسانی خواب یا نیند کی حالت میں وارد ہوئی ہوئی کیفیات سے انسان کا سکون یا اسکی پریشانی کا دارومدار ہوتا ہے۔ لطیف کیفیات کا تقاضا ہے۔ کہ انسان نیند کی حالت میں دنیوی الجھنوں سے محفوظ ہو کر بے خبر سو رہتا ہے۔ یا اسکی خواب کی دنیا اسکے لئے پر سکون ماحول پیش کرتی ہے۔ اور یہ تمام فوائد الصلوٰۃ (نماز) سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ کہ انسان باوجود مادیت میں ملوث ہونے کے۔ باوجود دنیوی گندگی میں الجھنے کے ہر حال میں ایک مستقل و مشرف انسان رہ سکتا ہے۔ یہ تو نماز کے فروعی نتائج ہیں۔ جہاں نماز میں۔ قوت ارادی کے اثرات۔ تزکیہ۔ ضبط نفس۔ اور لطافت سے تعلق رکھنے کے اثرات ہیں۔ وہ اثرات یقینی طور پر انسان کے وجود میں اسقدر لطافت پیدا کرتے ہیں۔ جس سے انسان کا مادی جسم بھی اسقدر لطیف ہو جاتا ہے۔ جو اسکے روحانی وجود کے ہم پلہ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان میں۔ مادی صورت میں بھی وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو اسکی اشرف المخلوقاتی ہیئت کے اعتبار سے ایٹم۔ ایتھر۔ الیکٹرسٹی سے کہیں قوی ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ۔ اس لطافت کے

ذریعہ سے۔ انسان ماوراُادراک لطیف ہیئتوں کا (روحانی) مشاہدہ بھی کر لیتا ہے۔ چنانچہ اسی کیفیت کو اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ کہا گیا ہے۔

نماز ان لوگوں کو جو اپنے نصب العین (تلاش حقیقت) کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور حقیقت کی تلاش کیلئے حقیقت کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ انکے لئے معراج (سیڑھی) ہے۔ جس میں تصور حقیقی کے ذریعہ۔ زمین (اَلْاَرْضَ) سے لیکر صراط مستقیم صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَـهٗ مَـا فِیْ السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ۔ کے تحت اللہ کے راستہ میں زمین سے لیکر سات آسمانوں اور آسمانوں سے اوپر ہر طبقہ نورانی میں زینہ بہ زینہ چڑھکر عروج کے انتہا (اللہ) تک پہنچاتی ہے۔ عروج کے لئے۔ تصور حقیقی۔ قلب کی لطافت اور روح (نور) کے قلبی تعلق کی ضرورت ہے۔ جو الصلوٰۃ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

اَلصَّلوٰۃ کے ان احکام میں سوائے اسکے کچھ مقصود نہیں۔ کہ عرفانِ الٰہی حاصل ہو۔ اگرچہ ان میں دنیوی لحاظ سے۔ قومی ملکی۔ ضبط نظام بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ قوانین فطرت کی مطابقت کیلئے ہے۔ اور اسکے ظاہری نتائج اگرچہ دنیوی حصول۔ ملک گیری۔ دولت و امارت کے حصول کیلئے بھی مفید ہوں۔ تو یہ اسکے فروعی نتائج ہیں۔ ان سے بھی مقصد یہی ہے کہ دنیا پر ایک صحیح قانون کے تاثرات رائج ہوں۔ ہر انسان کسی ضرورت کا محتاج نہ رہے۔ تاکہ انسان میں۔ نفس پرستی۔ خود غرضی۔ اور ناجائز حصول کی خواہش نہ رہے۔ جس سے دنیوی نظام۔ دنیوی ماحول پر امن رہے۔ اور ہر فرد کیلئے مقصود الٰہی حاصل کرنے میں مادیت حائل نہ ہو۔ اور انسان آسانی سے اپنا مقصود حاصل کر سکے۔ یہی تمام۔ اصول اور ماحول ملکر ایک۔ شرعی۔ روحانی۔ تمدنی ۔اقتصادی نظام پیدا کرتے ہیں۔ جسکا مقصد صرف انسانی شرافت کا برقرار رکھنا اور اس شرافت کے ذریعہ حقیقت (الٰہی) کو پانا ہے۔

شریعت کے احکام کے نتائج ہر شخص پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یعنی جو شخص بھی ان احکام کی پابندی کرے اسے عرفانِ الٰہی حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن۔ ہر زمانہ میں۔ ہر دور

یکساں حالت میں نہیں رہا۔قوموں کی نافرمانی۔انحراف کیوجہ سے انسان کو ہر وقت صحیح ماحول حاصل نہیں ہوتا۔اسلیئے ماحول کا اثر اسکی شرافت پر بھی اثر انداز ہو جاتا ہے۔اور وہ خود بخود زمانہ کے غلیظ اثرات کا شکار ہو جاتا ہے۔ایسی حالت میں انسانی قوت کے مطابق ہر شخص اتنی قوت کا حامل نہیں رہتا۔کہ وہ بدرجہ اتم وکمال اللہ کا عرفان حاصل کر سکے۔جب تک کہ وہ زمانہ کے ماحول میں کلی طور اپنا واحد نصب العین صرف ایک حقیقی خالق کی تلاش میں صرف اسی کیلیئے اپنی کوشش کو وقف نہ کردے۔یہ کردار نہایت شدید۔مشکل اور مخصوص ہوتا ہے۔اسلیئے ایسے کام میں زمانہ میں صرف مخصوص ہستیاں پائی جاتی ہیں۔باقی جو شخص جتنی سعی کرتا ہے۔اتنا ہی وہ حقیقت کے قریب ہوتا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر چند افراد کسی مقامِ مقصود تک پہنچنے کا ارادہ کرتے ہیں۔تو ہر شخص اپنی قوت کے مطابق ان مراحل میں راہ روی کرتا ہے۔اور اپنی وسعت (ذرائع) کے مطابق ہی جلد یا بہ دیر۔دور یا نزدیک اس مقام کو پالیتا ہے۔مثلاً اگر کسی ملک میں جانا ہو۔تو مختلف سواریاں (ذرائع) ہر شخص کو میسر ہوتی ہیں۔کوئی پیدل سفر کرتا ہے۔کوئی کسی تیز رفتار سواری پر جاتا ہے۔کوئی آرام طلبی سے ٹھہر ٹھہر کر سفر کرتا ہے۔اور راہ کے مناظر میں بھی کسی جگہ الجھ جاتا ہے۔کوئی تیزی سے صرف اپنا مقصود مدنظر رکھکر چلتا ہے ایسی صورت میں چند افراد ہی دارالخلافہ میں پہنچ سکینگے۔اور باقی ملک کی مختلف حدود کے اندر داخل ہونگے۔اس صورت میں ملک کے اندر داخل ہونا مقصود ہے۔اسکا تعلق ارادہ ونیت سے ہوتا ہے۔گویا ہر شخص اپنے مقصود میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اپنے ذرائع اپنی کوشش سے ہر شخص کو وہی مقام (قریب وبعید) حاصل ہوتا ہے۔جتنا اسنے اپنے سفر میں دلچسپی اور طاقت کو استعمال کیا ہو۔یہی صورت عرفان الٰہی کی ہوتی ہے۔کہ ہر شخص کا یہ عندیہ ہو کہ حقیقت کی تلاش انسانی نصب العین میں ایک لازمی چیز ہے۔اب ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق عرفان حاصل کریگا اور مخصوص لوگ ہی اپنے عرفان کی تکمیل کر پائینگے اسی طرح اللہ کو پانے کیلیئے انسان کی ذات سے ہی منزل شروع ہوتی ہے۔جسقدر انسان تفکر کرے۔تفکر کے ساتھ

قرآنی علم (الصلوٰۃ) سے استفادہ کرے اسی قدر اسے حقیقی مقام حاصل ہوگا۔

گزشتہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ قرآن میں چند آیات ایسی ہیں جو صرف اللہ کو خالق و معبود تسلیم کرنے کیلئے دلیلاً پیش کی گئی ہیں۔ جن سے مقصود صرف یہ ہے۔ کہ اللہ کائنات اور تمام ماوراءِ ادراک کا خالق ہے۔ دوسری آیتیں۔ عبادت (احکام) سے متعلق ہیں۔ جن میں اللہ تک رسائی کرنا اور اسے پہچاننے کا مواد پایا جاتا ہے۔ تیسرے دنیوی معاملات میں اعتدال کی تلقین ہے۔ جن کا مقصد بھی قوانین فطرت کی مطابقت کرنی۔ اور دنیا میں مقصود الٰہی حاصل کرنے کیلئے ایک سازگار ماحول قائم رکھنا ہے۔ ان آیات میں خصوصی آیات اَلصَّلٰوۃ ہی ہے۔ یہی الصلوٰۃ (نماز) شریعت کی روح ہے ـــــ الصلوٰۃ ان تمام نیکیوں کا مرکب ہے۔ جو قوانین فطرت کی مطابقت کیلئے ایک بہتر ماحول قائم کرتی ہیں۔ جن میں ہر نیک اقدام کی تحریک ہوتی ہے۔ لیکن ان سب نیکیوں میں افضل الصلوٰۃ (نماز) ہی ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے تبلیغی دور میں سب سے اول احکام الٰہی میں ایک مومن کیلئے جو عمل پیش کیا۔ وہ ظاہر عمل لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اعلان ہے۔ کہ وہ ایک اللہ ہی تمام مخلوق کا خالق و معبود ہے۔ یہ عقیدہ زبان و دل سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اسکا عملی عقیدہ (اظہار عقیدہ) نماز سے ہی قائم کیا۔ اور سب سے پہلے باطل کی مخالفت میں یہی اقدام کیا کہ ایک حقیقی معبود کے آگے سجدۂ بندگی ادا کیا۔ جسکا تعلق ہمارے ظاہر سے ہے۔ کہ ہر پیرِو رسول۔ کلام الٰہی سے استفادہ کرنے کی نیت سے رسول کی پیروی میں خواہ کسی بھی حالت میں ہو۔ اسکے لئے نماز قائم کرنا ضروری ہے۔

الصلوٰۃ کو دن کے چوبیس گھنٹوں میں پانچ وقتوں پر مقرر کیا گیا۔ تاکہ بطلان (کفر) کے مقابلہ میں مسلمان دن میں بار بار ایک معبود حقیقی کا تصور کر سکے اور اسے اپنی دنیوی الجھنوں سے باہر نکل کر ایک مدت حقیقی تصور کیلئے بھی میسر ہو۔ تاکہ انسان کے ذہن میں ایک اللہ کا تصور بھی قائم رہے۔ جماعت کے ساتھ ایک جگہ مسجد میں نماز ادا کرنے سے بھی مراد تو یہی ہے کہ ہر مسلمان کا عقیدہ ایک ہو۔ تمام مسلمان ہم خیال ہوں انکے نظریات میں اختلاف نہ پایا جائے۔ اور مسلمان

ایک دیوار کی صورت میں بطلان (کفر) کے آگے کھڑے ہو کر ایک مستحکم ماحول پیدا کریں جس میں کسی شیطانی قوت کو داخل ہونے کیلئے کوئی راستہ نہ مل سکے۔ لازمی امر ہے۔ کہ جب انسان کے ذہن میں ایک حقیقی اللہ کا تصور سما جائے تو ذہن اس تصور سے کسی وقت خالی نہیں رہ سکتا۔ پھر خواہ مجلس ہو یا خلوت ہر جگہ انسان ایک مسلسل تصور کو پالیتا ہے۔ الغرض قرآنی احکام میں نماز ایک ایسا عمل ہے۔ جو انسان کے ظاہری باطنی معاملات میں اصلاح کر کے اسے حقیقت شناس کر دیتی ہے۔

قرآنی شریعت (کتاب) کا دوسرا خصوصی اصول (حکم) روزہ ہے۔ روزہ کا عربی لفظ اَلصِّیَامُ ہے۔ یہ بھی الصلوٰۃ کی ایک جز ہے۔ اَلصِّیَام کا عمل الصلوٰۃ سے علیحدہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اسلئے کہ اگر ہم اَلصَّلٰوۃُ کو نماز سے موسوم کریں تو نماز کے مقابل روزہ کی نوعیت کچھ علیحدہ ہے۔ یہ نوعیت نماز کے مقابل مختلف ہونے کیوجہ سے علیحدہ محسوس ہوتی ہے۔ ورنہ نماز اور روزہ الصلوٰۃ کی ہی دو مختلف جزیں ہیں۔ نماز کی طرزِ ادا ایک ہے۔ اور روزہ کی طرز ادا دوسری۔ لیکن یہ دونوں عمل ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ نماز اللہ کے تصور میں حقیقی تصور اور یکسوئی کی تحریک دیتی ہے اور روزہ نماز کے عمل میں حقیقت کی جھلک پیدا کر کے مشاہدہ کراتا ہے۔

روزہ (الصیام) سال کے بارہ ماہ میں ایک ماہ مقرر ہے۔ جسے رمضان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس سے قبل گزشتہ پیغمبروں کو بھی الصیام کا حکم تھا۔ لیکن انکے لئے انکی جسمانی قوتوں اور وجودی کیفیتوں کے مطابق مختلف طریقوں پر روزہ مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے وقت اور دیگر پیغمبروں کے زمانہ میں چالیس دن کے روزے مقرر تھے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے وقت میں بھی تیس دن اور دس دن (مجموعی طور چالیس دن) کے روزے مقرر تھے۔ جسکی ترکیب یہ تھی کہ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک وقت کھا سکتے تھے۔ اسکے علاوہ روزمرہ معمولات میں بھی کچھ پابندیاں تھیں۔ لیکن اسلام میں روزہ صرف تیس دن (ایک ماہ) کیلئے مقرر کیا گیا ہے۔ اور اس وقت میں رات ہونے سے صبح ہونے تک کسی قسم کی (کھانے پینے اور دیگر امور میں) پابندی نہیں۔

روزہ سے مراد۔ پابندی۔ ضبط نظام۔ اور ممنوعات سے باز رہنے کے ہیں وغیرہ۔

اسلام میں روزہ کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ کہ ماہِ نو کی ابتدائی صبح سے دن کے خاتمہ تک انسان کیلئے کھانا۔ پینا۔ اور دیگر ضروریات زندگی کے استعمال سے پابندی کے ساتھ باز رہنا۔ مسلمانوں میں بظاہر تو روزہ کی کیفیت صرف صبح کی ابتدأ سے دن کے خاتمہ تک فاقہ کرنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور روزہ میں دن کا فاقہ ضروری ہوتا ہے۔ یعنی ہر وہ چیز جو جسم کو قوت دینے والی ہو۔ اور ہر وہ چیز جو انسانی خواہش کو پوری کرنے والی ہو ان تمام اشیأ میں پابندی ہوتی ہے۔ دراصل روزہ انسانی تزکیہ نفس کیلئے مقرر کیا گیا ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے۔ کہ انسان کا مادی جسم انہیں زمینی (ارضی) قوتوں سے نشو ونما پاتا ہے۔ اور یہ نشو ونما انسانی مادیت کو ابھارتی ہے۔ انسان کی ابتدائی پیدائش پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان اپنی پیدائش میں ایک خالص اور لطیف وجود کا حامل ہوتا ہے۔ جوں جوں اسکی نشو ونما مادی غذا سے ہوتی ہے۔ مادیت اس پر غالب آجاتی ہے اسکے ساتھ ہی انسان کو جس قسم کا ماحول میسر ہو اسی قسم کی اسکی عادات اور خصائل بھی بنتے جاتے ہیں۔ جس وقت انسان اپنے ارادہ واختیار میں کامل ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس میں ادراک ومشاہدہ کی قوت (جسکا تعلق لطیف قوت سے ہوتا ہے) مادہ کے دباؤ میں مغلوب ہو چکی ہوتی ہے۔ چونکہ ہر انسان کیلئے ماورأ ادراک کیفیات میں تفکر ومشاہدہ لازمی چیز ہے۔ اسلئے ایسی مغلوب حالت میں ہر شخص کیلئے جو مستقل تزکیہ نہ کر سکتا ہو مجموعی حیثیت سے روزہ ہی انسان کی لطیف قوتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ گو ہر شخص کو عرفان الٰہی کیلئے پوری سعی کرنی لازمی ہے۔ لیکن بعض وجوہات پر ہر انسان کلی طور اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی روحانی قوتوں کو جلا پانے کیلئے ماحول اور دیگر ذرائع حاصل کر سکے۔ اسلئے ایسی حالت میں روزہ اس کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ روزہ سال میں ایک ماہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور روزہ میں خصوصی طور فاقہ کرنا یعنی غذا۔ کھانا۔ پینا۔ منشیات مثلاً چائے۔ تمباکو۔ سگریٹ۔ پان وغیرہ ان اشیأ کی پابندی فرض کی گئی ہیں وہ اشیأ جن سے جسم کو قوت پہنچتی ہے۔ ان میں زیادہ تر مادیت ہوتی ہے۔ جیسے روٹی صبح شام کی۔ انکی ممانعت اسلئے کی گئی ہے کہ ایک ماہ کے

مسلسل عمل سے انسان میں مادیت کا غلبہ کم ہوتا ہے۔ اور روحانیت (لطافت) میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ ویسے روزوں میں بھی غذا اتنی ہی مقدار میں کھائی جاتی ہے۔ جتنی عام دنوں میں کھائی جاتی ہے۔ لیکن صیام (روزوں) میں ایک خاص اصول کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ اسکے لئے دن سے قبل (سرگئی[1]) اور دن کے ختم ہونے پر (افطار کو) کھائی جاتی ہے۔ ان دو وقتوں میں پابندی کے ساتھ کھانا وغیرہ کھانے سے انسانی تزکیہ کا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔ یعنی ''سرگئی'' کے وقت غذا کھائی جائے تو اسکے ہضم ہونے میں زیادہ سے زیادہ چھ گھنٹے لگتے ہیں۔ اسکے بعد معدہ اور آنتیں سب خوراک سے خالی ہوجاتی ہیں۔ معدہ میں خوراک ختم ہونے کے بعد لازمی طور بھوک لگنی شروع ہو جاتی ہے۔ اسکے لئے انسان ہر چار یا چھ گھنٹے بعد کھانا تو نہیں کھاتا۔ بلکہ دیگر لوازمات۔ چائے۔ پھل یا ایسی قسم کا ناشتہ استعمال کرتا ہے۔ یہاں تک کہ کھانے کا دوسرا وقت ہوجاتا ہے۔ روزہ میں کھانا کھانے کے چھ گھنٹے بعد افطار تک کم از کم [2]سات گھنٹے باقی رہ جاتے ہیں۔ اسلئے سرگئی میں اگرچہ انسان اپنی اشتہا سے زیادہ بھی پیٹ بھر کر کھانا کھائے۔ جب بھی اسے سات گھنٹے کا فاقہ ہوجاتا ہے۔ اور اس عرصہ میں کوئی شے اپنی بھوک کو کم کرنے کیلئے استعمال نہیں کی جاسکتی۔ اسلئے اتنی مدت فاقہ سے۔ معدہ کی یا انسانی وجود کی قوت (خون) ہی جسم کو پہنچتی ہے۔ چونکہ انسانی جسم میں خون پانی وغیرہ کی ایک مقررہ مقدار موجود رہتی ہے۔ اس مقدار میں سے ہی جسم کے اعضاء و اعصاب کی کمی پوری ہوتی رہتی ہے۔ جسکا نتیجہ لازمی طور مادیت کی کمی ہوتی ہے۔ اور یہی کمی انسانی مادی خواص میں کمزوری پیدا کرکے لطافت پیدا کرتی ہے۔ اسکے علاوہ روزہ میں باقی فروعات کی ممانعت اور خاص کر اشتہا (بھوک) محسوس ہونے پر پیاس کی شدت اور مزید دنیوی کاروبار میں

---

[1] سحری (ناشر) [2] روزے اسلامی سن ہجری کے مطابق نویں (۹) قمری مہینے میں ہوتے ہیں۔ اور یہ سنہ موسم کے لحاظ سے تبدیل ہوتا ہے۔ یعنی گرمی میں بھی آتا ہے اور سردی میں بھی آتا ہے۔ گرمی میں روزے کا دن موسم کے لحاظ سے تقریباً سترہ (۱۷) گھنٹے کا ہوتا ہے گویا اس حساب سے تقریباً گیارہ بارہ گھنٹے کا فاقہ ہوجاتا ہے اور سردیوں میں دن تقریباً بارہ گھنٹے کا ہوتا ہے اس حساب سے بھی چھ سات گھنٹے فاقہ ہوجاتا ہے۔

محنت و مشقت سے بھوک کی شدت میں ہر شے کی طلب کو ایک قانون کی پابندی میں روکنا۔یہ چیزیں انسانی ضبط نفس۔استقلال۔اور قوت ارادی کو قوی کرتی ہیں اگر ایک شخص چائے۔تمباکو۔پان۔شراب وغیرہ کا عادی ہو چکا ہو۔تو ایسا انسان وقت کی طلب پر اپنی خواہشات کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔بلکہ یوں کہئے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کو بار بار پورا کرنے سے اپنی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔اور ہر بری خواہش کو پورا کرنے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔اور یہ مجبوری انسان کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے ایسی حالت میں مجبوری کے وقت انسان اپنے ارادے کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔جب انسان اپنے نفس کا غلام بن جاتا ہے تو اس میں روحانی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔اور مادیت غالب آجاتی ہے۔ایسی حالت میں انسان ہر برے فعل پر اپنے آپ کو باوجود برائی کو محسوس کرنے کے بھی برائی سے بچا نہیں سکتا۔اور برائی کر گزرتا ہے۔جس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔کہ انسان اپنی شرافت اور اپنی روحانی عظمت کھو بیٹھتا ہے۔یہی شے اسے حقیقت سے دور کر دیتی ہے۔اور انسان قوانین فطرت کی خلاف ورزی اور انحراف پر آمادہ ہو جاتا ہے۔روزہ میں فاقہ اور دیگر خواہشات نفسانی کی پابندی میں ضبط نفس اور پرہیز (تقویٰ) ہونے سے انسان ہر اس عادت اور مجبوری سے نجات پا کر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔اسکی قوت ارادی مستقل ہو جاتی ہے۔جس سے انسان ہر برے فعل کو برا سمجھکر اسے آسانی سے ترک کرنے کی قوت حاصل کر لیتا ہے۔اسکے ساتھ ہی روزوں میں زیادہ عبادت کا حکم بھی ہے۔مثلاً زائد نماز (نوافل) دن کی نمازوں میں اور رات کو طویل نماز (نفل تراویح) ایک طرف اسکی کھائی ہوئی شام کی غذا ہضم کر دیتی ہے۔دوسرے اسکے اعصاب میں دن کی تھکان دور کر دیتی ہے۔تیسرے نیند جو ایک فطری اثر ہے۔یعنی جب انسان پر نیند کا غلبہ ہو جائے تو انسان بمشکل نیند کو روک سکتا ہے۔اور جب اسکا وقت مقرر ہوتا ہے۔تو انسان پر خواہ مخواہ غالب ہو جاتی ہے۔ایسے وقت میں نیند کو روک کر ایک زائد مشقت میں مشغول ہونا پھر تھوڑی دیر سو کر دوبارہ ''سرگی'' کے انتظام میں قبل از وقت جاگنے سے انسان نیند جیسی شدید کیفیت پر بھی غالب آجاتا ہے۔کہتے ہیں نیند تختۂ دار پر بھی آنے سے نہیں رکتی۔گو یہ فسانہ

ہے۔لیکن اس میں حقیقت بھی پائی جاتی ہے۔کہ انسان کی تھکاوٹ پر اسکے اعضائے فطری طور شل ہو جاتے ہیں۔اسکا دماغ (تعقل) اور اعصاب (Nerves) خود بخود کام کرنے سے رہ جاتے ہیں۔تو پھر اسکا نتیجہ نیند ہوتی ہے۔مثال کے طور پر اگر ایک شخص لگاتار مقررہ وقت سے زائد محنت کرے تو اسکی قوتِ عمل کام کرنے سے رہ جائیگی پھر انسان کوئی کام کرنے سے عاجز ہوگا۔اور انسان مجبور ہوکر گر جائیگا۔اور اس پر غنودگی طاری ہو جائیگی۔یہ نیند ہر حالت میں انسان پر غالب ہوگی۔اسلامی شریعت نے اس موقع پر دوبارہ عزم کرنے کیلئے ایک حقیقی تصور (نماز) مقرر کیا تاکہ کچھ بوجھ تعقل سے ہٹ کر شعور کی طرف بٹ جائے۔اور رکوع وسجود و قیام کی حرکت ایسی ہے۔جو انسان کے اعصاب (Nerves) کو ایک طرف محتاط رہنے کی تحریک دیتی ہے دوسری طرف ان میں قوتِ عمل کی سپرٹ بھر دیتی ہے۔اور پھر نیند کے رکنے سے انسانی دماغ وقلب کی خاصیتیں کھل جاتی ہیں۔اور انسان کے قلب پر لطیف انوار کا عکس آ جاتا ہے۔جب انسان اس حالت میں ماوراُادراک ماحول کا مشاہدہ کرنا شروع کرتا ہے تو اس میں ایک ذوق پیدا ہوتا ہے۔یہ ذوق انسان کی تکان۔نیند۔تساہل۔ختم کر دیتا ہے۔یہی استغراق انسان کو حقیقت کا مشاہدہ کراتا ہے۔اسکے علاوہ۔روزہ انسان کے ظاہری معاملات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔کم کھانے۔کم سونے کی عادت کے علاوہ اس میں احساس۔درد۔ہمدردی۔پیدا ہوتی ہے یہ کیفیتیں ظاہری ماحول کو پاک وصاف کر دیتی ہیں اور اسی کردار سے انسان کو ایک خالص ماحول میسر ہوتا ہے۔جس میں انسان آسانی سے اپنے تفکر وعمل کے لئے ہموار راہیں پاتا ہے۔اسلئے شریعت نے روزہ کو ایک فریضہ کی صورت میں انسان (مومن) کیلئے پیش کیا۔تاکہ ہر وہ شخص جو حقیقت کو پانے کیلئے اپنی سعی کیلئے ذرائع حاصل نہیں کرسکتا روزہ سے اُس کمی کو پورا کیا جائے۔

اسکے بعد چوتھا اصول کتاب کا زکوٰۃ ہے۔زکوٰۃ کے معنی بھی تزکیہ ہے۔یعنی انسان اپنے جمع شدہ اثاثہ (دولت) سے اڑھائی فیصد چالیسواں حصہ علیحدہ کر کے ان لوگوں میں تقسیم کرے جو اپنی ذاتی ضروریات فراہم نہیں کر سکتے۔اسکے ساتھ ''صدقات'' کا بھی حکم ہے۔یعنی

اس حصہ سے علاوہ اگر انسان کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ میسر ہے تو اس حد تک کہ انسان صرف اپنی وقتی ضرورت کے علاوہ سب دے سکتا ہے۔ لیکن اس میں انسان کی اپنی مرضی کا انحصار ہے۔ خواہ دے یا نہ دے لیکن قانونی طور پر انسان اپنے تمام اثاثہ کا چالیسواں حصہ (جبکہ اسکے قریب اور ایسے لوگ بھی ہوں جو محتاج ہوں) محتاجوں کو دینے کیلئے بجبر مجبور کیا گیا ہے۔ اسکی وجہ؟

دنیا پر ہر شخص کائنات کی اشیاء پر بحصہ مساوی حق رکھتا ہے۔ اگر ایک شخص دولت مند ہے۔ اور اسکے مقابل ایک شخص غریب ہے۔ تو اسکی وجہ یہ سمجھی جاتی ہے۔ کہ سرمایہ دار نے ایسے ذرائع حصول اختیار کئے ہیں جن سے وہ اپنی قوت[1] سے زائد حاصل کر رہا ہے۔ اور اس حصول میں قوانین فطرت کے مطابق دوسروں کو اپنے حصول کیلئے گنجائش نہیں رہتی اور انکے لئے حصول کی

---

[1] قوت سے زائد حصول سے مراد یہ ہے۔ کہ ایک شخص کیلئے اتنی قوت درکار ہے۔ کہ وہ اپنے لئے سامان زندگی میں اسی قدر حاصل کر سکتا ہے۔ جتنی اسے وقتی طور ضرورت ہے۔ یعنی ایک وقت کا کھانا۔ ایک انسان اپنے لئے سال بھر کا کھانا۔ یا دیگر اشیاء جائداد (مکانات۔ زیورات۔ اور دیگر ضروریات جنکا تعلق خوراک سے نہیں) جمع کر رہا ہے۔ اسکے لئے انسان وہ ذرائع اختیار کر رہا ہے۔ جن کے لئے وہ دوسروں سے کام لیتا ہے دوسروں سے کام لیکر دولت کا جمع کرنا۔ انسان کی قوت سے زائد سمجھا جاتا ہے۔ گویا اگر انسان دوسروں کی مدد سے زائد دولت حاصل کر رہا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر دوسرے انسان فرداً فرداً اس امدادی حصول کو تقسیم کریں۔ تو اس شخص کے پاس اتنا ہی رہیگا۔ جتنا اسکی وقتی ضرورت کا کھانا یا اس سے کچھ (قلیل مقدار میں) زائد ہو۔ ایسی صورت میں ایک سرمایہ دار دوسروں کی محنت کا پھل بھی اپنی ملکیت میں لے لیتا ہے۔ گویا یہ ایک فطری اصول ہے۔ اب اگر ایک شخص زائد دولت کا مالک و مختار خود بنتا ہے تو اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ کسی انسان سے ظلم۔ یا جبر سے نہیں لیتا بلکہ اسکے لئے وہ ایک تدبیر (اختراع) پیدا کرتا ہے۔ اور اپنی دماغی قابلیت سے وہ ایسے ذرائع پیدا کرتا ہے۔ جس سے وہ اپنی قوت سے زائد اشیاء حاصل کر لیتا ہے۔ نیز ہر شخص جو اسکی معاونت (ملازمت) کرتا ہے۔ وہ خود اپنی ضرورت کیلئے ہی یہ کام کرتا ہے۔ جو اس سے پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن اس طریق سے اگر یہی طریق اکثریت حاصل کرے تو لازمی طور۔ اس حصول میں دوسروں کیلئے حاصل کی گنجائش نہیں رہتی اور دوسروں کیلئے حصول کے راستے تنگ ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ انسان اپنی ضرورت میسر نہ ہونے پر محتاج ہو جاتا ہے۔ اس حصول کے دو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

راہیں تنگ ہو جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف سرمایہ دار زائد مال جمع کر کے دوسروں کے فطری حقوق پر قابض ہو کر فطری قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ دوسری طرف ایک شخص کو جب اپنی ضروریات کی فراہمی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ تو انسان اپنی ضرورتوں سے تنگ آ کر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے۔ کہ ایک شخص جو اپنی قوت سے دن کے آٹھ گھنٹے میں ایک حصہ کما سکتا ہے۔ اگر اسے اس حصہ سے دہ چند (دس گنا) حصول کی خواہش ہوتی ہے۔ تو وہ خود دس گنا بوجھ اٹھا نہیں سکتا۔ مثلاً اگر ایک شخص تجارت میں ایک بوجھ اٹھا کر دس روپے کما سکتا ہے اور اسے بیک وقت دس گنا مال سے ایک سو روپیہ حاصل ہو سکتا ہے۔ تو وہ خود دس گنا بوجھ اٹھا نہیں سکتا۔ اگر کوئی شخص اسکی تجارت میں مددگار نہ ہو تو وہ کسی صورت میں دس گنا بوجھ فروخت کرنے کی قوت نہیں پا سکتا۔ تو اسکے لئے یہ ناممکن ہے۔ کہ وہ خود دس گنا نفع (ایک سو روپیہ) کمائے۔ جب تک کہ وہ دس آدمیوں کی مدد یا اپنے سے علاوہ مدد حاصل نہ کرے۔ ایسی صورت میں اسکا مددگار ایک انسان ہی ہوگا جو انسان اس دنیا میں بحصہ مساوی حصول کا حق رکھتا ہے۔ جب ایک شخص اپنے سے زائد انسانوں کی امداد حاصل کرتا ہے۔ تو اسکا مطلب یہ ہے۔ کہ مالک کے ساتھ باقی مددگاروں نے بحصہٗ مساوی کام کیا جسکا نفع صرف ایک شخص حاصل کر لیتا ہے۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ مالک خود کام بھی نہیں کرتا۔ اور اسکے مددگاروں کے ذریعہ ہی اسے دس گنا منافع ملتا ہے تو ایسی صورت میں ایک شخص نے دس آدمیوں (یا اپنے سے زائد دوسروں) کے حصول پر بھی احاطہ کر لیا۔ یہاں پر اگر اس طریق کو صحیح سمجھا جائے تو اسکی صورت یہی ہو سکتی ہے۔ کہ مالک اپنے مددگاروں کو انکی محنت کے مطابق اسقدر معاوضہ دے کہ وہ اگر پورے سرمایہ دار نہیں کہلا سکتے تاہم انکے پاس بھی مالک کے مقابلہ میں اسکی جائداد کے تناسب سے ہر شے میسر ہونی چاہیے اگر ہر شخص کو برابر کا نفع حاصل ہو تو اسے اشتراک (شراکت) کہتے ہیں۔ اسطرح ہر شخص خود اپنی محنت کے ثمرہ کا مستقل مالک ہوتا ہے۔ اگر یہ طریق اکثریت سے جاری ہو تو پھر کوئی شخص محتاج نہیں رہ سکتا بلکہ ہر شخص ایک دوسرے کے مقابل یکساں پوزیشن (حالت) میں بحصہٗ مساوی سامان زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ یہی شے اشتراکیت کہلاتی ہے اسکے علاوہ دوسرا طریقہ: اگر ایک شخص اپنی قوت سے زائد حصول کے لئے کوئی امداد حاصل کرے۔ اور مددگاروں کو بحصہٗ مساوی انکی محنت کے مطابق نہ دے۔ بلکہ ایک مقررہ رقم ادا کرے جو انکی محنت (آٹھ گھنٹہ یا مقررہ میعاد) کیلئے معاوضہ مقرر کیا گیا ہو۔ تو لازمی طور وہ محررہ بالا طریق کے مطابق اپنی قوت سے زائد کا قابض سمجھا جائیگا۔ اور اسکی ملکیت میں دوسروں کا حصہ بھی تصور کیا جائیگا۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک شخص دس کے مقابلہ میں دس (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ناجائز طریق اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جس سے۔ چوری۔ جھوٹ۔ دغا فریب اور مختلف قسم کے جرائم قوم میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں غریب ہی زیادہ تر قانون فطرت کی خلاف ورزی کا عادی ہو جاتا ہے۔ ایسا طریق خلاف قوانین فطرت قوم کے تمام ماحول کو یکسر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) حصہ حاصل کریگا اور اکثریت دسویں حصہ سے کم کی مالک ہو گی۔ ایک شخص دوسرے انسانوں کی مدد سے۔ عماراتِ شاہی محلات۔ زیورات۔ باغات (جنت ارضی) اور دیگر اشیاء کا مالک ہوگا۔ اور اپنی ضرورت سے زیادہ جائداد حاصل کر کے صرف اپنے لئے وقف کریگا۔ اور دوسروں کیلئے یہ ضروریات کم ہوتی جائینگی وہ اِن ضروریات کے حصول سے محروم رہینگے۔ اور ایسے لوگوں کی ضرورتیں رفتہ رفتہ تنگ ہوتی جائینگی۔ اور انسانوں میں اعلیٰ و ادنیٰ امیر و غریب سرمایہ دار اور محتاج دو فریق ہونگے ایک شخص اپنی قوت کے مطابق زائد ضروریات کا مالک ہوگا۔ دوسرا شخص اپنی قوت کے مطابق حاصل کرنے کے باوجود۔ اپنے حقیقی فائدہ سے بھی کم کا مالک ہوگا۔ یہی طریق سرمایہ داری کہلاتا ہے۔ جس سے قوم میں افلاس و غربت پیدا ہوتی ہے۔

لیکن اسلام نے زکوٰۃ کا حکم جاری کرنے سے ان دونوں طریقوں کے درمیان ایک معتدل طریقہ اختیار کیا۔ اسلام ایک فطری دین ہے۔ اس کی نسبت اسی ابتدائی قانون سے ہے۔ جو قانون ابتدائے آفرینش سے کائنات پر جاری ہوا۔ یعنی کائنات کی تمام اشیاء ایک قانون کے مطابق پابندِ نظام ہیں۔ ہر شے انسان کے سامان زندگی کیلئے ایک ذریعہ مہیا کر رہی ہے۔ اور اس تمام کائنات پر صرف انسان کا ہی تصرف ہے۔ ابتدائے آفرینش (پیدائش) سے انسانیت کا مطالعہ کیا جائے۔ تو ضرور یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ انسان نے اپنی تخلیق کی ابتداً اس کائنات پر کی اسی سے اسنے اپنی نشو و ارتقاء کا سامان حاصل کیا اور ہر انسان کو اپنی ضرورت کا سامان جہاں بھی وہ اس کائنات میں رہا۔ جتنی بھی اسے ضرورت تھی اِسنے آسانی سے اپنا سامانِ زندگی حاصل کیا۔ جسقدر اسے ضرورت تھی اسی قدر انسان نے حاصل کیا حالانکہ تمام کائنات ان ضرورتوں سے بھری پڑی تھی۔ لیکن انسان کی ضرورت خود محدود تھی۔ اسے اتنی ہی خواہش تھی جتنی ضرورت سے وہ اپنے آپ کو مطمئن کر سکتا تھا۔ لیکن انسان اپنی مختصر ضرورت پر کیوں مطمئن تھا؟ کیا اسے علم نہ تھا کہ یہ تمام اشیاء میرے قبضہ میں ہونی چاہیں؟ کیا اسے ان کے حصول کے ذرائع کا علم نہ تھا؟ ـــ ان کے لئے کوئی سوال اسکے اطمینان کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اتنی وسیع کائنات میں جبکہ ہر انسان کائنات کی ہر شے سے بغیر کسی رکاوٹ کے فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔ اور انسان خود بخود ہر شے کو پاتا تھا۔ پھر "علم نہ ہونا" اور ذرائع کی ضرورت یا قبضہ کی خواہش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ انسان کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

زہریلا کردیتا ہے جس سے باہمی اخوت۔ ہمدردی۔ اور انسانی یگانگت ختم ہو کر ایک دوسرے سے بغض وعناد پیدا ہو کر ایک دوسرے کو لوٹنے۔ ڈاکہ ڈالنے۔ قتل کرنے کی نوبت آجاتی ہے۔ انسان قانون کی زد سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور دنیا میں فساد وخونریزی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اطمینان کی وجہ یہ تھی۔ کہ انسان ایک مکمل ہیئت میں تھا۔ وہ صرف زندہ رہنے کیلئے سامان زندگی حاصل کرتا تھا۔ سو زندہ رہنے کیلئے اسی قدر ضرورت تھی جس قدر اسکی زندگی بغیر دشواری برقرار رہ سکتی تھی۔ جب زندگی امن سے گزرتی پھر دیگر ذرائع استعمال کرنے کی کیا ضرورت رہتی ہے ــــ انسان کی یہ زندگی ایک فطری زندگی تھی۔ اسکی شب و روز کی زندگی ہی ایک فطری قانون تھا۔ یہی فطری زندگی۔ یہی فطری قانون۔ دین فطرت کہلاتا ہے۔ اسلام بھی اسی فطری ازلی قانون کی طرف انسان کو تحریک دیتا ہے۔ کہ انسان دنیا میں صرف سامانِ زندگی کی فراہمی کیلئے پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ یہ سامان تو اسکی زندگی سے قبل اسکے لئے مہیا کیا جاچکا ہے۔ جس پر صرف انسان کا تصرف ہی ہے۔ صرف دیکھنا یہ ہے۔ کہ انسان کو کس شے نے اپنے مقصد سے ہٹا کر صرف سرمایہ کی فراہمی اور دنیا پر ناجائز قبضہ پر آمادہ کیا۔ یہ کثرت آبادی نہیں۔ یہ دیگر ذرائع کی اختراع کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ انسان ہر شے کی ایجاد (علم) ہونے پر لذت کا تابع ہوا لذت نے آرام طلبی۔ ہوس۔ خودغرضی پیدا کردی۔ اب یہ امراض دور کرنے کیلئے پھر فطری قانون کی تجدید ہوتی ہے۔ جو دین محمدیؐ کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ کہ انسان اب اس مقام پر پہنچا ہے۔ جہاں شہر۔ سلطنتیں۔ بازار۔ خرید و فروخت کا چرچا ہو چکا ہے۔ دولت و امارت کی ہوس انسان کی عادتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ امیر و غریب۔ شہنشاہ و غلام کا وجود پیدا ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں نہ اشتراکیت کا اصول قابل عمل ہوسکتا ہے۔ کیونکہ انسانی عادات و خصائل اور بڑھتی ترقی اسے اشتراک پر مائل کرہی نہیں سکتے۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ زمانہ میں انقلاب رونما ہوگا۔ ایک انسان دوسرے کو فنا کرنے کے درپے ہوگا۔ اور پھر وہی خونریزی و فساد جاری ہوگا اور انسانی فطرت میں نسلاً بعد نسلاً ایک عناد و اختلاف پیدا ہوگا جو مواد بعد اصلاح کے بھی کسی وقت ابھر سکتا ہے۔ اسلئے حال و مستقبل کا اس خدشہ سے پاک رہنا انسانی فطرت کے اعتبار سے بھی ناممکن ہے۔ اسکے مقابل سرمایہ داری ہے۔ اگر اشتراکیت پر عمل نہیں ہوسکتا تو پھر اسکے مقابل سرمایہ داری پر عمل کرنا ہوگا۔ لیکن سرمایہ داری تو فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ اسلئے انسان کو اسی فطری نکتہ کی طرف رجوع کرایا جائے کہ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ''ج وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ '' لِّمَنِ اتَّقٰى قف (پارہ ۵ سورۃ ۴ آیت ۷۷) دنیا کا تمام سرمایہ تھوڑی مدت کیلئے ہے۔ اور اسکے مقابلہ میں وہ سرمایہ بہتر ہے۔ جو ایک دائمی زندگی (طویل زندگی) کیلئے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس مضرت کے سد باب کیلئے اسلام نے زکوٰۃ کو پانچ احکامِ عبادت میں شامل کر کے عبادت کے طور پر ہر انسان کو فرد واحد کی حیثیت سے ان احکام کی پابندی کیلئے پیش کیا۔ پیغمبر نے اسلامی قانون کو دین کی حیثیت سے پیش کیا جس میں شہنشاہیت ۔حکومت ۔ بادشاہت کا کوئی تعلق نہیں ۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ضرورت ہے یہ سرمایہ اسے حاصل ہوسکتا ہے ۔ جو خوف (دائمی زندگی میں محتاجی اور تکلیف) کا احساس کرے ۔ جو خوف کے بعد قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرنے سے پرہیز کرے ۔ ایسی حالت میں ۔ اگر ایک سرمایہ دار آدمی کو یہ احساس ہو جائے ۔ تو اسکے لئے دونوں صورتیں قائم ہو جائینگی ۔ ایک طرف اشتراکیت کا مادہ اس میں پیدا ہوگا وہ ہر انسان کے حقوق کو مساوی سمجھکر اسکی حفاظت کریگا ۔ دوسری طرف وہ سرمایہ دار بنکر ہر شے کو اپنی ملکیت جانکر بھی ہر انسان کیلئے اپنا تمام سرمایہ واپس کرنے پر بروقت آمادہ رہیگا ۔ جب انسان اپنے مقصد زندگی اور فطری قانون پر غور کرے ۔ تو اسے یہ احساس ہوگا کہ یہ سب سامان صرف وقتی غذا زندگی کے برقرار رکھنے کیلئے حاصل کرنی ہے اور کائنات کی اشیأ پر ہر شخص مساوی حق رکھتا ہے ۔ تو وہ اپنے لئے زیادہ دولت و امارت ہوتے ہوئے بھی یہی ابتدائی نظریہ قائم کریگا ۔ کہ اس تمام دولت سے اسی قدر استعمال کیا جائے جتنی انسان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کیلئے ضرورت ہے ۔ ایسی حالت میں انسان اپنی دولت سے اسقدر لگاؤ نہیں رکھتا جتنا کہ ایک سرمایہ دار دولت سے محبت رکھتا ہے ۔ نہ ہی ایسے انسان کو زیادہ حصول کی خواہش رہیگی ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مقدس کا مطالعہ کیا جائے ۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتی زندگی کتنی مختصر رہی ۔ ابتدائی زندگی میں اگرچہ آپکو ذرائع میسر نہ ہوئے ہوں ۔ لیکن درمیانی زندگی میں آپنے تجارت بھی کی ۔ لیکن اپنی زندگی کا سامان صرف جو یا مختصر خوراک رہی ۔ اسکے بعد وہ زمانہ بھی آیا جب عرب کے ایک مشہور متمول خاتون کی ملازمت بہ رضا و رغبت قبول کی ۔ حالانکہ یہ چیز سرمایہ داری کا نمونہ تھا ۔ تو اریخ شاہد ہے ۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امداد سے تجارت میں اسقدر نفع ہوا ۔ کہ پیشتر کبھی نہ ہوا تھا لیکن حضورؐ پر اس ماحول کا کچھ اثر نہ ہوا ۔ اسلئے کہ آپکی زندگی قانون فطرت کے عین مطابق تھی ۔ اور آپکی ذات مقدس مکمل شرف حاصل کئے ہوئے تھی ۔ نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ آپکی اس روحانی جبلت کا اثر خاتون پر بھی ہوا ۔ انہیں یہ طریق عبدیت پسند آیا ۔ اور اپنے آپکو ایک یتیم ہستی کی شرکت میں پیش کیا ۔ یہاں سرمایہ داری بھی ہے ۔ اور اشتراکیت بھی قائم ہوئی لیکن ابھی مقصد سے دوری تھی ۔ سو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فطری (اسلامی) جذبہ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو متاثر کئے بغیر نہ چھوڑا اور آپ بھی اسی فطری مقام پر پہنچیں جہاں بانئے دین فطرت کھڑے تھے ۔ آپنے اپنی تمام دولت مخلوق (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بلکہ ہر شخص کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ کہ وہ ان احکام کی پابندی کرے۔ یا نہ کرے۔ اگر انسان ان احکام کی پابندی پر آمادہ ہوگا۔ وہ دنیوی حصول کے نظریہ پر ان احکام کی بنیاد نہیں رکھیگا۔ بلکہ اپنے تکمیل مقصد کیلئے۔ جسکا تعلق انسانی نصب العین۔ یعنی تلاش حقیقت سے ہے۔ ایک عبادت کی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) انسانی میں تقسیم کر کے حق دار کو اپنا حق واپس کر دیا۔ تو ارخ شاہد ہے۔ کہ یہی محترم و مقدس خاتون اکثر حضورؐ کی معیت میں فاقہ کرتی رہیں۔ اور دولت تقسیم کرتی رہیں۔ اسکے بعد خلیفہ اسلام حضرت ابوبکر صدیقؓ کا واقعہ اس حقیقت کی بین دلیل ہو سکتی ہے۔ کہ آپ کے دور خلافت میں ایک بار آپکی اہلیہ محترمہ نے اپنی ضرورت سے زائد حلوا کھانے کی خواہش ظاہر کی اور حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ ایک بار حلوا کھانے کی خواہش ہے آپ نے فرمایا۔ کہ ہمیں بیت المال سے صرف ضرورت زندگی کیلئے خوراک ملتی ہے۔ اس سے زائد فراہم ہو تو حلوا کھائیں؟۔ آپکی اہلیہ نے ہفتہ بھر چند درہم اپنی خوراک سے بچت کر کے حضرت ابوبکرؓ خلیفۃ المومنین کو دیئے۔ کہ یہ رقم ہمیں اپنی خوراک سے بچت ہوئے ہیں سو آج اسی میں حلوہ کا سامان لائیے۔ چنانچہ آج دن کی خوراک بھی اسی رقم میں شامل تھی۔ آپ نے زائد رقم سمجھکر بیت المال میں جمع کر دی اور آئندہ اتنی رقم مقررہ خوراک سے کم کر دی۔ شام خالی گھر لوٹے تو اہلیہ محترمہ نے سامان کا پوچھا تو آپ نے فرمایا۔ یہ رقم دراصل زائد تھی اسلیئے ہم نے بیت المال میں واپس جمع کر دی۔ بلکہ ہمیں افسوس ہے۔ کہ اس عرصہ ہم یہ زائد رقم خرچ کرتے رہے۔ جو قوم کی خیانت سمجھی جاتی ہے آخر اسکا جواب کچھ نہ تھا۔ رات کو فاقہ سے سوئے۔ اسی تحریک کیلئے اسلام نے زکوٰۃ و صدقات کا حکم دیا ہے۔ کہ انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ میرے پاس اپنی قوت سے زائد سرمایہ موجود ہے۔ اس میں ان لوگوں کا حق بھی ہے۔ جو اپنی زندگی کا سامان مہیا کرنے سے مجبور ہیں۔ دوسرے قومی اصلاح کیلئے ایک ایسا نظام ہے۔ جس میں قوم میں غربت و افلاس دور ہو کر بے شمار نقائص اور جرائم کا سدباب ہو جاتا ہے۔ اور انسان۔ ہوس پرستی۔ خود غرضی سے پاک رہتا ہے۔ زکوٰۃ کے لغوی معنی تزکیہ ہے۔ زکوٰۃ سے مال کا تزکیہ ہوتا ہے۔ کہ انسان کا مال اسکی ذات کیلئے پاک ہو کر اسکے لئے نفع بخش رہتا ہے۔ اور اسکے خرچ کرنے پر فراخدلی سے آمادہ رہتا ہے۔ پھر بھی اس میں کمی واقع نہیں ہوتی مبادا انسان دولت کے نقصان میں محتاج نہ ہو جائے۔ دوسری طرف انسانی قلب کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔ کہ مال ہوتے ہوئے مال کی محبت ہوس نہیں رہتی اس مال کو اسی قدر سمجھتا ہے۔ جسقدر اسکی وقتی ضرورت پوری ہو سکے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کا ذکر ہے۔ کہ ایک شخص نے حضورؐ کے سامنے اپنی تکالیف بیان کرتے ہوئے کچھ امداد کی گزارش کی آپنے کسی صحابی (پیرو۔ دوست) کی طرف بھیجا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حیثیت سے ان احکام کی پابندی کریگا۔ جسکے لئے انسان پر کوئی زبردستی۔ یا ظاہری سزا کا دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ انسان ظاہری خوف نہ ہونے کی وجہ سے احکام الٰہی کی پابندی سے اکثر کوتاہی کرتا رہا۔ لیکن یہ کوتاہی بغیر نتیجہ کے نہیں رہ سکتی جبکہ دنیا پر ایک ابدی اور مستقل نظام کا فطری احاطہ قائم ہے۔ اور یہی نتیجہ انحراف کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ اور انحراف کا انجام فطری قانون کے مطابق یہی ہوتا ہے۔ کہ ایک طرف انسان خود فساد و خونریزی پیدا کر کے اپنا اطمینان

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) (جو ایک متمول شخص تھا) کہ اس سے امداد ملیگی۔ یہ شخص صحابی کے گھر رات کو پہنچا دروازے پر پہنچ کر کیا دیکھتا ہے صحابی اپنی اہلیہ سے ناراض ہو رہے ہیں۔ کہ چراغ میں بتی بڑھا کر تیل زیادہ جلا دیا! ـــــ سائل بغیر مانگے ہی یہ سنکر لوٹ آیا۔ دوسرے دن دوبارہ حضوؐر کی خدمت میں سوال کیا۔ آپنے پوچھا۔ کہ کل کچھ نہیں ملا تھا۔ اسنے عرض کی کہ وہ بیوی سے چراغ کی بتی زیادہ کرنے پر جھگڑ رہے تھے۔ میں نے اس حالت کو دیکھکر اندازہ کر لیا۔ جو ذرا بھر تیل زائد جلنا گوارا نہیں کر سکتا وہ سائل کو کچھ دینا کب گوارا کر سکتا ہے۔ حضوؐر صحابی سے واقف تھے۔ آپنے دوبارہ جانے کیلئے فرمایا۔ آخر سائل صحابی کے مکان پر جا کر انسے ملے اور حضوؐر کا پیغام دیا۔ انہوں نے ایک تھیلی دینار سے بھری دیدی۔ سائل کیلئے یہ مقام تعجب تھا۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کل تو آپ ذرا بھر تیل کیلئے اہلیہ سے جھگڑ رہے تھے۔ اور آج آپ نے ایک تھیلی دیناروں کی کیسے دینے کی جرأت کی صحابی نے جواب دیا۔ ہمیں کم تیل جلانے سے اپنی ضرورت پوری ہوتی تھی۔ باقی زائد خرچ فطرت کے خلاف ہے۔ یہ سارا مال کسی وقت قوم کیلئے وقف ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں قوم (مسلمان) کا حق بھی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں زکوٰۃ کے ایثار نے انکی اجتماعی زندگی میں ایک طرف دولت سے لاتعلقی اور دوسری طرف غربت و افلاس کو دور کر کے ہر شخص کیلئے سامان زندگی کا حصول آسان کر دیا۔ اکثر ممالک کے عمال (امیر یا گورنر) باوجود کثیر رقم تنخواہ پانے کے اکثر اوقات فاقہ سے گزارتے تھے اور اپنی تمام تنخواہ غربا و مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ایسا ہی ایک واقعہ ہے۔ کہ ایک گورنر نے ایک سال تمام سال کی سالم زکوٰۃ کی رقم دارالخلافت میں بھیجدی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے فوراً اس گورنر سے دریافت کیا کہ زکوٰۃ کی سالم رقم کیوں بھیجی گئی کیا غربا کی ضرورت سے کوتاہی تو نہیں برتی گئی۔ انہوں نے واپس جواب دیا کہ اب اس شہر میں کیا مسلم کیا غیر مسلم کوئی ایسا شخص نہیں جو زکوٰۃ لینے والا ہو۔ ہر شخص خود اپنی ضروریات کا اب کفیل ہو چکا ہے۔ اسلئے زکوٰۃ نہیں لیتے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے خصوصی طور تحقیقات کرائی اور واقعہ بالکل ایسا ہی تھا۔

اور آزادی کھو بیٹھتا ہو۔ دوسری طرف کائنات فطرت کے منضبط نظام کے تحت دنیا پر فطری تباہی۔ سیلاب۔ طاعون۔ طوفان پیدا ہو کر غیر فطری مواد فنا ہو جاتا ہے۔

اسلام نے فطری طور پر انسانی فلاح و بہبودی کا ایک خصوصی طریقہ اختیار کیا۔ کہ انسانی قلوب کا تزکیہ کرایا جہاں سے ان تمام امراض کا وجود پیدا ہوتا ہے۔ اس نے احکام (دین) کی صورت میں ایسے اصول پیش کئے۔ جو بنیادی طور پر انسان کی باطنی اصلاح کرتے ہیں۔ باطنی اصلاح سے ایک تو مقصد حقیقی حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے خود بخود نظام کائنات میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلئے پانچ احکام دین میں جہاں زکوٰۃ ایک جز کی حیثیت سے ایک حکم ہے۔ وہاں باقی چار احکام اس حکم کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ یعنی اگر ایک شخص کلمہ۔ نماز پر عامل نہیں تو وہ زکوٰۃ کا عامل ہونے سے بھی مکمل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ایسا شخص زکوٰۃ کا عامل بھی نہیں رہ سکتا۔ یہ حکم انسان کو مومن کی صورت میں پورا کرنا ہے۔ اگر مومن نہیں۔ تو اسکا ہر جزوی عمل نفع بخش ثابت نہیں ہوسکتا۔ اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں ہر حکم اکٹھے نہیں پیش کیا۔ بلکہ انسان کی ابتدائی اصلاح کیلئے حسب ضرورت پے در پے احکام بھیجے۔ پہلے کلمہ۔ پھر نماز۔ پھر روزہ۔ جب ان احکام سے بتدریج انسان کی بنیادی کمزوریوں کی اصلاح ہوتی گئی۔ انسان کی اصلاح کے ساتھ اسکی دنیوی زندگی بھی سدھرتی گئی اور اب ضرورت اس چیز کی تھی۔ کہ دنیوی ماحول کو مستقل صورت میں خالص بنایا جائے۔ دنیوی نظام میں حصول دولت ہی ایک ایسی شے ہے جو انسان میں لذت ہوس۔ خود غرضی پیدا کرتی ہے۔ جس سے قوموں میں فسادات رونما ہوتے ہیں۔ اسکے لئے زکوٰۃ کا حکم دیا گیا۔ تاکہ ایک اسلامی ماحول میں دوبارہ ماحول خراب ہونے کا احتمال نہ رہے۔

اسلامی دور میں مسلمانوں کی اجتماعیت۔ شہنشاہیت یا حکومت واقتدار کی غرض سے نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ اجماع (جماعت بندی) پیغمبر کی قوتِ عمل اور احکام الٰہی کی پابندی کا فطری نتیجہ تھا۔ کہ ہر فرد ایک ہی نظریہ اور کردار کا حامل ہو کر ایک جماعت کی صورت اختیار کر گئی۔ اور احکام الٰہی کی پابندی نے ایک فطری قانون کی صورت اختیار کر لی۔ جس میں ایک سازگار۔

خالص ماحول کا وجود قائم ہوا۔اس سازگار ماحول کا لازمی اثر یہ تھا۔کہ ہر شخص صرف فطری خوف (تقویٰ) کے اثر سے۔احکام کا پابند رہا۔یہی خوف۔یہی پابندی۔ظاہری طور۔ظاہری قانون کی صورت اختیار کر گیا۔لیکن جب تک انسان کے وجود کو کسی قانون کی سزا سے اذیت کا احساس نہ ہو۔انسان خلاف ورزی کرنے سے محتاط نہیں رہ سکتا۔اسلئے اسلامی شریعت نے باطنی خوف کے ساتھ ظاہر ماحول کی اصلاح کیلئے ظاہری چند سزائیں مقرر کرلیں تاکہ انسان کیلئے برائی کی طرف رجوع کرنے کا کوئی موقع باقی نہ رہ سکے۔اور جب اسلامی اجتماعیت اپنی پابندی میں وسیع ہوتی گئی۔تو لازمی طور اسے خود بخود اقتدار حاصل ہوا۔ایسے اقتدار کو (جو فلاح انسانی کیلئے سودمند ثابت ہو) قائم رکھنے کیلئے ہر وہ ذریعہ اختیار کرنا ضروری تھا۔جو ایک طرف ماحول کو محفوظ رکھتا اور دوسری طرف باطل قوتوں کیلئے Defence (قوت مقابلہ) کا کام دے سکتا۔یہ ذرائع کوئی اختراعی نہ تھے۔بلکہ احکام الٰہی ہی تھے جن احکام میں ایک مکمل نظام اور قانون کا ضابطہ موجود تھا۔

اس بیان سے غرض صرف یہ ہے۔کہ اسلام نے ایک خوبصورت ترتیب کے ساتھ صرف الٰہی احکام کا اجراٗ کیا۔تاکہ انسان کے مقصد زندگی کی تکمیل ہو سکے۔یہ الٰہی کلام قرآن (کتاب) سے موسوم ہے۔اور اسکا ہر حکم ایک خصوصیت کا حامل ہے۔کلمہ۔نماز۔روزہ اور زکوٰۃ بھی انہیں خصوصیات سے ہیں۔الغرض زکوٰۃ کا حکم ایک مومن کو اسلئے دیا گیا ہے۔تاکہ فطری نظام میں زائد حصول اور خواہش نفس کے تحت جو خلل واقع ہونے والا ہو اس سے انسان محفوظ رہ سکے۔اس فطری حکم کے تحت ایک شخص اپنی قوت سے زائد حاصل کر کے اپنی جائداد کا چالیسواں حصہ ادا کر کے فطری قانون کی مطابقت میں آجاتا ہے۔جبکہ یہ زکوٰۃ باقی مخلوق کی اصلاح کیلئے کافی ہوسکتی ہے۔اور ہر شخص اس قومی فنڈ سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرسکتا ہے۔اب یہ چیز اسلامی اقتدار میں قانون کی صورت اختیار کرگئی۔کہ وہ شخص جو اسلامی وجود کا ایک جز ہے۔زکوٰۃ کی عدم ادائیگی پر اس سے بجبر زکوٰۃ حاصل کی جائے تاکہ اسلامی معاشرہ میں انتشار نہ پیدا ہو۔چنانچہ خلیفہ اول نے اپنی خلافت کی ابتداٗ میں زکوٰۃ کی ادائیگی میں خصوصی حکم صادر فرمایا کہ میری خلافت میں کوئی شخص زکوٰۃ

دینے سے کوتاہی کرے۔تو میں اس سے جنگ لڑونگا۔اسکا مطلب یہ تھا کہ بقول آپکے تب تک میں اپنی ملازمت (خلافت کی انجام دہی) میں مکمل نہیں جب تک کہ میں ظالم سے مظلوم کا حق پورا نہ کراؤں۔گویا کہ آپکا نظریہ یہی تھا۔کہ کائنات میں ہر انسان مساوی حق رکھتا ہے۔زکوٰۃ دوسروں کا حق ہے۔جو ہم نے حقدار کو دینا ہے۔الغرض اسلام نے خصوصیت کے ساتھ مسلمان کیلئے زکوٰۃ فرض کردی۔یہ زکوٰۃ بے شمار خصوصیات کی حامل ہے۔

پانچواں حکم (اصول) حج ہے۔اسلامی شریعت میں حج مکہ معظمہ میں بیت اللہ (کعبہ) سے متعلق ہے۔یعنی ہر سال تمام عالم کے اطراف سے مسلمان بیت اللہ (مکہ) میں جمع ہوجاتے ہیں۔اور ہر شخص خواہ وہ مشرق کا ہو یا مغرب کا شمال کا ہو یا جنوب کا حج کرنے کیلئے ایک ہی نیت ایک ہی نظریہ لیکر آتا ہے۔کہ بیت اللہ میں پہنچکر اسلام کے مقرر کردہ مناسک (یعنی حج ادا کرنے کے طریق) ادا کرے۔یہ رسم اسلام کے وقت سے نہیں۔بلکہ قدیم سے چلی آتی ہے۔اس حج کی ابتدا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی ہے دراصل ادائے حج بیت اللہ۔اللہ کے خالق ومعبود ہونے اور پیغمبر کے منجانب اللہ ہونے اور اللہ سے کلام (کتاب) حاصل ہونے کی ایک کھلی (ظاہر) نشانی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ (فرزند ابراہیمؑ) کو حکم دیا کہ ایک گھر (مکان) بناؤ چنانچہ قرآن خود اس واقعہ کو پیش کرتا ہے۔کہ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا یعنی جب بنایا ہم نے ایک گھر (کعبہ) کو لوگوں کے واسطے (بزرگی کے اعتبار سے) ثواب (نیکی) کی جگہ اور امن کی جگہ۔(اور حکم دیا لوگوں کو) کہ حضرت ابراہیمؑ کے (بنائے ہوئے) مقام کو نماز کی جگہ بناؤ (یعنی اسجگہ جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کا گھر بنا کر اسجگہ نماز قائم کی) وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۱۲۵) پھر عہد کیا ہم نے حضرت ابراہیم کی طرف (یعنی مقرر کیا اس طریق کو) کہ اس میرے گھر کو ہمیشہ امن وسلامتی اور بزرگی و

پاکیزگی کا مقام بناؤ۔اور مخصوص کرو(پاک کرو)طواف کرنے والوں۔اعتکاف[1]کرنے والوں۔ رکوع کرنے والوں۔اور سجود کرنے والوں کیلئے۔جس وقت مکہ میں بیت اللہ بنایا گیا اسوقت یہ جگہ بالکل ویران سنسان اور غیر آباد جگہ تھی۔لیکن بیت اللہ بنانے سے قبل ایک اور واقعہ یہاں پر پیش آیا۔کہ جہاں پر کعبہ(بیت اللہ)کی داغ بیل ڈالی گئی۔اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر میں رہتے تھے۔حضرت اسماعیلؑ بھی یہیں پیدا ہوئے اُنکی پیدائش پر اللہ کا حکم ہوا کہ حضرت اسماعیلؑ اور آپکی والدہ(ہاجرہؓ)کو مکہ میں چھوڑ دو۔یہ پیغمبر کی محبت اور تعمیل حکم کا ایک امتحان تھا۔چنانچہ حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہؓ کو بمعہ بچہ کےلیکر مکہ آئے اور ایک ریگستانی مقام پر تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔حضرت ہاجرہ و اسماعیلؑ کے پاس کھانے پینے کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔نہ ہی اس مقام پر کوئی ایسی شے تھی جس سے ایک وقت کا گزارہ بھی ہو سکے۔ریگستان ہونے کی وجہ سے یہاں شدت کی گرمی ہوتی تھی۔آخر فاقہ اور پیاس کی وجہ سے بچہ(حضرت اسماعیلؑ)تڑپنے لگے۔ایسی حالت کو دیکھکر حضرت ہاجرہؓ بھی پریشان ہوئیں۔اور اسی پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر پانی کی تلاش میں دوڑیں۔یہاں دو خشک پہاڑیاں بھی تھیں۔حضرت ہاجرہؓ پانی کی تلاش میں ان پہاڑیوں پر کئی بار دوڑ کر چڑھیں لیکن پانی کہیں نہ ملا۔آخر مایوس ہو کر بچہ کے پاس واپس آئیں۔تو بچہ کے پاس ایک چشمہ[2]ابلتا ہوا پایا۔طبیعت کو اطمینان ہوا۔اور پانی پیا۔اور اسی پانی پر چند دن

---

[1] اعتکاف سے مراد۔تنہائی اور خاموشی میں مراقبہ(یکسوئی Concentration)کرنا۔گزشتہ انبیاً(پیغمبر)میں عبادت کا یہ طریقہ تھا کہ وہ معبد میں ایک علیٰحدہ کمرے میں مراقبہ(یعنی یکسوئی و استغراق کے ساتھ اللہ کا تصور اپنے دل میں قائم کرنا)کیا کرتے تھے یہ انکی خصوصی عبادت ہوتی تھی۔اور جب حج کا حکم پیغمبر کو ہوتا تو وہ طواف(اردگرد چکر لگانا)اعتکاف۔رکوع و سجود کرتا چنانچہ یہودی عیسائی مذہب میں یہ طریق اب بھی موجود ہے۔

[2] چشمہ ایک معجزۂ پیغمبری تھا۔مکہ کی ہزار ہا سال مسلسل عظمت اور مکہ(بیت اللہ)سے متعلق واقعات اور حضرت اسماعیلؑ کی پیغمبرانہ خصوصیات جو رہتی دنیا تک عالمگیر حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔حضرت اسماعیل علیہ السلام کے منتخب پیغمبر ہونے کی ایک بین دلیل ہوسکتی ہے۔اسلئے حضرت اسماعیلؑ کے شیر خوارگی میں ایڑیاں رگڑنے سے پانی کا چشمہ ایک ریگستان میں جاری ہونا معجزاتِ پیغمبر سے تعلق رکھتا ہے۔

گزارے اتفاقاً یہاں سے تجارت کا ایک قافلہ گزر رہا تھا۔غیر متوقع طور ایک سنسان ویران ریگستان میں پانی کا چشمہ دیکھکر متعجب ہوئے۔کیونکہ قافلہ یہاں کے تمام مقامات سے واقف تھا۔ ان پر بھی ایک تنہا عورت اور معصوم بچہ کی موجودگی اور غیر متوقع طور پر پانی کا چشمہ ہونے سے حضرت ہاجرہؑ کی عظمت کا اثر پڑا چنانچہ قافلہ والوں نے ایک بزرگ خاتون سمجھکر آپکی خدمت کی اور آپکے لئے کافی عرصہ کا سامان خوراک مہیا کر دیا۔اور اسی طرح قافلہ والوں کا یہاں لازمی قیام مقرر ہوا۔اور رفتہ رفتہ پانی کی وجہ سے یہاں پر کچھ لوگ بھی آباد ہونے لگے قافلہ والوں کو اس مقام پر پانی ملنے کی وجہ سے آسانی ہوئی اور ہر قافلہ یہاں آکر رکنے لگا۔چونکہ اس زمانہ میں اکثر تجارت ہوا کرتی تھی۔اسلئے اکثر تجارتی قافلے ادھر ادھر پھرا کرتے۔گویا پانی کی وجہ سے یہ جگہ بھی قافلہ والوں کیلئے ایک پڑاؤ کی صورت اختیار کرگئی۔اسطرح یہاں آبادی کے نشان شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضرت اسماعیلؑ بھی عمر میں ترقی کرتے گئے۔چونکہ اس جگہ کی ابتداً حضرت ہاجرہ و اسماعیلؑ سے ہی ہوئی تھی اسلئے یہ مقام اور چشمہ حضرت اسماعیلؑ کی ہی ملکیت تصور کی جاتی تھی۔ لہذا انہیں ایسی صورت میں کسی ضرورت کی احتیاج نہ تھی جبکہ ہر قافلہ اور دیگر لوگ بھی اس چشمہ سے فیض یاب ہوتے تھے۔نیز حضرت ہاجرہ و اسماعیلؑ کی عظمت کا اثر بھی لوگوں پر طاری ہونا لازمی تھا۔جسکا نتیجہ یہ لازمی تھا کہ حضرت اسماعیلؑ کی حیثیت ایک سردار کی سی ہو۔اور ہو کیوں نہ جبکہ حضرت اسماعیلؑ ایک اولوالعزم پیغمبر کے فرزند تھے۔چنانچہ عرصہ اتنا گزرا کہ حضرت اسماعیلؑ اب جوان ہو گئے تھے اسی اثنا میں حضرت ابراہیمؑ (بحکم خداوندی) مکہ میں آئے تو یہاں پر حضرت ہاجرہ و اسماعیلؑ کو بخیر و عافیت پایا۔جگہ کی شادابی پسند آئی اور آپنے بھی اسی جگہ کو اپنا مستقر (رہنے کی جگہ) بنایا۔اور اب ایک کنبہ کی صورت میں یہ مقدس خاندان بسر کرنے لگا۔چند عرصہ اطمینان سے بسر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر پر ایک اور آزمائش کا وقت آیا۔حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے خواب کی حالت میں حکم دیا کہ حضرت اسماعیلؑ کو میری خاطر قربان[1] (ذبح) کرو چنانچہ

---

[1] قربانی کا طریق ابتدائے آدم سے ہی جاری تھا۔چنانچہ اسکی ابتداً حضرت آدمؑ کی اولاد (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت ابراہیمؑ ایک پہاڑ پر حضرت اسماعیلؑ کو لے گئے اور ذبح کرنے کی کوشش کی لیکن یہ چونکہ آزمائش تھی اور اللہ کو اپنی خوشنودی کیلئے انسانی قربانی لینی منظور نہ تھی اسلئے حضرت ابراہیمؑ کو بتا دیا کہ ہم نے تمہارا کردار دیکھنا تھا۔ سو اس میں تم کامیاب ہوئے چنانچہ قرآن میں اسکا ذکر بھی موجود ہے۔ کہ وَاِذِابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ط۔ (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۱۲۴) اور اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کا آزمائش میں ڈالکر امتحان لیا پس اسنے ان دونوں آزمائشوں کو پورا کر دیا۔ ان آزمائشوں کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی کا پورا صلہ دیا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ۔ اسحاق و اسماعیلؑ کو ظاہری باطنی سر بلندی عطا کی۔ ایک طرف حضرت ابراہیمؑ کی اولاد سے ہی دنیا کے (حضرت ابراہیمؑ کے بعد) تمام پیغمبر بنائے۔ اور اسی قوم بنی اسرائیل (حضرت اسحاقؑ کی اولاد) کو ہر زمانہ میں ہدایت و سر بلندی عطا کی دوسری طرف آبادی کے اکثر حصوں پر انہیں ہی کی حکومت رہی اور یہ فضیلت ابھی تک بدستور جاری ہے۔ اور آج کی بنی اسرائیل قوم (اقوام مغرب) اگرچہ ہدایت سے خالی ہے۔ لیکن دنیا پر انہیں کی حکومت جاری ہے۔ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ○۔ (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۱۲۲) اے اسرائیل کے بیٹو یاد کرو اللہ کی نعمتیں جو موسیٰ عیسیٰ اور دیگر پیغمبروں کے زمانہ میں تمہاری قوموں کو میں نے عطا کیں اور تمہیں ہمیشہ میں نے بزرگی دی تمام زمانوں میں تمام لوگوں پر۔ پھر کیا وجہ ہے کہ باوجود اسقدر کھلی یاداشتوں کے تم اللہ اور اسکے رسول پر یقین نہیں رکھتے۔

حضرت ابراہیمؑ کی انتہائی فرمانبرداری پر اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ دیا۔ کہ اب تمہارا طریق ہی مُسند کر کے تمام لوگوں کیلئے یہی طریق اخذ کرونگا کہ ہر شخص اسی طریق کی تقلید کرے اور ہر پیغمبر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ہابیل و قابیل سے ہوئی۔ یعنی ان دونوں کو قربانی کا حکم ہوا تھا۔ اور یہ طریق اس زمانہ میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی طریق کے تحت حضرت ابراہیمؑ کو قربانی کا حکم ہوا تو انہیں سب سے عزیز شے حضرت اسماعیلؑ ہی محسوس ہوئے چنانچہ اس کی قربانی دی۔

اسی دین کی اشاعت کرے وَعَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ اللہ نے یہ عہد کیا کہ اس گھر کو تم پاک کرو میں اسکو مخلوق عالم کا مرجع بنا کر تمہارا نام ہمیشہ زندہ رکھونگا۔ اور تمہارے کردار کی ہر شخص سے تجدید وتقلید کراؤ نگا۔ اور ہر شخص کیلئے یہ فرض کر دونگا کہ خواہ وہ ہزاروں میل دور کسی جہت میں ہو تب تک میری خوشنودی حاصل نہ ہو گی جب تک تم حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں اپنا روپیہ خرچ کر کے حضرت ہاجرہ و اسماعیلؑ کی طرح اپنے گھر بار۔ بال بچوں کو خیر باد کر کے اس گھر میں طریق ابراہیمی پر طواف رکوع وسجود نہ کرو۔ تو حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ کی دیواریں بناتے ہوئے ایک خواہش کا بھی اظہار کر دیا۔ جو آج سے ہزاروں سال قبل کا واقعہ ہے۔ اور آج تک بدستور وہ خواہش برابر پوری ہو رہی ہے۔ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَیْنَا ج اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ یُزَكِّیْهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ع (پارہ اول سورۃ ۲ آیت ۱۲۷ تا ۱۲۹) اور جس وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو انہوں نے دعا کی) اے رب ہمارے تو ہماری قبول کر تحقیق تو (بدرجہ اتم) سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو اپنا مطیع وفرنبردار رکھ اور ہماری ذریت (آئندہ آنے والی نسلوں) کو بھی ایک فرمانبردار جماعت (امت) اپنی بنا اور سکھا ہمکو ہماری عبدیت کے طریقے (تا کہ ہم انتہائی طریقہ سے اپنی عبدیت کا اظہار کریں) اور ہماری طرف توجہ کر۔ تحقیق تو پھر آنے والا (ہر شخص کے طرف متوجہ ہونے والا) بخشش کرنے والا ہے۔ اے رب ہمارے (ہماری اس ذریت میں) اٹھا انمیں سے ایک رسول انہیں میں سے کہ وہ پڑھے ان پر تیری آیتیں (یعنی تیرا کلام انہیں سنائے) اور (تیری) کتاب کا علم بھی بتائے اور تیری کائنات کے اسرار (حکمۃ) بھی بتائے اور انکے روحانی جسمانی تزکیہ کر کے انہیں مشاہدہ تک

پہنچائے۔ تحقیق تو غالب اور حکمت والا ہے (تو ہر شے کرسکتا ہے) یہ ہے وہ قرآنی واقعہ جسکی اطلاع اللہ نے اپنے پیغمبر محمد رسول اللہؐ کے ذریعہ کائنات کی مخلوق کو دی۔ اور یہ واقعہ ایک کھلی نشانی۔ کھلی دلیل کے طور پر دہرایا جو نشانی ہمیشہ کیلئے قائم ہے۔ اور ہمیشہ کیلئے قائم رہیگی۔ یہی نشانی ایک طالب حقیقت کیلئے (اسکی تقلید کرنا) فرض کی گئی۔

تواریخ سے کسی شخص کو انکار نہیں ہوسکتا۔ ہو کیونکر سکتا ہے۔ جب کہ کائنات خود ایک تواریخ کی صورت میں گزشتہ واقعات کو ہمیشہ دہراتی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ کی کوئی تحریر تواریخ پائی نہیں جاتی۔ لیکن ہر دور میں زمانہ خود ان واقعات کو دہراتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آجتک یہ واقعہ ابراہیمی ایک ہیئت میں دنیا کے سامنے پیش ہورہا ہے۔ اگر یہ واقعہ درحقیقت نہ ہوتا۔ تو دنیا اس واقعہ کو بھلا چکی ہوتی۔ اور آج نہ حضرت ابراہیمؑ کا نام ہوتا نہ اس واقعہ کا کوئی نشان موجود ہوتا۔ ہمارے سامنے قرآن اس واقعہ کو پیش کرتا ہے۔ لیکن کسی معترض یا انکار کرنے والے کیلئے قرآن کے واقعات کو ماننا اسوقت تک نہیں ہوسکتا ہے۔ جب تک کہ وہ پیغمبر اور قرآن کی عظمت وصداقت تسلیم نہ کرے۔ سو قرآن کی صداقت کیلئے گزشتہ کافی دلائل پیش کئے جاچکے ہیں۔ ان دلائل کے بعد جب انسان قرآن کی صداقت کا قائل ہو۔ تو اسکے لئے اس قرآنی تواریخ کا تسلیم کرنا بالکل آسان ہوسکتا ہے۔ اور یہ واقعہ حج کے رکن کی تشریح ہے۔ سو اس واقعہ کی نسبت قرآنی صداقت سے نہیں بلکہ قرآنی صداقت کی تسلیم کے بعد حج کی صداقت تسلیم کرنا ہے۔ اسلئے یہ واقعہ قرآن کے تسلیم کرنے والوں کیلئے ایک دلیل ہے۔ علاوہ اسکے ان واقعات میں جو ظاہری نشان پائے جاتے ہیں۔ اصولی طور پر مطالعہ کرنے سے بھی ایک شخص قرآن کی صداقت کا قائل ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ انسان خودغرضی کے بغیر ایک حقیقت کا کھوج لگانے والا ہو۔ (اسلامی شریعت میں حج کی ترکیب مسلمانوں کیلئے مقرر کی گئی ہے۔ کہ وہ ایک جماعت کی صورت میں۔ ایک لباس ایک نظریہ ایک ہی حالت میں۔ مناسک حج ادا کریں۔ جن میں خصوصی مناسک طواف۔ نماز۔ سعی وغیرہ ہیں)

حضرت ابراہیمؑ کے بعد تولیت کعبہ (انتظام اور رکھوالی) حضرت اسماعیلؑ کے سپرد ہوئی

اور آپ نے حسب طریق پیغمبر اپنے مناسک طواف۔ رکوع وسجود ادا کئے اسکے ساتھ چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس خاندان کے دو خصوصی کردار پسند آ چکے تھے اسلئے وہ بھی ان مناسک میں (بحکم خداوندی) شامل کئے گئے۔ ایک اسماعیل علیہ السلام کی یادگار قربانی (اسکے عوض میں ایک جانور قربانی دینا مقرر کیا گیا) چونکہ کعبہ کے پاس ایک آبادی تکمیل پا چکی تھی اسلئے یہ تمام لوگ اسی دین ابراہیمؑ کے پیرو ہو چکے تھے اسلئے ہر سال اسی موقع پر حضرت اسماعیلؑ اور باقی لوگ حضرت اسماعیلؑ کی معیت میں حج کرنے لگے۔ اسکے علاوہ دوسری یادگار اسماعیلی حضرت ہاجرہؑ کا عالم پریشانی میں ادھر ادھر پانی کی تلاش میں دوڑنا اور پہاڑیوں[1] پر دوڑ کر پانی کی تلاش میں چڑھنا اترنا۔ یہ ادا بھی اللہ تعالیٰ کو پسند تھی۔ کہ ایک ضعیف عورت نے صرف ایک خالق حقیقی کے حکم کی تعمیل پر ایک غیر آباد ایک غیر ذی ذرع (ویران) جگہ پر بغیر آب ودانہ ٹھہر کر صرف اسکی تابعداری میں صرف اسی کی یاد۔ اور اسکی قوت وطاقتِ لازوال پر بھروسہ کر کے بے فکر ہو کر قیام پر آمادگی اور مستعدی کا اظہار کیا۔ لہذا ـــــ یہ یادگار بھی بطور عبادت ہر شخص کیلئے مقرر کی گئی جسے ''سَعِیُ'' کہتے ہیں۔ اسکے علاوہ ایک اور یادگار بھی ان مناسک میں شمار ہے۔ وہ ان تاثرات کا اظہار اللہ نے کرنا تھا۔ جو ایک عمر رسید والد کیلئے جبکہ وہ اولاد سے قطعاً ناامید ہو۔ پھر اچانک اسے ایک فرزند ملے اور وہی اسکی عمر کا آخری سہارا۔ آخری نکتہ ہو۔ پھر وہی شخص جانتا ہے۔ کہ ایسی حالت میں ایسے فرزند کی محبت انسان کے دل میں کتنی جاگزیں ہو سکتی ہے۔ ایک شخص ایسے فرزند کی زندگی کیلئے اپنی جان کی قیمت بہت کم سمجھ سکتا ہے۔ ایسے عزیز فرزند کیلئے جب قربانی کا حکم ہے۔ تو وہ ایک پیغمبر ہی ہو سکتا ہے۔ جو اپنے خالق کے سامنے اپنی انتہائی عبدیت کے مظاہر میں ایسی عزیز شے قربان کرے۔ لیکن انسان میں بشریت کا مادّہ بھی تو ہے۔ دل کے ساتھ حافظہ وتعقل بھی کام کرتا ہے۔ انکے مادّی اثرات اگرچہ ان پر قابو ہی کیوں نہ ہو لیکن انکے اثرات کا ابھرنا لازمی ہے ایسے وقت میں اس نازک ترین مرحلہ

---

[1] انہیں صفا ومروہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

پر جسے ''شہادت گہ عشق''۔یا ''اقرار وانکار کا دھارا'' کہتے ہیں جو خیالات انسان کے حافظہ میں اٹھتے ہیں۔ضرور وہ اس امر کی تحریک دینگے کہ ایسی عزیز شے جس پر انسان کی تمام امیدیں۔تمام راحت واطمینان وابستہ ہو کیسے اپنے ہاتھوں ذبح کرنا گوارا کر سکتا ہے۔انسانی شرافت نے عبدیت کی خاصیت میں قربانی پر آمادہ کر دیا۔اور مادیت اس قربانی میں تذبذب پیدا کرتی ہے۔انسانی شرافت آج کے دن خوش تھی آج محبوب کی خوشنودی حاصل ہو گی لیکن شیطان رو رہا تھا۔کہ دنیا میں ایک نئے روحانی باب کا دروازہ کھل رہا ہے۔جس دروازہ سے میرا داخلہ ناممکن ہو گا۔شیطان نے کوشش کی کہ حضرت ابراہیمؑ کو قربانی سے روکوں۔کہیں حضرت ابراہیمؑ پر اثر ڈالا کہ تمہارے پاس پاسبان عقل ہے کیوں وہم میں مبتلا ہو رہے ہو! لیکن قلب کی نورانیت نے اسے پتھر مار کر بھگا دیا۔ کہیں اسماعیلؑ کو انکار پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن آپ نے بھی پتھر مار کر بھگا دیا۔حضرت ہاجرہؑ تو مجسم صبر و رضا کا پیکر تھیں۔یہاں عشق کے دیوانے کب کسی کی سنتے ہیں۔ چنانچہ بطور یادگار مناسک حج میں رمی جمار (یعنی تین جمروں ــــ جمرۂ اولیٰ۔جمرۂ وسطیٰ۔جمرۂ عقبہ پر کنکریاں مارنا) ایک واجب کی حیثیت سے شامل ہے۔

الغرض ان سب یادگاروں کے ساتھ حضرت اسماعیلؑ سے ہی سالانہ حج مقرر ہوا۔اور یہ طریق برابر حضرت اسماعیلؑ اور دیگر مکہ کی آبادی کے لوگوں میں جاری رہا۔حضرت اسماعیلؑ نے پیغمبر کی حیثیت سے بھی عرب۔حجاز۔یمن۔حضر موت تک تبلیغی سلسلہ جاری رکھا۔آپکی بارہ اولادیں ہوئیں ہر ایک ایک قوم کا سردار رہا۔اور عرب میں انکے نام کی بستیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور ضروری تھا کہ یہ تمام لوگ ہر سال اس واقعہ کی یادگار کو حج کی صورت میں قائم کرتے رہیں۔

حضرت اسماعیلؑ کی شادی قبیلہ بنو جرہم کے سردار مضاض نامی کی بیٹی سے ہوئی تھی بنو جرہم عرب کا قدیم حکمران طبقہ تھا۔قریبی سسرال کا تعلق ہونے سے حضرت اسماعیلؑ کے بعد کافی عرصہ تولیت کعبہ انہیں کے ذمہ رہی بنو جرہم کے بعد عمالقہ کا مکہ پر قبضہ ہوا اور کعبہ کا انتظام بھی انہیں کے سپرد ہوا۔کچھ عرصہ بعد بنو جرہم نے دوبارہ اقتدار حاصل کر کے مکہ پر قبضہ کیا۔لیکن انہوں نے

اپنے اقتدار کے ساتھ ظلم و تشدّد شروع کیا۔تو عمرو بن الحیٰ خزاعی نے جو بنو جرہم کا ہمشیرہ زادہ تھا۔نے بنو جرہم کو مکہ سے نکالدیا۔اور خود مکہ پر قابض ہوکر تولیت کعبہ اپنے ذمہ کرلی۔لیکن خزاعی نے ۲۰۷ سنہ عیسوی میں کعبہ میں بت پرستی کو بھی رائج کر دیا۔اس سے قبل ہر قبیلہ اور ہر فرد دین ابراہیمی پر ہی قائم رہا۔اسطرح بیت المقدس میں حضرت اسحاقؑ کی بنی اسرائیلی اولاد میں سے پیغمبر ہوتے رہے۔جنکا زیادہ تر تعلق شام کی طرف رہا۔اور مکہ میں صرف خاندان اسماعیل کی آبادی پھیلتی رہی۔خزاعی نے مصر و شام میں عمالقہ کو بت پرستی کرتے دیکھا۔کہ انہیں بتوں کے طفیل مرادیں پوری ہوتی ہیں۔اسلئے وہاں سے ایک بت لاکر خانہ کعبہ کے اوپر نصب کیا۔اس بت کا نام ھبل تھا اُسوقت سے کعبہ میں بتوں ۱ کی پرستش کا رواج ہوکر مختلف قسم کے بت خانہ کعبہ میں نصب کئے گئے۔جو بت آخر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت تک برابر رہے۔انکی اولاد بنوخزاعہ کہلاتی تھی۔

بنوخزاعہ سے تولیت کعبہ قُصَیٰ کے ہاتھ آئی وہ اسطرح کہ بنوخزاعہ کا سردار حلیل نامی مکہ کا سردار تھا حلیل نے اپنی بیٹی مسماۃ حُبَّـیٰ قُصَیٰ سے بیاہ دی اور جہیز میں تولیت بیت اللہ کا حق بیٹی کو عطا کیا اور ابو غبشان کو بیٹی کا وکیل مقرر کر دیا۔حلیل کے مرجانے کے بعد ابوغبشان نے شراب کے مشکیزہ کے عوض قُصَی کو حقِ وکالت فروخت کر دیا اس طرح قُصَی کا قبضہ ۲ بیت اللہ پر ہوا۔قُصَی

---

۱ یہ پرستش انحراف کے باعث نہ تھی۔بلکہ یہ سب قبیلے دین ابراہیم و اسماعیلؑ پر ہی قائم تھے۔البتہ طویل زمانہ گزرنے کی وجہ سے لوگوں کے عقائد میں کمزوری پیدا ہوگئی تھی ان میں دین کے تقدس کا احساس کم ہوکر بہت سے رسمی عقائد پیدا ہوگئے تھے یہی وجہ تھی کہ خزاعی نے رسمی طور بت پرستی کا ایک رسمی عقیدہ پیدا کیا۔

۲ اوپر بیان ہو چکا ہے۔کہ اس وقت لوگوں میں عقائد کی کمزوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔لیکن ہر شخص بیت اللہ کے تقدس کا قائل تھا اور یہاں نذر و نیاز چڑھاوے کثرت سے ہوتے تھے۔جسوجہ سے بیت اللہ کے نام پر بے شمار روپیہ جمع تھا۔ایک طرف کثرت زر دوسری طرف بیت اللہ کی عظمت یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں کہ ہر سردار مکہ کے قبضہ کے ساتھ بیت اللہ کی تولیت کا بھی خواہشمند ہوتا تھا۔اور بیت اللہ کی تولیت کچھ عزت و عظمت کیلئے اور کچھ مال وزر کو اپنی تحویل میں لینے کیلئے ہر شخص اپنے قبضہ میں لینا ایک خصوصی فخر سمجھتا تھا۔اسکے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے قبضہ کو بنوخزاعہ کے باقی قبیلوں نے تسلیم نہ کیا۔ آخر قُصَی اور بنوخزاعہ میں تولیت کعبہ کے حصول پر جنگ چھڑ گئی۔ طویل عرصہ جنگ رہنے کے باوجود کوئی فریق کامیاب نہ ہوسکا۔ آخر یعمر بن عوف کو ثالث مقرر کیا گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ بنوخزاعہ کو اپنے مارے ہوئے آدمیوں کا خون بہا ادا کر دیا جائے بنوخزاعہ شہر کی حکومت چھوڑ کر مکہ سے باہر جائیں مکہ اور کعبہ پر قُصَی کا قبضہ بحال رہے۔ اسطرح قُصَی کا مکہ اور بیت اللہ پر پورا قبضہ ہوگیا۔ قُصَی فَھر بن مالک کا چھٹی پشت میں پوتا تھا۔ فھر اور اسکی اولاد عرب کے تمام قبیلوں میں بہادر اور طاقتور قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ اور خود فہر بھی ایک بہترین شہسوار۔ تلوار کا دھنی۔ نڈر بہادر تھا جس طرف جاتا۔ لوگ اسکی ہیبت سے خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتے جسوجہ سے اسے قریش کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ قریش۔ عربی زبان میں ویل مچھلی کو کہا جاتا تھا۔ ویل مچھلی سمندری جانوروں میں سے مہیب اور عظیم الجثہ تصور کی جاتی تھی اسلئے فہر کی ہیبت کی وجہ سے اسے بھی قریش کے نام سے پکارا جاتا۔ اور آئندہ فہر کی اولاد کو بھی قریش قبیلہ سے خطاب کیا گیا۔ قُصَی نے مکہ پر قبضہ ہونے کے بعد اپنے قبیلہ کے تمام افراد کو جمع کر کے مکہ میں بسایا۔ اسلئے قُصَی کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ تک قریش کا ہی قبضہ مکہ پر رہا اور تولیت بیت اللہ بھی انہیں کے سپرد رہی۔ قُصَی کے تین بیٹے ہوئے (۱) عبد مناف (مناۃ کا بندہ یہ ایک بت تھا) (۲) عبد الدار (۳) عبد العزیٰ (عزیٰ بھی کعبہ کا ایک بت تھا)۔ عبد مناف کا نسب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جاملتا ہے۔ اور عبد الدار سے حضرت عثمانؓ کا نسب جاملتا ہے۔ قُصَی کے بعد تولیت کعبہ عبد الدار کے سپرد ہوئی اور آئندہ بھی اسی خاندان کو یہ تولیت ملی اور کعبہ کا کلید بردار آخر تک یہی خاندان رہا۔ فتح مکہ کے وقت جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کعبہ کو بتوں سے پاک کیا تو تولیت کعبہ کی دوبارہ سپردگی اسی خاندان کو مستقل طور پر تفویض کی گئی۔ اسوقت

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) حصول کیلئے ہر ممکن کوشش کیجاتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ مکہ پر قبضہ کرنے کی تحریک بیت اللہ کی تولیت ہی ہوتی تھی۔

بیت اللہ کی تحویل میں اسقدر مال و دولت جمع تھا۔ جسکا کچھ شمار نہ ہوسکتا تھا کیونکہ ہزاروں سال سے بیت اللہ میں چڑھاوے چڑھتے رہے اور اس دولت کو کسی نے چھوا بھی نہ تھا اسلئے کثیر تعداد میں دولت جمع ہونی لازمی تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ تمام مال و دولت اسی طرح جمع رہنے دیا۔ اور اسکا انتظام قریش کو ہی سپرد کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے حضور علیہ السلام کے زمانہ تک اولاد اسماعیلی میں اگرچہ بت پرستی بھی رائج ہو چکی تھی لیکن ہر زمانہ میں حج کے مناسک (طریق) کو طریق ابراہیمی و اسماعیلی پر ہی ادا کیا گیا۔ چنانچہ حضورؐ کی نبوت سے پیشتر بھی حج و عمرہ بدستور کیا جاتا تھا۔ فتح مکہ سے ایک سال پہلے جسوقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بمعہ آپکے رفقاؑ کے مکہ سے نکالکر مدینہ کی ہجرت پر مجبور کیا تھا۔ آپ بیت اللہ میں حج کیلئے بمعہ اپنے رفقاؑ (امت) کے مکہ تشریف لائے لیکن کفار قریش نے آپکو حج کی اجازت نہ دی اور آپ واپس مدینہ تشریف لائے۔ اور پھر دوسرے سال مکہ فتح ہوا۔ مکہ کی فتح کے بعد مسلمانوں کا کلی اقتدار ہو چکا تھا اسلئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بمعہ اپنے رفقاؑ کے حج کو آئے اس عرصہ میں آپکو وحی الٰہی کے مطابق حج کے حقیقی مناسک (مناسک ابراہیمی) سے اطلاع دی گئی اور اسی قرآنی حکم کے مطابق حضورؐ کے بعد ہمیشہ کیلئے ایک ہی اسلامی طریق جاری ہے اور چودہ سو سال گزرنے کے بعد اگرچہ مسلمانوں میں بھی اکثر عقائد میں فروعی اختلاف اور جماعت بندیاں پیدا ہو چکی ہیں لیکن مناسک حج میں ایک ذرہ بھر فرق نہیں واقع ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ سے لیکر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مقدس تک اولاد اسماعیلی مکہ کے تمام اطراف میں وسعت کے ساتھ پھیلیں۔ اور ان میں بے شمار قبیلے بنے۔ ان قبیلوں میں آپس میں خونریز جنگیں بھی ہوئیں۔ لوگوں میں بت پرستی۔ اور غلط عقائد بھی پیدا ہوئے۔ دوسری طرف مصر و شام میں خاندان اسحاق و یعقوب میں کئی پیغمبر اسحاقؑ۔ یعقوبؑ۔ یوسفؑ۔ داؤدؑ۔ سلیمانؑ۔ موسیٰؑ۔ یحییٰؑ۔ زکریاؑ۔ عیسیٰؑ وغیرہ پیدا ہوئے۔ انکے دین بھی جاری ہوئے۔ بیت المقدس میں شریعت موسوی بھی اپنی انتہا کو پہنچی۔ کئی عظیم الشان سلطنتیں بھی اس دین میں قائم

ہوئیں۔لیکن جو دین ابراہیمؑ نے پیش کیا۔اور جو طریق حج حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پیش کیا۔باوجود طویل زمانہ کے بھی اس طریق میں خلل واقع نہ ہوسکا۔بنی اسرائیلی قوموں میں پیغمبروں نے دین الٰہی جاری کیا۔اور زمانہ میں پیغمبر اسکی تجدید بھی کرتے رہے۔لیکن اکثر زمانوں میں۔ ان ادیان (دین) میں ظالم حکمرانوں اور باطل پیروان مذاہب نے ان ادیان کی اصلی حالتوں کو اسقدر مسخ کیا۔کہ دین کی اصلی حالت یکسر نابود ہوگئی۔لیکن دین ابراہیمی اور اسکی یادگار کو زمانہ کا کوئی انقلاب زمانہ کی کوئی غلط روی نہ بدل سکی۔اسکی وجہ یہی ہے۔کہ دین ابراہیمی اللہ کا ایک خصوصی اور پسندیدہ دین تھا۔جو بنی اسحاق و بنی اسماعیل کیلئے مخصوص کیا گیا تھا۔چونکہ اس دین میں حضرت اسماعیلؑ کا خصوصی کردار شامل تھا۔اسلئے یہ دین اولاد اسماعیلؑ کا ہی ورثہ رہا اور اسی اولاد میں یہ دین برابر جاری رہا۔یہاں تک کہ آخر زمانہ میں اولاد اسماعیل سے ہی حضرت محمد رسول اللہؐ پیدا ہوئے اور آپ نے اس دین کی کلی طور تجدید کر کے اسقدر استحکام بخشا کہ اللہ نے خود اسکی تائید فرمائی۔کہ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (پارہ ۶ سورۃ ۵ آیت ۳) ہم نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔اور دین کی تمام نعمتیں آپ پر تمام کر دیں۔اور دین اسلام آپکے لئے پسند کیا۔یہ دین ابتداً سے انتہا تک محفوظ رہا۔اور کوئی انقلاب اس پر غالب نہ آسکا۔یہ استحکام اور یہ دوام اس امر کی بین دلیل ہے کہ جو دین (قانون) اسقدر دوام واستحکام حاصل کر کے ہمیشہ زندہ رہے۔وہ قانون خود اللہ کا ایجاد کردہ ہوتا ہے۔اور جس قانون میں دوام واستحکام قائم رہے۔وہ دین خود اس امر کی دلیل ہے۔کہ کائنات میں ایک نظام قائم ہے۔جسکا خالق خود اللہ ہے۔اور قوموں میں جو دین ایک مستقل و مستحکم ہیئت اختیار کر کے نظام کائنات سے مطابقت کرے۔وہ دین دین الٰہی ہوتا ہے اور جب دین قانون فطرت کے مطابق اپنے میں فطرت کی مطابقت کرانے کا مواد پاتا ہو۔تو اسکا مالک ضرور ایک خالق ہوتا ہے اور اسکا اجراً کرنے والا ضرور ایک برحق پیغمبر ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے۔کہ اللہ نے ابتداً سے ہی اپنے دین (قانون) کو ایک مستقل صورت

میں قائم کیا۔ جو حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ دنیا پر خصوصی طور ظاہر ہوا۔ حضرت ابراہیمؑ کو ابوالانبیاءً (پیغمبروں کا باپ) کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے تفکر کا ایک بہترین سبق انسان کو دیا۔ اور آپ نے احسن طریقہ پر اللہ کو پہچانا۔ چنانچہ قرآن خود اس امر کی شہادت دیتا ہے۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ج قَالَ هٰذَا رَبِّىْ ج فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّىْ ج فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِىْ رَبِّىْ لَاَ كُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَالشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّىْ هٰذَآ اَكْبَرُ ج فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○ اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ع (پارہ ۷ سورۃ ۶ آیت ۷۶ تا ۷۹) پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا آپ نے فرمایا کہ یہ میرا رب ہے۔ (یعنی آپ نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تمہارے زعم کے موافق یہ میرا اور تمہارا رب ہے) جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا۔ یہ میرا رب ہے۔ سو جب وہ غروب ہو گیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرتا۔ تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاتا۔ پھر جب آفتاب کو دیکھا چمکتا ہوا۔ تو فرمایا یہ میرا رب ہے۔ یہ تو سب سے بڑا ہے۔ سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا۔ اے قوم بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ میں اپنا رخ اسکی طرف کرتا ہوں جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو توحید کرنے والا ہو کر۔ اور نہیں میں شک کرنے والوں سے۔

یہ حضرت ابراہیمؑ کا انسانی حیثیت سے ابتداءِ قدم تھا جس میں آپ نے اپنے ابتدائی تعقل و شعور کی تکمیل پر ایک حقیقت پر تفکر کر کے ایک خدائے حقیقی کا تصور کیا۔ اور اس تصور کو اکمل طریقہ پر حضرت محمد رسول اللہؐ نے اپنے انتہائی مقام پر پہنچا کر محمد و احمد کا نام پایا۔ اور حضرت محمد رسول اللہؐ کے ورثہ میں ہی تقلید ابراہیمی تجدید ابراہیمی اور تکمیل ابراہیمی مقرر کی گئی چنانچہ اسی ذین کا یادگار عمل بھی حضرت محمد رسول اللہؐ کے ورثہ میں دیا گیا۔ کہ اسلامی شریعت محمدیؐ میں کتاب اللہ کے ذریعہ

کتاب کے پانچ خصوصی احکام میں ایک خصوصی جز حج کا ادا کرنا ایک فریضہ کے طور پر مقرر کیا گیا۔

حج بظاہر چند حرکات وسکنات کا مجموعہ ہے۔لیکن یہ حرکات وسکنات رسمی نہیں۔ بلکہ ایک مفکر اعظم کے تفکر کی یادگار ہے جس میں اللہ کا عرفان۔ انسانی عبودیت۔اور انسان کی یکسانیت و مساویت۔اور ایک عالمگیر نظام ایک فطری قانون کی مطابقت پائی جاتی ہے۔نماز۔روزہ۔زکوٰۃ انسان کی اصلاح نفس کرتا ہے۔اور اسکے قریبی ماحول میں ایک فطری خصوصیت پیدا کرتا ہے۔ لیکن حج انسان کو عالمگیر حیثیت سے۔پابند نظام کر کے۔حقیقت کا عرفان عطا کرتا ہے۔انسان جب دور مقام سے دولت سے مالا مال ہو کر اللہ کے گھر کی طرف رجوع کرتا ہے۔اسوقت دنیوی لحاظ سے وہ ہر طرح آسودہ ہوتا ہے۔مال وزر کی اسے افراط ہوتی ہے۔کیونکہ حج اسی شخص کیلئے فرض ہوتا ہے۔جو دنیوی لحاظ سے کلی طور ہر ضرورت پر غالب ہو۔اللہ کے گھر کی طرف رخ کرتے وقت اسکا نظریہ صرف بیت اللہ تک پہنچنے یا طواف کرنا ہی نہیں ہوتا ہے۔بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی تقلید میں وہ اپنی ہر عزیز شے کو خیر باد کہکر ایک مالک حقیقی کے حکم کی تعمیل کیلئے ہر عزیز شے کی محبت دل سے یکسر نکالدیتا ہے۔اور زبان سے پکارتا ہے۔ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ۔

ایسی حالت میں وہ اپنے معبود کے تصور میں ہر شے سے بیخبر ہو جاتا ہے۔پھر جب بیت اللہ کے قریب پہنچتا ہے۔تو وہ سب سے پہلے انسانی شرف اور انسانی مساویت کا ایک ہی جامہ پہنتا ہے۔اور ایسی حالت میں کسی امیر وغریب۔کسی اشتراکی۔کسی نیشنلسٹ کی تمیز نہیں رہتی اور انسان اس مقام کی طرف رجوع کرتا ہے۔جس مقام سے اسکی ابتدا ہوتی ہے۔نہ کوئی مغربی ہے نہ مشرقی۔نہ کوئی خاندانی ہے۔نہ کوئی ملکی ہے۔بلکہ ایک عالمگیر دین فطرت کا پابند بندہ ہوتا ہے۔جہاں اخوت ومساوات۔غیر خداؤں کے تسلط سے باہر ایک خدا کا غلام۔اسکے حکم کا عامل۔ اور اسکے برگزیدہ پیغمبر کا مقلد (تابعدار) بن کر ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔جہاں نفسانی خواہشات۔ یکسر ختم ہو کر مجسم نور کا پیکر بن جاتا ہے۔ایسی حالت میں جب انسان اسکا تصور کرے جب دنیا کی کوئی خواہش اسکے قلب وحافظہ میں نہیں آسکتی اسکے سوا اور کیا آسکتا ہے۔کہ اسکے قلب پر حقیقت کا

نور موجزن ہو جائے۔ یہ تو اس حکم کی حقیقت ہے۔ یہ علیٰحدہ بات ہے کہ ایسی حالت میں انسانی نفسی کمزوری اگر اسے اس مقام پر نہ پہنچنے دے تو یہ انسان کی ذاتی کمزوری اور اسکی اپنی ذمہ داری ہے اسکے باوجود۔ یہ رسم ایک حج کرنے والی کثیر جماعت پر پھر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ کہ مسلمان میں۔ مال کی خواہش۔ نفس پرستی۔ اور مادیت کے غلبہ سے ضرور نجات مل جاتی ہے۔ کیونکہ مسلمان ایسی حالت میں حج کیلئے نکلتا ہے۔ جب کہ یہ ان دنیوی مادیات سے گھرا ہوا ہوتا ہے حقیقی رنگ اگر اس پر اثر انداز نہ بھی ہو تب بھی انسان خواہ مخواہ ان مادیات سے باہر ہو جاتا ہے۔ جو اسکے لئے ایک غلط ماحول اور غلط راہ پیدا کرنے کے اسباب ہوتے ہیں ــــ جسکا اثر ضروری یہ ہوتا ہے۔ کہ انسان حج کے بعد ایسے تاثرات حاصل کرتا ہے۔ جو انسانی قلب میں ہمیشہ نیکی کی تحریک دیتے ہیں۔ اور انسان کو بار بار حقیقت کی طرف رجوع ہونے کی ترغیب ملتی ہے۔

ان پانچ احکامِ شرعی (کتابی) کے مجموعہ کو اَمْرَ (حکم) کہتے ہیں ان احکام کے علاوہ اور بھی احکام ہیں جن میں خصوصی طور۔ چوری۔ جھوٹ۔ شراب۔ زنا۔ کم تولنا۔ جوا کھیلنا۔ سود لینا وغیرہ احکام ہیں۔ جو روزمرہ معاملات دنیوی میں پائے جاتے ہیں۔ ان احکام کو نہی کہتے ہیں ان احکام میں ان امور میں ممانعت کی گئی ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے۔ کہ اس قسم کی خلاف ورزیاں انسان کے ماحول کو بگاڑ کر انسان کو نفس پرست خودغرض بنا کر بغاوت و انحراف پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ ایسے عادات انسانی پاکیزگی کو ختم کر کے انسان کو تنزل اور غلط روی کی طرف لے جاتے ہیں ۔ یہی وہ بداعمالیاں ہیں۔ جن کے اثرات سے انسان قوانین فطرت کی خلاف ورزی پر آمادہ ہو جاتا ہے اسکے علاوہ باقی اصول و قوانین جتنے بھی قرآن (کتاب) میں پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے اصول و قوانین میں جن پر عمل پیرا ہو کر انسان ایک ادنیٰ سے قول (حکم) پر عمل کرنے سے پے در پے درستی کی طرف رخ کرتا جاتا ہے۔ قرآن نے اپنے قوانین کچھ اسطرح وضع کئے ہیں۔ کہ اگر اسکے ایک ادنیٰ سے حکم کو بھی اسکی حیثیت کے مطابق ادنی سمجھکر لاپرواہی سے پس پشت ڈالا جائے۔ تو یہی کوتاہی کسی وقت بھی انسان اپنی عدم توجہی پر اسکا غلط نتیجہ پائیگا۔ یعنی مسلمان اگر ایک حکم

السلام علیکم کہنے میں بھی لاپرواہی کریگا۔تو اسکے دل میں محبت انسانی کی بجائے طبیعت میں ۔کینہ۔حسد۔بغض کا مادہ عود کر آئیگا۔اور انسان میں دوسروں کے حقوق کی حفاظت کرنے کا مادہ نہ رہیگا۔ایسا انسان خود بخود۔غرض پرست اور ناجائز حصول کا شکار ہوگا انسان اگر ایک ادنیٰ اسلامی فعل (بٹوانی) مٹی سے استنجا کرنے میں کراہت محسوس کریگا۔تو اس میں کئی جسمانی اور روحانی امراض کا دروازہ اسی جگہ سے کھل جائیگا۔فی زمانہ جدید تمدن (مغرب زدہ) کے لوگ اسلام کے ایسے اصولوں کا مضحکہ اڑا کر انہیں ایک حقیر فعل سمجھتے ہیں۔لیکن اسلام نے کوئی ایسا حکم جاری نہیں کیا جس میں انسانی اصلاح کیلئے بے شمار فوائد موجود نہ ہوں۔بٹوانی (مٹی سے استنجا) انسان کیلئے ایک اہم کردار ہے۔اسی کردار سے اسکے اخلاق۔اسکی پاکیزگی۔اور روحانی سپرٹ کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

پیشاب کرنے کے بعد بعض اوقات کچھ قطرے باہر نکلنے سے رہ جاتے ہیں۔دوسرے پیشاب کے بعد لازمی طور پیشاب کی نمی جگہ پر رہ جاتی ہے اگر بٹوانی کا استعمال نہ کیا گیا۔تو ان قطرات میں اندرونی تیزابی فضلات کا مادہ ہوتا ہے۔یہ گندہ تیزابی مواد اگر ایک جگہ رہ جائے تو ہوا کے اثر سے اس تیزابی مادے میں اور زہر پیدا ہوتا ہے۔اور یہ زہریلا مواد اپنی تیزابی خاصیت میں اندر سے پیشاب کی نازک نالی میں زخم پیدا کر دیتا ہے۔جس سے ایک اچھا خاصا مرض پیدا ہو جاتا ہے اور یہ مرض کسی وقت سوزاک یا آتشک جیسے مہلک امراض کا سبب بن جاتا ہے۔بٹوانی (مٹی) ان قطرات کو چوس کر صاف کر دیتی ہے۔نیز مٹی میں ایسے اجزأ موجود ہوتے ہیں جو ان تیزابی جراثیم کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔اور ایسے تیزابی جراثیم سوائے مٹی کے ذرات کے اور کسی تیز سے تیز ادویات یا زہریلے جراثیم سے بھی ہلاک نہیں ہوتے۔دوسرے اگر انسان پیشاب کے بعد مٹی سے صاف نہ کرے تو اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔کہ ایک تو یہ زہریلے جراثیم کپڑوں اور ارد گرد جسم کے ساتھ لگ کر جسم میں گندے جراثیم پیدا کرتے ہیں۔یہ چیز اصولاً مضر ہے۔انسان میں پاک و صاف رہنے کی تمیز نہیں رہتی جو انسانی صحت کیلئے ایک لازمی چیز ہے۔انسان ایک فعل کے بار بار کرنے سے اسکا عادی ہو جاتا ہے اور عادت کے پختہ ہونے پر یہ فعل انسان سے چھوٹ نہیں سکتا۔

بلکہ کئی اور عادتوں کا سبب بن جاتا ہے۔اسی طرح پیشاب کے معاملہ میں اگر ایک شخص صفائی کرنے میں لاپرواہی کرے تو یہ چیز اسکی عادت بن جاتی ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے۔کہ انسان صفائی اور گندگی۔پاکیزگی اور پلیدی میں تمیز کرنے سے رہ جاتا ہے۔پیشاب کے بعد مٹی سے استنجالازمی طور پاکیزگی اور صفائی کی عادت ڈالدیتا ہے۔جب انسان اپنے ہاتھ سے بڑائی (استنجا) کرتا ہے۔تو اسے پیشاب کی پلیدی سے زیادہ ہاتھ کے پلید ہونے کا احساس ہو جاتا ہے۔اور اسے جب تک ہاتھ نہ دھوئے ایک الجھن سی رہتی ہے۔گویا پلید کو جب تک پاک نہ کیا جائے انسان میں پاک ہونے کی تحریک ابھرتی رہتی ہے۔اور یہ تحریک جب عادت کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔تو انسان میں احتیاط پیدا ہو جاتی ہے۔جب انسان کسی میلی یا ناپاک شے کو ہاتھ لگائے یا اسکے ساتھ لگ جائے۔جب تک اسے پاک وصاف نہ کرے تو انسان کو چین نہیں آتا۔یہ ایک فطری تحریک ہے۔جو انسان کو ناپاکی سے پاکیزگی کی طرف رجوع کراتی ہے۔اسی طرح انسان رفتہ رفتہ ہاتھ دھونے کے ساتھ۔منہ میں بھی چند چلو پانی کے ڈالدیتا ہے۔کبھی ناک میں بھی پانی ڈالکر گردوغبار صاف کرتا ہے۔کبھی منہ سے بھی گردوغبار دھونے لگ جاتا ہے۔اور یہی عادت ایک مستقل صورت اختیار کر جاتی ہے۔نماز کیلئے وضو کرنا ضروری رکھا گیا ہے۔بغیر وضو نماز درست نہیں ہوتی وضو سے مراد۔ہاتھ۔منہ۔ناک۔چہرہ۔بازو۔پاؤں۔جہاں تک گردوغبار۔کے اثر کا احتمال ہو دھونا۔۔۔۔۔جب انسان بڑائی کے ایک فعل سے ایک وقت آسانی سے اپنا تمام وضو پورا کر لیتا ہے۔تو اسکے قلب پر پاکیزگی کا اثر ہونے سے نماز کی تحریک بھی ہو جاتی ہے تو انسان خود بخود نماز کا عادی ہو جاتا ہے۔اگر اسکے ابتدائی ارکان پر دلچسپی اور آمادگی کی تحریک نہ ہو تو انسان میں بجائے پاکیزگی کے غلیظ رہنے کی عادت ہو جاتی ہے۔جس سے قلب پر بھی غلاظت کا اثر ہو جاتا ہے۔اور انسان میں تساہل پیدا ہو جاتا ہے۔اور انسان میں پاک وناپاک کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔تساہل و غلاظت کا مادہ انسان کو نکما اور ہر معاملہ میں نااہل بنا دیتا ہے۔اور انسان کے اخلاق و عادات پر برا اثر پڑ جاتا ہے۔ایسا انسان حقیقت سے دور ہو جاتا ہے۔الغرض قرآن کریم

(کتاب) کا بغور مطالعہ کرنے سے اس میں انسانی اصلاح کا۔کافی مواد ملتا ہے۔اسلئے اسلام نے انسانی خاصیتوں کے عین مطابق اپنے اصول۔تسلیم اللہ۔ملائکہ۔کتاب کے تسلیم کرنے کی خصوصی طور تاکید کی ہے۔تاکہ انسان اپنی اصلاح کیلئے اپنے دنیوی معاملات کے برتاؤ سے ہی ایک حقیقی راہ کی طرف نشانات پاسکے۔

کتاب کے یہ پانچ اصول اور تسلیم اللہ۔ملائکہ وکتاب یہ اصول کسی خودساختہ دین یا کسی ایسی کتاب سے جو زمانہ کے انقلابات وحوادث کا شکار ہو چکی ہو۔نہیں مل سکتے ہیں۔جب تک کہ کتاب خود قوانین فطرت کی مطابقت نہ کرتی ہو اور وہ کتاب وہی ہوسکتی ہے۔جو پیغمبر نے خود پیش کی ہو۔اسلئے قرآن میں اپنے خود دلائل موجود ہیں جو اپنی صداقت کیلئے کافی ہو سکتے ہیں۔اسکے بعد اسکی صداقت کی دلیل اسکی شریعت کے ساتھ اسکے عامل کی ہے۔قرآن کے عامل خود حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور آپکا عمل خود دین اسلام کیلئے ایک عظیم الشان دلیل ہے۔اسلئے کتاب پر عمل کرنے کیلئے رسول کی صداقت کو تسلیم کر کے رسول کے احکام اور عمل کی تقلید کرنا شریعتِ اسلام میں ضروری ہے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات کے لئے آپکی [1] صداقت کی دلیل اتنی ہی کافی ہے۔کہ آپ کے زمانہ کے حالات کا مطالعہ کیا جائے۔اور ایسے وقت میں جبکہ عرب کے خونخوار انسانوں میں کسی کو مدمقابل کسی سے بات کرنے کی جرأت نہ تھی۔ایک تنہا یتیم ونادار۔جنکا نہ کوئی ساتھی۔نہ مددگار۔نہ دولت۔نہ قوت ساتھ تھی۔کسی طاقت کے بل بوتے پر نہیں۔صرف قرأت [2] قرآن اور اپنے ذاتی عمل پر چند سالوں میں غیر یقینی ترقی کی اور یہی دین اسلام آپ کے ہاتھوں۔قیصر وکسریٰ۔ہرقل۔خسرو پرویز الغرض عظیم الشان سلطنتوں کو فنا کر کے تمام دنیا پر چھا گیا۔اسلام نے اپنا اقتدار حاصل کر کے دنیا کو محکوم نہیں بنایا بلکہ۔

---

1. رسول کی صداقت کی دلیل گزشتہ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (پیغمبر کی صداقت میں) دی گئی ہے۔

2. قرأت: لوگوں تک کلام الٰہی پہنچانا۔

یتیموں کی پرورش کی۔ بیواؤں کو پانی تک بھر کر دیا۔ انکے بوجھ اٹھائے۔ غلاموں کو آزادی دی۔ غلاموں کو سوار کر کے خلیفہ نے خود اونٹ کی لگام تھامی۔ یہ سب حضرت محمد رسول اللہؐ کی تعلیم تھی۔ اس سے زیادہ ایک اصولی انسان کیلئے دلائل کی ضرورت نہیں۔

پانچواں عقیدہ قیامت: اسلام کے عقائد میں پانچواں عقیدہ قیامت ہے۔ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ (اسکی مفصل تشریح ص ۵۶ تا ۶۷ تک پر کی گئی ہے) قیامت کے معنے ٹھہرنا۔ یعنی اس نظام کائنات کی رفتار کا رک جانا۔ اس نظام کائنات میں پیدائش کا ایک تسلسل ابتدأ سے جاری ہے۔ ایک دن ایسا ہوگا جب اس تمام کارخانہ حیات کا خاتمہ ہوگا۔ اور کائنات کی ہر شے فنا ہو جائیگی۔ زندگی اور موت کا یہ سلسلہ ختم ہو جائیگا۔ اسکے بعد کیا ہوگا؟ یہی تصور قیامت کے عقیدے میں پایا جاتا ہے! جسکے لئے قیامت کا عقیدہ لازمی رکھا گیا ہے۔

اسلامی شریعت میں یَوْمُ الْقِیٰمَةِ کو یَوْمُ الْحَشْرُ ۔یوم المیقات ۔یَوْمُ الدّین ۔یَوْمُ الجزأ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(ا) یَوْمُ الْقِیٰمَةِ کے معنی جب سورج کا چلنا چاند ستاروں کے طلوع وغروب۔ نباتات کا اگنا۔ جانداروں کا پیدا ہونا اور زندگی کی رفتار کا۔ جاری رہنا بند ہو جائیگا ان تمام اشیأ کا تعلق زمین سے ہے۔ اور زمین متزلزل[ا] ہو کر روئی کے دھنکے ہوئے گالے کے مانند فضا میں اڑ کر منتشر ہو جائیگی اسکے ساتھ تمام زندگی کا نظام درہم برہم ہو کر فنا ہو جائیگا۔

[ا] تجربات سے بھی معلوم ہو چکا ہے۔ کہ ہر شے (زمین۔ سورج۔ چاند وغیرہ) کی ذاتی قوتیں رفتہ رفتہ ختم ہوتی جاتی ہیں۔ اور ایک دن یہ قوت اسقدر ختم ہو جائیگی کہ ان میں کشش کی قوتیں ختم ہو جائینگی اور جب ہر شے ایک دوسرے کی کشش سے باہر ہو جائیگی تو اسکا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ فضائے آتشی میں تمام دنیائیں منتشر ہو کر گرد وغبار کی صورت اختیار کرینگی۔ اور جب یہ گرد وغبار فضا میں یکجا ہو کر اکٹھا ہوگا تو اسکی بھی ایک کیفیت پیدا ہو جائیگی بظاہر ہر شے فنا ہو جائیگی۔ لیکن فنا ہونے کے بعد لازمی ہے کہ منتشر (ذرات) اجزأ کی صورتمیں قائم رہینگے۔ اور کرۂ آتشی میں یہ اجزأ دوبارہ ایک آتشی فضا پیدا کرینگے۔ گویا یہ سب اجزأ اپنی ابتدائی کیفیت میں آ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۲) لیکن ہر شے اپنی علت کی طرف رجوع کریگی اور یہ کائنات ایک ایسی فضا میں تبدیل ہو جائیگی جس میں کائنات کے تمام سورج۔ چاند۔ ستارے اکٹھے ہو کر ایک ایسی فضا پیدا کرینگے۔ جیسی کہ ان تمام اشیأ کی ابتدائی علت تھی۔ اس فضا میں کئی قسم کی کیفیتیں پائی جائینگی یعنی وہ ہر شے جس نے دنیا میں زندگی اختیار کی ہوگی اور ایک ہیئت پائی ہوگی یہ سب اشیأ بھی اس فضا میں جمع ہو جائینگی (یا سمائی ہوئی ہونگی) اسے یوم الحشر کہتے ہیں۔

(۳) یہ فضا ایک لا انتہا وسعت کے ساتھ طویل ہوگی اور اس فضا کو ایک وسیع میدان کی صورت میں محسوس کیا جائیگا۔ ہر شے اپنی ہیئت کے مطابق اس فضا سے اثر پزیر ہوگی۔ جیسے عرب کے کسی ریگستان میں مختلف ممالک کے لوگ جمع ہوں جن میں انتہائی سرد علاقے کے لوگ بھی پائے جائیں۔ درمیانی موسم کے لوگ (جہاں سردی گرمی برابر ہوتی ہے) بھی جمع ہونگے۔ اور انتہائی گرم علاقے کے لوگ بھی موجود ہونگے۔ ہر شخص اپنی ہیئت کے مطابق ماحول کی گرمی محسوس کریگا۔ اسے یَوْمُ المیقات کہتے ہیں۔

(۴) یَوْمُ الدین۔ یہ ایک دن ہوگا جبکہ ہر شخص اپنے ان افعال کے نتائج کو بھی پائیگا جنکے نتائج وہ دنیا میں ظاہر طور پا چکا ہوگا اور خصوصی طور ان افعال کے نتائج کو بھی دیکھیگا جن کے نتائج اُسنے دنیا میں نہ پائے ہوں۔ اسے یوم الدین کہتے ہیں۔

(۵) ہر انسان کے افعال کے نتائج ایک کیفیت میں پائے جائینگے اور ان کیفیات کا اثر انسان کے اس مبدل وجود پر اثر انداز ہوگا۔ جو وجود اسے یوم حشر میں حاصل ہوگا۔ اور یہی اسکے ہر عمل کا بدل (نتیجہ) یا بدلہ ہوگا اسے یوم الجزأ کہتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) جائینگے۔ جو کیفیت انکی ابتدائی علت تھی۔ کیونکہ ہر شے کی اصل کیفیت فنا ہونے کے بعد صرف ہیئت ہی بدلتی ہے۔ اور ذات اپنی اصلی Material کے ساتھ مل جاتی ہے۔ اسی طرح یہ سب اشیأ ایک مجموعی فضا دوبارہ قائم کرینگی۔ یہ ایک فطری قانون ہے۔ اور فطری قانون کا خالق اللہ ہے۔ اسلئے اس قیامت کی نسبت اسی ارادہ ازلی سے ہوگی جو اللہ سے تھا۔ گویا اللہ کے حکم سے ہی قیامت واقع ہوگی۔

ان کیفیات کے نام کیوں دیئے گئے ہیں؟۔وہ اسلئے کہ:۔

ہر شے کی ماہیت کیلئے اسکا ایک نام ہوتا ہے۔اسی نام سے اس کیفیت کا تصور کیا جاتا ہے۔اگر وہ شے مادی ہو اور حواس میں آنے والی ہو۔تو اسکی ظاہر ہیئت سے ہی اسکا تصور قائم ہو جاتا ہے۔اور جس شے کی ماہیت مادراُمادہ ہو۔وہ لطیف ہوتی ہے۔اسکا تصور اسکے نام کی کیفیت سے کیا جاتا ہے۔مثال کے طور''پانی'': یہ نام ہے۔جب تک پانی نہ دیکھا جائے پانی کا تصور نہیں آسکتا البتہ پانی کی تعریف کی جائے تو ایک خیالی یا وہمی تصور ضرور قائم ہو جاتا ہے۔اور جب اسے دیکھا جائے تو اسکی اصل ماہیت کا تصور خود بخود آجائیگا۔اور تصور کے ساتھ پانی کے تاثرات کا تصور بھی حافظہ سے پیدا ہوگا اسی طرح آگ کے تصور کے ساتھ جلانے کی کیفیت کا تاثر بھی قائم ہو جائیگا۔

قیامت کے نام سے دنیا کا خاتمہ اور کائنات کے خاتمہ کا ایک ہیبت ناک منظر بھی اسکے نام اور تصور کے ساتھ قائم ہو جائیگا۔یوم المیقات۔یوم الحشر کے ساتھ ایک وسیع اور تابانی (یعنی آگ سے تیز تر) کیفیت کے ساتھ ایک جلادینے والے تاثر کا تصور بھی انسانی ذہن میں قائم ہو جائیگا۔اسطرح انسان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیگا کہ آخر زندگی کا یہی انجام ہے اور ہمارا انجام بے معنی نہیں بلکہ ضرور اسکا ایک نتیجہ قائم ہوگا۔

یوم الدین ایک انسان کو یہ ضرور احساس دلائیگا۔کہ انسان کی پیدائش اگر اسی مقصد کے لئے ہے۔کہ وہ ایک مکمل اور مستقل وجود حاصل کرے۔جو ایک حقیقی قانون پر عمل پیرا ہونے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔تاکہ انسان کا یہ مکمل وجود آئندہ آنے والی فضا کے شدید تاثرات کا متحمل ہو سکے۔تو پھر انسان اپنے اعمال وافعال کا محاسبہ کریگا کہ آیا اسنے فطرت کے قانون کی پابندی سے وہ قوت حاصل کرلی ہے یا نہیں۔اگر نہیں تو وہ ایک تکلیف دہ تاثر کا تصور کریگا اور یہ تصور اسے حقیقت کی طرف رجوع کرنے کی تحریک دیگا۔

یومُ الجزأ میں جب وہ یقین کرلیگا کہ ہر شخص کیلئے یہ فطری طور مقرر کیا جاچکا ہے۔کہ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ جو کچھ اس دنیا کی کھیتی میں (اَلدُّنیا مَزْرَعَۃُالاٰخِرَۃِ) انسان بوئیگا وہی پھل

اسکے لئے آئندہ زندگی میں کارآمد ہوگا۔یعنی جو کچھ انسان عمل کریگا اسی کے مطابق قیامت میں اسے راحت (جنت) اور تکلیف (عذاب دوزخ) حاصل ہوگی۔تو انسان ہر لمحہ اس تصور کے تاثر سے متاثر رہیگا۔اور اپنے ہر برے فعل پر اسے تنبیہ ہوتی رہیگی۔

قیامت کا احساس ہی ایک ایسا احساس ہے۔جو انسان کے ارادوں میں تبدیلی کرنے والی کیفیت ہے۔قیامت کے جزأ کے احساس سے ہی انسان ہر وقت خواہ وہ دنیوی معاملات میں کتنا ہی الجھا ہوا ہو۔اسے اپنے نصب العین کی تکمیل کیلئے اسکا قلب لمحہ لمحہ پکارتا رہیگا۔اور اس اثر سے انسان پر ایک شدید تکلیف کا خوف رہیگا۔جس خوف کے اثر سے۔انسان خواہ کسی ذلیل سے ذلیل ماحول میں کیوں نہ گھرا ہو۔انسان کبھی ماحول سے متاثر ہوکر نفس پرستی۔آرام طلبی۔یا باطل کی حمایت اور انحراف کی طرف مائل نہ ہوسکیگا۔بظاہر ظاہری قانون کے خوف سے انسان خالی رہتا ہے۔جبکہ اسے یہ معلوم ہو۔کہ قانون نے میرا جرم نہیں دیکھا۔وہ جرم کے ارتکاب کیلئے طریقے پیدا کرتا ہے۔اور سزا سے محفوظ رہنے کیلئے اپنے جرم کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔رفتہ رفتہ انسان جرائم کا عادی ہوجاتا ہے۔عادت پختہ ہونے پر انسان ظاہری قانون کے خوف سے یکسر لاپرواہ ہو جاتا ہے۔لیکن قیامت کا تصور انسان کو کسی طرح بھی سزا سے بچ رہنے کی امید نہیں دلاتا۔جس سے انسان نہ اپنے جرم کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔نہ اسکا جرم کسی حالت میں بھی چھپ سکتا ہے اور نہ وہ خوف سے لاپرواہ ہوسکتا ہے۔اور جب خوف اور سزا یقینی صورت اختیار کرلیتی ہے۔تو انسان کسی صورت میں جرم کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا۔یہی صورت قیامت کے تصور میں انسانی افعال پر اثر انداز ہوتی ہے۔کہ وہ کسی طرح جرم (بدی) کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا ہے۔ایسا احساس انسان کو خواہ مجلس ہو یا تنہائی ہر جگہ ہر حالت میں قانون فطرت کی خلاف ورزی سے باز رکھتا ہے۔

شریعت اسلامی انسان کے ہر فعل کو ایک نتیجہ کے طور پر واقع ہونے کیلئے یوم جزأ کا احساس دلاتی ہے۔کہ یقینی طور پر ایک وقت ضرور آئیگا۔دوسرے قبل از وقت اس آنے والے وقت کا احساس پیدا ہونے سے انسان ہر حال میں اپنی اصلاح کی طرف متوجہ رہتا ہے۔قرآن نے

قیامت کے تصور اور احساس کے ساتھ بتایا اس ماحول میں ہر شخص کو اسکے ذاتی اعمال کے مطابق ہی راحت وعذاب ہوگا وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وہی کچھ تمہارے لئے ہے جو دنیا میں عمل کرو گے۔ انسان اس احساس میں بھی اکثر بے خوف رہنے کی کوشش کرتا رہا اور انسان کی مادی خاصیتیں انسان پر غالب آکر اسے کوتاہ اندیش اور لاپروا کرتی رہیں۔لیکن قرآن نے قیامت کے ماحول کی شدت بھی اسکی پوری کیفیت کے ساتھ بیان کردی۔وَ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۚ وَتَرٰهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِىْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ○ (پارہ ۲۵ سورۃ ۴۲ آیت ۴۴۔۴۵) اور دیکھیگا تو ظالموں کو جسوقت دیکھینگے عذاب کہینگے کیا ہے کوئی جگہ (واپس) جانے کی ؟۔اور دیکھیگا تو انکو حاضر کیئے جائینگے اوپر اسکے (قیامت کے عذاب کے) عاجزی کرتے ہوئے ذلت کے ساتھ کن اکھیوں سے چھپکر دیکھتے ہونگے۔اسوقت کہینگے ایمان والے تحقیق نقصان پانے والے لوگ وہی ہیں جنہوں نے (نافرمانی سے) اپنے آپکو اور اپنے اہل کو نقصان پہنچایا۔قیامت کے دن۔خبردار رہو! تحقیق ظالم ہمیشہ کیلئے عذاب میں رہینگے۔

اس آیت میں صرف حوالہ ہے قیامت کا کہ ضرور ہوگی اور ہر نافرمان کو سزا ضرور ملیگی۔

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؕ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؕ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ○ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۚ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ؕ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ (پارہ ۲۹ سورۃ ۷۵ آیت ۱تا۹) قسم کھاتا ہوں میں قیامت کے دن کی۔اور قسم کھاتا ہوں میں ملامت کرنے والی جان (ضمیر یا روشن قلب) کی کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اسکی ہڈیاں ہرگز جمع نہ کرینگے؟ بلکہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ دوبارہ بنائیں۔ بلکہ ارادہ کرتا ہے انسان تاکہ (آسانی سے) گناہ کرتا رہے۔پوچھتا ہے کب ہوگی قیامت؟ پس جسوقت پتھرا

جائینگی (ایک ہیبت ناک آواز سے) آنکھیں۔اور چاند کی روشنی گھن میں آئیگی۔اور اکٹھا کیا جائیگا سورج اور چاند (یعنی یہ سب فضا میں منتشر ہو کر اپنی ہیئت فنا کرینگے اور دوبارہ ایک ہی ہیئت میں اکٹھے ہونگے)۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۞ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۞ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۞ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۞ وَ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۞ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۞ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۞ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۞ (پارہ ۳۰ سورۃ ۷۹ آیت ۳۴ تا ۴۱) پس جب آئیگی بڑی آفت۔اس دن یاد کریگا انسان جو کچھ اسنے کیا ہوگا۔اور اس دن دوزخ کو ظاہر کیا جائیگا۔پس جس نے سرکشی کی اور دنیوی زندگی کو (اپنے نصب العین کے مقابلہ میں) اختیار کیا۔پس دوزخ جگہ ہے اسکے رہنے کیلئے۔اور لیکن جو کوئی ڈرا (قیامت کے دن) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے اور باز رہا خواہشات نفسانی سے۔پس اسکے لئے جنت ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیگا۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۞ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۞ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۞ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۞ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ۞ (پارہ ۳۰ سورۃ ۸۲ آیت اول تا ۵) جسوقت کہ آسمان پھٹ جائے۔اور جب ستارے جھڑ جائیں۔اور جب دریا چیرے جاویں۔اور جب قبریں کریدی جائیں (مردے اٹھائے جائیں)۔ہر شخص جان لیگا جو کچھ اس نے آگے (اپنے عمل سے) بھیجا ہوگا۔اور پیچھے چھوڑا۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۞ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۞ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ۞ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۞ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۞ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۞ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۞ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۞ (پارہ ۳۰ سورۃ ۹۹ آیت اول تا ۸) جسوقت ہلائی جائیگی زمین اسکے زلزلہ سے۔اور نکالیگی (زمین) بوجھ (اپنے اندر کی چیزیں) اپنے اور کہیگا انسان کیا ہوا ہے اسکو۔اس

دن کہیگی زمین سب باتیں۔ جو تیرے رب کے اسکے لئے حکم بھیجے۔ اسدن پھر آئینگے لوگ (قیامت حشر کی طرف) متفرق۔ تاکہ انہیں انکے (دنیا میں) کئے ہوئے اعمال دکھلائے جائیں۔ پس جس نے ایک ذرہ بھر اچھائی کی ہو وہ بھی اسدن پائیگا (دیکھیگا) اور جس نے ایک ذرہ بھر برائی کی ہو وہ بھی اسدن (پائیگا) دیکھیگا۔

اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ ۝ وَمَآ اَدْرٰکَ مَاهِیَهْ ۝ نَارٌ حَامِیَةٌ ۝ (پارہ ۳۰ سورۃ ۱۰۱ آیت اول تا ۱۱) "ٹھوکنے" والی۔ کیا ہے "ٹھوکنے والی"؟ اور کس چیز نے ادراک (معلوم) کرایا تجھکو کیا ہے "ٹھوکنے والی" جس دن لوگ مانند ٹڈیوں کے پراگندہ ہونگے۔ اور پہاڑ دھنی ہوئی پشم کے ہو جائینگے۔ (یعنی زمین کے زلزلہ سے پھٹ جانے پر روئی کے گالوں کی طرح اڑ اڑ کر ریزہ ریزہ ہو جائینگے۔ جیسے کسی آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کے موقع پر ہو جاتا ہے) پس اسوقت جسکے اعمال اچھے وزن میں زیادہ ہونگے وہ عیش و خوشی میں ہوگا۔ اور لیکن جسکے اعمال اچھے (برائی کے مقابلہ) کم ہوں۔ اسکی ماں ہاویہ ہے۔ تم کیا جانو ہاویہ کیا ہے؟ ایک آگ جلتی ہوئی ہے!

ایک انسان خواہ وہ حقیقت کا اقرار کرنے والا ہو۔ یا اسکا انکار کرنے والا ہو۔ جب تک وہ اپنے ذاتی تعقل سے کسی حقیقت کا علم حاصل کرنا چاہے۔ اسکا علم بغیر کسی راہنمائی کے مبنی بر صداقت نہیں ہوسکتا۔ انسان اپنی قوتِ تعقل سے کتنے ہی مشاہدات حاصل کرے جب تک وہ کسی حقیقی راہنما سے امداد حاصل نہ کرے اسکا علم مکمل نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے انسانی کردار کیلئے ایک ٹھوس فارمولا (لائحہ عمل یا عقیدہ) پیش کیا کہ وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (پارہ ۳۰ سورۃ ۱۰۳ آیت اول تا ۳) قسم ہے وقت کی تحقیق انسان ہر حال میں نقصان میں رہیگا سوائے اس شخص کے

جس نے اللہ کے خالق ومعبود ہونے پر تسلیم کیا اور اچھے عمل کئے اور حقیقت کی اور صبر کی تلقین کی۔ یعنی خود بھی قوانین فطرت کی مطابقت کی اور دوسروں کیلئے بھی بہتر ماحول پیدا کیا۔ خود بھی برائی سے بچا اور دوسروں کیلئے بھی برائی سے بچنے کیلئے راہیں کھولیں۔ گویا یہ کردار ہر انسان کیلئے لازمی ہے۔ کہ وہ تلاشِ حقیقت کیلئے ایک بہتر طریق اختیار کرے۔ ورنہ گمراہ ہوگا اسی طرح اگر ایک انسان خود غرضی چھوڑ کر چند ساعت کیلئے حقیقت کا کھوج لگانے کا ارادہ کرے تو اسے۔ اسلام کے ان ابتدائی عقائد میں ایک ہموار راہ۔ اور سیدھا راستہ۔ حقیقت کو پانے کیلئے حاصل ہوگا۔

ایک شخص اسلام کے ابتدائی پانچ عقائد پر بھی غور کرے۔ اور چند ساعت کیلئے ایک موہوم تصور اپنے ذہن میں قائم کرے۔ اور۔ اللہ۔ ملائکہ۔ کتاب ۔رسول کے تسلیم کیلئے ایک فرضی عقیدہ قائم کرنے کے بعد اپنی زندگی کی ابتدا سے۔ اپنا اور کائناتِ فطرت کا مطالعہ کرے۔ تو انسان پر ضرور ایک کیفیت طاری ہوگی جو اسے حقیقت تسلیم کرنے کی تحریک دیتی ہے۔

مثلاً انسان اپنی زندگی اور کائنات کے باہمی تعلقات پر غور کرے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان اس کائنات میں عدم سے وجود میں آتا ہے۔ یعنی وہ اپنے ارادے سے خود کو پیدا نہیں کر سکتا بلکہ فطرۃ کے مطابق پیدا ہوتا ہے۔ اسکی پیدائش ایک لازمی چیز ہوتی ہے۔ جو اسکی قدرت سے باہر ہوتی ہے۔ زندہ ہونے کے بعد وہ اپنی ضروریات کائنات سے حاصل کرتا ہے۔ گویا وہ اپنی ضروریات کیلئے اسی کائنات کا محتاج ہے۔ اگر یہ اشیاً موجود نہ ہوں۔ تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اپنی زندگی کیلئے ہر حال میں انسان محتاج و عاجز ہے۔ پھر کائنات میں ربوبیت (پرورش) کا ایک منضبط نظام واقع ہے۔ یعنی اگر ہوا کے حصول کیلئے انسان پابند ہوتا اور اسے کسی جگہ سے ہوا حاصل کرنی پڑتی تو انسان اپنی عمر اسی ہوا کے حاصل کرنے میں ہی گزار دیتا۔ کیونکہ ہوا کی انسان کیلئے ہر لحہ اور ہر مقام پر ضرورت ہے۔ اگر اس میں پابندی ہوتی تو انسان کی زندگی اسکے لئے وبال[1] بن

---

[1] جیسے آج کل چاند میں سفر کرنے والے یا فضاءِ آسمانی میں تیرنے والے سائنسدان یہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جاتی۔اسی طرح پانی کی بھی ضرورت ہے۔اگر پہاڑ کی چوٹی پر انسان کو پانی کی ضرورت ہواور پانی کیلئے بھی دریا کی پابندی ہوتو انسان اپنی پانی کی ضرورت کیلئے دریا سے پانی حاصل کرنے کیلئے اپنی ساری زندگی ختم کرڈالے اسی طرح ہر شے کی کیفیت ہے۔گویا انسان ہر حال میں اس فطری نظام کا پابند اور اسکی ضرورتوں میں محتاج ہے۔ایک شخص زندہ ہوتا ہے۔نہ وہ زندہ رہنے پر قادر ہے۔نہ وہ مرنے پر قادر ہے۔چاہا زندہ ہوا اور چاہا موت کو بلالیا۔گویا انسان پر کسی وقت بھی موت آسکتی ہے اور اس وقت موت سے بچنے کیلئے نہ کوئی ظاہری سبب اسے بچا سکتا ہے۔نہ موت کسی کی خواہش یا ارادہ سے ٹل سکتی ہے اب انسان ذرا اپنی موت کا ہی تصور کرے۔جبکہ وہ کسی قیمت پر مرنے کیلئے تیار نہیں۔اس نے دنیا کی تمام نعمتیں۔تمام آرام آسائش۔محلات۔باغات۔ہر شے حاصل کی ہے۔کسی نے کچھ آرام اٹھایا۔اور کوئی اب اپنی دولت سے راحت حاصل کرنا چاہتا ہے۔اچانک موت کے آثار اسی انسان پر طاری ہوتے ہیں۔اسے ضرور یہ احساس ہوگا کہ میں اپنی تمام دولت۔عظمت۔جاہ وجلال۔رشتہ دار۔بیوی۔بچے۔عزیز واقربا۔دوست۔محبوب۔کو بجبر چھوڑ رہا ہوں!۔اسکے عزیز اسکے بستر مرگ پر اسکے آخری سانس کو دیکھ رہے ہیں۔اور کوئی اسکی مدد نہیں کرسکتا۔انسان خود اپنا تماشا دیکھتا ہے! سب کو دیکھتا ہے! اور رفتہ رفتہ موت قریب ہوتی جاتی ہے۔یہاں تک کہ یہ ہر شے کی ملکیت سے غیر قابض ہو کر اس دنیوی زندگی سے ایک نئی زندگی کی طرف آتا ہے۔اسکا پہلا مقام بھی اسکی موت کے ساتھ ہی تعمیر ہوتا ہے۔وہ اسکی قبر (زمین) ہوتی ہے۔یہ قبر جہاں انسان دن کو بھی بھولے سے نہیں گزرتا۔گزرتا بھی ہے۔تو اسے نہ ان مکینوں کی اس زندگی کا احساس ہوتا ہے۔نہ اسے اپنی موجودہ زندگی اور اپنی آئندہ زندگی کا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) محسوس کرتے ہیں کہ جس مقام پر انسان کو ہوا میسر نہ ہو وہاں زندہ نہیں رہ سکتا بفرض محال اگر انسان ہوا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔اور اس نے کیمیاوی اجزا کی مدد سے ہوا حاصل کی۔تو اندازہ کیجئے اگر یہ ذریعہ اچانک حادثہ کا شکار ہوا تو اس وقت انسان کی عاجزی اور موت کے یقینی ہونے کی بھی ایک عجیب کیفیت ہوگی۔

موازنہ کرنے کا احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان دنیا کی خواہش میں ہر تکلیف دہ منظر کو بھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی مقام ہے۔ جہاں انسان پر ایک سنسان ہیبت ناک رات طاری ہو جاتی ہے۔ اور یہی مقام ہے۔ جہاں انسان کیلئے کسی بستر کی سردی گرمی۔ کسی آرام کا خیال نہیں کیا جاتا یہاں تک کہ انسان جس جسم کو کانٹا چبھنے نہیں دیتا۔ وہی جسم۔ وہی چہرہ۔ وہی سینہ۔ وہی ہاتھ پاؤں۔ وہی پیٹ سب سڑنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ اعضۓ منتشر ہو کر جزوِ زمین بن جاتے ہیں۔ اور انسان جہاں اپنے آپکو ایک مجسمہ سمجھتا تھا۔ چند عرصہ بعد اسکا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ انسان اپنی عمر کے کسی حصہ میں اس بات کا چلتی پھرتی حالت میں۔ جبکہ اسے ایک مکان بھی حاصل ہے۔ آرام وآسائش کا انتظام بھی ہے۔ تھوڑی دیر یہ احساس کرے۔ کہ آج سے پچاس برس بعد میری یہ تمام چیزیں گل سڑ کر نابود ہو چکی ہونگی۔ تو ضرور انسان پر ایک ایسا اثر طاری ہوگا۔ کہ وہ اپنی خوشی پر خوش نہیں ہو سکتا۔ اپنے غم پر غمگین نہیں ہو سکتا۔ اپنی راحت پر نازاں نہیں ہو سکتا۔ اپنی تکلیف پر رنج محسوس نہیں کر سکتا۔ بلکہ اسکا قلب ایک معتدل کیفیت پر آ جائیگا۔ جو کیفیت انسان کو کبھی دنیوی معاملات میں زیادتی اور فطرت کی خلاف ورزی پر (خواہ وہ ایک معمولی سی بات ہی کیوں نہ ہو) مائل نہ ہونے دیگی۔ یہ تو دنیوی معاملات ہی تھے مر گئے چلو قصہ ختم انسان پر اس کیفیت سے جبکہ انسان دنیوی لذتوں میں پھنسا ہوا ہوا اکثر خوف نہیں آتا۔ لیکن اس زندگی کو جب مرنے کے بعد ایک نئی زندگی سے وابستہ کیا جائے تو اسکا تصور اسکا احساس ایسی کیفیت ہے۔ جس میں ایک فرضی (موہوم) تصور کرنے سے بھی انسان پر خوف طاری ہو جاتا ہے جسے قیامت کہتے ہیں۔

زمین وآسمان کا پھٹ جانا۔ متزلزل ہو جانا۔ پاش پاش ہو جانا۔ پہاڑوں کا اُڑ جانا۔ ایک تباہ کن اور ہیبت ناک منظر ہے۔ انسان کتنا ہی دلیر۔ بے خوف۔ اور موت سے نہ ڈرنے والا ہو۔ لیکن ہر شخص اپنے آپکو تکلیف سے بچانے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ ایک شخص یہ جانتا ہے۔ کہ سمندر میں انسان گر کر بچ نہیں سکتا۔ وہ آسانی سے موت کے ساتھ کھیلتا ہے اور سمندر میں جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ اچانک حادثہ میں جہاز طوفان کا شکار ہو کر فنا ہو سکتا ہے۔ پھر بھی وہ سمندر

میں چلا جاتا ہے۔ایک شخص یہ جانتا ہے۔کہ ہوا میں پرواز مہلک بھی ہوسکتی ہے۔پھر بھی وہ ہوا میں اڑتا ہے لیکن توپ کا ایک گولہ لگنے کے بعد۔جبکہ وہ یہ یقین کر لیتا ہے۔کہ اب میری موت یقینی ہے۔وہ موت اور اپنی تکلیف کو روکنے کیلئے ضرور حرکت کرتا ہے۔ذرا اندازہ کیجئے کہ ایک جہاز بم لگنے سے جب سمندر میں ڈوب رہا ہو۔اچانک جہاز میں دوسرا بم گرنے پر انسان اسکی زد سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔حالانکہ انسان موت کے منہ میں آچکا ہوتا ہے۔یہ ایک فطری خاصیت ہے۔ جو انسان پر خوف طاری کر دیتی ہے۔اسی طرح زمین کا پھٹ جانا۔زلزلہ اور دنیا کے فنا ہونے کی کیفیت ضرور ایک خوف پیدا کر دیتی ہے۔اس میں شک نہیں کہ آج انسان اس کیفیت کا تصور کرنے پر جبکہ قیامت اسکے قریب نہیں۔اس کیفیت سے متاثر نہ ہو۔لیکن۔یہ کیفیت صرف اس خوف کے پیدا ہونے کی تحریک دیتی ہے۔جس کیفیت کی ابتدأاس خوفناک منظر سے ہوتی ہے۔وہ کیفیت حشر۔یوم الدین (یوم الجزا)۔ہے۔جبکہ انسان کو حشر۔جزا۔المیقات۔اور قیامت کے شدید ماحول کا تصور ہے۔اور بعد مرنے کے دوبارہ زندہ ہو کر ایک وجود حاصل کرنے کا تصور ہے۔یعنی انسان یہ جان لے کہ موت کے بعد انسان ہر راحت وتکلیف سے آزاد نہیں ہوسکتا۔بلکہ اسکی راحت وتکلیف سے آزادی کا انحصار اسکی دنیوی زندگی کے عمل پر منحصر ہے۔وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ آئندہ زندگی ضرور ہے۔وہاں بھی راحت وتکلیف ہوگی۔وہاں دنیا کی مانند پیشتر ہی سے ضروریات مہیا نہ ہونگی بلکہ وہ کچھ ہوگا جو کچھ تم نے دنیا میں اپنے لئے بنایا ہوگا۔وہاں صرف دو کیفیتیں ہونگی "راحت" "تکلیف" جسے راحت ہوگی اسے کبھی تکلیف نہ ہوگی جسے تکلیف ہوگی وہ کسی کوشش سے راحت حاصل نہ کرسکیگا۔انسان کو تکلیف کا احساس ضرور ہوتا ہے۔اگر وہ اپنی زندگی میں قیامت پر آثارِ قیامت۔اور کیفیات قیامت کا فرضی تصور بھی کرے تو بھی اُسے ایک تکلیف یا خوف کا ضرور احساس ہوگا۔قرآنِ عربی۔قیامت کیلئے خصوصی کیفیات کا احساس دلاتا ہے۔وہ کیفیات۔یوم حشر۔یوم الجزا۔یوم الدین میں موجود ہیں ___ لیکن قرآنِ عربی کو عربی طرز عربی زبان سے مطالعہ کیا جائے۔تو معلوم ہوگا کہ یوم الجزأ صرف بدلہ کا دن ہی نہیں۔

بلکہ اسکی کیفیت اسکا تصور انسان کے رونگٹے کھڑے کرنے والا تصور ہوگا۔ الغرض اللہ کا تسلیم۔ ملائکہ کا تسلیم۔ کتاب اور رسول کا تسلیم کرنے والا شخص جب قیامت کا تصور کریگا تو یقینی طور۔ اسکی ذاتی خاصیتیں۔ قلبی خاصیتیں خود بخود اصلاح پزیر ہونگی۔ جو خاصیتیں کسی خود ساختہ مذہب یا خود ساختہ قانون۔ یا خود ساختہ سزاؤں سے کبھی درست نہیں ہوسکتی ہیں اسی اصلاح نفس اور قوانین فطرت میں انسان کا ذاتی کردار اور ماحول روشن کرنے کیلئے قیامت کا عقیدہ اشد ضروری ہے۔

شریعتِ اسلامی انسان کے ہر فعل کو ایک نتیجہ کے طور پر واقع ہونے کو قیامۃ سے تعبیر دیتی ہے۔ کہ ایک تو یقینی طور پر ایک وقت ضرور آئیگا۔ اس وقت کا احساس اسلئے دلایا گیا ہے۔ کہ دنیا میں رہ کر انسان جو کچھ بھی کریگا اُن افعال و اعمال کے نتائج قیامت میں ضرور اسے حاصل ہونے ہیں۔ ایسی صورت میں قبل از وقت احساسِ قیامت انسان کیلئے ایک بہتر نتیجہ پیدا کرسکتا ہے قرآن انسانی افعال و اعمال کے نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتاتا ہے۔ کہ قیامت میں تمہاری راحت و تکلیف کا انحصار تمہارے ذاتی اعمال پر ہی منحصر ہے وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ تمہارے لئے وہی ہوگا جو دنیا میں تم کماؤ گے۔ اور یہ خیال نہ کرو کہ ہمارے افعال و اعمال کی قیمت صرف دنیا پر ہی ہے۔ نہیں بلکہ تمہارا ہر فعل محفوظ رہیگا۔ جو کچھ تم مادی حیثیت میں کرتے ہو اسکا فائدہ بھی تم دنیا میں حاصل کر لیتے ہو اور وہ اعمال جنکا تعلق تمہاری ذات سے ہے لیکن انکے نتائج تم پر کلی طور اثر انداز نہیں انکے نتائج محفوظ ہیں وہ افعال نیکی (قوانین فطرت کی مطابقت) اور بدی (قوانین فطرت کی خلاف ورزی) ہیں انکے اثرات نیکی کا (ثواب) بہتری۔ اور بدی کا (عذاب) تکلیف۔ جو اثر تم باوجود نیک و بد کام کرنے کے بھی محسوس نہیں کرتے۔ یہ اثرات محفوظ ہیں۔ یہی اثرات یہی نتائج تمہاری آئندہ زندگی میں تمہیں حاصل ہونگے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ پس جس نے اچھا عمل کیا ایک ذرہ برابر بھی وہ قیامت کے دن اسکے نتیجہ کو دیکھیگا وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ پس جس نے ایک ذرہ برابر برائی کی وہ بھی قیامت کے دن اپنے برے نتیجے کو دیکھیگا۔

بظاہر انسان کسی نیک کام کرنے پر یہ جان لیتا ہے۔ کہ اسکا کوئی نتیجہ نہیں۔ کہ کسی غریب

کو روٹی کھلائی جائے۔کسی کی جان بچائی جائے۔سچ بولا جائے۔پورا تولا جائے۔شراب۔زنا۔ جوا۔جھوٹ وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔ان اعمال کے نتائج نہیں۔اسی طرح۔کسی کو تکلیف دیکر اپنا آرام حاصل کرنا۔شراب پینا۔جھوٹ بولنا۔دھوکہ دینا۔جوا کھیلنا۔قتل کرنا وغیرہ ان اعمال کے نتائج بھی سوائے اسکے معلوم نہیں ہوتے کہ انسان چند ساعت کیلئے اپنی خواہشات نفسانی میں لطف پیدا کرتا ہے۔لیکن یہاں پر ہی اسکا اثر ختم نہیں ہوتا۔بلکہ قانون فطرت کے مطابق انکے اصلی اثرات ابھی موجود ہیں۔جو انسانی ظاہری زندگی میں اسکی ذلت کی شکل میں اور آخرت (قیامت) کی زندگی میں عذاب کی صورت میں ضرور پیش ہونگے۔انسانی وجود کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔کہ انسانی روحانی۔اخلاقی ترقی کا دارومدار انسانی افعال پر ہی ہوتا ہے۔اگر انسان قوانین فطرت یا دین فطرت کے مطابق عمل کرے۔تو ظاہری طور ایسا شخص با اصول۔با اخلاق۔ اور نیک انسان سمجھا جاتا ہے۔اور دنیا پر اسکی عزت وعظمت تسلیم کی جاتی ہے۔اور باطنی طور پر انسان اپنے آپ کو مکمل اشرف المخلوقاتی حیثیت میں پاتا ہے۔اور اسکی جسمانی (روحانی اور مادی) کیفیت ترقی کر کے ایک حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے۔بس! یہی اسکے اعمال کا نتیجہ ہے۔کہ بعد مرنے کے بھی یہ اپنے اسی مقام پر قائم رہیگا۔یہی اسکے لئے وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ کا نتیجہ ہوگا یہی خیر وشر کا نتیجہ اسکے لئے قیامت میں مقرر ہوگا۔اسی طرح ایک وہ شخص جو قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ایک ذلیل اور بدکردار شخص کہلاتا ہے۔ہر شخص کی نظروں میں ایسا انسان ذلیل ہوتا ہے۔اور اسکے لئے ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔اگر ایسی حالت میں انسان دنیوی حالت میں ترقی حاصل بھی کر لے۔مگر یہ طاقت باطل اور ظالم طاقت تصور کی جائیگی اور اسکا نتیجہ عبرتناک تباہی اور ذلت کی موت میں واقع ہوگا۔اور اسکی روحانی کیفیت بھی یہی ہوگی کہ ایسا انسان۔خونخوار ۔باغی ۔انحراف کرنے والا اور حقیقت سے دور ہوگا اسکا نتیجہ اسکی حقیقت سے دوری میں یہی ہوگا کہ ایک تاریک اور دردناک ماحول میں اسکا مقام ہوگا یہی اسکا عمل۔یہی اسکا نتیجہ۔جو ظاہری زندگی میں محسوس نہیں کرتا۔اسکی ہیئت کے مطابق اسکے مرنے کے بعد (قیامت میں) اسے حاصل

ہوگا۔ان حالات میں احساسِ قیامت کا ایسا ہی اثر ہوتا ہے۔جیسے ایک مجرم کو چوری کرنے پر ظاہری قانون کا خوف طاری رہتا ہے کہ اسے سزا ملیگی۔قتل کرنے پر اسے ایک خوف طاری ہو جاتا ہے۔کہ میرے اس فعل کے نتیجہ میں قانون اسے موت کی سزا دیگا۔اسی طرح قیامت کے عذاب کا احساس اسے ہر قسم کی برائی پر خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ ہر حال میں انسان اپنے نتیجہ کے احساس سے خوف زدہ ہوگا جسے تَقْویٰ (خوف۔برائی سے پرہیز) کہتے ہیں گویا انسان احساس قیامت پر متقی ہوکر تمام احکام خداوندی کا پابند ہوکر قوانین فطرت کی پابندی میں اپنی اصلاح خود کرتا ہے۔اور خود ہی اپنے مرتبہ اشرف المخلوقاتی کو پاکر حقیقت سے قریب ہوجاتا ہے۔

یہاں تک گزشتہ بیانات میں زمانہ آخر کے دین (دین اسلام) کی تحقیق میں۔تسلیم اللّٰہ ___ اور پیغمبر (محمد رسول اللہؐ) کی صداقت۔اور کلام الٰہی (قرآن) کی خصوصیات پیش کی گئی ہیں۔اب ان کی مزید صداقت کیلئے انکے ظاہری دلائل بھی دیکھنے ہیں کہ آیا اس صداقت وحقیقت کے لئے دنیا میں ہدایت کا کوئی نشان پایا جاتا ہے؟

دین اسلام کی سب سے بڑی دلیل خود پیغمبر سے ملتی ہے۔کہ پیغمبر میں کہاں تک پیغمبرانہ قوتوں کا صدور ہوتا ہے۔جو اسے کلام الٰہی کے عمل سے حاصل ہوتی ہیں؟اور اسکے بعد عام انسانوں میں سے پیروانِ مذاہب میں اس علم الٰہی سے۔تسلیم اللہ۔اور پیغمبر کی تقلید میں کیا خوبیاں پائی جاتی ہیں۔تاکہ انہیں آثار کی روشنی میں ہر انسان اس مذہب کی طرف رجوع کرنے پر آمادہ ہوسکے۔

دین اسلام کے بانی حضرت محمد رسول اللہؐ ہیں۔آپکے ذاتی کردار اور پیغمبرانہ خصوصیات کا ذکر پیشتر کیا جاچکا ہے۔اسکے علاوہ آپ نے کلام الٰہی کیسے حاصل کیا۔اور اس پر کیسے عمل کیا۔اور اسکا نتیجہ کیا حاصل ہوا؟ یہ باتیں قابل غور ہیں۔

قرآن کریم حضرت محمد رّسول اللہ ﷺ کی خود تعریف بتاتا ہے۔جس میں عام انسان میں پیغمبر کی ذات کا تعارف ہوتا ہے۔قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَر'' مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ (پارہ ۱۶ سورۃ ۱۸ آیت ۱۱۰) آپ اعلان کردیجئے کہ میں تمہاری مثل ایک بشر ہوں۔تم میں مجھ میں۔تسلیم اللہ کے

معاملہ میں صرف فرق یہ ہے۔ کہ مجھے وحی حاصل ہے۔ بَشَـر " مِّثْلُكُمْ سے یہ مراد ہے۔ کہ انسان میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ حقیقت کی تلاش صرف پیغمبر کیلئے مخصوص ہے۔ یا یہ کہ پیغمبر کے منتخب ہونے کی وجہ سے اسے عرفان حاصل ہے۔ یا یہ کہ پیغمبر انسانوں کے مقابلہ میں کوئی خاص وجود حاصل کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اسلئے عرفانِ الٰہی صرف پیغمبر کیلئے ہی مخصوص ہے۔ نہیں بلکہ پیغمبر کو اسلئے عام انسانوں کے مقابلہ میں فوقیت ہوتی ہے۔ کہ اسے وحی (کلام الٰہی) پانے کیلئے ایک روحانی قوت (قوتِ مشاہدہ) حاصل ہوتی ہے۔ سو ہر انسان جب قوت مشاہدہ حاصل کرے۔ تو اسکے لئے عرفان الٰہی آسان ہو جائیگا۔ اسلئے ضروری ہے۔ کہ پیغمبر کے ارشاد کے مطابق ہر شخص پیغمبر کی تقلید کرے۔ تا کہ اسے عرفان (مقصد حقیقی) حاصل ہو۔ جسکی تائید خود قرآن کرتا ہے۔ لَـقَـدْ مَنَّ اللّٰهُ عَـلَـى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِـمْ رَسُـوْلًا مِّـنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُـعَـلِّـمُـهُـمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج (پارہ ۴ سورۃ ۳ آیت ۱۶۴) البتہ تحقیق اللہ نے احسان کیا مَنَّ اللّٰهُ ان لوگوں پر جنہوں نے اللہ کو خالق معبود تسلیم کیا۔ اور اسکے حقیقی علم سے راہنمائی حاصل کرنے کی خواہش کی۔ عَـلَـى الْـمُـؤْمِنِيْنَ جب اٹھایا ان میں سے ہی ایک پیغمبر (مثل بشر) اِذْ بَـعَـثَ فِيْهِـمْ رَسُــوْلًا جو کلام الٰہی (بذریعہ وحی) انکو سناتا ہے۔ کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اسکا مقصد زندگی تلاش حقیقت ہے۔ اور دنیا میں رہ کر انسان صرف سامان زندگی کے حاصل کرنے کیلئے پیدا نہیں ہوا۔ یا وہ دن بھر دنیوی زندگی میں الجھ کر نیکی و بدی کا احساس کئے بغیر بسر کرنے کے لئے نہیں پیدا ہوا۔ انسان دنیوی مادیت میں ملوث ہو کر اپنی اشرف المخلوقاتی شرافت کھو چکا ہے۔ جسوجہ سے وہ حقیقت کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ پھر پیغمبر انکی اصلاح کرتا ہے انکا تزکیہ کرتا ہے وَ يُـزَكِّيْهِمْ اور انکے سامنے حقیقی علم اور اسکا اصلاحی مواد (دین) پیش کرتا ہے۔ وَ يُـعَـلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ اور اس تمام کارکردگی سے۔ انسان کو اللہ کے اسرار۔ صحیح راہ کا ماوراُ ادراک کا مشاہدہ کراتا ہے وَالْحِكْمَةَ۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان پر یہ لازم ہے۔ کہ وہ خود تلاش حقیقت کے

تفکر کیلئے ارادہ کرے۔ اور پیغمبر کی تقلید میں دین کے علم سے استفادہ کرے۔ چنانچہ اسے حقیقی علم حاصل کرنے کیلئے کسی دین کے پیغمبر اور اسکے پیروؤں کے کردار کا مطالعہ کرنا ہے۔ سو اسلام کے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے کردار کا مطالعہ کیا جائے۔ کہ آپ نے اپنی ابتدائی زندگی ایک بشر کی حیثیت سے گزاری۔ آپ بھی اسی ماحول میں پیدا ہوئے۔ جہاں عرب کے باقی لوگ پیدا ہوتے تھے۔ آپکی زندگی بھی اسیطرح گزری جسطرح باقی لوگ گزارتے تھے۔ اس پیدائش اور اس ماحول کے تاثرات وہی ہونے چاہیے تھے جو عوام پر اثر انداز ہونے چاہیں لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ جسوقت آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپکے والد ماجد علیہ السلام آپکی پیدائش سے پیشتر وفات پا چکے تھے۔ پھر آپکی والدہ ماجدہ علیہا الصلوٰۃ والسلام کے پاس اتنی گنجائش نہ تھی کہ آپکی زندگی کی پرورش اور اصلاح کا پورا سامان فراہم کرسکتیں چنانچہ تواریخ شاہد ہے۔ کہ آپنے اپنی ابتدائی زندگی کا آغاز ایک دایہ (حلیمہ علیہا السلام) کے گھر میں کیا۔ وہاں آپکی تربیت کیلئے سوائے اسکے اور کچھ سامان نہ تھا کہ آپ پر بھی چرواہوں اور گلہ بانوں کا اثر طاری رہتا۔ اور یہ ماحول بھی ایسا ہی تھا جو عام عرب کے لوگوں کا تھا۔ اسکا نتیجہ لازمی یہی ہونا چاہیے تھا۔ کہ آپ بھی وہی خصائل پاتے جو عام لوگوں کے خصائل تھے لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتی خصوصیت نے اس حالت میں بھی کسی ماحول سے کوئی ایسا تاثر نہ پایا۔ جو حقیقت کے خلاف تھا۔ آپ کی طبیعت پرسکون تھی۔ ہمیشہ خاموشی۔ تنہائی پسند رہنے کے ساتھ آپ میں قوتِ تفکر پائی جاتی تھی۔ انسان ہونے کی حیثیت سے آپ میں وہ قوت موجود تھی جو انسان کو تفکر کی طرف آمادہ کرتی ہے۔ آپنے ابتدأ سے ہی غلط روی سے نفرت کی اور ہمیشہ تفکر کی طرف رجوع کیا۔ ایک طرف جنگلوں کی تنہائی۔ دوسری طرف اشرف المخلوقاتی خصائل تھے۔ اسکے ساتھ ہی خصوصیت نبوت بھی آپکو بدرجہ اتم حاصل تھی جنکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ تفکر کے ساتھ آپکا تزکیہ ہوتا رہا۔ اور آپکی روحانی قوت علےٰ حالہ برقرار رہی۔ جوں جوں عمر میں اضافہ ہوا۔ ویسے ہی آپکی روحانی خاصیتوں میں ترقی ہوتی رہی۔ چنانچہ رسالت سے قبل (جبکہ آپکا شمار بھی عام انسانوں میں کیا جاتا تھا) آپ میں مافوق الفطرت قوتوں

کا صدور ہوتا رہا یہ انسانی تفکر اور حقیقت کی طرف رجوع کا ہی اثر تھا۔ کہ آپ نے رسالت سے قبل ایک مافوق الفطرت قوت حاصل کی۔ اور اسی قوت کا نتیجہ تھا۔ کہ آپ نے اپنی ابتدائی عمر میں قوم کی گمراہی اور غلط طریق کار کو محسوس کرتے ہوئے انکی اصلاح کی کوشش شروع کی۔ چنانچہ رسالت سے پیشتر قومی اصلاح اور آپکی ذاتی شرافت کی مثالیں تواریخ خود دہراتی ہے۔ یہ تو انسان کا ذاتی کردار تھا۔ جو حضور محمد رسول اللہ ﷺ نے تکمیل تک پہنچایا۔ چنانچہ اسی تکمیل کے ساتھ وحی حاصل ہونے کیلئے آپ کو کسی تزکیہ یا روحانی عروج کی ضرورت نہ رہی۔ اور اسی مقام پر آپکو وحی حاصل ہوئی۔

وحی حاصل ہونے کے بعد آپؐ کے کردار کا ثبوت آپکی ابتدائی زندگی ہی کافی ہے۔ کہ جس ہستی نے اپنی ذاتی قوت سے اپنے آپکو گمراہ کن ماحول سے محفوظ رکھا۔ وہ آئندہ زندگی میں کب ناقابل تقلید سمجھے جاسکتے ہیں۔ قرآن کے احکام حاصل ہونے پر آپ نے پوری دلچسپی سے قرآن کے ایک ایک حکم کی تعمیل کی۔ زمانہ گواہ ہے۔ کہ باقی پیغمبروں کے مقابلہ میں آپکے پاس۔ نہ دولت تھی۔ نہ خاندان تھا۔ نہ جماعت تھی۔ نہ اقتدار تھا۔ نہ کوئی ذاتی پوزیشن تھی۔ اگر کچھ عرصہ مکہ کے لوگ آپکی شریفانہ۔ صادقانہ عظمت کے قائل ہو بھی چکے تھے۔ لیکن اعلان رسالت کے ساتھ یہ وقار بھی ختم ہوا۔ اور اپنا خاندان بھی مخالف ہو گیا اسوقت سوائے آپکی ذات واحد اور اللہ کی ذات احد کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا جو ان باطل قوتوں کے مقابلہ میں اپنے مشن (تبلیغ) کو جاری رکھنے کیلئے مددگار ہو سکتا۔ پھر کیا تھا؟ جس نے آپکی تبلیغ کو جاری رکھا۔ اور آپ روز بروز ترقی کرتے گئے؟ ـــــ وہ صرف آپکا۔ علم اور کردار ہی تھا جو لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا گیا۔ اور لوگ ایک نامعلوم تحریک کے اثر سے دین اسلام کے تابع ہوتے گئے۔

حضورؐ کی ابتدائی زندگی: آپکا بچپن جنگل میں گلہ بانی کرتے گزرا۔ اس وقت کا ماحول۔ بلکہ تمام دنیا کا ماحول۔ کفر و انحراف سے بھرپور تھا ہر طرف فسق و فجور۔ شراب خوری۔ جوا۔ لوٹ مار۔ قتل و غارت غرض کہ ہر برائی کا انسانی دنیا پر عملدرآمد تھا۔ کسی عیب کے کرنے میں کوئی حجاب کوئی ڈر محسوس نہ ہوتا تھا۔ ایسے وقت میں اگر کوئی محفوظ مقام ہو سکتا تھا۔ تو وہی جگہ ہو سکتی تھی۔

جہاں آبادی نہ ہو۔ اسلئے حضورؐ کو بچپن میں ہی ایک پرسکون اور صاف فضا میسر ہوئی۔ جہاں تنہائی تھی۔ جہاں کسی عیب کا دخل نہ تھا۔ ایسے موقع پر انسانی فطرت خود بخود سکون پذیر رہتی ہے۔ اور جہاں ذہن کو فروعی خیالات و تصورات کا ذخیرہ نہ ملے۔ لازمی طور ذہن میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت پر جبکہ ذہن کسی تخیل میں مصروف نہ ہو انسانی حافظہ اپنے قریبی ماحول کے واقعات حاصل کرتا ہے جنگلوں کی فضا میں خاموشی تنہائی میں سوائے اسکے کیا مل سکتا ہے؟۔ کہ یا تو اردگرد کی فضا کو دیکھکر ان پر غور و تفکر کا مادّہ عود کر آئے یا اپنی فطری قلبی خواہشات کے نقوش ذہن کی طرف منتقل ہوں۔ یہی کیفیت و ماحول حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے ابتدائی قدم پر حاصل تھے۔ جن سے آپ میں غور و تفکر۔ تنہائی میں یکسوئی۔ یکسوئی سے انہماک پیدا ہونا تھا۔ انسان کو اپنی ابتدائی زندگی میں ایسے ماحول میں اپنے نصب العین کے تحت غور و تفکر کی لازمی طور تحریک ہوتی ہے۔ چنانچہ حضورؐ کی یہی عادت رہی کہ آپکو اپنے دنیوی مشاغل (گلہ بانی) کے ساتھ ساتھ غور و تفکر میں زیادہ وقت میسر ہوتا رہا۔ اور اس تفکر کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آپ کائناتِ خلقت کی تخلیق اور اسکی پیدائش کے مقصد کی تلاش میں مصروف رہے[1]۔ یہاں تک کہ حضورؐ کو درمیانی عمر میں تجارت کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ چونکہ آپ کو حقیقت سے ایک خصوصی لگاؤ اور دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اسلئے آپکو بیرونی دنیا کے سفر میں اپنے گرد و پیش کی آبادیوں میں لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنے کا بھی موقع ملا۔ لیکن یہ وہ وقت تھا۔ جبکہ آپکو اپنے غور و فکر اور انہماک حقیقی سے ایک عقل سلیم حاصل ہو چکی تھی۔ آپنے عام لوگوں کے حالات کا جائزہ لیکر یہ جان لیا۔ کہ انسان کا کام فطری طور پر ایک حقیقت کا انکشاف کرنا ہے۔ جسکے لئے عمل صالح کی ضرورت ہے۔ برعکس اسکے دنیا کے لوگ۔

---

[1] یہ چیز ایک فطری ملکہ (خاصیت) بھی ہوتی ہے۔ عام انسانوں میں اکثر محقق فلاسفر پیدا ہوتے رہے۔ انمیں فطری طور کچھ تو ذہنی قابلیت پائی جاتی ہے۔ کچھ ماحول سے اثر لیتے ہیں۔ ایسے دماغ بھی کائنات کی تخلیق اور اسکی موجودات کی تحقیق کی طرف مائل ہو کر۔ حکمت و فلسفہ پیدا کرتے ہیں۔ اور جب ایک ایسی ہستی جو اپنے میں پیغمبرانہ (روحانی) قابلیت رکھتی ہو۔ ضروری ہے کہ کائنات کی تخلیق اور اسکی موجودات پر ہی تفکر کرے۔

اصول وقانون سے باہر ہوکر۔ غفلت وانحراف کی طرف جارہے ہیں۔اس مطالعہ کا نتیجہ یہی نکلا۔ کہ آپکے دل میں ہر برائی سے نفرت کے ساتھ انکی اصلاح کی طرف بھی توجہ ہونے لگی۔ ماحول اگرچہ مسموم (زہریلا) تھا۔لیکن آپ پر اسکا اثر الٹا پڑا۔آپ نے ہر ماحول سے علیٰحدگی اختیار کی۔ چونکہ ابتداءً آپکو کسی غیر فطری ماحول سے سابقہ نہ پڑا تھا۔اسلئے آپکی قوتِ تفکر پر بیرونی ماحول کا کچھ اثر نہ ہوا۔اور آپ کا تفکر ہر شے کیلئے جاری رہا۔البتہ آبادی میں آنے سے جب آپکو غیر فطری ماحول سے سابقہ پڑا تو آپکی قوتِ دفاع پر یہ اثر ہوا۔کہ آپنے اپنے عمل میں سختی سے کام لیا۔جسکا نتیجہ یہ ہوا۔کہ آپکی قوتِ فکر اور قوت ارادی میں استحکام پیدا ہوا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے۔اپنے بچپن۔جوانی میں اکثر تنہائی کو اختیار کیا۔اور آخر جوانی کی عمر تک آپکا مخصوص مقام غار ''حَـــرَا'' تھا۔جو مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ چنانچہ آبادی میں آنے کے بعد رسالت سے قبل آپ اکثر غارِ حرا میں جاکر مہینوں قیام رکھتے۔آپکی عادت تھی کہ ستو (جو کا برادہ) کی ایک تھیلی ہمراہ لیکر غار حرا میں معتکف (خلوت نشین) ہوتے۔ جہاں ایک خالق اور مخلوق کی تحقیق وتفکر میں گزارتے۔آبادی سے دور تنہائی میں رہنا یقینی طور غور و تفکر اور مشاہدہ حقیقی کیلئے ایک سازگار ماحول ہے۔دنیوی مشاغل اور فروعی تخیلات سے محفوظ رہنے کیلئے ایسا مقام جبکہ ماحول سازگار نہ ہو۔ایک بہترین ذریعۂ [1] پناہ ہوسکتا ہے۔جب تک کہ

---

[1] مشاہدہ کیلئے خود انسان میں تمام سامان موجود ہیں۔جن سے کام لینے کیلئے صرف یکسوئی Concentration کی ضرورت ہوتی ہے۔مسمریزم ایک مشہور طریق اسی مشاہدہ کی ایک جز ہے۔جس میں انسان صرف تصور کیلئے ایک نقطہ قائم کرکے۔اپنی قوت بصر سے قوتِ ارادی کو ترقی دیتا ہے۔اس ترکیب کی تکمیل سے انسان میں مادی حیثیت میں بھی اتنی طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔کہ وہ ایک ساکن چیز کو متحرک اور ایک متحرک چیز کو ساکن کردیتا ہے ایسی قوت جب دماغ سے متعلق ہوجاتی ہے۔تو انسان اپنے حواس سے باہر اشیاً کا (جو مادہ سے تعلق رکھتی ہوں) ادراک بھی کرسکتا ہے۔اور اکثر نیم لطیف اشیا (جنات۔ناری اشیاً ناری ماحول) کا بھی ادراک کرسکتا ہے۔لیکن چونکہ اس صورت کا روحانیت سے قریبی تعلق نہیں اسلئے وہ خالص روحانی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انسان اپنی حاصل کی ہوئی قوتوں سے اسقدر غلبہ حاصل نہ کر لے۔ جس سے قوت ارادہ کے ساتھ ہر ناقص ماحول پر قوی غلبہ حاصل کر سکے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے غارِ حرا میں کیا عمل کیا؟ سوائے اسکے کچھ نہیں۔ کہ آپ نے حافظہ اور قلب کو زمانے کی مضر فضاؤں کے تخیلات اور خواہشات سے محفوظ کر لیا۔ اسکے ساتھ ہی کائنات خلقت اور اپنی پیدائش میں ایک حقیقی خالق کا تصور کیا۔ آپ نے اس انداز سے تفکر کیا۔ کہ اس کائنات کا کوئی بنانے والا ہے۔ جیسا کہ آپکے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا۔ اور آخری مقام پر ایک ایسا تصور باندھ لیا۔ کہ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ یعنی میں اپنے تصور وادراک کا رخ اسی ہستی کی طرف پھیرتا ہوں جو آسمان وزمین کا مبدع (پیدا کرنے والا اور ابتدائی علت) ہے یہ تصور چونکہ پیغمبرانہ تصور تھا۔ اسلئے طریق ابراہیمی پر چلنے والے پیغمبر کا یہی تصور ابتداءً ہونا چاہیے تھا۔ اس جستجو نے تلاش میں محبت کا مادّہ پیدا کیا۔ تلاش اور دلچسپی کا لازمہ محبت ہوتا ہے۔ جو شخص کسی شے کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور اسکی خواہش میں ہمہ تن مصروفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ شے قلب کی خواہشات میں گھر کر جاتی ہے۔ قلب سے جب خواہش اٹھتی ہے۔ تو اسی شے کی شکل بن کر حافظہ میں آجاتی ہے۔ اور انسان کے حافظہ میں بار بار آنے سے اسکی یکسوئی اسی شے کی طرف ہو جاتی ہے۔ قلب سے بار بار ایک شے کا خواہش بنکر حافظہ وعقل وشعور پر چھانے کو محبت (حُب) سے تعبیر دیا جاتا ہے۔ اور اسکی تاثیر کو استغراق سے تعبیر دیا جاتا ہے لہذا محبت کا تقاضا یہی تھا کہ آپؐ پر اسی خالق کے نورانی وجود کا تعلق قائم ہو گیا۔ آپؐ ہمہ وقت اسی خالق کی یاد زبان ودل سے ''اَللّٰہ ھُوْ'' سے کرتے رہے۔ زبان و

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) واقعات کو اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اسکی صلاحیت دین کے عمل سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ دین کے علم کے ساتھ مشاہدہ کرنے کو ولایت کہتے ہیں۔ مسمریزم کے ذریعہ مشاہدہ کرنے کو کشف کہتے ہیں۔ ان دونوں طریقوں میں اپنے وجودی قویٰ میں جلا پیدا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یکسوئی جسے مراقبہ کہتے ہیں غرض دونوں کیفیتوں میں طریقہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مادی طریقہ یکسوئی۔ اور روحانی مراقبہ کہلاتا ہے۔

دل سے یاد کرنے میں محبت میں اضافہ ہوتا رہا۔اس نے جذبہ بیخودی پیدا کی اور بیخودی نے لطیف نور کا تسلسل قائم کر دیا۔اور تصور خیالی میں حقیقت کا اصلی رنگ آ گیا۔یہی کیفیت عرفانِ الٰہی کہلاتی ہے۔اس تفکر میں دائمی یکسوئی۔استغراق۔مدتوں کی تنہائی میں اکثر فاقہ کشی کا تقاضا یہی تھا۔کہ جہاں نورِ حقیقی کا اثر وجود سے متعلق ہوا۔فاقہ کی وجہ سے مادیت کم ہوئی (Electric Connection) نورانی تعلق سے جسم میں لطافت پیدا ہوئی اور یہی نور آپکی غذا کا کام دینے لگا (کیونکہ نور مجسم زندگی تھا۔اسلئے آپکی زندگی برقرار رکھنے کیلئے یہی نور غذا کا کام دینے لگا) جب آپکی غذا نور سے حاصل ہونی شروع ہوگئی تو اسکا نتیجہ لازمی یہی تھا۔کہ آپکی جسم کی مادیت یکسر نور میں بدل گئی اور آپکا جسم بظاہر مادی محسوس میں آتا۔درحقیقت اسکی کیفیت محض (خالص) نورانی تھی۔ایسی حالت میں ماوراٗ ادراک کا مشاہدہ کرنا آپکے لئے آسان بلکہ معمولی تھا۔۔۔۔اور جب آپکی عمر بیس پچیس سال کی تھی یہ وہ وقت تھا جبکہ آپؐ اکثر اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ بیرونی ممالک میں تجارت کیلئے جاتے تھے اور اسی دوران میں مکہ کی ایک متمول خاتون حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کا نکاح بھی ہوا۔تو اسوقت آپکا مشاہدۂ حقیقی بہت وسیع ہو چکا تھا۔

یہ طریق آپؐ کا بچپن سے لیکر چالیس سال کی عمر تک برابر جاری رہا۔چنانچہ حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد بھی آپؐ بدستور چالیس سال کی عمر تک غارِ حرا میں اکثر تنہائی و تفکر اور مشاہدہ حقیقی میں گزارتے رہے۔چنانچہ اسی ہیئت کے مطابق آپکو مشاہدۂ حقیقی کی تکمیل پر انسانی راہنمائی کیلئے مامور کیا گیا۔اور یہ وقت آپکو وحی حاصل ہونے کیلئے سازگار تھا۔یہی شے یوحیٰ اِلَیَّ سے مراد ہے۔کہ پیغمبر خود فطری قانون کے مطابق اسقدر استطاعت حاصل کر لیتا ہے۔کہ وہ تمام اسرارِ الٰہی اور عرفانِ الٰہی کی تکمیل کر لیتا ہے۔تاکہ اسی قوت کی روشنی میں وہ انسان کی راہنمائی کی اہلیت رکھتا ہو کہ انسان کو بھی مراحلِ حقیقی سے گزارتا ہوا حقیقت اور علتِ لامحدود اللہ سے شناسا کرائے۔یہاں پر ہی پیغمبر کو ایک دین عطا کیا جاتا ہے۔جو عام لوگوں کی اصلاح کیلئے ایک قانون کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔اسلئے حضور محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور آپکا عمل وہی کچھ

ہے۔ جوایک انسان (پیغمبر) کوعرفان الٰہی کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عمل بھی فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے کیونکہ اسکا نتیجہ بھی فطرت کے مطابق مشاہدۂ حقیقی میں ہوتا ہے۔ اب ظاہری صورت میں پیغمبر کے ساتھ ایک دین الٰہی حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جس سے انسان عمومی حیثیت میں اپنے مقصد کی تکمیل کرسکتا ہو۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رسالت کے بعد جو کچھ بذریعہ وحی حاصل ہوا۔ وہ عام انسانوں کی راہنمائی کیلئے تھا جس سے انسان میں تزکیہ نفس۔ اصلاح نفس۔ اور اصلاحِ ماحول کی کیفیت پیدا ہو۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعمیل صرف ایک نمونہ عمل اور تقلید (اتباع پیغمبر) کی صورت میں تھی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو کچھ انسان کو بتلایا وہ تمام قرآن میں موجود ہے۔ آپنے قرآن کے حکم کی تشریح اپنے عمل سے دکھائی۔ کیونکہ تقلید اور اتباع کا طریقہ یہی ہوتا ہے۔ کہ ایک راہنما (پیغمبر) اس امر میں راہنمائی کرسکتا ہے جس پر وہ خود عامل ہو۔ تاکہ لوگوں کیلئے عمل کا صحیح نمونہ قائم ہو سکے۔ یہ عمل آپکی امت کیلئے نمونہ تھا۔ ورنہ آپؐ اپنے مقصد کی تکمیل پیشتر ہی کر چکے تھے۔ اب آئندہ عمل اسلیئے تھا۔ تاکہ آپکی ذات سے ہی ایک خالص ماحول کی داغ بیل ڈالی جائے۔ اور مسلمانوں کے عمل اور تابعداری سے ہی اس دین کو وسعت دی جائے۔ آپنے وحی کے ہر حکم پر تعمیل کی یعنی جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے اس پر وحی کے مطابق ہی خود عمل کیا۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج اور دیگر احکام کے ہر طریق کو خود سے جاری کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ انسانی آبادی میں حقیقت شناسی کا ایک نیا علم وعمل ظہور میں آیا۔ جس میں انسانی تمدن۔ معاشرت اور ہر شعبۂ زندگی کیلئے ایک بہتر نظام کا اجرا ہوا۔ جس سے باطل کا زور گھٹ گیا اور انسان کو ایک خالص ماحول میسر ہوا۔ تاکہ اس ماحول میں وہ حقیقت کی راہ پر گامزن ہو کر حقیقت کو پالے۔ چنانچہ حقیقت کو پانے کے لئے قرآن نے ایک خصوصی طریق پیش کیا۔ وہ طریق یہی احکام قرآنی ہیں جسے شریعت کہتے ہیں اس سے باطل قوتیں ختم ہوگئیں۔ اور عرفان کی راہیں انسان کے لئے کھل گئیں اس

پر مزید عبادات جو رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئیں۔ جو خالص طریقِ عرفان کیلئے مقرر کی گئیں۔ ان پر آپ نے خود عمل کیا اور وہ مقام حاصل کیا جو طریق عرفان میں انتہائی مقام تھا جسے قرآن نے خود اس کیفیت کے ساتھ پیش کیا۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (پارہ ۱۵ سورۃ ۱۷ آیت اول) یہ وہ مقام ہے۔ جہاں انسانی وجود اپنی لطیف حالت میں انتہائی عروج حاصل کر کے اپنا انتہائی (جسمانی روحانی) عروج حاصل کر لیتا ہے جو اس تمام کارخانہ قدرت اور ارادہ ازلی کا اصلِ مقصد۔ خلافت۔ نبوت۔ رسالت اور شریعت سے پیش کیا گیا اور اسکا نتیجہ آپکو یہ حاصل ہوا کہ آپکی تقلید میں انسان کو یہ رتبہ انتہائے معرفت حاصل ہوا۔

آپؐ نے اعلان رسالت پر جو کچھ پیش کیا در حقیقت ایک شریعت تھی۔ یعنی اللہ کی طرف سے ایک ہدایت تھی۔ جس پر چلکر انسان کو یقیناً ایک طرف سازگار ماحول میسر ہوتا اور دوسری طرف وہ تلاش حقیقت میں حقیقت سے ہمکنار ہو جاتا۔ سو یہ امر اظہر من الشمس ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیروؤں نے۔ مذہب اسلام کی کسقدر پابندی کی۔ کسقدر رسول کے حکم کی تابعداری کی۔ کس قدر رسول کی محبت اور اللہ کی محبت میں ہر قسم کی خواہشات کو قربان کر دیا۔ آپکے پیروؤں میں خصوصی درجہ۔ حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت خدیجہؓ۔ بلال حبشیؓ۔ حضرت عباسؓ۔ حضرت حمزہؓ۔ خالد بن ولیدؓ وغیرہ کا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ مکہ کے امراو شرفا میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت عثمانؓ حضرت خدیجہؓ بھی اپنی دولت میں ثانی نہیں رکھتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے کے بعد اپنی تمام دولت تقسیم کر دی۔ اور اپنی تمام عزیز چیزوں کے مقابلہ میں محبتِ رسولؐ کو مقدم سمجھا۔ اور اسی محبت کے تحت شریعت کی پوری پابندی کی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب قیامت کا حال سنتے تو فرماتے کاش ہم پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔ تاکہ ہم وہ وقت ہی نہ دیکھتے جسدن قیامِ قیامت اور اسکی ہولناکی واقع ہونگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسقدر رعب ہوتا تھا۔ کہ اگر کسی شخص کی طرف دیکھتے تو انسان پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن قیامت اور حشر کی آیات سنکر زار و قطار روتے اور اسی اثر سے کئی

دن بیمار رہتے! اسی طرح ہر شخص کے حالات تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کے اعلان سے قبل۔ عرب قبائل آپس میں خونریز لڑائیاں لڑتے۔ شراب کے شدت سے عادی تھے۔ جوا کھیلتے۔ اپنی غیرت کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ دفن کرتے۔ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد یہی قوم باوجود تکلیف پہنچنے کے اُف نہ کرتی شراب کی ممانعت ہوئی تو اسی وقت سے شراب پینی چھوڑ دی الغرض جتنے بھی عیوب کسی میں تھے سب سے کنارہ کشی کی اور یہی وہ قوم اور یہی وہ پیروان مذہب اسلام ہیں جنہوں نے دنیا پر امن کا جھنڈا لہرایا۔ اور ہر انسان کو نیکی کی طرف بلایا۔ ان باتوں کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں تو اریخ اسلام خود اس امر کی شہادت پیش کرتی ہے۔ اسکے بعد کسی زمانہ میں بھی اسلام کے بعد نظر ڈالو۔ پیروان اسلام کے علماً۔ خلفاً۔ جرنیل۔ سپاہی۔ روحانی عالم جیسی ہستیاں کسی قوم میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ اور پھر اسکی خلافت۔ علم۔ جہاد اور روحانی مشاہدات کیلئے اسلام کے پیروان مذہب اور انکے واقعات خود اسلام کی شہادت اور دلیل ہیں۔ اور زمانہ نے ہر قسم کا فیض (فائدہ یا راہنمائی) اسلام اور مسلمان سے حاصل کیا۔ اور باوجود طویل زمانہ گزرنے کے بھی مذہب اسلام اور اسکے علم کی وسعت برابر جاری ہے۔

یہ بات یاد رہے۔ کہ اسلام میں کسی شخص نے دین کے علاوہ کسی قانون کسی علم کی اختراع نہیں کی۔ بلکہ ہر شخص کے پاس وہی ابتدائی علم تھا جو حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔ اور جو علم آپکو بذریعہ وحی حاصل ہوا۔ آپؐ نے اپنے پیروؤں کو ہر اس حکم پر عمل کرایا۔ جو قرآن کی صورت میں آپکو حاصل ہوا۔ یہ چیز چھپی نہ تھی بلکہ ہر حکم کی تعمیل عام انسانوں کیلئے ظاہری طور پر تھی۔ یہی شریعت کی تعمیل وہ مواد تھا۔ جس سے انسان اپنے حقیقی خالق تک پہنچ سکتا ہے۔ اصحاب رسول اللہؐ نے اور عام مسلمانوں نے وہی کچھ کیا۔ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا اور ہر شخص نے اسی عمل کی تقلید میں عرفانِ الٰہی حاصل کیا۔ جب ایک پیغمبر کے حکم کے مطابق عمل کیا جائے تو یقینی طور عرفانِ الٰہی حاصل ہو سکتا ہے۔

تمت بالخیر